

عبداللہ ؛ ہاشم ندیم

Abdullah: Sequel

...Continued from Abdullah 1

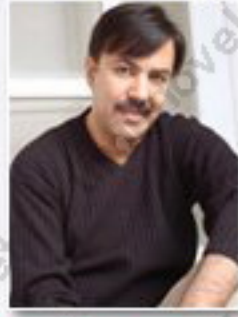
عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے
انوکھے و لافانی سفر کی داستان

پی ڈی ایف میں تبدیلی

وحید احمد

princesnowwhite@gmail.com

0321-7255030



قارئین!! آپ کے بے حد اصرار پر ہم نے 24 اگست 2008ء سے سنڈے میگزین کے پہلے ناول ”عبداللہ“ کی سلسلے وار اشاعت کا آغاز کیا۔ ناول کا یہ بہت کام یاب سفر 8 مارچ 2009ء کو اپنے اختتام پر پہنچا۔ ناول کتاب کی صورت مارکیٹ میں بھی آگیا، لیکن بھی، قارئین نے توفیق، خطوط اور ای میلز کے ذریعے احتجاج کر کے جینا محال کر دیا، خصوصاً کئی نوجوان خواتین نے تو باقاعدہ رونا دھونا شروع کر دیا۔ ناول کو یوں اچانک ختم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ آپ نے بہت بڑا عزم کیا ہے۔ ابھی تو کئی تکنیکیاں باقی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ توجی، ہم ایک بار پھر ”عبداللہ“ کے ایک نئے آغاز، لیکن پرانے تسلسل کے ساتھ حاضر خدمت ہیں۔ ملاحظہ کیجیے، اس Sequel کی پہلی قسط۔

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلا کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربست مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ۔ آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabulab@junggroup.com.pk

(”عبداللہ“ کے پہلے حصے، سابقہ 29 قسطوں کا خلاصہ)

شہر کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان، ساحر ایک کاررلس کے اختتام پر خود کو ایک ساحلی درگاہ کے قریب پاتا ہے۔ قریب بکھری ایک بڑی گاڑی کو دیکھنے کا شوق اسے درگاہ تک پہنچا دیتا ہے اور وہاں ایک پرچی واپس زہرہ کی ایک ہی جھلک اسے اپنی دنیا سے بے گانہ کر دیتی ہے، لیکن زہرہ کا من جیتنا ساحر کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ واضح الفاظ میں اس کا بھیجا گیا رشتہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ساحر کا جنوں اسے درگاہ کے متولی عبداللہ تک کھینچ لاتا ہے، جہاں اس کی سلطان بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے، جو عبداللہ کے استاد ہیں۔ ساحر سلطان بابا سے بحث میں الجھ کر اپنی تقدیر کا ٹھکڑا کر رہا ہے اور سلطان بابا جو بابا اسے آگے لے جاتے ہیں کہ عشق کا حصول کچھ آسان کام نہیں۔ پہلے ساحر خود کو اس جنوں کا اہل ثابت کرے اور اپنی دنیا چھوڑ کر درگاہ پر عارضی دبیرا کر لے تو کوئی اس کے دعوے کی سچائی کو تسلیم بھی کرے۔ ساحر یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے، لیکن تب اس پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ زہرہ کی ادوی کی نہیں، خود درگاہ کے متولی عبداللہ کی نظر سے گھائل ہے، لیکن عبداللہ اسے بتاتا ہے کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور زہرہ کبھی بھی اس کی منزل نہیں رہی۔ ساحر گھر والوں کی اجازت سے درگاہ پر آ بیٹھتا ہے اور یہاں اسے اپنے نئے نام ”عبداللہ“ کی شناخت ملتی ہے۔ سلطان بابا پرانے عبداللہ کے ساتھ کسی سفر پر نکل جاتے ہیں اور ساحر، مولوی خضر کی تربیت میں درگاہ پر اپنے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ مولوی خضر کی صحبت میں اس پر کئی نئے اسرار کھلتے ہیں اور خود زہرہ بھی ساحر کے جنوں کے آگے رکھی اپنی ڈھال کو زنگ زدہ پاتی ہے، لہذا ساحر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے، کیونکہ ساحر کا جنوں اس کے راستے کی دیوار ہے۔ ساحر گھر تو لوٹتا ہے، لیکن اپنا سب کچھ درگاہ ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ آخر کار، ساحر کے والدین اس کی بیٹی ہوئی زندگی اور تقسیم شدہ روح کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے دوبارہ درگاہ جانے کی اجازت دے دیتے ہیں، لیکن اس بار، اس کی منزل درگاہ نہیں، بلکہ سلطان بابا کا ساتھ ہے اور ان دونوں کا پہلا پڑاؤ دور دراز کی سینٹرل جیل ہے، جہاں سکندر نامی قیدی کی پھانسی اگلی صبح طے ہے۔ مقتول کی بیوہ نانکہ خود کبھی سکندر کی زندگی کی ڈور تھمتی، لیکن اب وہ سکندر کو پھانسی پر جھولنا دیکھنا چاہتی ہے۔ عبداللہ (ساحر) کی کوشش تو رنگ لے آتی ہے، نانکہ آخری وقت میں سکندر کو معاف تو کر دیتی ہے، لیکن خود بھی سکندر کی سانسوں کے ساتھ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ سلطان بابا کا اگلا پڑاؤ باب کی حویلی بنتی ہے، جہاں یا قوط نامی ایک جن زدہ راہب کی زلفوں کا امیر ہے۔ وہ سلطان بابا کو شکست دینے کے لیے عبداللہ کے جسم پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے، لیکن جیت آخر انسان ہی کی ہوتی ہے اور راہب، یا قوط کے جھڑگل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سلطان بابا عبداللہ کو جیل پر و روانہ کر دیتے ہیں، جہاں راستے میں زہرہ کی موت ملی، بہن زریاب کو دیکھ کر عبداللہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر اسے ٹکس نامی ٹنڈے کے عذاب سے بچانے کے لیے عبداللہ کو ایک بار پھر سلطان بابا کو پکارنا پڑتا ہے۔ زریاب تو ٹکس کی دست برد سے نکل آتی ہے، لیکن خود جیل پر گئے تھان کریم کی آنکھوں کا تارہ، لاریب، عبداللہ کے ماں باپ کی زبانی ساحر اور زہرہ کی لانا وال داستان سن کر کاٹاؤ عبداللہ کو دل میں بسا لیتی ہے اور شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ عبداللہ کو ایک بار پھر زہرہ کے مرہم کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ زہرہ کو جیل پر طلب کر لیتا ہے، لیکن خود زہرہ اس مرتبہ عبداللہ کی مستقل مزاجی اور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ لاریب کو زہرہ کی سچائی اور اس کے جذبے کی طاقت دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے اور زہرہ، عبداللہ سے کہتی ہے کہ اب اس کی روح عبداللہ کے بلاوے کی منتظر رہے گی۔ سلطان بابا اور عبداللہ جیل پر اسے اپنے نئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔ (اب آگے پڑھیے)

میری آوارگی میں کچھ دھل ہے تمہارا بھی محسن

تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ہمیں جیل پر سے نکلے، آج تیسرا دن تھا اور اب تک ہم دوڑیں بدل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے آس پاس کے مناظر سے سبزہ اور پہاڑ اوجھل ہوتے جا رہے تھے اور تیسرے دن دو پہر تک باہر کا موسم یک سر بدل چکا تھا۔ ریت اور گرد کے گولے گاڑی کی ادھ گھٹلی کھڑکیوں اور برسوں سے زنگ خورہ، جامد دروازوں سے ہمارے استقبال کو یوں اندر لپک رہے تھے، جیسے کوئی صدیوں کا پتھر اپنے گم شدہ محبوب کی طرف بڑھتا ہے، گرم لہو کے تھپڑے چہروں کو ٹھلسانے لگے تھے اور ہاہر دوڑتی زمین کے آثار بتا رہے تھے کہ ہم کسی صحرا میں داخل ہو رہے ہیں۔ آس پاس کے مسافروں نے جلدی جلدی سامان سے تولیہ یا کوئی اور کپڑا نکال کر پانی میں بھگوایا اور سر اور چہرے چھپانے لگے۔ سلطان بابا نے مجھے بھی یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا، لیکن میں مسکرا کر ٹال گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس سے کہیں زیادہ ”شدید لو“ تو شاید ازل ہی سے میرے اندر چل رہی ہے۔ باہر چلتی ہوا کے یہ چند گرم جھونکے بھلا مجھے جیسے گرم جلے کا کیا لگاڑ پائیں گے۔ اور پھر بات باہر کے موسم کی قسمی ہی کب، جن کے اندر ہی سدا کے لیے خزاں ٹھہر گئی ہو، انہیں بیرونی تہذیبوں سے کیا واسطہ۔ گاڑی اب باقاعدہ ایک وسیع صحرا سے گزر رہی تھی، جہاں اڑتی ریت کی زیادتی سے گرم دھوپ میں چمکتی لوہے کی پٹری بھی جگہ جگہ

ریت میں وحش کو غائب ہو جاتی تھی۔ شاید اسی لیے فرین کی رفتار اب کافی مدہم بڑھ چکی تھی۔ دو اہل کار ایک بڑی سی کنا سے نما کپڑے کی رسی لیے گاڑی کے آگے آگے بھاگ رہے تھے، جسے انہوں نے زمین پر یوں ڈھلا کر رکھا تھا کہ اس کے پونچھے کی رگڑ سے پٹریوں پر پڑی ریت پونچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی مقصد کے لیے رسی کو اچھی طرح پانی میں بھگوایا گیا تھا۔ ایک تیسرا اہل کار ایک بڑے سے کہن میں پانی لیے ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیسے ہی ٹوکے گرم ٹیئروں سے پونچھا خشک ہونے لگا، وہ جلدی سے دوبارہ پانی کا چھڑکاؤ کر کے اسے بھگو دیتا۔ بعض جگہ ریت کے نیلے باقاعدہ لوہے کی پٹری کے اوپر برک آئے تھے، جنہیں ہٹانے کے لیے متعین عملے کو خاص پہلوں کی مدد سے فرین زکو اگر ریت ہٹانی پڑتی تھی۔ کہیں پڑا تھا کہ ریت بھی ہم انسانوں کی طرح سفر کرتی ہے اور صحرا کی منزل بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، تو بہت دیر تک اس سرکٹی ریت اور بدلتے صحرا کے کھیل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ افق کے یار سورج ڈوبنے کے باوجود آتشیں گلابی رنگت کی ایک واضح لکیر، یوں گاڑی کے ساتھ بہت دیر تک دوڑتی رہی، جیسے کسی دیہاتی کا مختصر سا شعلہ رگڑ کھانے کے بعد لکڑی کی تیلی پر اپنے انتہام کی جانب دوڑتا ہے۔ صحرا کے آسمان کی حد پر قدرت نے بھی کوئی دیہاتی سی جلادی تھی، جو اب ٹیڑی سے افق کے دوسرے پار تک اپنی گلابی آغ پھنپا کر پورے فلک کو جلادینا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز ہم نے ہچکولے لگاتی گاڑی ہی میں پڑھی اور مکمل اللہ پیرامو نے تک ہمیں کسی انسانی ہستی یا اسٹیشن کے آثار نظر نہیں آئے۔ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا، چپ فرین نے ایک آخری ہچکولی اور دھیرے دھیرے ایک ویران سے اسٹیشن پر رگڑ کئی۔ سلطان بابا نے مجھے اشارہ کیا ”چلو میاں..... ہماری منزل آگئی ہے۔“ میں اپنے خیالات کی زوٹے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا نوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس ڈھین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایسا تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لائین کی کم زوری روشنی، کھڑکی کے ٹکڑے شیشوں سے بچن کر باہر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی سوئی تہہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے، تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچے ایک لکڑی کے تختے نہایت کدو دار اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی، لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ آتی ریت نے اسے ڈھک لیا۔ ہم انسان پوری زندگی اس گرد سے غمو کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لے لیتی ہے۔ سچ ہے ”آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے“

دفعاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس۔ ٹانے میں موجود ہوا اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو دو پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راز کو بہ طور کھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا بیوا سا دکھائی دیا، لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات کئے، ایک تھلاڑی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے جذبہ و خال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور ابھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ”کن سوچوں میں کم ہو..... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر تھکن زیادہ ہو تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں، لیکن پھر بہت سیرے ٹھکنا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلنے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔“ سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی، میں مسکرایا۔ ”نہیں..... ہم ابھی سفر کریں گے..... میں بالکل تازہ دم ہوں.....“ سلطان بابا نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ میں نے پلیٹ فارم سے نکلنے سے پہلے ہلت کر دیکھا۔ وہ لڑکی اب وہاں نہیں تھی۔ ایک لمبے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کوئی واہمہ ہو، لیکن وہم اس قدر بجز نیات کے ساتھ تو نہیں اترتے۔ ہر حال، میں سر جھٹک کر صحرا میں آکے بڑھتے سلطان بابا کے نقش قدم پر چل پڑا۔ جن لوگوں نے صحرا کی ڈھلتی رات کو جیا ہے، وہ اس کے سحر سے ضرور واقف ہوں گے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پوری کائنات ایک آسمان بن گئی ہو اور اس پر چپکتے ان گنت تارے مجھ سے سرگوشیاں ہی کر رہے ہوں کہ ”ہمیں چھوڑ کر کہاں چل دیے؟“ رات کے وقت صحرا خود ایک لامتناہی سمندر کی طرح نظر آتا ہے۔ بس، ہر موڑ پر ایک نیا سراپا چھل دینے کے انتظار میں کھڑا ملتا ہے۔ جانے یہ تارے صحرا میں اتنے روشن اور چمک دار کیسے ہو جاتے ہیں، میرے مقدر کا ستارہ تو سدا کا وہندا تھا۔

صبح ہونے سے کچھ پہلے ہم ایک صحرائی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ بستی کیا تھی، بس ویرانہ ہی تھا۔ کچے کھروں کی طویل قطاریں دور دور تک صحرا میں پھیلی ہوئی تھیں، جنہیں لیکر نما ایک بھاری کی ہاڑھ سے ڈھکا گیا تھا۔ بستی کی زبوں حالی اور غربت، ان آگے چھوٹے زبوں ہی سے ظاہر تھی، البتہ کچھ آگے بڑھنے پر چند تکی عمارتیں اور پھر خاکی رنگ کی ایک بہت بڑی سی قلعہ نما عمارت بھی نظر آئی۔ شاید پوری بستی میں یہی ایک واحد عمارت تھی، جہاں بجلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی گھردہ..... کی سی آواز سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ اجالا کسی بہت بڑے جزییر کا سر ہون مست ہے۔ میں نے بستی کی میز میز می، اینٹوں سے بنی سڑکوں اور کچی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک اور عجیب سی بات بھی محسوس کی کہ کسی ایک آوارہ ستنے نے بھی ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید پوری بستی میں کوئی عمارت ہی نہیں۔ بس، ایک کر دینے والا خانہ طاری تھا۔ اب بستی کا باقاعدہ بازار ختم ہو رہا تھا اور دور دور چاند لگیوں سے پرے، صحرا میں ایک لمبے پر ایک چھوٹا سا چراغ ٹٹماتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، البتہ بستی ختم ہو جانے کے بعد، میں جس روشنی کو بہت قریب کچھ بیٹھا تھا، صحرا میں وہ عمارت اور وہ چراغ بھی بہت دور نظر آئے۔ چراغ نے دھیرے دھیرے ایک بڑی سی گلیں جی کی شکل اختیار کر لی اور ریت کا ٹیلہ دھیرے دھیرے صحرا میں کھڑے ایک بوسیدہ مزار کی عمارت کی شکل اختیار کر گیا۔ یہی زرد اینٹوں سے بنایا گیا، صہ یوں پرانا مزار ہماری منزل تھا، جو صحرا میں رہتے کے ایک بہت بلند لمبے پر واقع تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، دور بستی کے کچے گھر اور وہ قلعہ، بچوں کے جانے گھر وہاں سے معلوم ہو رہے تھے۔

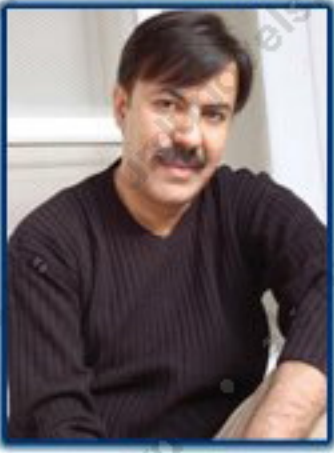
مزار کا بوسیدہ لکڑی کا گیسے تیز ہوا سے بھول کر، اس۔ ٹانے میں ایک عجیب سی اور منتقل آواز پیدا کر رہا تھا، جیسے نئے آنے والے مہمانوں سے اپنی بے کسی کی فریاد کر رہا ہو۔ مزار کا صحن بھی انہی کچی اور پلے رنگ کی اینٹوں سے بنوایا گیا تھا، جس کا استعمال قصبے کی سڑک میں نظر آتا تھا۔ صحن سے کافی پرے، چند بوسیدہ کمرے اور دو سرائیں ایک گنبد تھا، جس کے اوپر کئی چٹریلی اور منتقل بیٹا کاری، مہبہ سال کی گردش کے سبب جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھی اور مزار کی چھت پر کھڑا یہ عظیم گنبد اس وقت خود کسی جدے کی سی حالت میں نظر آ رہا تھا۔ دفعاً میرے دل میں وہی پرانا سوال پھر سے جاگ اٹھا ”لوگ ان مزاروں پر کیوں آتے ہیں۔ ان پرستی ویرانوں کا ہمارے دل کی ویرانی سے کیا رشتہ ہے.....؟“ آہٹ سن کر اندر سے ایک بوڑھا نکل آیا اور اس نے بڑے تپا ک سے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ سلطان بابا اسے اکرام اللہ کے نام سے مخاطب کر رہے تھے اور جب انہوں نے عہد اللہ کے نام سے مہر اتعارف کر دیا تو اس نے پہلے تو چونک کر ایک ہار پھر سے میرا پغور چانڑہ لیا اور پھر نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ کس مقصد کی بات کر رہا تھا؟ اگر ذہری میرا مقصد تھی، تو شاید اسے تو میں حاصل کر چکا تھا، تو پھر ذہریہ مجھے بعد وہ کون سا مقصد تھا، جو مجھے ان ویرانوں میں در بدر بھٹکا رہا تھا۔ یہ کبھی تلاش تھی، جو ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی تھی۔؟ کچھ ہی دیر میں فجر کا وقت بھی ہو گیا۔ اکرام اللہ صاحب نے ان دنوں اور سلطان بابا کی صحبت میں ہم دونوں نے باہم امت نماز پڑھ لی۔ کچھ ہی دیر میں پھر شفقت سے قدرت کی وہ ان دیکھی ویا سلامتی ٹٹکی اور مدھم شعلے جیسی اک گلابی روشنی، افق کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی جانب لپکی۔ میں چلن بھر کے لیے مہوت سارہ گیا۔ فلک پر ایسا چراغ تھا، میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اکرام صاحب پتیل کی چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور ایک پتلیکیر میں روٹی کے چند ٹکڑے لیے اندر سے برآمد ہوئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی میرے منہ میں ریت کا ذائقہ اور ذلت بھرت گئے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں اس ریت بھری چائے کو نگلوں یا نگلوں..... یہی حال اندم کے آنے سے بنی اس روٹی کا بھی تھا۔ اکرام صاحب غور سے میری حالت دیکھ رہے تھے، دھیرے دھیرے سے مکائے ”بھئی یہاں کی ہر چیز میں تمہیں اس ریت کا اذی و لذت ملے گا۔ آنا اور چینی کتنے بھی ڈھانک کر رکھو، ریت کہیں نہ کہیں سے اندر چھن ہی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ”کال کڑھ“ والے اب اس ریتیلے ڈانٹے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو سالن میں نمک، مرچ اور دیگر مسالوں کے ساتھ ریت کا بھی باقاعدہ حساب رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں تمہیں کھر جیسا ناشتا نہیں پیش کر سکتا۔“ ان کا آخری جملہ سن کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک وقت تھا کہ ساحر صاحب صبح کا ناشتہ صرف اس لیے چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے کہ فرانس کا مارسلیز اور مسر کا شہد ہیز پر موجود کیوں نہیں۔ بالینڈ کے بٹے ہوئے دلیے کے علاوہ اگر کوئی دلی یا بدلی کارن فلکیں ہوتا تو یورادون مزاج بکڑا رہتا۔ ہم انسانوں کی زندگی بھی کیسے کیسے ان چائے موڑوں اور غلام گردوش بھی انہی گولائیوں سے بھرچ رہی ہوتی ہے۔ کون، کب کیا ہو جائے..... کس کو خبر.....؟

کچھ ہی دیر میں سورج کا گولا مشرق سے بلند ہوا اور آٹا ٹٹانا جیسے ہر چیز کو آگ سی لگ گئی۔ میں نے صحرائی گرمی اس سے پہلے کبھی نہیں پہیلی تھی۔ کبھی پایا یا کاشف کے ساتھ فلکار یا کھپ قاتر کے لیے جانا ہوا بھی تو ہمارے ساتھ بڑے بڑے ہزیر ہوتے تھے اور ہمارے محسوس کو ٹھنڈا کرنے کا پورا اہتمام

ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا تھا، لیکن یہ تپش..... دو گھنٹوں ہی میں مجھے یوں لگنے لگا تھا، جیسے میرے وجود کے ساتھ ساتھ میری روح بھی پھل کر بہہ جائے گی۔ یہ نیلا آسمان ایسے قہر بھی برساتا ہوگا، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کال گڑھ ایک صحرائی بستی تھی، جس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی سدا کا کال اور قحط ہی تھا۔ یہاں برسوں سے بارش نہیں برسی تھی اور پانی یہاں آب حیات سے بھی بڑی عیاشی تھا، قصبہ میں توے فی صد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتی تھی اور پوری بستی پر قلعے کے بامیوں کا قبضہ تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے اکرام اللہ صاحب سے چٹا چلیں، جو خود کال گڑھ کے واحد اور برائے نام مڈل اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بستی کے بچوں کو درس قرآن دیتے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کا اکھوتا بیٹا ہی بچا تھا، جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اُسے کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی پسند نہیں تھی، لہذا وہ میٹرک کے بعد ہی باقاعدہ شہر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلعے کے ذکر پر اکرام صاحب کچھ بے چین اور باقاعدہ خوف زدہ سے ہو جاتے تھے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا۔ ”آپ نے ہر چیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا ہے، لیکن یہ قلعہ اور اس میں بسنے والے قلعہ داروں کا اسرار مجھے سمجھ میں نہیں آیا“ میرا سوال سنتے ہی اکرام صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ انہوں نے جلدی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں ستون کے گرم سائے میں مچھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سلطان بابا اندر کمرے میں آرام کرنے جا چکے تھے۔ اکرام صاحب نے سرگوشی کی ”عبداللہ میاں..... ان قلعہ داروں کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔ بہت سفاک اور اذیت پسند ہے، وہاں کا بڑا قلعہ دار..... سارا علاقہ کا پتلا ہے جبروت کے نام سے.....“ ”جبروت.....؟ یہ کیسا نام ہے.....؟“ نام تو ماں باپ نے شاید جاہر رکھا تھا، جو پیار سے جبرو ہوا اور پھر اس کے ظلم کی دہشت نے اسے جبروت بنا ڈالا۔ اور اب وہ اسی نام سے حکمرانی کرتا ہے۔“ جبروت جو کوئی بھی تھا، اس کی دہشت، میں اپنے سامنے بیٹھے اکرام اللہ کے چہرے ہی سے محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے مزید جو کچھ بتایا، وہ اس جدید دنیا میں مجھے ایک ماورائی داستان سے کچھ کم محسوس نہیں ہوا۔

کال گڑھ جبروت کی کسی ذاتی جاگیر کی مثال بن چکا تھا۔ علاقے میں کوٹوالی یا پولیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سب انسپکٹر، ایک برائے نام سی تھانہ، نما عمارت میں چار، چھ کانسٹیبلوں کی نفری کے ساتھ بیٹھتا تو تھا، لیکن اس کی حیثیت بھی جبروت کے ذاتی غلاموں جیسی ہی تھی۔ کال گڑھ کا قانون، عدالت اور انصاف، سب کچھ جبروت تھا۔ علاقے کے تمام مقدمے اسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی ان کا فیصلہ کرتا تھا۔ اس کی حکم عدولی کی سزا فوری اور انتہائی اذیت ناک تھی۔ قلعے کے اندر اس نے ذاتی جیل بھی بنا رکھی تھی، جس کی کال کوٹھڑیوں میں اس کے مجرم پڑے پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ان سے دن بھر انہی زنجیروں اور بیڑیوں سمیت مشقت لی جاتی تھی اور پھر شام ڈھلے، ان ہی بندھے بھاری پتھروں سمیت پھر سے تہہ خانوں کے زندان میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے تو کئی ایسے تھے، جنہیں قلعے سے باہر کا آسمان دیکھے بھی برسوں بیت چکے تھے۔ پورا قصبہ جبروت کے دیے ہوئے قرض کے بوجھ تلے دب ہوا تھا اور ان کی دوسری نسل بھی اس قرض کو چکاتے چکاتے، اپنی جوانی بڑھاپے میں بدل رہی تھی۔ برسوں کے قحط نے کال گڑھ کے بامیوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور اب تو انہوں نے قرض کی اس غلامی سے باہر نکلنے کا خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ قلعے میں جبروت کے پہرے داروں اور محافظوں کی فوج کے علاوہ اس کی تین بیویاں اور کتوں کی ایک فوج بھی رہتی تھی۔ جبروت کو اگر دنیا میں کسی چیز سے پیار تھا، تو وہ اس کے پالے ہوئے خوں خوار گائے تھے، جنہیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ویسے بھی جبروت کی تمام اولاد، بچپن ہی میں ماں کی گود ہی میں خدا کو پیاری ہو جاتی تھی۔ اسی اولاد کی خواہش میں اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں اور چوتھی بیوی کا انتقال بھی زندگی کے دوران ہی ہوا تھا، لیکن کچھ افسانے یہ بھی دہراتے تھے کہ جبروت نے خود ہی کسی بات پر ناراض ہو کر اُسے زہر دے دیا تھا، وجہ کچھ بھی رہی ہو، آج کل پھر جبروت کی چوتھی بیوی کا کمر اور نشست خالی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور ہر بار پوری بستی کی اس وقت تک جان پر بنی رہتی تھی، جب تک جبروت کہیں نہ کہیں سے کوئی نئی نویلی چوتھی بیوی بیاہ کر نہیں لے آتا تھا۔ چارگی اس گنتی کو تین کرنے میں جبروت کی کسی نہ کسی بیوی کو کبھی بیٹھے، کبھی سانپ کے کاٹے، کبھی بخار اور کبھی کسی دوسری ”انبوئی“ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترنا ہی پڑتا تھا۔ سچ ہے ”قدرت کے لکھے“ کو بھلا کون نال سکتا تھا، لیکن چارگی گنتی پوری کرنے کے چند دن بعد ہی جبروت پھر سے ان کھلونوں سے اُوب جاتا اور پھر سے قدرت کے لکھے کا انتظار کرنے لگتا۔ ہاں البتہ، اس کی دل چسپی اگر سدا کسی مشغلے میں برقرار رہی تو وہ تھی، خون خوار بھیڑ یا نما کتوں کی دیکھ بھال اور نشوونما۔ سنا تھا کہ ان کے راتب اور خوراک وغیرہ میں غفلت کرنے والے نوکروں کو وہ انہی بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ دن میں تین مرتبہ ان کتوں کو خوراک، ورزش اور غسل کے بعد ٹھکانے کے لیے جب بستی میں نکالا جاتا تھا تو جبروت خود ان کے ساتھ ہوتا اور انہیں دیکھ کر ہی بستی والوں کا پٹا پانی ہو جاتا۔ ان کتوں کے بارے میں ایک اور لرزہ خیز فسانہ بھی کال گڑھ میں زبان زد عام تھا۔ کہنے والے کہتے تھے، جبروت اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلتا تھا۔ اسے خود کو انصاف پسند کہلانے کا بہت شوق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اسے کبھی بے انصاف کا لقب نہ دے، لہذا اپنے دشمنوں کو مروانے سے پہلے وہ انہیں ایک پیش کش کرتا تھا کہ اگر اس کا دشمن چاہے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے، بس اسے جبروت کے ان لاڈلوں کو ہرانا ہوگا۔ کھیل یہ طے پاتا تھا کہ ملزم کو کال گڑھ کا تپتا صحرا بھاگ کر پار کرتے ہوئے سات کوس کے فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہوتا تھا۔ شکار کے سرپٹ صحرا میں دوڑنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد، جبروت کے خوں خوار دندے بھی اس دشمن کے تعاقب میں چھوڑ دیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آج تک ایک بھی ایسا خوش نصیب ثابت نہیں ہو سکا تھا، جس کی لرزہ خیز چیخوں سے کال گڑھ کا صحرا نہ گونجا ہو۔ بستی میں داخل ہونے والے ہر ذی روح کو پہلی سلامی کے لیے جبروت کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، ورنہ وہ شخص پہلے دن ہی سے باغی قرار پاتا تھا۔ اکرام صاحب کے بقول، میں اور سلطان بابا اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ جبروت دو دن سے کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا، لہذا اسے فی الحال ہماری کال گڑھ میں موجودگی کا پتا نہیں چل پایا تھا، لیکن ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جب جبروت کی واپسی ہوگی تو وہ ضرور ہم دونوں سے ملنا چاہے گا۔ اکرام صاحب نے پریشانی سے سر ہلایا۔ دفعتاً تب ہی ہمارے عقب میں آواز ابھری ”جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے“ میں اچھل ہی تو پڑا۔ سلطان بابا جانے کب سے، ہمارے عقب میں کھڑے جبروت نامی اس عجیب الخلق کردار کے فسانے سن رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر ان کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں جب معمول ملامت آمیز سکوت پھیلا ہوا تھا۔

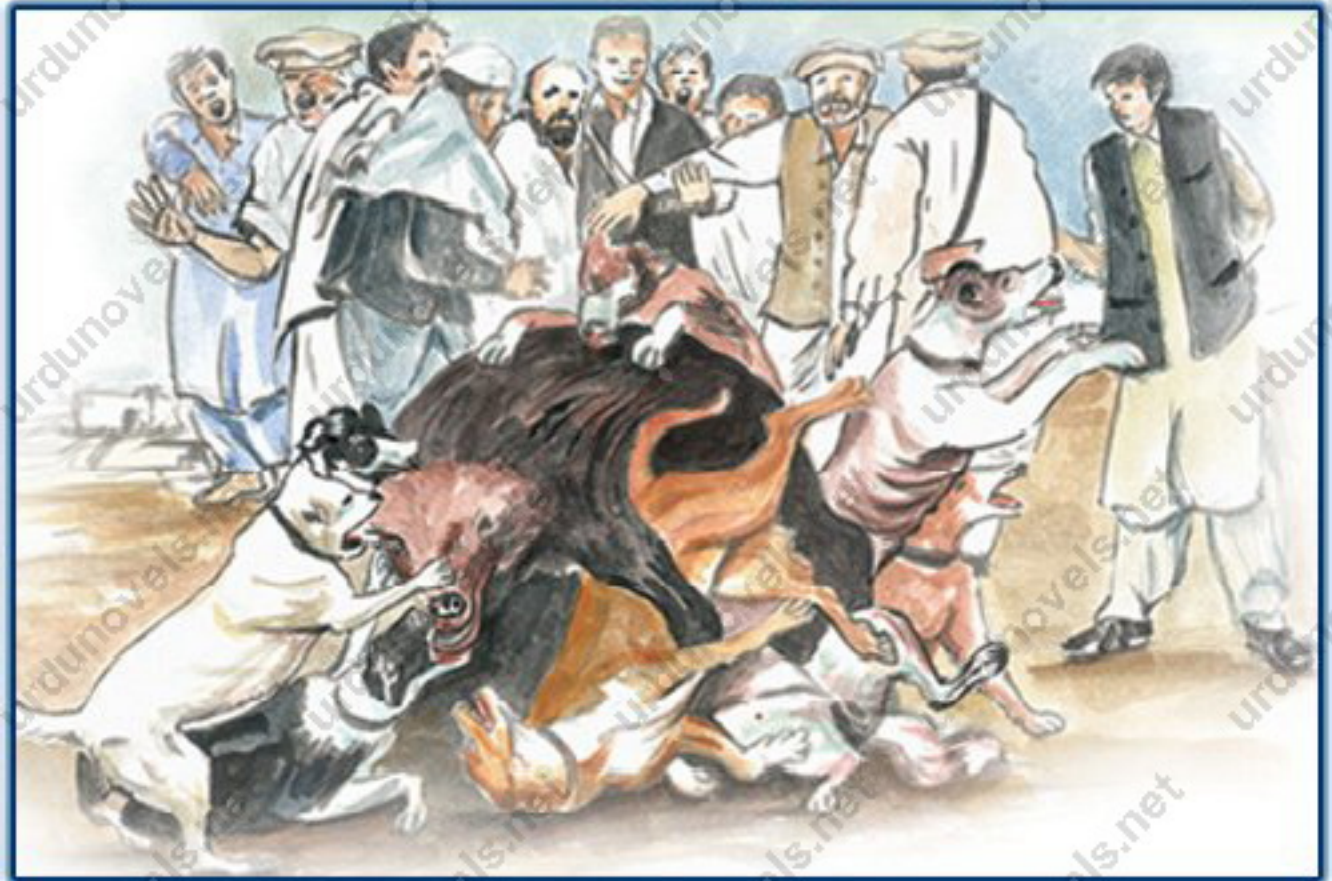
اکرام صاحب ہمارے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلے گئے۔ اسی سوچ و بچار میں شام بھی ڈھل گئی اور پھر سے وہی خواب ناک صحرائی رات، تاروں بھرا آجکل لیے ہمارے سروں پر آ کر ٹھہر گئی۔ اکرام صاحب مغرب سے کچھ پہلے ہی واپس لوٹ چکے تھے۔ عشاء کے بعد سلطان بابا نے مجھ سے کہا ”اب تم بھی ذرا کمر لگا لو عبداللہ میاں..... میں بھی کمرے میں اپنی تسبیح پوری کروں گا۔“ لیکن میری خبر آنکھوں میں بھلا نیند نے کب آبیاری کی تھی۔ سو کچھ دیر کروٹیں بدلتے کے بعد گرمی اور جس سے پریشان ہو کر میں مزار کے صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر چمکتے ستاروں کا کارواں مجھے دیکھ کر مُسکایا۔ میں ان تاروں میں اپنا اور زہرہ کا تار تلاش کرنے کے لیے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا، جیسے مزار کے صحن کے باہر، میں نے کسی کے پھولوں بھرے آجکل کی ایک جھلک لہراتے دیکھی ہے۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی، جسے میں نے کل رات ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا، لیکن وہ میرے پیچھے یہاں اس ویرانے میں آدھی رات کو اس مزار تک بھی آ پہنچی، کیوں.....؟ مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن کل کی طرح آج بھی ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا اور پھر اس کا وہ لمبا صحرائی گھونگھٹ کل کی طرح پردہ بن کر اس کے خدا و خال مجھ سے چھپا رہا تھا۔ آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ حلیہ تو اسی ریگستانی بستی ہی کا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فضا میں دو تین جیپ نما گاڑیوں کا شور گونجا۔ میری توجہ لمحے بھر کو صحرائی جانب بٹی، جہاں دو تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جگمگاتی ہوئی مزار کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحوں میں نے دوبارہ وہاں نظر ڈالی، جہاں وہ کچھ دیر پہلے گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی، تو اب وہ جگہ سنسان تھی۔ شاید کسی کو اتادیکھ کر وہاں سے بڑھ گئی ہو۔ تینوں گاڑیاں پرانے ماڈلز کی ولیز جیپیں ہی تھیں، جواب بالکل مزار کے قریب پہنچ کر رک گئی تھیں۔ دفعتاً میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے غزانے کی آواز گونجی۔ جیپ سے کوئی کود کر نیچے اُترا اور اس نے بھاگ کر پچھلی جیپ کا دروازہ کھولا۔ ایک دراز قد ہینولا اندھیرے میں نیچے اُتر آیا۔ میری آنکھیں ابھی تک جیپ کی جلتی لائٹس کی وجہ سے چندھیائی ہوئی تھیں، لہذا روشنی کے پیچھے چھپے سائے بصارت کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے۔ باقی اشخاص پیچھے کھڑے رہے۔ دراز قد شخص روشنی میں آ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اکرام اللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق میرے سامنے کھڑا وہ شخص جبروت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے، اچانک جبروت کے عقب سے ایک خوں خوار لٹا میری جانب لپکا۔..... (باقی آئندہ)



قارئین!! آپ کے بے حد اصرار پر ہم نے 24 اگست 2008ء سے سنڈے میگزین کے پہلے ناول ”عبداللہ“ کی سلسلے وار اشاعت کا آغاز کیا۔ ناول کا یہ بہت کامیاب سفر 8 مارچ 2009ء کو اپنے اختتام پر پہنچا۔ ناول کتاب کی صورت مارکیٹ میں بھی آ گیا، لیکن بھئی، قارئین نے تو فون، خطوط اور ای میلز کے ذریعے احتجاج کر کر کے جینا محال کر دیا، خصوصاً کئی خواتین نے تو باقاعدہ رونا دھونا شروع کر دیا۔ ناول کو یوں اچانک ختم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ آپ نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ ابھی تو کئی تکنیکیاں باقی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو جی، ہم ایک بار پھر ”عبداللہ“ کے ایک نئے آغاز، لیکن پرانے تسلسلے کے ساتھ ماسٹر خدمت ہیں۔ ملاحظہ کیجیے، اس Sequel کی دوسری قسط۔

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلا کہ جہاں اسے ہر نئے دن عشق حقیقی کی نئی نئی معنویتیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بٹنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ کچھ مختلف انداز، نئے سب سے سب کے ساتھ۔ آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای سیل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabduallah@janguroup.com.pk



اس خون خوار کتے کی لپک اتنی اچانک اور شدید تھی کہ میں نے اس کی غزاحت سے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہوا میں یوں بلند کیے کہ جیسے اس کے حملے کو روک ہی تو لوں گا، لیکن اچانک فضا میں جبروت کی گرج دار آواز گونجی، ”ناں..... کالے.....!!“ اور اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ زقذ بھرنے کے لیے تیار اور اپنے خون خوار جڑے کھولے اور اپنی اگلی ناگوں پر اپنے وزن کو توالتے ہوئے کتے کو سکتہ سا ہو گیا اور وہ وہیں زمین پر رہنا آواز کے یوں بیٹھ گیا، جیسے اگر ذرا سی بھی جنبش ہوئی، تو پتھر کا ہو جائے گا۔ جبروت نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ ”کون ہو تم؟“ اور میرے علاقے میں کیا کر رہے ہو؟“ ”عبداللہ..... مزار کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔“ جبروت کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ”اوہاں! ہیڈ ماسٹر نے بتایا تھا، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟“ ”وہ آرام کر رہے ہیں..... لمبے سفر کی تھکن ہے۔“ جبروت نے لمبا سا ہکا بھرا ”ہوں.....“ اور جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ”ہیڈ ماسٹر سے کہنا، کل تم لوگوں کو قلعے سے ضرورت کا سامان دلوادے۔ یہاں تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔“ جبروت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی جیب کی جانب بڑھ گیا اور پھر اس کے بعد مجھے بھی رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے اکرام صاحب پریشانی میں بڑبڑائے ہوئے سے تیز تیز چلتے مزار کے حاطے میں داخل ہوئے۔ ”کیا رات کو جبروت یہاں آیا تھا، اس نے کیا کہا؟“ سلطان بابا اس کی پریشانی دیکھ کر مسکرا دیے۔ ”بھئی میں تو کمرے میں تھا۔ اس کی ملاقات صرف عبداللہ سے ہوئی تھی۔ وہ درپردہ ہمیں قلعے میں حاضری لگانے کا حکم دے گیا ہے۔“ میں نے اکرام اللہ کو ساری تفصیل بتادی، جسے سن کر ان کے ماتھے پر پڑی سلوٹیں مزید کھری ہو گئیں۔ ”میری مائیں تو آپ دونوں دو گھڑی کے لیے آج وہاں سے ہوئی آئیں۔ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے پیرا چھا نہیں ہوتا۔ جو چند دن آپ لوگوں نے یہاں گزارنے ہیں، کم از کم وہ تو سکون سے گزر جائیں گے۔“ سلطان بابا پہلے ہی سے کسی گہری سچ میں کم تھے، انہوں نے تسبیح کا آخری دانہ پڑھ کر سر اٹھایا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنا ممکن ہو، شر اور فساد سے پہلو ہتی کرنی چاہیے۔ عبداللہ مایاں! آج سہ پہر تم اکرام صاحب کے ساتھ قلعے سے ہو آنا۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ اکرام صاحب ہڑبڑائے۔ ”اور آپ..... آپ نہیں چلیں گے کیا؟“ ”نہیں، ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا، اگر میرا پوچھیں، تو کہیے گا کہ میں بھی جلد ہی اس کے در دولت پر حاضری دوں گا۔ فی الحال میرا نمنا بندہ ہی ہے۔“ اکرام صاحب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ان کے اندر کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے، لیکن وہ سلطان بابا کے احترام کی وجہ سے چپ ہی رہے اور میرے ساتھ سہ پہر کا وقت ملے کر کے اگلے قدموں لوٹ گئے۔

رفیقہ رفیقہ سورج کا گولہ پھر سے وہی آگ برہ سالے لگا جانے کیوں اس صبح کا یہ آفتاب میرے لیے بالکل اجنبی تھا، یہ تو کوئی دوسرا سورج تھا، میری دنیا کے سورج سے بالکل جدا، اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا، کہیں یہ اس سورج کا دوسرا رخ تو نہیں تھا۔ کہیں میں چلتے چلتے اپنے سورج کے دوسری جانب تو نہیں پہنچا؟ ہاں شاید یہ ایسا ہی تھا، ورنہ یہ فلک مجھ سے بھی اتنا انجان جان تو تھا۔ سلطان بابا آگے بڑھے، تسبیح بھیر رہے تھے، میرے

آنے کی آہستہ ہوتی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ”کیا یہ میاں، کبھی اپنی سوچ کے تصور کے کوئی کام بھی دیتے ہو یا نہیں، کبھی تو ان اصحابی رہنماؤں کو آزار بھی چھوڑ دیا کرو۔“ چائے انہیں ہر مرتبہ میری سوچ کی خبر کیسے ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اس وقت حصار کے برآمدے میں بیٹے بوسیدہ سے ایک کمرے میں موجود تھے، یہاں برا دروازے کو سے نیچے کے لیے دروازے اور پچھلی جانب کھلتی کھڑکی کی چھوٹی ہوئی کھڑکی کے اوپر ایک ٹوٹی پھوٹی جتن اور چتر پٹے کی کسٹریں لگا کر ڈھانچے کی ناکامی کو شش کی گئی تھی۔ کمرے میں فرش کی جگہ ریختے کا بستر تھا اور ایک سرائی کمرے کے کونے میں ادھ بھری رکھی تھی۔ یہیں سلطان بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر من میں بہت دنوں سے چھلتا سوال میرے ہونٹوں پر آئی گیا۔ ”ایک بات بتائیں، ہم ان درگاہوں اور مزاروں کے ارد گرد ہی خدا کو کیوں کھاتے پھرتے ہیں۔۔۔۔۔ میں آپ کی طرح اسے اپنی شہرگ کے قریب کیوں محسوس نہیں کر سکتا۔ اور ہر بار ہمارا بیسویں ایسی ہی کبھی وہ ان درگاہ یا حصار سے متصل کیوں ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے تسبیح ختم کر کے اپنے اور میرے چہرے پہ پھونکا۔ ”اسے کسی حصار یا درگاہ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی اسے اپنی شہرگ سے بھی قریب ڈھونڈنے کے لیے کسی خاص وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں یکساں موجود ہے۔ تمہاری یہ فکر تم اسے محسوس کیوں نہیں کر سکتے، یہ بھی تمہاری اس سے قربت ہی کی ہی ایک نشانی ہے۔ بس، اتنا ضرور یاد رہے۔ یہ فکر کبھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ وہی بات کہ ہم ہمیشہ ایسی ہی درگاہوں، مسجدوں یا مزاروں ہی میں کیوں قیام کرتے ہیں، تو ہمارے دروازے اب ملے بھب کے نام پر کچھ کم ہی کھلتے ہیں۔ ایسے میں ان بستیوں میں موجود یہی درگاہیں اور خانقاہیں اپنی ہاتھیں پھیلائے ہر گھڑی ہمارے استقبال کو تیار ہوتی ہیں۔ ہمارے سونے کو اٹلس و کم خواب کے بستر نہ بنی، ہر مسجد کا فرش جیسے موجود رہتا ہے۔ یہی خاک ازل سے ہمارا مقصد اور ہمارا مقدر ہے اور ہمیں سب کو یاد دلانے رہتا ہے کہ ہم سب نے آخر خاک ہی ہو جاتا ہے۔“ میرے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ”لیکن اس بار آپ نے اس قدر دروازے علاقے کا انتخاب کیوں کیا، ہم راتے میں نہ جانے ایسی کتنی درگاہیں چھپے چھوڑ آئے ہیں۔“ سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ”اس بار معاملہ بے اختیار ہی کا ہے۔ اب تک تم نے جو بھی جیسا، اس میں کہیں نہ کہیں، ہمیں کچھ اختیار ضرور حاصل تھا، لیکن اس مرتبہ ہم دونوں کبھی اور کے اختیار میں ہیں میاں۔“ انہیں نے چٹک کر ان کی آنکھوں میں دیکھا، نہ جانے کیوں گھٹے سلطان بابا کی آواز میں دھڑکنیں کسی شدید پریشانی اور آنے والی پریشانیوں کا احساس ملا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے در پہنچے وہ بولے چلے گئے۔ ہاں جی ہاں تو تھا۔ اس پورے علاقے پر ایک خاتم اور انتہائی۔ فاکٹس کی حکومت تھی، ایک طرف سرحد تھی اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض چٹا صحرا۔ دو مہمان میں سات کوس کے فاصلے پر وہ بستی واقع تھی، جس سے گزر کر ہی ہم کال گڑھ سے فوجات کے واحد ذریعے، یعنی دن میں ایک بار گزرنے والی فرین کے انٹرنل تک پہنچ سکتے تھے، تو کم از کم یہاں چار گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا، ایک دم ہی میرے روٹ گئے، یہ سوچ کر ہی کھڑے ہوئے گئے کہ اگر کبھی ہمیں اس بستی سے دھڑت کرنی بھی پڑتی تو اس کی اجازت اور اختیار بھی صرف اس جگہ کو حاصل تھا، جو اس چھائی گھاٹ کا پہرے دار بھی تھا، میں نے انہیں آئینے کے لکڑیوں سے سلطان بابا کو دیکھا۔ ”لیکن کیوں، اس بے اختیاری کی منزل سے گزرنا اس قدر ضروری کیوں اس امتحان اور اس کسوٹی سے کیا حاصل۔۔۔۔۔؟“ ”سارا کھیل ہی تو اس اختیار و بے اختیاری میں توازن کا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے اختیار کی حدود ختم ہو جاتی ہیں، جہاں سے ہمیں اپنے خود مختار ہونے کا دم ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ میں آ جائے گا۔ جاؤ تم تیار ہی کرو، ابھی ظہر کے بعد تمہیں قلعہ بھی جانا ہے۔“ جانے کیوں، ایک دم ہی میرے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالوں کے چھوٹے ٹکڑے مارنے لگے تھے۔ اختیار و بے اختیاری کے دھانگوں میں میرا سنی کچھ یوں الجھا کہ گھٹے اکرام اللہ صاحب کے ساتھ بستی چھوٹے تک بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ میں تب چونکا، جب بستی کے کئی اینٹوں والے ہزار میں اونٹوں کی ایک لمبی قطار نے مجھے تقریباً مس کرتے ہوئے کراس کیا۔ کال گڑھ کے اس مختصر سے بازار میں۔ پھر کی اس شدید دھوپ کے باوجود ابھی خاصی چمک چمک نظر آرہی تھی۔ بازار کے پچیس بچے بکریوں کے ایک ریوڑ کی خرید و فروخت جاری تھی، جس کے ساتھ ہی ایک پرانی سی دکان میں جلیبیاں تلی جارہی تھیں۔ دکان دار پرانے اٹھارہات کے بڈل پھاڑ پھاڑ کر گاہکوں کو شیرے سے بھری تارنگی جلیبیاں پکڑا رہا تھا اور بالکل سامنے خشک گھاس اور بھوسے کے گھٹے تیل گاڑی سے اتروائے جا رہے تھے، سنہری بھوسا تارنگی شیرے میں ضم ہو رہا تھا اور پچھلی جانب پرانی سائیکلوں کے اٹار کے بیچ، ایک کار گیر سامنے مٹ میں پانی بھر رہے، پرانی نیو یوں کو پتھر لگا رہا تھا۔ بازار کے سرے پر ایک دھنکی پرانی دھانچوں اور لٹافوں کی روٹی دھن رہا تھا اور انشا میں اڑتے اون اور روٹی کے خستے ٹکڑے گرہاڑ رہتے کے ساتھ ہمارے مطلق میں پھنس رہے تھے۔ اگلے نظر پر ایک ماٹھی پرانی سی مٹک میں انتہائی گدلا پانی بیچ رہا تھا۔ اون دھننے والے کے اڈار کی دھن دھن کی جرس، ہیلز ٹکریوں کا شور، گرم شیرے کے نیچے پلٹنے والا کی دھنکی اور ماٹھی کے آواز۔۔۔۔۔ سب مل کر چند لمحوں کے لیے اس مردہ کال گڑھ کو کس قدر زندہ کر گئے تھے۔ موڑ مڑتے ہی گھٹے کی آسمان سے ہاتھیں کرتی خاکی چار دیواری شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے ہم قلعے کے مرکزی دیوار کی شکل دروازے کی جانب بڑھتے گئے، وہ پیسے پیسے قلعے کے اندر سے ایک عجیب سے وحشت ناک شور کی آواز میں بلند ہوتی گئیں اور پھر جیسے ہی میں نے انعام صاحب کے پیچھے بڑھتے ہوئے قلعے کی چار دیواری میں اپنا پہلا قدم رکھا، تو ان کرب ناک چوٹیوں کا راز بھی کھل گیا۔ وحشت اور بربریت کا ایک خوف ناک کھیل بین گھٹے کی بیرونی چار دیواری کے وسط میں کھلا جا رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین ہی میں گڑ گئے۔ جبروت اپنے عوار یوں کے جھرمٹ میں ایک اونچے سے تخت پر ہر اوجان و مثیاف انداز میں بیٹھ رہا تھا۔ تعجب لگا رہا تھا اور گھٹے میں گالیاں تک رہا تھا۔ اس کے سامنے کھلے میدان میں ایک لمبی اور موٹی سی فولادی ڈنچہ گھلے میں ڈالے ایک عظیم الجذہ سیاہ رینجر اپنا خون خون بدن لیے کھڑا جمول رہا تھا اور جبروت کے آنکھوں کو خوار کئے چاروں طرف سے، اس بیڑیوں میں جکڑے قیدی، رچھے پر حملے کر رہے تھے اور رچھے کے جسم سے لپٹے کتے اسے پھنچوڑ رہے تھے اور گھاس رکھنے کا زخم زخم بدن خون کا فوارہ بنا ہوا تھا، لیکن رچھے نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ پوری قوت سے ان وحشی کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے زخموں سے عجیب سی خیر خیر کی آوازیں نکلتی رہی تھیں اور اس کی قلیل کا کڑا زور لگانے کی وجہ سے اس کی ناک کی نازک چھلک کو پھینچا ہوا ہڈی کے اندر تک دھنسن چکا تھا، جس کی ناقابل برداشت اذیت نے رچھے کو انتہائی حد تک غصہ ناک کر دیا تھا، اور وہ کرب اور تکلیف سے بے حال، غصے میں پاگل ہو کر چٹکاڑ رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ آنکھ طرفہ جیسے کو کسی طور روک پائے۔ یہ سارا وحشیانہ کھیل ایک بہت بڑے جہوم کے دائرے میں ہو رہا تھا۔ تنہا ہی جبروت کے خوف کے سبب صرف کتوں ہی کو داد دے رہے تھے۔ خود جبروت کا وحشی پن بھی عروج پر تھا۔ وہ کتوں کی اذیت بڑھانے کے لیے انہیں پھل پھل کر ہٹکار رہا تھا اور کتوں کے منہ سے پتے کف کی طرح، اس کی رال بھی فرط جوش سے ہار مار رہی تھی۔ جب کوئی کتا رچھے کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید تیز جاتی ہو جاتی اور اگر رچھے کی خوش قسمتی سے کوئی کتا اس کے پیچھے کے پیچھے سے یا گرفت میں آ جاتا تو جبروت بے قابو ہو کر اپنے کتوں اور ان کے مددگار نے والے خدا سے گاروں کو کندی کندی گالیاں دینے لگتا۔ ان پر فرات، پٹا، اور بالکل اچھے سے اکٹڑ جاتا۔ مقابلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور محسن اور پیاس کے مارے کتوں کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں، لیکن شاید ایسے مقابلوں میں کتوں کو پانی کے قریب نہیں پھینکنے دیا جاتا، جب ہی کتوں کے رکھوالے انہیں بار بار پانی سے دور ہانک دیتے تھے، ان میں وہ کتا بھی شامل تھا، جسے جبروت نے رات ”کالے“ کہہ کر غائب کیا تھا۔ دفعتاً رچھے کو ایک موقع ملا اور ایک چٹکیرے کتے کی لٹا چھلانگ نے اسے رچھے کے بازوؤں کی پھینٹ میں دے دیا۔ رچھے نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنی گرفت شدید تر

کردی اور میں نے اتنی دور کھڑے ہونے کے باوجود اس کان بچاؤ دینے والے شور میں بھی اس کتنے کی ریزہ کی ہڈی کے چٹختے اور پھر ٹوٹ کر تڑکنے کی آواز سنی۔ کتے کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور زمین پر گر گئے ہی چند لمحوں کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسی اثناء میں ریچھ کا پنجہ پوری قوت سے لہرایا اور ”کالا“ ہوا میں لہراتے ہوئے جھوم کے دائرے سے باہر جا گرا اور گرتے ہی بے سدھ ہو گیا۔ جبروت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ زور سے چلا یا ”مرنے دے اس مردار کو، کوئی ہاتھ نہ لگائے اس حرام خور کو.....“ آٹھ میں سے دو کتوں کو ریچھ نے مکمل پچھاڑ دیا تھا، لیکن اسے اب بھی چھ طرفہ حملے کا سامنا تھا اور ریچھ کے جسم سے تیزی سے بہتا خون، اب اسے دھیرے دھیرے نڈھال کر رہا تھا۔ جبروت نے جھولتے اور ڈمگاتے ریچھ کو دیکھا، تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے پاس کھڑے ڈھونکنے کو ڈھول پٹنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول کی پہلی تھا پ سننے ہی، ادھ مرے کتوں میں جیسے بجلی کی لہری کوند گئی اور ان سب نے اپنے گھائل جسم سیٹے اور ایک ساتھ ہی ریچھ کے شکستہ جسم پر حملہ آور ہو گئے۔ جانے کیوں، اس لمحے مجھے وہ اذیت و کرب سے لہرا تا ریچھ رومن دور کے ان جنگجوؤں کی یاد دلا گیا، جنہیں گلیڈیٹر (Gladiator) کہا جاتا تھا اور جنہیں رومن بادشاہ سزا کے طور پر اسی قسم کے اکھاڑوں میں بھوکے شیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے، صرف ایک ڈھال اور نیزے کے بل پر اتار دیتے تھے، لیکن یہاں تو ڈھال اور نیزے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ بالآخر ایک کتا ریچھ کے زخروں میں اپنے خونیں جڑے گاڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریچھ کے زخروں سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور اس پاس کئی تماشاخیوں کے کپڑے سرخ چھینٹوں سے داغ دار ہو گئے۔ دوسرے کتے موقع پا کر ریچھ کی تھوٹنی اور ٹکیل والے حصے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ گلیڈیٹر ہار چکا تھا، زمین پر گر گئے سے پہلے اس نے ایک بے کسی کی نگاہ اکھاڑے کے بے حس تماشاخیوں پر ڈالی اور اس کا عظیم جشہ بے دم ہو کر زمین چھونے کے لیے آخری بار جھول کر ڈھلکا، لیکن اس سے پہلے ریچھ کے مالک کی آنکھ سے ٹپکے دو آنسو زمین کو اپنی آخری سلامی پیش کر چکے تھے۔ ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر گرا اور گرد کا ایک طوفان اٹھا۔ چھ کتوں میں سے دو مزید شدید زخمی حالت میں ایک جانب پڑے تڑپ رہے تھے اور باقی چار کی حالت سے بھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے معمول کی حالت تک پہنچنے کے لیے ہفتوں درکار ہوں گے۔ جبروت نے فتح کا نعروں لگایا اور ڈھولکے نے ڈھول کی تان تیز کر دی۔ تماشاخی آگے بڑھ بڑھ کر جبروت کو مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مٹھائی کے نوکرے کا منہ کھولا اور ایک شاندار حریف کی موت کے جشن میں مٹھائی تقسیم کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے رش میں سے راستہ بنایا اور مجھے کھینچتے ہوئے جبروت کے قریب لے گئے۔ نہ جانے اس شور میں جبروت کو ان کی بات سمجھ میں آئی یا نہیں، لیکن اس وقت وہ خوشی سے اس قدر سرشار تھا کہ اس نے میرے وجود کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اپنے کسی کارندے کو چلا کر راشن دینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں جب ہم قلعے سے باہر نکل رہے تھے، تو اکرام صاحب کے ہاتھ میں آٹے، چاول اور گڑ کے چند تھیلے موجود تھے۔ جبروت اس ہنگامے کی وجہ سے میرے دوسرے ساتھی یعنی سلطان بابا کی کمی محسوس نہیں کر سکا تھا اور اس بات پر اکرام صاحب سارا راستہ اللہ کا شکر ادا کرتے آئے کہ چلو بالائی تو سہی۔

میرامن اس وحیاناہ کھیل کو دیکھنے کے بعد اس قدر پشمرہ ہوا کہ میں شام تک ایک گھونٹ پانی بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اتار سکا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے اس بے بس اور لاچار ریچھ کی وہ نہ ختم آنکھیں اور اس کے ہار کر زمین پر گر گئے کا منظر آ جاتا۔ سلطان بابا بہت دیر تک مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھتے رہے۔ انہیں اکرام صاحب نے واپس جانے سے پہلے ساری کہانی سنا دی تھی کہ میں کیوں اتنا گم صم سا واپس لوٹا ہوں۔ مغرب کے بعد سلطان بابا تسبیح ختم کر کے میرے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہوا بالکل بند تھی اور دن کا سورج ڈھلنے کے بعد چاند ایک دوسرے تپتے سورج کے روپ میں طلوع ہونے کی تیاری میں تھا۔ انہوں نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیوں میاں، کچھ سمجھ میں آیا، یہ اختیار اور بے اختیاری کا کھیل۔ آج دو پہر کو جو کچھ تم نے دیکھا، وہ بھی اسی معنی کی ایک کڑی ہی تو تھی۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا ”وہ کیسے؟“، ”بھئی ذرا غور کرو تو وہ بے بس جانور بھی ہماری زندگی کا ایک استعارہ ہی تو تھا، اور آٹھ جانب سے پکٹے وہ حملہ آور، وہ مجبور یاں، جرم، گناہ اور فریب کے وہ حملے تھے، جو ہم تمام عمر جھیلنے ہیں اور ریچھ کی آخر کار وہ موت اختیار سے بے اختیاری کی جانب، اس کا آخری سفر تھا۔ اس کے پیروں سے بندھی وہ زنجیر اور اس کی ناک میں ڈلی ٹکیل، ہمارے معاشرے کی پابندیاں اور قانون سمجھ لو۔ کبھی کبھی یہ چیزیاں رشتوں کی صورت بھی ہمیں جکڑے رکھتی ہیں۔ زندگی خود اختیار کی ایک قسم ہے اور موت بے اختیاری ہے۔ ہاں البتہ، اس جانور اور انسان میں ایک واضح فرق ضرور ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اختیار کی حدیں کسی بھی مخلوق سے بہت زیادہ ہیں۔“ مجھے سلطان بابا کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی، لیکن میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ معما بھی از خود مجھ پر کھل ہی جائے گا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی، جس کا ہیولا میں دوسرے کال گڑھ آنے کے بعد دیکھ چکا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے ذکر کیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے ”بعض مرتبہ یہ صحرا ہم انسانوں سے عجیب خواب و سراب کے کھیل کھیلتا ہے، لیکن سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہے، خاص طور پر اگر یہ کسی انسانی بیولے کا معاملہ ہے۔ اگر تیسری مرتبہ پھر وہ شبیہ تمہیں دکھائی دے، تو اس کے قریب جانے کی کوشش کرنا، لیکن یاد رہے، صحرا کا فسوں بڑا گہرا ہوتا ہے۔“

عشاء کے بعد سلطان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں پھر سے اپنے نصیب کے چند ستاروں کے ساتھ، اس کالی رات میں مزار کے صحن میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ ہماری زندگی کی زیادہ تر انہونیوں کا تعلق رات ہی سے کیوں ہوتا ہے؟ کیا دن کا اجالا بہت سے حقائق کو ڈھانپ لیتا ہے، حالاں کہ عموماً ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ ڈھانپنے اور پردہ ڈالنے کا واسطہ اندھیرے سے ہوتا ہے، لیکن مجھ پر تو زیادہ تر رات ہی کھلتی تھی اور دن ہمیشہ ہی سے میرے لیے ایک دبیز پردے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہوا کے دوش پر مجھے دور سے کسی بانسری کی لے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں تک تو میں اس آواز کو بھی اپنا وہاں ہی سمجھتا رہا، لیکن پھر سلطان بابا کی کہی ہوئی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”ہاں، واہوں اور سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہوتا۔“ لیکن یہ مدھرے تو لگتا تھا اور مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مزار سے نکل کر اس ٹیلے کی جانب قدم بڑھائے، جہاں سے آواز آرہی تھی، قریب پہنچنے پر وہ آہٹ کی آواز سننے ہی بانسری تھم گئی اور کوئی دھیمی سی آواز میں بولا..... ”نوری..... تم ہو.....؟“ میں ٹیلہ پار کر کے دوسری جانب آ گیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اندازے سے آواز لگائی ”میرا نام عبداللہ ہے، میں صحرا کے مزار کا نیا خدمت گار ہوں، تم کون ہو.....؟“ چند لمحوں کے بعد دوسری جانب خاموشی رہی اور پھر ایک نوجوان لڑکا بانسری ہاتھوں میں تھامے ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ”اوہ..... میں کچھ اور سمجھا تھا، نیچے آ جاؤ، میرا نام سانول ہے۔ میں یہیں کال گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ مجید مستری کا بیٹا۔“ لڑکے نے صحرا کی روایت کے مطابق اپنا مکمل تعارف کروا دیا تھا اور اب میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا نام اور مزار سے تعلق دوبارہ دہرانے کے بعد کہا، ”تم بانسری اچھی بجالیے ہو، لیکن اتنی دور ویرانے میں اور یوں آدھی رات کو.....“ اس نے میری بات کا ٹ دی ”میرے باپ کو میرا بانسری بجانا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح قلعہ داروں کے ہاں مبینہ بھری گندم اور گڑ کے بدلے نوکری کر لوں، پر مجھے وہ غلامی پسند نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کسی مزار یا درگاہ کا مجاور بن جاؤں۔ ویسے بھی میرا یہاں دل نہیں لگتا۔“ مجھے اس کی بات سن کر مٹی آ گئی۔ ”مجاور بن کر کیا کرو گے، مجاور تو بانسری بھی نہیں بجا سکتے.....“ وہ بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ”ہاں واقعی، یہ تو ہے، پر تم مجھے کچھ دوسرے قسم کے مجاور لگتے ہو۔ میں تمہیں بانسری سناؤں، تم نے کبھی موسیقی سنی ہے۔“ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا کوئی چارٹ ٹاپر (Charttopper) ایسا نہیں تھا، جو میرے ذاتی کلیکشن میں شامل نہ ہو۔ بیک اسٹریٹ بوئےز اور ونٹی ہیوشن کی ایل ڈیز سے میرے کمرے کے شیف بھرے رہتے تھے اور دنیا کے ہر کونے سے میرے دوست میرے لیے نئی تخلیقات بھیج کر میرا خزانہ بڑھاتے رہتے تھے۔ گھر، گاڑی، یونیورسٹی، پارٹی، کلب، ڈسکو، ہر جگہ، ہر لمحہ یہ تانیں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ سانول مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ہچکچایا۔ ”اگر تمہیں پسند نہیں تو میں نہیں بجاتا،“ ”نہیں نہیں، تم بجاؤ، مجھے بانسری کی اتنی سمجھ تو نہیں، لیکن پھر بھی تمہاری لے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“ سانول کا چہرہ خوشی سے چمک سا گیا۔ اس نے جلدی سے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک پرانے گیت کی تان چھیڑ دی۔ اس کی نظریں بانسری بجائے ہوئے بھی مستقل مجھی پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی دھن کا اثر میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دنیا کا ہر ہنر، ہر فن اک ستائش ہی سے تو متصل ہوتا ہے۔ ایسے دیوانوں کی ہر کوشش خود کو منوانے اور جہوم میں الگ و ممتاز رہنے کی ایک پروانہ وار کوشش ہی تو ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنے ہنر کی تعریف کا بھوکا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ”خدا اور محبت“ کا ایک جملہ گونجا ”اپنے ہنر کی تعریف کی یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے۔ تب ہی انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ تعریف اور سراہے جانے کا جذبہ ہم میں نہ ہوتا، تو شاید ہم اب تک پتھر کے دور ہی میں زندہ ہوتے.....“ انہیں سوچوں میں گم، میں سانول کی بانسری کی مدھرتان سن رہا تھا کہ اچانک مجھے سانول کے عقب میں کچھ دور اسی لڑکی کا سراپا لہراتے ہوئے نظر آیا۔ ہاں..... وہی تھی..... بڑا سا پلو لیے، میں ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سانول کے ہاتھ بے بوکھلاہٹ میں بانسری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر بولا۔ ”یا اللہ خیر..... کیا ہو گیا.....؟“

(باقی آئندہ)

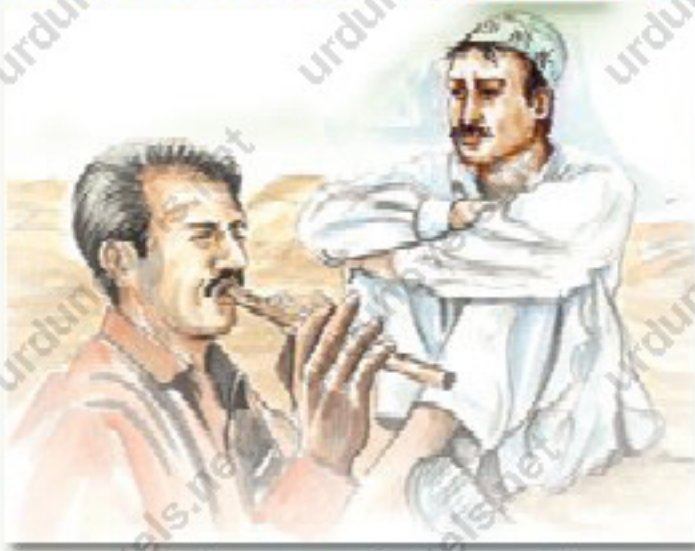
ذیوں سے اگر لفظ نکلیں جائیں تو ہم کس قدر نامکمل سمجھ سکتے ہیں، اب خاک بسر نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی ہمدردی سے کچھ دور تلاش رہا تھا

ہاشم ندیم، قسط نمبر 3



”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے ٹیکزین“ ہی میں چھپنے والے ”عبداللہ“ کا نیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پڑائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی ہی مغزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے۔ لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سرایت بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سبب نامکمل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ آئی ٹیل آئی وی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار کے پردہ راستہ بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabduallah@janggroup.com.pk



میرے منہ سے اس اتنا ہی نکلی پایا۔ ”وہ..... لڑکی.....“ سانول نے بھی جلدی سے پلٹ کر دیکھا، یہی وہ چند لمبے تھے، جب میری توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی ہوگی، لیکن اب جب ہم دونوں لے سانول کے عقب میں دیکھا، تو وہاں صرف خانائی تھا۔ سانول کچھ دیر تک حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے پیچھے مڑ کر اس ان دیکھے وجود کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”تم بھی اس صحرائے چکر میں آ گئے نا، عاف کرنا مزار کے پچھلے خدمت گار کو میں حافظہ ہی کہتا تھا، لیکن تم تو میرے ہی ہم عمر ہو۔ برائہ ماٹو، تو میں تمہیں عبداللہ کہہ کر ہی پکارا کروں.....؟“ تم جو چاہو مجھے پکار سکتے ہو، لیکن میں کسی وہم کا شکار نہیں ہو رہا۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔“ اب سانول کے چوتھنے کی باری تھی۔ ”اچھا.....؟ ذرا مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ۔“ میں لے جلدی جلدی جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ تھا، اس کے سامنے ہر اویا۔ سانول میری بات سن کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”بڑا سا پلو، پھولوں والی چادر، ہاتھ میں کھانچوں تک، سفید چوڑیاں، سانولا سا رنگ، ماتھے پر بندیا..... تم کہو، تو ایسی دور درجن لڑکیاں میں کال گڑھ کے بڑے میدان میں آج صبح ہی ہواؤں۔ ارے بھئی، یہ تو اس علاقے کی ہر دوسری لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے تم نے۔ یہاں سب ہی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی خاص نشانی یاد ہو تو بتاؤ؟“ میں سانول کی بات سن کر گھٹنے میں پڑ گیا۔ ”خاص نشانی.....؟ ارے ہاں، ابھی تمہاری دیر پہلے تم نے کسی نوری کو پکارا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں تھی؟“ سانول، نوری کا نام سننے ہی کچھ شیشا سا گیا۔ اس کے چہرے پر مٹی رنگ آ کر گزر گئے، پھر وہ شرما کر بولا۔ ”نہیں، جی..... وہ نوری نہیں ہو سکتی..... میں تو یونہی ہر آہٹ پر اس کا نام پکار بیٹھتا ہوں، وہ بھلا اس ویرانے میں آدمی راستہ کو کہاں سے آئے گی۔ اس پر تو دن میں بھی ہزار چہرے لگے رہتے ہیں۔“ میں نے شرم سے لہاتے سانول کو پھینکا۔ ”اوہ..... تو یہ بات ہے، پر یہ نوری ہے کون.....؟“ ”نوری میری ٹنک ہے جی! یہیں کال گڑھ میں رہتی ہے۔ آپ مزار پر ہیڈ ماسٹر اکرام اللہ سے تو ضرور ملے ہوں گے، نوری انہی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ پوری آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے اس نے، پھر اس کے باپ نے گھر بٹھا لیا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کے لیے کال گڑھ سے بیس کوس دور، دوسری سستی کے ہائی اسکول تک جانا پڑتا ہے۔“ سانول شرما شرما کر اپنے اور نوری کے رشتے کی بابت بتا رہا تھا کہ کیسے، اس کے گھر والے نوری کے گھر رشتہ لے کر گئے اور پھر نوری کے گھر والوں نے سانول کی نشانی تو رکھ لی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جب تک سانول ہر سر روزگار نہیں ہو جاتا، وہ بیٹی کو رخصت نہیں کریں گے، لیکن کال گڑھ میں روزگار کے نام پر صرف قلعے داروں کی غلامی ہی تھی، جو سانول کو کسی صورت منگور نہیں تھی، کیوں کہ قلعے کے قرضے کے چنگل میں ان لوگوں کی تیسری نسل پس رہی تھی اور سود و سود کا یہ جال کال گڑھ والوں کو کسی ان دیکھے خون آشام مغریت کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ سانول کا باپ بھی اس سے بچ نہیں پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوری کو اب تک بیاہ کر گھر نہیں لاسکا تھا، کیوں کہ بستی کے تمام رشتوں کا فیصلہ ہر سال قرض ادا کرنے کے موقع پر جبروت کی بیچاہٹ ہی کرتی تھی۔ لوگ اپنا پرانا قرضہ چکاتے اور اپنے پیاروں کے رشتے کے لیے بے قرض کی کھڑی اپنے شانوں پر ڈالے، قلعے سے نکل آتے۔ اسی لیے سانول کا باپ چاہتا تھا کہ سانول بھی قلعے داروں کی نوکری کر لے، تاکہ باپ، بیٹا دن رات بہت کر کے قلعے کا تمام قرض اسی سال چلتا کر دیں اور سانول کا رشتہ پکا ہو سکے، لیکن خود سانول کو یوں رشتے کے بہانے بار بار نوری اور اس کے گھر والوں کا قلعہ ہایا جاتا، ایک آنکھ بھی نہیں بھانتا تھا۔ اس کا بس چلتا، تو وہ نوری کو سات پردوں میں، زمانے کی نظر اور ہر ذی کی آنچ سے بچا کر چھپا رکھتا، لیکن وہ اس وقت بے بس تھا، کیوں کہ نوری پر اس کا ہر احق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور یہی بات سانول کو ہر دم پریشان رکھتی تھی، اس نے نوری کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے باپ یا چچا کے بغیر کبھی اپنے گھر کے آگن سے قدم بھی باہر نہیں دھرے گی، کیوں کہ جبروت کے حواری اور گڑھے آوازہ کتوں کی طرح پورا دن کال گڑھ کی گلیوں میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سانول کے بقول، جب سے نوری کے

ساتھ اس کی منگنی طے ہوئی تھی، وہ ویسے بھی دُہرے عذاب کا شکار تھا۔ پہلے تو بھر بھی کبھی کبھار اسے نوری کی ایک آدھ جھلک نصیب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتا تھا۔ میرادل چاہا کہ میں سانول کو بتاؤں کہ کوئی بھی منگنی یا دوسرا بندھن، اس کا قصور وار نہیں، یہ سارا قصور تو اس محبت کا ہے، جو اپنے جلو میں ہر بار جانے ایسی کتنی بے چینیوں، درد اور لا حاصل پن کی چھین لے کر آتی ہے، جب تک ہمیں کسی سے محبت نہیں ہو جاتی، وہ شخص ہمارے لیے کس قدر عام ہوتا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک، ہمارے آس پاس باقی لوگوں کی طرح چلتا پھرتا اور ہماری دسترس میں۔ لیکن جیسے ہی ہمیں اس سے محبت ہو جاتی ہے، پل بھر میں وہ ہمارے لیے کس قدر ناممکن، کتنا لا حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جو پہلے پہروں ہماری محفل میں سامع بنا بیٹھا رہتا تھا، اب اس کی قربت کی دوکڑی کے لیے بھی ہم ترس جاتے ہیں۔ یہ محبت آخر ہے کیا بلا..... کیا اپنے ساتھ ہی یہ مجبور یوں، پریشان یوں، دور یوں اور کرب کا ایک دریا لیے وارد ہوتی ہے؟ پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت کا نزول ہی ہمیشہ دوا ایسے افراد کے درمیان ہوتا ہے، جن کا ملن ناممکنات کا دوسرا نام ہو، لیکن اب مجھ پر یہ راز دھیرے دھیرے آشکارا ہونے لگا کہ اصل میں محبت خود اپنے ساتھ ایک ایسا سحر لیے نمودار ہوتی ہے کہ جو ہمارے محبوب کو ہمارے لیے پری زاد بنا دیتا ہے۔ جانے کوہ قاف کے بلند و بالا پہاڑ خود بخود ہمارے درمیان کہاں سے آکھڑے ہوتے ہیں۔ زمانے کی نظر بدل کر برچھی کیوں بن جاتی ہے۔ اپنے بھی پرانے ہو کر طعنہ مارنے لگتے ہیں، ہمدردی طغیانی بدل جاتی ہے۔ کل تک پلکوں پر ہنسانے والے سخی پا ہو کر سرزنش کرنے لگتے ہیں۔ یہ محبت ہمیشہ ہمارے ارد گرد کا ہر موسم، رویہ ہمارے خلاف کیوں کر دیتی ہے۔ ہر بہار کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے آپ تک سے جدا کر دیتی ہے۔ یہی سب کچھ سانول کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے اپنا درد بانٹا رہا۔ جانے اس نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا بھروسہ کیا اور کیسے کر لیا تھا، رخصت ہوتے وقت بھی اس نے مجھ سے کئی بار وعدہ لیا کہ میں روز رات کو کچھ دیر کے لیے صحر میں اس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

میں جب سانول کو اللوداع کہہ کر مزار کے صحن میں داخل ہوا تو صبح کی اذان کا وقت قریب ہی تھا۔ سو، وہیں کچی اینٹ کے صحن کو بستر بنا کر اور ہاتھوں کے نیچے پر سر رکھ کر کچھ دیر کمرنگانے کے لیے لیٹ گیا اور پتا نہیں، کس کھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھے عجیب سے سائے ڈراتے رہے۔ میں نے اچانک خود کو اسی وسیع و عریض اور لبق و دق صحرا کے بچوں بچ کھڑا پایا۔ سوانیزے پر آیا سورج میرے سر پر اپنی تپتی کرنوں کی برچھیاں لیے کھڑا ہے اور پھر اچانک ہی مجھے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک طرف کودتا ہوں تو آٹھوں کتوں کو اپنے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتے پاتا ہوں اور پھر ان میں ایک کتا اچھل کر میرے زخروں میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں..... یا اللہ..... یہ خواب تھا یا کوئی عذاب.....! سلطان بابا صحن ہی میں ایک برتن سے پانی لے کر وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا، ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت احتیاط سے پانی کا استعمال کر رہے تھے۔

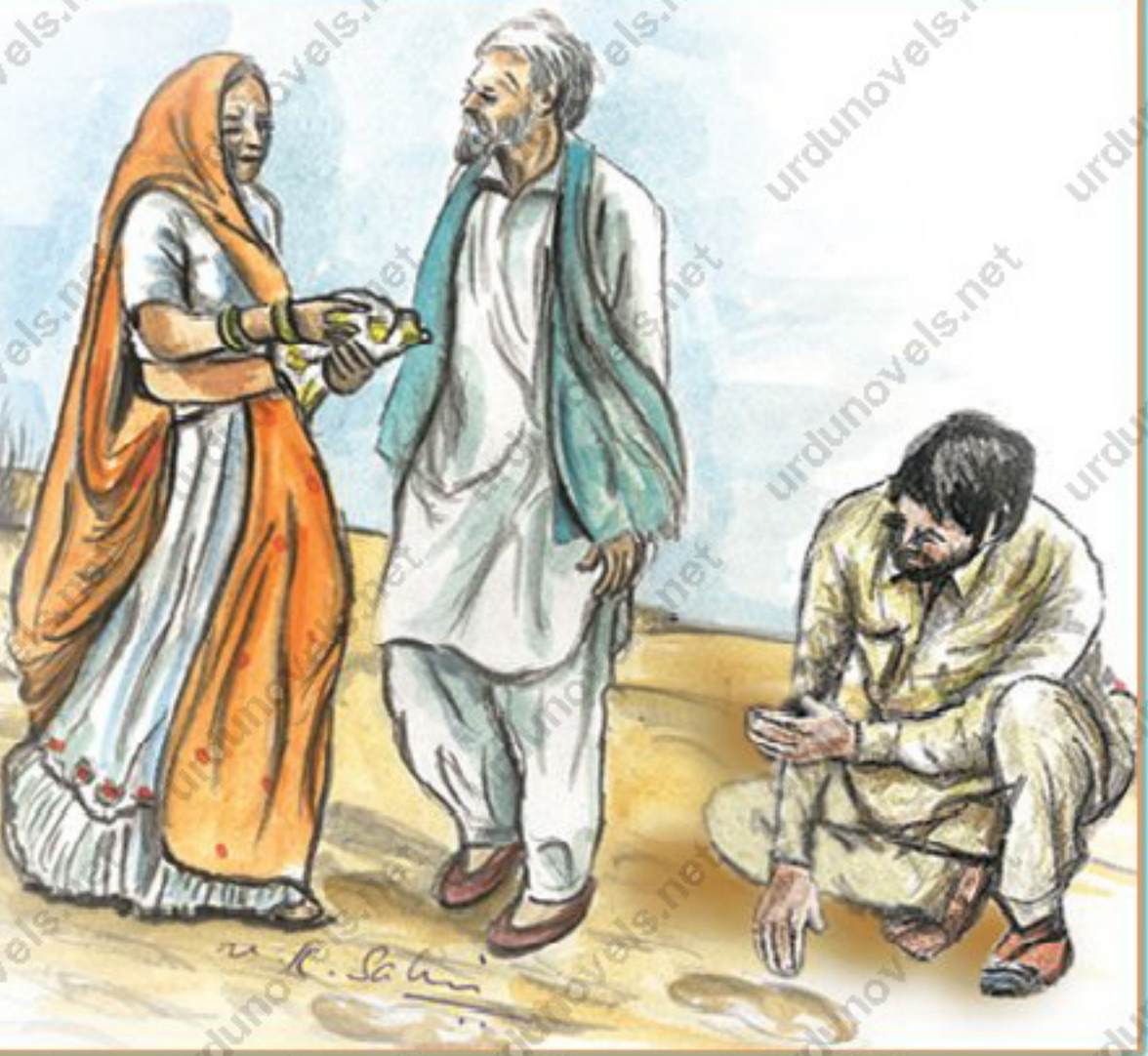
فجر کی نماز کے بعد میں نے انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ میں نے سنا تھا کہ صبح کے قریبی خواب سچے ہوتے ہیں۔ سلطان بابا میرا خواب سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ میں نے اصرار کیا تو دھیرے سے بولے، ”خواب تقدیر نہیں ہوتے، کبھی کبھی مستقبل کی ایک جھلک ضرور ثابت ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جھلک سچی ہے، تو آنے والے دنوں میں یہ صحر اتمہاری بہت بڑی امتحان گاہ ثابت ہوگا، نہ صرف تمہارے لیے، بلکہ خود میرے لیے بھی..... لیکن ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ جسم صرف اس دنیاوی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ اصل حیات تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔“ نہ جانے سلطان بابا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ صحرا کی بے رحم دھوپ نے مزار کی روشنیوں پر ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔ میں ابھی تک رات کے خواب کے اثر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ کوئی سکا درد سے بے چین ہو کر رو رہا ہے۔ چند لمحوں میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ بھی رات والے خواب ہی کا کوئی تسلسل ہے، لیکن جب ایک ہی آواز دو تھے وقفے وقفے سے مزار کی عقی دیوار سے ابھرنے لگی، تو مجھے خود کو مجتمع کر کے اٹھنا ہی پڑا اور پھر جب میں تپتی ریت میں پیر دھنسائے ہوئے عقی سمت تک پہنچا، تو اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ دیوار کے نامکمل سائے میں ادھ مرا ”کالا“ پڑا ہوا تھا۔ ہاں، جبروت کا وہی لاڈلا کتا، جس نے پہلی رات مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گزشتہ روز مجھے ریت میں پوری قوت سے اپنے پنجے کے ایک ہی ٹھیکڑے سے ہوا میں اچھال کر جھوم کے دائرے سے پرے پھینک دیا تھا۔ مجھے اگر ام اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جبروت اپنے بار جانے والے یا شدید زخمی کتوں کو مرنے کے لیے صحرا میں پھنکوا دیتا ہے۔ شاید کالے کو بھی ادھ مرا سمجھ کر وہ لوگ صحرا میں پھینک گئے تھے، لیکن وہ اس حالت میں یہاں تک کیسے آ پہنچا۔ کتے کا جسم بری طرح زخمی تھا اور پیچھے کے ٹوں خوار پنوں نے کالے کا پیٹ بری طرح سے ادھیڑ دیا تھا۔ وہ گرم ریت پر کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی دھونکی جیسی چلتی سانس اور منہ سے لگی زبان ریت چاٹ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کی کوشش کی، لیکن وہ صرف ایک کراہ کے بعد ٹھہر گیا۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں، میں جلدی سے بھاگ کر مزار کے احاطے میں پڑی پرانی مشک اٹھا لایا، جس کی تہ میں ابھی کافی پانی موجود تھا۔ میں نے چند قطرے جانور کے چہرے پر نچکائے تو اس نے جلدی سے زبان باہر نکال دی اور پانی کی گرتی بوندوں کو بے تابی سے اپنے طلق سے نیچے اتارنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے زخم کی اصل گہرائی کا اندازہ ہوا، لیکن افسوس میرے پاس اس وقت وہاں کوئی ایسا سر ہم نہیں تھا، جسے میں زخم پر لگاؤں۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ایک پرانا ٹاٹ کاکڑا صحن کی دیوار کے پاس پڑا نظر آیا۔ میں نے دیوار میں بنے طاق کے اندر سے مایوس اٹھائی اور ٹاٹ کو آگ لگا دی۔ لیکن میں ایک بار کاشف کی بلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا، تب میں نے اپنے لنگوٹ پر یار کو یہی نسخہ آزما دیا دیکھا تھا۔ ٹاٹ کی راکھ میں نے کالے کے زخم کے اوپر پھیر دی۔ پتا نہیں، اسے اس سے سکون ملا یا نہیں۔ میں رات کی بچی ہوئی روئی کے چند ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روئی نگھنے اور پانی پینے کے بعد وہ مجھے کچھ سکون میں دکھائی دیا، لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا، بے زبانی..... اچانک ہی مجھے اس زبان اور ان لفظوں کی شدید اہمیت کا احساس ہوا۔ ہمارے پاس یہی لفظ ہی تو ہوتے ہیں، سب سے خاص، سب سے ممتاز گروینے والے..... اور اگر ہماری زندگی سے یہ لفظ نکال دیے جائیں، تو ہم کس قدر نامکمل، کس قدر کھوکھلے ہو جائیں۔ بے زبانی کا کرب جس شدت سے اس لمبے میں نے محسوس کیا، شاید ہی سمجھی کیا ہو، کالے نے اپنے جسم کو تولا اور تقریباً گھسٹتے ہوئے ایک طرف کوروا دھو گیا۔ میرادل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، میں پڑا رہے، لیکن میں تو اشاروں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اور پھر بات اشاروں کی زبان تک ہی کہاں مخصوص تھی۔ میں تو بول کر بھی بعض مرتبہ اپنے لفظوں کو کو لگا ہی پاتا تھا۔ کالے نے اوچھے نیچے سے پلٹ کر ایک ہاتھ بھر بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر ریت کے اڑتے گرم گولوں میں غائب ہو گیا۔ اتنے میں اندر مزار کے صحن سے کسی کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں پلٹ کر وہاں صحن میں داخل ہوا، تو اگر ام صاحب ایک بوڑھے جوڑے کے ساتھ سلطان بابا کے قریب بیٹھ، دکھائی دیے۔ بوڑھے کی نظر شاید بالکل ہی جواب دے جی ٹھنی، لہذا وہ بڑھیا کے ہمارے ٹول ٹول کر سلطان بابا سے مخاطب تھا۔ میں بھی سلام کر کے خاموشی سے ان لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بڑھیا گزارے لائق بھی اردو نہیں بول سکتی تھی، سو بوڑھے ہی کو اس کے جیسے کے الفاظ بھی ادا کرنے پڑے تھے خود بوڑھا بھی اپنا منہ ناٹوٹی پھوٹی اردو اور صحرائی زبان کی آمیزش میں بیان کر رہا تھا۔ اگر ام صاحب بھی درمیان میں لقمے دیتے رہے۔ مانجہ کچھ یوں تھا کہ بوڑھے اور بوڑھی کی انویسی چھ ماہ پہلے بیاہ کر اپنے گاؤں سے، یہاں سیت کال کڑھ سے دو گاؤں آگے، رحمان کڑھ کے لیے روانہ ہوئی تھی، لیکن وہ اور اس کا شوہر کبھی رحمان کڑھ نہیں پہنچے پائے۔ لڑکی کے گاؤں اور رحمان کڑھ کے بیچ صرف کال کڑھ کا ریلوے اسٹیشن ہی پڑتا تھا اور تلاش کے دوران چند ریلوے

ملازمین نے اتنی گواہی تو ضرور دی تھی کہ انہوں نے اس رات ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو کال گڑھ کے ریوے اسٹیشن پر اترتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ ٹرین پر سوار ہوئے یا کہیں اور نکل گئے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ لڑکی کے ماں، باپ تو چند سال پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ لڑکی کے نانا، نانی نے ہی پال پوس کر اسے بڑا کیا اور بیاہا تھا۔ لڑکا رحمان گڑھ میں کونکے کی کان میں مزدور تھا اور بیٹے بھری چھٹی لے کر صرف بیاہ کے لیے اپنی دلہن کے گاؤں آیا تھا۔ بوڑھا اور بوڑھی اپنی نواسی کی جدائی میں بے حد مضمحل تھے۔ خاص طور پر بڑھیا کے تو آنسو ہی نہیں رکتے تھے، بقول اس کے، اسے کال گڑھ کی مٹی میں سے اس کی سیکنہ کی خوش بو آتی تھی اور گزشتہ چھ ماہ ہی سے وہ دونوں درد کی ٹھوکریں کھا رہے تھے، لیکن ابھی تک ان کی نواسی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، نہ ہی اس کے شوہر کا کوئی پتا تھا۔ کال گڑھ کی ناکارہ پولیس بھی چند دن کی دکھاوے کی دوڑ دھوپ کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی تھی اور اب تو حوالدار نے باقاعدہ ان دونوں کا داخلہ بھی تھانے میں بند کروا دیا تھا کہ کون روزانہ ان دو خبیث بوڑھوں کی حکمران سننا پھرے۔ اکرام صاحب نے سلطان بابا کو یہ بھی بتایا کہ شروع میں سب سے پہلے سیکنہ کے نانا، نانی نے علاقے کی روایت کے مطابق جبروت سے بھی رابطہ کیا تھا اور جبروت نے چند دن اپنے ہر کارے آس پاس کے علاقوں میں دوڑائے بھی کہ شاید کہیں لڑکا لڑکی کا کچھ پتا چل سکے، لیکن چند دن بعد کارندے بھی تھک ہار گئے۔ اب تو جبروت نے بوڑھے اور بڑھیا سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے، اس کے پاس کتنے لڑانے جیسے اور بھی بہت سے اہم کام ہوتے تھے، وہ کب تک اپنے وفاداروں کو بلکان کرتا، لیکن سیکنہ کی نانی یہ علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے اب بھی امید تھی کہ اس کی لاڈلی کی اگر کوئی خبر ملے گی، تو وہ بیہیم کال گڑھ سے ملے گی۔ بڑھیا نے بوڑھے کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے اسے ڈانٹا۔ بڑھیا نے پھر منت کی۔ بوڑھا بادل ناخواسہ گڑ گڑایا۔

”میری لگائی سٹھیا گئی ہے پیر صاحب۔ آپ سرکار لوگ ہو، برائیں ماننا، پر یہ کہتی ہے کہ اسے روزانہ کئی مہینوں سے ہر رات ایک ہی عجیب سا خواب آتا ہے کہ ہماری سیکنہ اس صحرا میں دوڑ رہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے کتے لگے ہوئے ہیں۔ سیکنہ روز روز سے رو رہی ہے اور ہمیں پکار رہی ہے۔“ میں زور سے چونکا۔ کچھ ایسا ہی خواب تو میں نے بھی رات کو دیکھا تھا۔ یہ صحرا کیا اپنے بھی باسیوں کو ایک جیسے ہی خواب دکھاتا تھا۔ بوڑھا گڑ گڑا رہا تھا۔ ”آپ ہمارے لیے دعا کرو پیر جی..... ہم بہت مجبور اور بے کس ہیں۔ بڑی دور سے چل کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔“ بوڑھا بولتے بولتے بھڑاسا گیا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر مزار کی بنجر زمین میں جذب ہو گئے۔ بڑھیا نے اپنے مرد کو روتے دیکھا تو جلدی سے اپنا دھڑا بھول کر، پلو سے اس کی آنکھیں پونچھنے لگ گئی۔ عجیب نظارہ تھا، وہ مجبور اور بے بس انسان ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے، حالاں کہ وہ دونوں اس بات سے باخبر تھے کہ ان کا دلاسا جھوٹا ہے۔ پتا نہیں کیوں، ایک دم ہی ہیرا دل بھرا آیا اور میں نے وہاں سے اٹھ جانے کی ٹھان لی۔ اتنے میں مزار کے دروازے سے زوردار آواز کے ساتھ سلام کی آواز سنائی دی، آنے والا سانول تھا، جو وہیں دروازے کے قریب کھڑے ہو کر مجھے پاس آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی وہاں سے نکلنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ سانول کے قریب پہنچ کر میں نے اس سے پوچھا۔ ”خیر تو ہے۔“ کہیں نوری گئے لیے کوئی منت مانگتے تو نہیں آئے۔“ وہ مسکرایا۔ ”منتوں سے اگر پیارے ملتے تو کال گڑھ کا یہ مزار اتنا دیران نہ ہوتا جناب۔“ ”واہ..... بڑی بات کہہ دی تم نے، کہو، کیسے آئے؟“ سانول نے کچھ رازدارانہ انداز میں میرے قریب ہو کر بتایا کہ نوری کی کسی سہیلی نے اسے پیغام بھجوایا ہے کہ نوری عصر کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مزار پر دعا کرنے آئے گی۔ شاید بچا اکرام بھی ساتھ ہوں۔ سانول بھی اس وقت کسی بہانے مزار پر آنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے یہی بتانے کے لیے اس جھلسا دینے والی دھوپ میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس کے ڈسے کوئی ایسا کام لگا دوں کہ وہ جب مزار پر آئے، تو نوری کے گھر والوں کو شک نہ ہو اور وہ برانہ مانیں۔ بقول سانول، نوری کے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت تھے، خاص طور پر اپنے پرانے اتحاد بیٹے ماسٹر اکرام صاحب سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میں نے اس کی رام کہانی سننے کے بعد مسکرا کر اس سے پوچھا کہ ”جہاں اس نے اتنی محنت کی ہے، وہیں ضرور کوئی اچھا سا بہانہ بھی خود ہی سوچ لیا ہوگا۔“ سانول بھی ہنس دیا۔ ”اس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ آج جمعرات ہے، میں یوں ظاہر کروں گا کہ جیسے تمہارے کہنے پر مغرب کے بعد پڑھ کر بانٹنے کے لیے چنے اور گڑ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ پچھلے حافظ جی بھی ہر جمعرات کو یہی نیاز بانٹا کرتے تھے۔“ یہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ایسے بہانوں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ میں نے سانول کو تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو کر واپس جائے۔ میں اس ”معاونت عشق“ کے جرم میں اس کا پورا ساتھ دوں گا۔ سانول کو پریشان دیکھ کر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ پیارا اپنے ساتھ اتنی کڑی پابندیوں کے کانٹے کیوں لے کر آتا ہے۔ ہفتوں صحرا میں سرچنے اور پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد آج جب محبوب کا دیدار نصیب ہو بھی رہا تھا تو وہ صرف چند گھڑیوں کے لیے، اور اس کے لیے بھی سو بہانے اور تاویلیں گھڑنی پڑ رہی تھیں۔ یہ پیارا اور محبت کا جذبہ، ہماری رگوں سے تمام خون نچوڑنے کے بعد ہی خوشی کی دو بوندیں ہماری روح کے شکلوں میں کیوں ڈالتا ہے۔ جاتے جاتے سانول کی نظر صحن میں سلطان بابا کے قریب بیٹھے بوڑھے اور بڑھیا پر پڑی۔ ”اوہ..... یہ بے چارے یہاں بھی آ پہنچے.....؟ تم جانتے ہو انہیں.....؟ کال گڑھ میں کون ہے، جو انہیں نہیں جانتا، پچھلے چھ ماہ سے علاقے کے ہر گھر کی چوکھٹ پر دستک دے چکے ہیں یہ دونوں۔ بوڑھا ظلم کیا ہے قدرت نے ان کے ساتھ۔ جانے ان کی نواسی کہاں کھو گئی ہے۔ علاقے کے سب ہی جوانوں نے چپ چاپ چھان مارا، لیکن ان دونوں کا آج تک کہیں پتا نہیں چلا۔ اب تو باقی صبح کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ضرور وہ لوگ کال گڑھ سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ یہاں ہوتے تو ان کا کچھ نشان تو ملتا؟“ جاتے جاتے سانول ایک بار پھر سے اپنا پورا منصوبہ بڑھرا کر اور مجھ سے تصدیق کر دیا کہ وہاں پلٹ گیا۔ سلطان بابا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ میں بھی آکر دعا میں شامل ہو گیا۔ دعا ختم کر کے سلطان بابا نے سیکنہ کے نانا، نانی کو تسلی دی کہ انشاء اللہ جلد ہی ان کی لاڈلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے دعا کے بعد واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑھیا نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سلطان بابا سے رخصت ہو کر جانے کے لیے پلٹے۔ بڑھیا کی گود سے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی پھسل کر نیچے زمین پر گر گئی، لیکن اسے شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میں بھی انہیں جاتا دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ پہلے میری نظر بھی وہاں نہیں گئی، پھر جب احساس ہوا، تب تک وہ مزار کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے اکرام صاحب کو آواز دے کر روکا اور جلدی سے پوٹلی اٹھا کر انہیں تھمانے کے لیے دروازے کی جانب دوڑا۔ پوٹلی کی گرہ شاید نرمی سے لگائی گئی تھی، تب ہی وہ بیچ راستے ہی میں کھل گئی اور دو چار کپڑے نکل کر صحن میں پھرنے لگے۔ ریت کا تیز گولا مزار کے صحن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی کپڑے سینے شروع کر دیے۔ ریت میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی، کپڑے کیا تھے، چند کسز نہیں ہی تھیں۔ تیز ہوائے ایک زمانہ دوپٹے کو دور پھینک دیا۔ میں باقی کپڑے سینٹے کے بعد اس جانب بڑھا، جہاں حمار کے صحن میں آگے نیکر کے ایک تھماڑ میں وہ دو پٹا لٹکا ہوا تھا۔ ریت کے اڑتے آڑوں نے آس پاس سب ہی کچھ دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میری نظر اس دوپٹے پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے۔ یہ..... یہ تو وہی پھولوں والی چادر کا ایک حصہ تھا، جو میں نے اس ان جان لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔ ہاں، وہی تو تھا..... لیکن یہ دو پٹا..... یہاں کیسے.....؟ میں نے جلدی سے نیکر سے کپڑا علیحدہ کیا اور اسے لے کر تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کے قریب کھڑے جوڑے تک پہنچا۔ اکرام صاحب بھی میری ہڑبڑاہٹ دیکھ کر گھبرا سے گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا، ”یہ کپڑے کس کے ہیں؟“ اکرام صاحب نے جواب دیے کے بجائے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ ہماری سیکنہ کی چادر کا آدھا حصہ ہے۔ شادی کے بعد آتے ہوئے اس نے اپنی بدنصیب نانی کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ اسے اپنے سینے سے لگائے پھرتی ہے جی۔ کہتی ہے، اس میں سے اسے اپنی لاڈلی کی خوش بو آتی ہے۔“ میرے ذہن میں یہ پیک وقت جانے کتنی آنندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک جوان جانی لڑکی رات کے اندھیرے میں مجھے اس صحرا میں دکھائی دیتی رہی، وہ سیکنہ ہی تھی۔

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ بہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی غنی غنی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد دہنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناٹھل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabduallah@janggroup.com.pk



میرادل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر ان دونوں کو بتاؤں کہ میں نے سیکند کو دیکھا ہے، لیکن نہ جانے وہ کون سا احساس تھا، جس نے مجھے اس اعلان سے باز رکھا۔ بوڑھا اور بڑھیا، اکرام صاحب سمیت اپنی نواسی کے کپڑوں کی پونٹلی لیے پلٹ کر چل دیے اور میں وہیں ریت کے شدید طوفان میں مزار کے دروازے کے قریب گرم صوم سناکھڑا رہ گیا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ریت کی چادر نے میرے سارے وجود کو اپنی جلتی چادر سے ڈھک دیا۔ یہ کیسا اسرار تھا؟ اگر وہ لڑکی سیکند ہی تھی، جو مجھے ایک آدھ نہیں، پورے تین بار دکھائی دی تھی، تو پھر وہ گزشتہ اٹھنے غریبے میں کال گڑھ کے دوسرے ہاتھوں کو کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ لیکن کیا صرف ایک پھولوں والی چادر کی مشابہت کی بناء پر مجھے اتنا بڑا دعویٰ کرنا بھی چاہیے یا پھر مزید کسی ثبوت کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں انہی سوچوں میں گم رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب عصر کا وقت گزر گیا۔ سلطان بابا نے ٹوکا تو میں نے جلدی سے سورج ڈھلنے سے کچھ قبل نماز ادا کی۔ آج مزار پر ہلکی پھلکی چہل پہل بھی تھی، شاید جمعرات کی وجہ سے۔ کچھ ہی دیر میں اکرام اللہ صاحب ایک پکی عمر کے مرد اور عورت کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، ایک سانولی سلونی سی نوجوان لڑکی، علاقے کی ریت کے مطابق بڑا سا پلٹو ٹکالے، اندر چلی آئی۔ اچھا تو یہ تھی، سانول کی نوری..... واقعی سانول کی تڑپ اور بے چینی بلا وجہ نہیں تھی۔ نوری کے نور سے مزار چند لمحوں کے لیے جگمگا سا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی سادگی میں کس قدر کشش ہوتی ہے، کچھ سراپے خود سرتا پا، ایک گہنا ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کسی زیور کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ نوری نے بھی سادہ سفید چوڑیاں گہنی تک ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور اکرام چچا کے ساتھ دعا میں مشغول تھی اور میں بار بار باہر سحر کی طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ نہ جانے سانول کہاں رہ گیا تھا، اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نوری کی خاص سہیلی نے نوری سے بھی چھپ کر اس کے مزار آنے کی یہ خبر سانول تک پہنچائی تھی۔ نوری کی سب ہی سہیلیاں سانول کی اس بے قراری سے واقف تھیں اور سب ہی کی دلی خواہش تھی کہ نوری جلد از جلد سانول کی ہو کر اس کے گھر چلی جائے، اس لیے وہ نوری کی ناراضی کا غطرہ مول لے کر بھی ایسی حرکت کر گزرتی تھیں، جس سے ان دونوں کو دو گھنٹی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع مل سکے۔ نوری کا سکون بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے سانول کی آمد کی خبر نہیں ہے، ورنہ ایسے شفاف آئینے کہاں کچھ چھپا پاتے ہیں۔ نوری نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور میں نے دور سحر میں نوری کی تسلیوں کے حلقے سے پرے سانول کو لیے لیے ڈگ بھرتے مزار کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی زوردار انداز میں ہم سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کپڑے کا تھیلا ایک جانب رکھتے ہوئے بولا ”چھوٹے چہرے جی..... آپ نے دعا کے لیے جو سامان منگوایا تھا، سب لے آیا ہوں۔“ اس کی اس ”چھوٹے چہرے جی“ کی اصطلاح نے مجھے بے ساختہ مسکراتے پر مجبور کر دیا۔ نوری نے چونک کے پلٹ گردن دیکھا اور اس کے چہرے پر بے یک وقت حیا، شرم اور کچھ کچھ غصے کی لالی بکھر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سانول کی اس ”سعادت مندی“ کے پیچھے کیا راز ہے۔ سانول نے باقی سب لوگوں سے بھی ملیک سلیک کی اور میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر بار بار پھسل کر نوری کے چہرے کا طواف کر رہی تھی اور چند لمحوں پہلے کسی کبری بھیل کی طرح بے سکون نظر آنے والی نوری، ابھی سمندر کے بے چین مد و جزر کی طرح مل کھانے لگی تھی۔ دعا ختم کرنے کے بعد نوری کے والدین نے سلطان بابا سے چند لمحوں کی ملاقات کی۔ اکرام صاحب نے ان سب کا تعارف کروایا۔ اس تمام مرحلے میں نوری مستقل سر جھکائے کھڑی رہی۔ سانول کا دیا ہوا القب، نوری کے ماں باپ کی زبان پر بھی چڑھ گیا تھا اور وہ مہمست ہوتے وقت تک مجھے ”چھوٹے چہرے“ کے نام ہی سے پکارتے رہے۔ گویا سلطان بابا کال گڑھ کے بڑے چہرے اور میں ان کا معتمد، چھوٹا چہرے۔ سانول کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ اس کی منت صرف نوری کی اک نظر ہے، لیکن اس بیکار حیا نے بھی جیسے صرف مزار کی زمین پر بھیجی رہت ہی کو نہار نے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ نوری نے آخری وقت تک اپنی نظر جھکائے رکھی، حتیٰ کہ اس کے ماں باپ اور چچا مزار کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سانول بالکل ہی پرمردہ سا ہونے لگا۔ میرے دل سے بے اختیار ایک صدا نکلی کہ اس کے جتنے کی نظر سے غیب کر دے اور ٹھیک اسی لیے نوری نے مزار سے نکلنے نکلنے ایک بل کے لیے پلٹ کر سانول کی جانب دیکھا۔

کیا کچھ نہیں تھا، اس ایک نظر میں، حجاب، سٹائش، سر ڈش اور ایک الوداع۔ تب تک کے لیے جب قدرت ایک بار پھر، ان دونوں کا سامنا کرا دے۔ سانول اپنی جگہ بہت سا کھڑا رہ گیا اور نوری پلٹ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نظر سانول کو کیا کچھ دے گئی ہے، لیکن مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اب اگلی ملاقات تک سانول کے جگر میں نوری کی یہ آخری نظر، زہر میں بچھ ہوئے ایک تیر کی طرح ہیوسٹ رہے گی۔ نہ جانے کتنے جگہ راتے اور دھوپ کے کتنے پہرہ ایسی ایک نظری کسک اور تڑپ کے اثر میں گزر جائیں گے۔ صورت چاہے کوئی بھی ہو، یہ سخت ہر حال میں ایک دو دھاری تلواری تو ثابت ہوتی ہے، نہ ملو تو جدائی کا تھی ہے اور ملاقات ہو جائے تو محبوب کا جلوہ، جلا کر رکھ کر دیتا ہے۔ سانول بھی اب صرف اپنی راکھ کی صورت ہی میں اس مزار کے احاطے میں موجود رہ گیا تھا اور گرم ہوا کے تیز جگے اور ریت کا طوفان، اس راکھ کو پورے مزار کی چار دیواری میں اُڑا رہا تھا۔ یہ جذبے کی کتنے منہ زور ہوتے ہیں، ایک لمحے ہی میں کیسے کیسے زندہ دلوں کو خاک کر دیتے ہیں۔ سانول بھی کچھ دیر بعد اپنے اس ریزہ ریزہ اور خاکسترو جو دو کو لیے واپس پلٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب سلطان بابا نے اپنی تسبیح ختم کی، تو میں نے انہیں سیکندہ کے دوپٹے والی ساری بات بتائی کہ اس چادر کا دوسرا حصہ پہنے ہوئے میں نے سحر میں اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ سلطان بابا میری بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے تو لہجہ تب بھی گھوٹا سا تھا۔ ”گویا وہ صرف ایک سراب ہی نہ تھی، قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینے والی ہے ساحر میاں! خیال رہے کہ اب قدم ڈمگانے نہ پائیں۔ ویسے میرا قیاس ہے کہ اب وہ لڑکی تمہیں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس نے تمہیں جو اشارہ دینا تھا، وہ دے چکی، اب آگے کی کھوج تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔“

بیشک کی طرح میں سلطان بابا کی پوری بات سمجھ نہیں پایا اور پُپ ہی رہا، کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ سلطان بابا مجھے اتنا ہی بتاتے ہیں، جتنا میرے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی اور میری ازلی وحشت اور بے چینی کا دور بھی شروع ہونے ہی کو تھا کہ مجھے باہر سے دی مخصوص غزاہٹ سنائی دی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ”کالا“ بھوک لگنے پر اب ہمیشہ مزار کی چار دیواری ہی کا رخ کیا کرے گا، کیونکہ اس کے پرانے مالک نے تو اسے اس کی زندگی بھر کی وفاداری کا صلہ ایک ”دیس نکالنے“ کی صورت ہی دیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر پاؤں پیارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے برتن میں پانی کا مستقل انتظام کر دیا تھا۔ روٹی کے چند ٹکڑے لٹکنے کے بعد کالا وہیں پیار کر بیٹھ گیا۔ جانے اسے اتنی سمجھ کیسے آگئی تھی کہ وہ مزار کی چار دیواری کے اندر پھنکتا بھی نہیں تھا۔ اتنے میں صحرائی طرف سے سانول کی ریموز بانسری کی لے ہوا کے دوش پر بکھری۔ اس کی تان میں جو درد آج تھا، اسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ شاید، شیلے نے کہا تھا کہ ”ہمارے سب سے پیسے نفعے وہی ہوتے ہیں، جو ہمارے اندر کے شدید غم کو بیان کرتے ہیں۔“ آج سانول کی بانسری بھی شیلے کے اس قول کو سچ ثابت کر رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے ہونٹوں سے بانسری ہٹائی۔ میں نے قریب جا کر اسے چھیڑا۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ نوری کی ایک جھلک، تمہاری ذہن کو اتنی زندگی بخش دے گی، ورنہ اس کے ماں باپ سے کچھ دیر مزار پر ٹھہرنے کی التجا ضرور کرتا۔“ سانول بھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”میں ہر لمحہ اسے دیکھنے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن جب بھی کسی اس کی ایک آدھ جھلک پالیتا ہوں، تو پھر ہفتوں یونہی اس اور بے چین رہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے عبداللہ.....“ ”پہلے تو تم یہ فیصلہ کر لو کہ میں عبداللہ ہوں یا چوٹا بیڑا، پھر اس کے بعد ہم مل کر اس درد کا مرہم بھی ڈھونڈ لیں گے۔“ اس سرتپہ سانول خود کو کھلکھلا کر ہنسنے سے روک نہیں پایا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اُسے یا سیت کے اس دور سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ اس محبت نے آج تک خوشی کم ہی بانٹی ہے۔ کیکر کا مقدر صرف کاٹنے ہوتے ہیں، گلاب نہیں۔

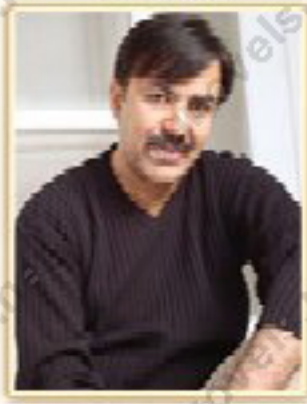
میں ابھی تک سیکندہ کے مجید میں الجھا ہوا تھا، میں نے سانول سے دوبارہ اس کا تذکرہ کیا کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ جس لڑکی کی جھلک، میں نے سحر میں تین مرتبہ دیکھی ہے، وہ سیکندہ ہی تھی لیکن اس بار سانول کا رد عمل بہت چوٹ کا دینے والا تھا۔ اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنی انگلی کی مہر لگا دی اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے سرگوشیاں انداز میں بولا ”میری ایک بات مانو گے، اس بات کو یقیناً تم کر دو، یہ کھوج تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“ مجھے اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی۔ ”کیوں.....؟ ایسا کیا ہے، اس کھوج کے انجام میں، دیکھو، اگر تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی پتا ہے تو مجھے ضرور بتاؤ، کیونکہ اب تو دوسرے دوسرے مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ میری کال گڑھ آدھ کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔“ سانول نے بات ٹالنے کی بجائے کوشش کی، لیکن میرے مضمر ارادے کے آگے اسے ہار ماننی پڑی۔ ”میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتا، لیکن شاید دوسروں سے کچھ بڑھ کر معلومات رکھتا ہوں۔ سیکندہ اپنے مشورے کے ساتھ کال گڑھ کے اسٹیشن پر کیوں آتری، اس کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ ایک رات بہت سی کس مکان میں ٹھہری تھی، مجھے اس جگہ کا پتا ہے۔ میں اور میرا دوست بیرل، وہاں گئے بھی تھے۔“ سانول بولتے بولتے پُپ ہو گیا۔ میں نے اسے ٹوکا ”تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے اور اب تمہارا دوست کہاں ہے۔؟“ سانول نے گہری سانس لی ”بیرل کو اس کے باپ نے اگلے ہفتے ہی شہر بھجوا دیا تھا، کیوں کہ اُسے ڈر تھا کہ یہاں اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“ اب میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ”خدا کے لیے یہ پہیلیاں مجھ انا بند کرو اور مجھے پوری بات بتاؤ۔“ سانول نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کبھی کبھی مجھے تم، وہ نہیں لگتے، جو تم ہو..... لیکن پتا نہیں، پھر بھی جانے کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔“

سانول نے ایک بار پھر اچھی طرح اطمینان کیا کہ نیلے کے آس پاس سحر میں کوئی دوسرا ہماری گفتگو سننے کے لیے موجود نہ ہو۔ پھر اس نے دھتکے انداز میں مجید کھولنا شروع کیا۔ میں دم بخود سا بیٹھا منتہار ہا۔ سانول کے مطابق، وہ اور بیرل اس رات گہروالوں سے ٹھپ کر قریبی قصبے میں ٹوٹکی دیکھنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ دلتی پہاڑ میں دیر ہو گئی اور آدھی رات کے وقت جب وہ پہاڑ کی طرف لوٹ رہے تھے، تو پہاڑ کی شرقی سمت، جہاں مغلزائیں کچے گھر دو دو در لاسٹے پر بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر گھر کے آگے کچا آنگن اور پھر آدھی لکڑی دیواری کی آڑھ بٹائی گئی ہے، وہاں ایک گھر کے قریب انہیں چند مائے نیک نظر آئے۔ سانول اور اس کا دوست ڈر کر، وہیں روک کر بیٹھ گئے اور پھر چند لمحوں بعد یہ پہاڑی فٹم ہوئی، تو وہ جلدی جلدی اپنے گھروں کو لوٹے۔ دو دن بعد یہی بوڑھا اور بوڑھی کال گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی نیکہ کی تلاش کی وہابی میں ہر دو روزے پر دستک دینی شروع کر دی۔ اسی تلاش میں وہ سانول کے دوست بیرل کے درجہ بھی گئے۔ بیرل کا باپ ایک تھوٹکی ہے، لہذا انہوں نے اپنی نواسی کے نکھوج کی التجا بھی کی۔ میں نے تھوٹکی لفظ پر سانول کو ٹوکا۔ ”یہ تھوٹکی کیا ہوتا ہے.....؟“ سانول نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”کیا، جہیں تھوٹکی کا نہیں پتا، یہ تو بڑے مٹی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے باپ دادا سے بہن ان کے اندر نسل در نسل چلتا ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ تھوٹکی وہ ہوتا ہے، جو زمین پر پڑے نشانات کے ذریعے گاؤں میں ہوئی، کسی بھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی حکمت تو اتنی تیز ہوتی ہیں کہ وہ ہفتوں پرانے نشان بھی اٹھا لیتے ہیں اور کچھ کی قوت شامہ اور چھٹی جس اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ صرف عورت یا مرد کے جسم یا پتھروں کی بے پھر کھوج کر سراغ نکال سکتے ہیں۔ تھوٹکی اگر اعلیٰ نسل کا ہو، تو وہ زمین پر

پڑے نشان دیکھ کر یہ بھی بتا سکتا ہے کہ یہ پاؤں کا نشان کسی عورت کا ہے یا مرد کا، بچے کا ہے یا کسی بوڑھے کا۔ عورت کا ہے، تو کیا وہ جوان تھی یا بوڑھی، جی کہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کا سراغ بھی، وہ مٹی پر پڑے، انہی بے جان نشانوں سے ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اس ساری جمع تفریق اور نشان پہچاننے کا ایک گہرا تعلق عورت یا مرد کے وزن سے بھی ہوتا تھا اور کھوجیوں کی تربیت میں کچھ ایسے خاص گھبے شامل ہوتے تھے، جو انہیں مرد و عورت کی چال ڈھال اور رہن سہن تک کے بارے میں سراغ دے جاتے تھے۔ بہر حال، یہ ایک خدا داد صلاحیت تھی، جو آج بھی چند مخصوص لوگوں کو حاصل ہے۔ میں سانول کی بتائی ہوئی کھوجیوں کی تفصیلات میں کچھ ایسا کھویا کہ چند لمحے کے لیے سیکنہ کو بھی بھلا بیٹھا۔ پھر سانول نے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا کہ سیکنہ کے نانا، نانی پیرل کے کھوجی باپ کے سامنے بھی اپنی فریاد لیے آن پہنچے۔ ان کی گریہ وزاری سے کھوجی کا دل تسج گیا اور اس نے حامی بھر لی۔ اگلے دن طے یہ پایا کہ کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے سیکنہ اور اس کے شوہر کے پیر کے نشان اٹھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، کیوں کہ پہلا سراغ وہیں مل سکتا تھا، لیکن کھوج اور نشان اٹھانے کے لیے ایک بہت اہم نکتہ زمین کی ساخت بھی تھا۔ کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن، چوں کہ صحرا کے پتھروں بچ تھا اور شدید تیز ہوا اور رات بھر چلتی آندھی تو پل بھر پہلے کے بنے نشان بھی زمین پر جھننے نہیں دیتی تھی، اوپر سے وہ ہر لمحہ سرکتی ریت، نتیجتاً کھوجی کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے مایوس لوٹنا پڑا۔ سانول نے مجھے بتایا کہ وہ، اس کا دوست پیرل اور سیکنہ کے نانا، نانی بھی کھوجی کے ہم راہ ہی تھے، جب وہ ریلوے اسٹیشن سے ٹھکے بارے بستی میں داخل ہو رہے تھے، سیکنہ کی نانی بار بار سیکنہ کی چادر کو چومتی، اپنی آنکھوں سے لگاتی اور روتی ہوئی ان کے پیچھے چلی آ رہی تھی کہ اچانک کھوجی کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ وہ پہلے بھی سیکنہ کی چادر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا، لیکن اس بار اس نے خصوصی طور پر بڑھیا سے چادر بھپٹ کر اُسے خوب اچھی طرح سونگھا اور ایک کچھ مکان کے سامنے جا کر ڈک گیا۔ سانول اور پیرل کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ یہ تو وہی مکان تھا، جہاں تین دن پہلے رات کو انہوں نے کچھ لپکتے سائے اور کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں سنی تھیں۔ مکان کا دروازہ بھڑا ہوا تھا، لیکن آدھی رات کی چادر دیواری کے پار آنگن کی ویرانی اور سناہوا کچھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ صحن سے پرے لکڑی کی بنچوں والے چھت کے برآمدے میں گھلنے والے اندر کے کمروں کے دروازے بھی اُدھ گھلے پڑے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے بعد کا جھپٹنا چھا رہا تھا۔ آخر سانول ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر صحن میں داخل ہو گیا، لیکن کھوجی کی تیز آواز نے اُسے اپنی جگہ جے، کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ کھوجی چلایا ”اپنی جگہ پر کھڑے رہنا سانول، صحن کی طرف نہ جانا۔ ہو سکتا ہے، وہاں کوئی نشان باقی ہو“ سانول نے پیچھے کھوجی اور پیرل بھی دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھے جوڑے کو انہوں نے باہر ہی روک دیا۔ سانول اور پیرل دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپکے کھڑے رہے۔ کھوجی نے اپنے کمرے کی جیب سے لکڑی کی دو عجیب سی لمبی اور پتلی ڈنڈیاں نکالیں اور ان سے صحن کی چکی زمین کو پھونکیں مار مار کر صاف کرنے لگا۔ صحن میں اترنے سے پہلے اس نے ایک کام اور بھی کیا کہ اپنے جوتے اتار دیے اور اپنے پیروں میں مخصوص ساخت کے بنا نشان والے اونچی موزے پہن لیے۔ شاید اس کا مقصد صحن کی ریشمی زمین پر اپنے پاؤں کے نشانات سے بچنا ہوگا۔ میں حیرت زدہ ہوا سانول سے فکھر پرٹس اٹھانے کا یہ انوکھا واقعہ سن رہا تھا۔ سانول نے بتایا کہ کھوجی نے بڑی احتیاط سے تمام صحن اور پھر دونوں کچے کمروں کی زمین پر پڑی ریت کو صاف کیا اور اس تمام عرصے میں سیکنہ کی چادر کی خوشبو سے بھی مدد لیتا رہا، پھر ایک خاص جگہ پہنچ کر کھوجی نے اپنی کلائی پر بندھی ایک خاص غنید ڈوری کھولی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی مٹی کو مخصوص طریقے سے یوں گھر چاک ڈوری کے دونوں سرے، کھوجی نے اپنے ہاتھوں کے دو انگوٹھوں سے ہاندھ رکھے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اس طرح کھول رکھا تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ زمین پر پھیرتا تو دھماکے کی ڈوری زمین پر گر کر کھاتی، چند مخصوص نشان مٹی میں سے ابھار دیتی۔ کھوجی نے اپنا کام ختم کر کے ایک لمبی سی سانس لی اور صحن سے باہر نکل کر بوڑھے سے پوچھا ”کیا تمہاری نواسی ہائیں سے چوبیس سال کی درمیانی عمر کی تھی اور کیا اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چوٹ یا زخم تھا۔“ بوڑھے سے پہلے، بڑھاپا چلا اٹھی ”ہاں ہاں! مہندی کی رات ہلک سے اترتے وقت اس کے پاؤں میں موبچ آگئی تھی، اس لیے وہ کچھ تکلیف میں تھی، لیکن تمہیں کیا پتا؟“ کھوجی نے ایک نظر آس پاس ڈالی اور پھر آہستہ سے بولا ”اس صحن میں اور کمروں کے اندر پڑے چند نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایک ہائیں تھیں سالاہ نو جوان لڑکی، جو اپنے داہنے پاؤں پر پورا بوجھ نہیں ڈال سکتی، موجود تھی، لیکن اس لڑکی کے علاوہ بھی یہاں کم از کم چار مردوں کے چلنے پھرنے کے نشانات موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے، ان میں سے ایک اس کا شوہر بھی ہو۔ بہر حال، ابھی تمہاری نواسی کی خوشبو اس گھر میں موجود ہے۔ اب رات سر پر ہے، لہذا ہم اب کل صبح گھر کے باہر سے نشان اٹھانا شروع کریں گے، تاکہ یہ پتا چل سکے کہ یہاں سے سیکنہ کس طرف گئی ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی کے منہ سے اتنا ہی سن کر وہ بوڑھا، بوڑھی اس قدر خوش ہونے لگا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ساری رات اسی ویران مکان کی چوکھٹ ہی پر گزار دیتے۔ بڑی مشکل سے سانول نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں صرف چند ہی گھنٹے بچے ہیں، لہذا کچھ دیر مزید انتظار میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ رات میں ویسے بھی کھوجی نشان نہیں اٹھا پائے گا۔

ان کے جانے کے بعد راستے میں کھوجی نے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے پیرل اور سانول کو اس بات کا اشارہ دیا کہ اُسے شک ہے کہ لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر اس گھر سے کہیں اور لے جایا گیا ہے، کیوں کہ کھوجی نے صحن میں واضح طور پر گھسیٹے جانے کے چند نشان دیکھے تھے۔ سانول نے کھوجی کو نوکریدا کہ اسے اس بات کا یقین کیسے ہوا کہ جس ذی روح کو کھینچا گیا تھا، وہ سیکنہ ہی تھی۔ کھوجی نے بتایا کہ چوں کہ گھسٹنے وقت بھی لڑکی اپنے داہنے پاؤں کا پورا وزن زمین پر نہیں ڈال پاری تھی اور پھر ایک مقام پر آ کر، جب وہ صحن میں گر پڑی تھی، تو اُس کے وزن اور مردوں کے پیروں کے نشانات اور کش مکش کے آثار اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحن میں کوئی ان ہوئی ضرور ہوئی ہے۔ کھوجی کو وہاں زمین پر لڑکی کی ایک بالوں والی پن اور ایک ٹوٹا ہوا ناخن بھی ملا تھا، جو اس نے نانا، نانی کو دکھائے بغیر ہی، اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ بہر حال راز جیسا بھی تھا، اسے اگلی صبح کھل ہی جاتا تھا۔

سانول اتنی کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی ”پھر اس کے بعد..... آگے کیا ہوا..... وہ بھی تو بتاؤ نا.....“ لیکن سانول خاموش ہی رہا۔ میں نے اسے جھپٹوڑا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ”اس کے بعد کی کہانی بے حد مختصر ہے۔ میں اگلی صبح پیرل کے گھر پہنچا، تو وہ دونوں بوڑھا بوڑھی پہلے ہی سے کھوجی کے دروازے پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے، لیکن دروازے پر پڑا موٹا سا کالا، ہم تینوں کا منہ چڑھا رہا تھا۔ تین دن تک سیکنہ کے بدلے بے نانا نانی، کھوجی کے بند درہی پر پڑے رہے اور جب چوتھے دن وہ لوٹا، تو پیرل اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے گول مول سا جواب دے کر ہمارے منہ بند کروا دیے کہ بڑے شہر میں اس کی خالہ نے کسی بچے میں چوکیدار کی نوکری ڈھونڈ نکالی تھی، لہذا اسے جلدی میں پیرل کو لے کر جانا پڑا۔ سیکنہ کی تلاش کے سلسلے میں بھی وہ بالکل ہی سرور دیے کا اظہار کرتا رہا کہ اب اتنے دن بعد کہاں کوئی نشان بچا ہوگا، البتہ بڑھیا کی حدت سے زیادہ آواز زاری سے تنگ آ کر وہ دو گھنٹی کے لیے ہمارے ساتھ اس ویران مکان تک چلا گیا، لیکن کچھ دیر باہر میدان کی خاک چھاننے کے بعد جتنی اعلان کر دیا کہ روزانہ کی چلتی آندھی اور تیز ہوا سے آس پاس کا ہر نشان مٹ چکا ہے، لہذا اب یہاں سیکنہ کی تلاش لا حاصل ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس کے چاہنے والے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں۔“ سانول نے بات ختم کر کے کچھ اس طرح میری جانب دیکھا، جیسے اسے خود بھی اس ناکمل داستان کے انجام سے شدید کوفت ہوئی ہو۔ ”لیکن کھوجی نے ایسا کیوں کیا، تم نے اس سے کچھ تو پوچھا ہوتا۔“ سانول نے باوقی سے سر ہلایا ”کھوجی نے اس دن کے بعد سے اپنے لب، کچھ اس طرح سے ہی لیے ہیں کہ اب وہ شاذ و نادر ہی کسی سے کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ نہ جانے پیرل کو بھی اس نے کہاں بھیج دیا ہے۔ میں تو گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے جگری یار کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس گیا ہوں۔“ ہم نے ساری رات باتوں میں گزار دی تھی۔ بستی کی جانب سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں، تو میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپکا۔ ”کیا ہم اس وقت اُس کھوجی کے گھر جا سکتے ہیں۔؟“ سانول میری بات سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ ”اس وقت..... کھوجی کے گھر، کیوں خیر تو ہے، وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اپنا وقت ضائع مت کرو عبد اللہ،“ میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے، چلو دیر نہ کرو، مجھے روشنی ہونے سے پہلے واپس مزار بھی پہنچنا ہے، ورنہ سلطان باپا پریشان ہوں گے۔“ کچھ دیر بعد ہی ہم بستی کی میز میز سے گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک پرانے سے بلاسیدہ مکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سانول کی قیصری دنگ پر اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی چہل کھینٹے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ہاتھ میں لائین تھا سے سر باہر نکال کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا، ”اس وقت کون ہے بھئی.....“ دفعتاً اس کی نظر پہلے سانول اور پھر مجھ پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بولا ”تم.....؟“..... (باقی آئندہ)



..... جہاں ہاشم ندیم جہاں.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و مشہور ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سفر بے جنگوں“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا ڈمبھر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پڑائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ مروجے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے حجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں دکھ کر کے کامرانی ورنش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سرایت پسندوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز پر اپنے مسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناطق کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک طبعہ دہائی میل آئی وی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabduallah@janggroup.com.pk

مجھے اس بوڑھے کھوجی کی جڑ پڑا ہٹ پر مزید حیرت ہوئی۔ ”آپ مجھے جانتے ہیں.....؟“ ”ہاں..... میں دن قہیں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ کھوجی کے بازار میں دیکھا تھا، تم مزار کے نئے مجاور ہو..... لیکن اس طرح منہ اندھیرے مہرے دروازے پر..... سب ٹھیک تو ہے؟“ ”آپ مائل نے بات منجانی۔“ ”ہاں چاچا اسب ٹھیک ہے، اس کا نام عبداللہ ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہتا تھا، سو میں اسے یہاں لے آیا۔“ کھوجی کے ناثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے مائل کی یہ ”خدا کی خدمت گاری“ ایک آنکھ نہیں بھائی، لیکن وہ چپ رہا اور بادل خواستہ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اور مائل بھی اس پڑی ایک جھلکا سی چار پائی کی پائنتی ہی پر ٹپ گئے۔ باہر گلی میں انکا ڈنگا نمازیوں کے ٹھکھارے اور چلنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر براہ راست سوال داغ دیا۔ ”آپ سیکھنے کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“ ”مہر اسوال سن کر کھوجی بوڑھے کے ہاتھ سے لائین گرے کر لے پئی اور وہ مائل کی طرف دیکھتے ہوئے دانت بیٹیں کر بولا۔ ”اچھا..... تو یہ قہاری شرات ہے، ہمدعاں لڑ کے، اس لیے میں نے یہاں کو بھی قہار سے سائے سے دور بھجوا دیا تھا، لیکن تم اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ نکل جاؤ تم دونوں یہاں سے..... میں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں مزید کچھ نہیں بتا۔“ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ”مائل نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا، جس سے آپ کسی سبب سے متاثر ہو جائیں۔ میں نے خود دیکھنا نہیں دیکھا ہے۔“ یہ دوسرا دھماکا تھا، جو میں کھوجی کے سر پر گئی، ہم کی طرح پھٹا۔ ”کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔“ ”مہر مطلب ہے کہ پھر تم اس کا پتا کھ سے کیوں پوچھ رہے ہو، جا کر ای سے پوچھ لو نا.....“ میں کھوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”وہ مجھے صرف چند لمحوں کے لیے ایک جھٹک کی طرح نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی، لیکن آپ اس کے بارے میں ضرور کچھ ایسا جانتے ہیں، جس سے مجھے اس کی کھوج میں کچھ مدد مل سکے، لیکن شاید آپ بتانا نہیں چاہتے۔“ کھوجی غصے سے بھر گیا۔ ”نقعی وفد کہوں کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا، اب تم دونوں یہاں سے چلتے جاؤ۔“ اپنی جوانی پر غصے، تو میرے بڑے ساپے پر کچھ دم کھاؤ۔ ”کھوجی کے حقیقی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس مڑ سے پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ صحن کا دروازہ کھولے کھڑا، ہماری رداگی کا انتظار کر رہا تھا۔ مائل نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے تو کھوجی دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ ”ٹھیک ہے..... آپ کچھ ہیں تو میں چلا جاتا ہوں، لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس یہ فن اور یہ خدا اور صلاحیت قدرت کی ایک امانت ہے اور..... آپ نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اوپر والے نے آپ کا اندر اس لیے روشن کیا کہ آپ دوسروں کو اندھیرے میں راستہ دکھائیں اور ان کی مدد کریں، لیکن آپ نے آج اپنے فرائض اور کام کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بے ایمانی آپ کی آنے والی سطوں کے اندر سے یہ وہدان و صلاحیت ہی ختم نہ کر دے۔“ میں بات ختم کر کے دباؤ کی گئی لیے پلٹا تو کھوجی اچھائی انداز میں چلا ہوا ”نہیں..... میں نے اپنے فن کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی..... لیکن بعض دفعہ مصلحت بھی آئے آ جاتی ہے، میں ایک فریب انسان ہوں اور میری ساری لاپٹی میرا جوان بیٹا بچل ہے۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں، پر اسے اگر کچھ ہو گیا، تو میں جیتے می مر جاؤں گا.....“ مائل نے حیرت سے پہلے میری اور پھر کھوجی کی جانب دیکھا۔ میں نے پیا طری کو شش اسی امید پر کی تھی کہ شاید کھوجی کے دل و دماغ پر بھی برف کچھ ٹھکے۔ ہر فرض و عیناں کا رنگ کی طرح وہ اپنے فن اور ہنر پر آیا التزام برداشت نہیں کر سکا اور ظلمتوں پر ہل اٹھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے کہیں زیادہ کم زور اور اس علاقے میں صرف ایک انجینی ہوں، لیکن پھر بھی اس لڑکی کی کھوج میں آپ تک چلا آیا۔ کیا آپ کو ان پانچوں میں سے کسی ایک میں جانا، جو اپنی زندگی کے آخری دن یوں اس تپتے صحرائی جلتی ریت جھانکتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ ان دنوں میں تو انہیں اپنے گھر کے آگلیں میں آرام اور سکون کی زندگی گزارنی چاہیے تھی، جیسے میں اور آپ گزار رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ دونوں اسی صحرائیں سسک سسک کر اپنی جان دے دیں۔“ کھوجی نے بے بسی سے سر ہٹا۔ ”تم مجھے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میرے باپ دادا نے بھی انگریزی پولیس میں کھوجی کی ڈیوٹی دی ہے۔ انگریز سرکار نے میرے باپ کو اس کی خدمت کے صلے میں بڑی عزت، بڑا مال دیا۔ خود میں نے بائیس سال کھوجی کی نوکری کی ہے، لیکن کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ میں اپنے پیٹھ کی بہت عزت کرتا ہوں، لیکن.....“ کھوجی کچھ بولتے بولتے چپ ہو گیا، پھر لمبی سی سانس لے کر بولا۔ ”اچھا نور سے سنو..... میں اگلی صبح اس مکان کے باہر نشان اٹھانے نکلتی گیا تھا۔ نشان اٹھانے کا بہترین وقت صبح شہم اور گھر کے کھٹک ہونے سے پہلے ہی کا ہوتا ہے، جب تک وہ بوڑھی اور بوڑھا نہیں پہنچے تھے، لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد قریب لڑکیوں تک گھسنا گیا تھا اور پھر اسے کسی اونٹ پر ادا دیا گیا تھا۔ اب اس جگہ سے آگے لڑکی کے جسم کے نشان ختم ہو گئے تھے۔ اب تو تم ہی سمجھ ہی گئے ہو کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ میں یہ بات اگر لڑکی کے نانا نانی کو بتا بھی دیتا تو وہ بے چارے

اس پردیس میں کیا کر لیتے۔ اسی لیے میں چپ رہا اور نہیں.....“ میں نے غور سے کھوجی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اس اونٹ کے پیروں کے نشان بھی تو کسی جانب گئے ہوں..... آپ نے اس کا کھوج نہیں لگایا؟“ کھوجی نے خود کو جیسے ہمارے حوالے کر دیا، وہ بالکل ہی ہار کر بولا۔ ”وہ ایک نہیں تین اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور تمام نشانات دوبارہ صحرا کی طرف ہی پلٹ گئے تھے۔“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ”تو پھر آپ نے یہ بات سیکھنے کے گھر والوں کو کیوں نہیں بتائی۔“ کھوجی نے بے بسی سے سر پٹا۔ ”کیسے بتانا، اغوا کنندگان کو کچھلی شام ہی ہماری ساری سرگرمی کی اطلاع مل چکی تھی اور صبح جب میں اس مکان کے سامنے سیکھنے کے نشان اٹھا رہا تھا، تب ہی منہ اندھیرے وہ تین نقاب پوش میری بے خبری میں، میرے سر پر آپہنچے۔ ان کے ہاتھ میں لڑکی کے شوہر کے خون آلود کپڑے تھے، جو انہوں نے میرے سامنے پھینک کر دھمکی دی کہ اگر میں نے اس معاملے میں زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش کی تو اسی رات اپنے اکلوتے بیٹے کا سر بھی اپنی چوکت پر لٹکا ہوا دیکھوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتا؟ میں اسی لمحے گھر پلٹا اور سب سے پہلے پیرل کو شہر پہنچا دیا۔ بس اتنی ہی کہانی ہے کہ میرے اندر کا کھوجی ایک مجبور باپ کے سامنے ہار گیا۔“

کھوجی اپنی بات ختم کر کے یوں لے لے سانس لینے لگا، جیسے برسوں کا بھرا اخبار اندر سے نکل گیا ہو۔ میں سانول کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے مزار وٹا تو سلطان بابا فجر کی نماز ختم کر کے سلام پھیر رہے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کیوں میاں! کہاں تک پہنچی تمہاری کھوج..... کچھ کام یابی ہوئی یا پھر مزید الجھنیں سیٹ لائے ہو۔“ ہمیشہ کی طرح سلطان بابا مجھ سے پہلے میری تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے رات بھر کی تمام روداد انہیں سنا دی۔ کھوجی کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے سیکھنے کا معاملہ کسی قبائلی رشتے داری کی غلطی کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں لڑکی کا رشتہ نہ ملنے پر یا ٹھکرائے جانے پر ایسی ان ہونیاں عام تھیں، لیکن اسی دن جب میں نے اکرام صاحب کے ذریعے، بہانے سے سیکھنے کے نانائانی کو کریدا تو یہ بھی محض میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ ان کے بقول سیکھنے بہت پہلے ہی اپنے شوہر رحیم بخش سے منسوب تھی اور ہنا کسی الجھن کے دونوں کا رشتہ ہنس خوش طے پایا تھا۔ دھاکے مزید الجھتے ہی جارہے تھے اور ہر جانب سے میرا راستہ ایک بندگلی میں آخر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ شام کو عصر کے بعد میں انہی سوچوں میں گم مزار کے صحن میں بیٹھا، سورج کے جلنے کو لے کر دھیرے دھیرے ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ سانول ہڑبڑایا ہوا سا مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں بھی اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ ”خیریت تو ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔“ سانول نے سر پٹا۔ ”یہ لوگ مجھے سکون سے کہاں رہنے دیتے ہیں۔ نوری کے باپ نے آج میرے ابا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ انہوں نے رشتے کے لیے شرط لگا دی کہ اگر لڑکا کال گڑھ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا، تو اسے شہر جا کر محنت مزدوری کرنی ہوگی، تاکہ وہ سال بھر میں اپنی بیٹی رخصت کر دیں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں یہ صحرا چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتا ہوں۔ میری بانسری کا تو ہر ساز اسی ریت سے زندہ ہے اور میری ہر دھن اسی ”ایک“ کے لیے ہے۔ میں تو مر جاؤں گا، اس سے دور جا کر..... مجھے تو یہاں کی ہوا میں بھی اس کی خوش بو محسوس ہوتی ہے، کسی دوسری فضا میں تو میری سانس ہی گھٹ جائے گی.....“ میں چپ چاپ سانول کو اپنے زخم ادھر دے دیکھا رہا۔ ال کیسٹ میں پاؤں لٹکھا ہے کہ ”جب تم کسی کو چاہتے ہو تو کائنات کی ہر چیز تمہیں ملانے میں جٹ جاتی ہے۔“ اگر آج وہ میرے سامنے موجود ہوتا، تو میں اسے بتاتا کہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں، تو پوری کائنات ہمیں جدا کرنے کی سازش میں جٹ جاتی ہے، ہمارے خلاف منصوبے بنائے لگتی ہے، ہمیں برباد کر دیتی ہے۔ سانول اور نوری کے خلاف بھی ہر طرف سے سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محبت بھلا ہمیں کب ہمیں کے دوسانس لینے دیتی ہے، جلد ہی ہماری سانسیں گھونٹنے کے لیے آس پاس کی فضا میں جدائی کا زہریلا دھواں بھر دیتی ہے۔ ہماری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اس عشق کو شاید خشک آنکھیں پسند ہی نہیں، وہ انہیں ہر لمحہ بہتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سانول کی آنکھیں بھی عشق کی اس سدا سے چھایا زمین کو سیراب کر رہی تھیں۔ میں نے اس سے آگے کے منصوبے کے بارے میں پوچھا، تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ صحرا میں کسی کارپوڑ چرا کر گزارا کر لوں گا۔ کاش کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی کے علاوہ بھی کوئی دوسرا روزگار ہوتا، تو آج میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔“ مغرب سے کچھ پہلے سانول واپس لوٹ گیا۔

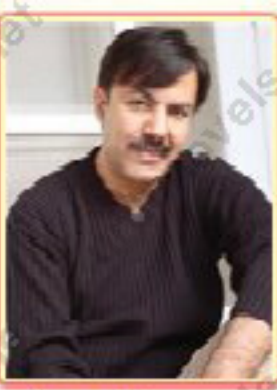
اندھیرا ہونے سے کچھ دیر قبل ”کالا“ بھی مزار کے باہر آ کر اپنی مخصوص غراہٹ سے مجھے بلانے لگا۔ اس کا زخم اب دھیرے دھیرے بھرنے لگا تھا۔ چال میں بھی کچھ توازن آ گیا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سدھایا ہوا آگتا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن محسوس کر لیا تھا کہ میں اس سے اپنے کپڑے کس کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ تب ہی شروع دن ہی سے وہ اپنی شکرگزاری کا اظہار بھی کچھ فاصلے سے کرتا تھا۔ کالے کے جانے کے بعد، میں پھر اس ویران مزار کی منڈیر کے قریب آ بیٹھا۔ جانے وہ کس کا مزار تھا۔ اندر گمروں میں بنی ایک گم نام قبر کے اوپر کسی نے پھولوں کی جو آخری چادر چڑھائی تھی، اب اس کے پھول بھی خشک ہو کر ہوا کے ساتھ ادھر ادھر بکھرے جاتے تھے۔ سلطان بابا اندر سے نکلے اور مجھے یوں کم صم بیٹھا دیکھ کر میرے طرف آگئے ”کیا سوچ رہے ہو میاں! کبھی اپنے اندر کی اس وحشت کو لگام بھی دے دیا کرو۔ جنوں حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“ میں نے ان کی جانب براہ راست دیکھنے سے گریز کیا۔ ”آپ میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتے۔ نصف بنوں سے مکمل دیوانگی کہیں بہتر ہے۔ میں خود اپنے اندر کی اس پل پل بڑھتی بے چینی سے بہت جھگ آ گیا ہوں۔“ سلطان بابا مسکرا دیے ”اپنے اپنے مقدر کی بات ہے، کسی کو خدا کا واس آئے، تو کسی کو جنوں۔ اب دیکھو، عبداللہ کے مقدر میں دیوانگی ہے یا فرزانگی؟“ انہوں نے میری نظروں کے تعاقب میں مزار کے گنبد پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بعد بولے ”بہادر شاہ ظفر کو پڑھا ہے؟“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا ”کون؟ وہ آخری محل شہنشاہ..... نہیں۔ بس، اس کی شاعری کے بارے میں یونیورسٹی میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔“ سلطان بابا نے حرار کے گنبد کی طرف اشارہ کیا ”شاید اس کا یہ قطعہ بھی ایسے ہی کسی حرار کے لیے ہوگا۔ سنو اور اسے اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھو۔ یہ ہم صوب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔“

نہ	کسی	کی	آنکھ	کا	نور	ہو
نہ	مسمی	کے	دل	کا	قرار	ہوں
ہو	کسی	مجھے	کام	نہ	آنکھ	
میں	وہ	ایک	محبت	خبر	ہوں	
پے	فاتحہ	کوئی	آئے	کیوں		
کوئی	چار	پھول	پڑھائے	کیوں		
کوئی	آکے	موج	جلانے	کیوں		
میں	وہ	بے	کسی	کا	مزار	ہوں

جانے اس قلعے میں کیا بات تھی، مجھے یوں لگا، جیسے میرا دل بہت دیر کے لیے ڈوب سا گیا ہے۔ مجھے یوں لگا، جیسے بہادر شاہ ظفر نے خاص طور پر میرے لیے یہ اشعار کہے ہوں۔ خود میری حالت بھی تو دن بدن کسی ایسے مزار تپتی ہی ہوتی جا رہی تھی۔ رات ڈھلتے ہی صحرائی طرف سے سانول کی بانسری کی آواز فضا کے دوش پر بکھرنے لگی، لیکن آج اس کی تان میں کچھ عجیب ہی تکتا اور کرب تھا۔ یہ محبت کس قدر چاہی اور زور آور ہوتی ہے کہ ہمارے مزار

اور ہماری تائیں بھی اسی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ آج میں سانول کو اس کی اپنی آگ میں جلنے کے لیے تباہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ گرم جس زدہ رات مجھ پر کسی نئے روپ میں کھلنے والی ہے۔ شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش شدید طور پر انگڑائیاں لے رہی تھی کہ میں کسی بھی طرح ایک بار پھر سیکینہ کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ اس بار میں نے پہلے ہی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا کہ میں اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ میں اندھیرے میں باہر صحرا پر یوں نظریں گاڑے بیٹھا تھا، جیسے ابھی یہ سیاہ پردہ پھاڑ کر کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہو، جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ کئی بار میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہوئیں اور ایک آدھ بار مجھے جھونک بھی آئی، لیکن رات کا کالا پردہ میرے مقدر کی طرح بند ہی رہا۔ صبح سے کچھ پہلے میں تھک کر اندر کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی ایک عجیب سی آواز میرے کانوں سے نکل آئی، شاید اونٹوں کا کوئی قافلہ صحرا سے گزر رہا تھا۔ ہاں..... یہ قافلے کی بختی جرس کی آواز ہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت سے اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ آواز قریب آنے لگی۔ میں دم بخود سا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ صحرا میں قافلے صبح منہ اندھیرے سے بھی پہلے روانہ ہوتے تھے، کیوں کہ ”مسافر شب کو اٹھتے ہیں..... جو جانا دور ہوتا ہے.....“ لیکن یہ کیا..... قافلے کی آواز اب بالکل قریب آچکی تھی اور مجھے اب تک کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر مزار سے باہر کھلے صحرا میں ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دور دور تک وہی ازلی ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا، لیکن میں اپنی سماعتوں کا کیا کرتا.....؟ میرے کانوں میں اب تک قافلے کا شور گونج رہا تھا اور ان آوازوں کی ہر بار یک تفصیل، مجھے کسی ریڈیو پر پیش کیے جانے والے کھیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ دور کوئی بچہ رو رہا تھا، اونٹوں کے گوبانوں پر رکھا سامان حرکت کی وجہ سے کھڑک رہا تھا۔ کوئی دور سے ہانکا لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اونٹ خرخرارہے تھے، حتیٰ کہ ان کے ریت پر پڑنے والے پاؤں کی دھمک بھی مجھے علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پازیبوں کی جھنکار، کچھ شریچوں کے ہسنے اور دوڑنے کی آوازیں اور قافلے کے پہرے داروں کی وقفے وقفے سے سب کو ہوشیار کرنے کے لیے نثارے پر چوٹ کی آواز تیز ہو گئی، ریت کا ایک طوفان سا اٹھا اور میں اسی ٹیلے پر کھڑا ریت کا حصہ بن گیا۔ میری آنکھیں ریت کی چھین سے جلنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ قافلہ اس وقت میرے آس پاس، بلکہ میرے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرگوشیاں جیز ہو گئیں، جیسے لوگ مجھ سے بچ کر دائیں بائیں سے گزر رہے ہوں، لیکن میری جلتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر اب بھی صرف ملبوں دور پھیلا ہوا ویران صحرا ہی اپنا عکس بکھیر رہا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یا خدا..... یہ کیا ماجرا تھا؟ یا تو میری سماعتیں ناکارہ ہو کر خود آوازیں تخلیق کرنے لگی تھیں یا پھر میری بصارت نے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کیا میری دیوانگی کا آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ قافلہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ ریت کا طوفان ختم کیا تھا، لیکن میرے اندر اٹھا طوفان کسی ریت کے جلنے بگولے کی طرح تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں کون تھا، یہاں کیا کر رہا تھا.....؟ میرے ساتھ ہی یہ ساری ان ہونیاں کیوں ہوتی تھیں۔ کیا واقعی میرا خرد سے جنوں کا سفر مکمل ہونے کو تھا۔ آخر کیا حد تھی، میرے اس سفر کی۔ میری وحشت کا اختتام کہاں تھا۔ میں دوسرے عام لوگوں کی طرح اپنی محبت کو پانے کے بعد اس کے ساتھ اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے کسی گھر کے آگن میں کیوں نہیں گزار سکتا تھا۔ زہرہ کی روح نے تو کب سے اپنی پردگی کا اختیار مجھے دے دیا تھا، پھر بھی میں ان ویرانوں کی خاک کیوں چھان رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس ٹیلے پر کھڑا ریت میں گھٹا رہا اور مجھے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ جانے کب سے تنہا کے لیے جاگے سلطان بابا مزار کے صحن میں نکلے اور مجھے یوں گم صم کھڑا دیکھتے رہے۔ میں تب چونکا، جب انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں نے وہ سارے سوال، جو کچھ دیر پہلے میرا اندر رکھا رہے تھے، ان کے سامنے اگل دیے اور قافلے کا سارا احوال بھی بیان کر دیا۔ میرے سوال ان کو سلطان بابا بہت دیر تک خاموش رہے، لیکن انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب کچھ جواب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولے تو ان کا لہجہ تھا ہوا سا تھا ”میں جانتا ہوں تم کس دور سے گزر رہے ہیں، ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہاتھ رستے اور مندر لیں صرف ہاتھ خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں، قدرت نے تمہارے لیے عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی راہ چنی ہے، تو ضرور تم میں ہاتھ خاص ہوگا، لیکن قسمر سلطانی کے گنبد کو چھوڑ کر مالے کی پوٹی پر ہمیرا کرنے کے لیے اپنی اڑان بھی اونچی رکھنی پڑتی ہے۔ جان ہو کم میں ڈانٹی ہی پڑتی ہے۔ یاد رہے، ابھی تمہیں ایسے عجز کی عذاب جھیلنے ہوں گے۔“ میں وردے چلا اٹھا ”لیکن میں ہی کیوں.....؟ وہ مسکرائے ”میں نے کہا نا..... کچھ چناؤ قدرت سے صرف اپنے ہاتھوں میں رکھتی ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چنا، اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے، لیکن فیصلہ تو اب بھی تمہارے اپنے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو ابھی اسی لمحے یہ سب کچھ ترک کر کے واپس پلٹ سکتے ہو۔ تم پر کوئی جبر نہیں۔ تم سے پہلے بھی جانے کتنے پلٹے ہوں گے۔ تم تو پھر بھی اس سفر میں بہت دور تک چلے آئے ہو، کئی ایسے بھی ہیں، جو قدرت کی طرف سے واضح اشارہ ملنے اور پہنچنے جانے کے باوجود پہلا قدم تک نہیں اٹھا سکے اور روزمرہ کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ تمہاری ہی ہمت تھی کہ تم اس راہ کا ہر کاٹنا چھتے ہوئے آج اس مقام تک آ پہنچے ہو۔ اتنا زور راہ بھی ایک زندگی کے لیے کافی ہے۔ جانا چاہو تو سلطان تمہیں خوشی سے رخصت کرے گا۔“ میں نے بے بسی سے سر ہٹا ”آپ جانتے ہیں، واپسی میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ ہی میری ایسی کوئی خواہش ہے، لیکن میں خود کو اس بوجھ سے ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اتنا ظرف نہیں ہے مجھ میں، جس کی توقع قدرت کے بیٹھی ہے۔“ انہوں نے میرا کاندھا دبا ”اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا۔ اسے آزمانے والے پر چھوڑ دو۔“ میں نے تھک کر ہتھیرا ڈال دیے ”لیکن یہ بھرے ہڈے قافلے کی صدا کیں، یہ کیا ماجرا تھا.....؟“ سلطان بابا نے گہرا سا سانس لیا ”صحرا کا اپنا فسون اور اپنا ہی جادو ہوتا ہے، البتہ ہو سکتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے واقعی کوئی قافلہ گزر رہا ہو، جب سے انسانی بستیاں بے تحاشا بڑھنے لگی ہیں، تو ایسے صحرا اور ویرانے ہی جنات اور دوسری مخلوقات کی آماج گاہ بنتی گئیں۔ ہماری بصارت کا پردہ کسی مادے سے روشنی کی لہر نکرانے کا محتاج ہے، لیکن اگر دوسری مخلوق کثیف نہ ہو، بلکہ لطیف ہو، یعنی ایسے مادے سے بنی ہو کہ جس کے اندر سے روشنی بنا کر اے گزر جائے، تو ہماری آنکھ کے پردے پر اس شے کی تصویر نہیں بن پائے گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا واسطہ بھی کسی ایسی ہی مخلوق کے قافلے سے پڑا تھا۔ عام حالات میں ہم انسانوں کی سماعت بھی ان کی آواز کی لہروں کو پکڑ نہیں سکتی، لیکن تم نے اگر ان کی دنیا کی آوازیں سنی ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ خاص اس لمحے قدرت نے تمہاری سماعت کا پردہ اتنا حساس کر دیا تھا کہ تم نے ان غیر مرئی صداؤں کو بھی سن لیا۔ دھیان رہے کہ یہ سارا معاملہ فریکوئنسی کا ہے۔ ہماری بصارت اور سماعت کی فریکوئنسی ان کی دنیا کی فریکوئنسی سے جدا ہے، لہذا ہم انہیں عام حالات میں دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ ہاں، الہت، کچھ خاص لوگ اس ارتعاش تک بھی پہنچ جاتے ہیں، جہاں ان کے لیے وہ خاص فریکوئنسی پکڑنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ جہانوں کا مالک تمہیں اپنے خاص بندوں میں ہمیشہ کے لیے شامل کر دے۔“ میں حیرت سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں بخلی سے لپکی ”اگر تصویر کا تعلق ہماری بصارت کے پردے پر روشنی کی لہر کے کسی کثیف مادے سے نکلنے ہی سے ہے، تو پھر اس کا مطلب ہے کہ سیکینہ کا وجود بھی اسی صحرا میں کہیں موجود ہے، کیوں کہ میں نے اس کی واضح تصویر دیکھی ہے، دھندلی، لیکن واضح انسانی خود خال کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ سیکینہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے.....؟“ ”ہاں..... ہو بھی سکتا ہے کہ یہ وہی سیکینہ ہو، لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو کہ ٹھیک اسی وقت تمہارے ساتھ سانول بھی تھا، جسے وہ دکھائی نہیں دی۔ خود میں بھی ریلوے اسٹیشن پر اس کی جھلک سے چوک گیا تھا۔ اگر اس سارے معاملے سے پھولوں والی وہ خاص چادر نکال دی جاتی، تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی عام صحرائی لڑکی کا بیولا ہو، جو صحرا میں بھٹک رہی ہے، لیکن اطمینان رکھو، جلد یا بدیر، تم اس بیولے کی حقیقت تک بھی پہنچ جاؤ گے۔ یاد رہے، ایک بار تم نے خود ہی ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلا میں ماضی کی آوازوں کی لہر زندہ رہ سکتی ہے، تو پھر ماضی کی تصویر کی جھلک کیوں نہیں ہو سکتا ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہو، وہ بھی اس حال کی نہیں، بلکہ ماضی کی کسی تصویر کی جھلک ہو۔ قدرت ہی نے تمہاری سماعت کی طرح تمہاری بصارت کے پردے کو بھی چند لمحوں کے لیے یہ طاقت عطا کی ہو کہ تم نے اس صحرا کے ماضی کی کوئی جھلک اس لڑکی کی تصویر کی صورت دیکھ لی ہو۔ یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں کہ اس قدر ت کے کارخانے میں، جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو ہوتا ہے.....“ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے اندر پلٹ گئے اور میں اپنی جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا وجود ایک ارتعاش سے کانپ رہا تھا اور کان سانس سانس گم رہے تھے۔ سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب تھے کہ مستقل دامن بچائے جاتے تھے۔

اچانک صحرائی جانب سے ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے سارے خیالات کے تار کھیر دیے۔ میں گھبرا کر پلٹا، چیخ دوسری مرتبہ بلند ہوئی۔ سامنے مزار کے صحن میں نماز پڑھتے سلطان بابا بھی سلام پھیر کر چوٹے توجھے جھکے سا لگا۔ مطلب یہ صرف میرا ہی واہمہ نہیں تھا، آواز سلطان بابا نے بھی سنی تھی۔ تیسری چیخ نے مجھے جگہ کا تعین کرنے کے بارے میں ہر شک سے آزاد کر دیا۔ آواز اسی جانب سے بلند ہو رہی تھی، جہاں سانول رات بھر بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ میں بے تحاشا اس جانب دوڑ پڑا۔ صحرائی ریت میں میرے پاؤں دھنسنے جا رہے تھے، دور سے میں نے اس اونچے ٹیلے پر فجر کے چھٹپٹے میں کسی عورت کا بیولا دیکھا، جو مسلسل نیچے کی طرف دیکھ کر چیخ رہی تھی اور اپنی صحرائی زبان میں کسی سے مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ ٹیلے کو دیکھتے ہی میری سانس رکنے لگی۔ یہ وہی ٹیلہ تھا، جہاں سانول گزشتہ رات بانسری بجا رہا تھا۔



اک فاک، برنو جوان کا قصہ..... جو خدا کو اپنی عہد رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

"عبداللہ" ملک کے معروف و منفرد ذرا رانا رائٹر، ناول نگار، ہاشم عظیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ "خندے سکرین" ہی میں چھپنے والے ناول "عبداللہ" کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم عظیم کے دو ناول "خدا اور محبت" اور "بچپن کا دبیر" بھی چھپنے کے بعد، ناول "عبداللہ" نے پرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سرجیکل کے مطابق "عبداللہ" دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ ناول میں ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر گھل اٹھا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا فاکر حسبِ حقائق انہی اسرار و رموز کے گرد گھومتا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متنازی دنیا کے سربستہ عہدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، "عبداللہ" ایک نئے آغاز، نئے تسلسل، کچھ نئے انداز، نئے سب ناسل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

کچھ لمحے کے لیے تو جیسے میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب تک میں دوڑ کر ٹیلیفون پہنچا، اس کی عمر کی چوہان کے ہاتھوں کے اشارے مجھے سمجھ میں آچکے تھے۔ نیلے کی پرلی چامب سانول بے سدھ پڑا تھا اور اس کے سر سے بہتا ہوا غول نہ جانے کب سے جم کر ریت کو سیراب کر رہا تھا۔ سلطان بابا بھی شاید میرے پیچھے ہی صحرائی جانب لپکے تھے، جس وقت میں سانول کی سائیس نزل رہا تھا، تب تک وہ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زندگی اگر صرف سانس لینے کا نام ہے، تو سانول ابھی زندہ تھا، لیکن اس کی سانس اٹھ رہی تھیں۔ جب میں اور سلطان بابا اسے لے کر سستی پہنچے تو سب سے پہلے سستی کے مضامعات میں مگن ہو گئے، اس صحرائی گوالے کی نظر ہم پر ہی پڑی، جسے میں پہلے بھی کچھ کے مقابلے کے دوران جبروت کے قلعے میں دیکھ چکا تھا اور پھر چند لمحوں ہی میں پورا کال گزرا سانول کے کچے آگن میں جمع ہو چکا تھا۔ سستی کے واحد طبیب نے فوراً ہی سانول کا زخم دھو کر مرہم پٹی تو کر دی اور کچھ دوا بھی اس کے قلعے سے نیچے انڈیل دیں، لیکن فی الحال سانول بے ہوش ہی تھا۔ بڑی مشکل سے سانول کے باپ، مجید مسزئی اور طبیب کی درخواست پر لوگوں کا ہتھکھچا چٹا۔ سانول کو ہم نے آگن سے اندر کمرے میں پہنچایا ہی تھا کہ اکرام اللہ صاحب اور ان کے پیچھے نوری کا باپ بڑے آئے ہوئے سے سانول کے گھر داخل ہوئے۔ وہی چند روایتی سوال "کیا ہوا..... کیسے ہوا.....؟ کس نے کیا.....؟" اور وہی ایک جواب کہ "اللہ جانے.....؟" کچھ ہی دیر میں نوری بھی چند دوسری عورتوں اور اپنی ماں سمیت صحن میں داخل ہوئی اور ٹھہری سے عورتوں والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ چوستانی میں وہ سانول کے باپ کو سلام کرنا بھی بھول گئی تھی اور پھر برآمدے کے قریب ماں کے کنبی مارنے پر چونکی تو جلدی سے صحن میں بیٹھے مجید کو سلام کر کے اندر چلی گئی۔ کچھ ہے کہ محبت آداب بھلا دیتی ہے۔ طبیب اپنا کام کر کے جا چکا تھا اور اس کے بٹول اب سانول کو دوا کے ساتھ دھانکی بھی اتنی ہی ضرورت تھی۔ سانول کی دوا تو نوری تھی اور نوری خود سراپا دہانی، اسی کے گھر کے آگن میں مالتا جینگے بندھے میں پڑی تھی۔ پھر بھی قدرت کو بڑھم آتے آتے تین راتیں بیت گئیں۔ سانول کی طویل بے ہوشی تیسری فجر سے کچھ پہلے ٹوٹی، اسی اثناء میں، میں اور سلطان بابا باری باری مزار سے ہو کر آتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے میں ہی سانول کے سر ہانے موجود تھا، جب اس نے دھیرے دھیرے کراہنے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ نوری کی دعا آخر کار غلک میں چھید کرتی ہوئی مقام قبولیت سے جا نگرانی تھی۔ سانول کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اس رات بھی حسبِ معمول اچی ٹھوس جگہ پر بیٹھا یا ٹھہری کی کانوں سے کھیل رہا تھا کہ اچانک ہی اندر گھر سے چار نقاب پوش ماٹے اس کی چامب لپکے اور پھر بھیچا تانی کے دوران کوئی کدو لادی پنڈر اس کے سر سے ٹکرائی، جس کے بعد سانول اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ ان نقاب پوشوں کی ٹکرائی کے بعد صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانول کو کال گزرا میں مزید ایک لمحہ بھی بروا شت کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہر حال، اس وقت تو سانول کا ہوش میں آ جانا ہی اس کے پیاروں کے لیے نصیب تھا۔ سانول کی دیگر گوں حالت اس بات کا اشارہ تھی کہ اسے فی الحال بستر سے اٹھنے میں چند دن مزید لگیں گے، لیکن میں جانتا تھا کہ سانول زیادہ دیر تک خود کو پا بند نہیں رکھ پائے گا۔ شام کو باپ میں مزار واپسی کے لیے اٹھنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ دھا کر مجھے کچھ دیر مزید رکھنے کا اشارہ کیا۔ عبادت کے لیے آئے ہوئے چند روایتی پک کمرے سے باہر نکل گئے تو اس نے دھیرے دھیرے سے پوچھا "وہ آئی تھی.....؟" مجھے اس کی حالت سے زیادہ اس کے سوال پر ہنسی آگئی "کہیں اسے ہوائے کے لیے خود ہی تو اپنا سر نہیں پھوڑا؟" میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا "اسے بلوانے کے لیے تو یہ سر کاٹھنوں سے اتار کر نیچے بھی رکھ سکتا ہوں۔" پھر اس نے صحرائی زبان میں ایک مصرع پڑھا۔ میں نے سوا لپہ نظروں سے سانول کی طرف دیکھا، تو اس نے لمبی سی آہ بھرتے ہوئے مجھے ترجمہ دیا کہ "عاشق چاہے ہیسا بھی درد اٹھالے..... کتنی ہی گہری چوٹ کیوں نہ کھالے، دنیا والے اس کے دھنوں کو ایک ڈھونج ہی سمجھتے ہیں، لیکن پھر بھی عاشق جسم پر زخموں کے داغ سجاتا ہی رہتا ہے، تاکہ جب کبھی محبوب سے ملاقات ہو، تو وہ اس سے داد پا سکے۔" میں حیرت سے سانول کی زبانی اس صحرائی قطعے کا ترجمہ سن رہا۔ کچھ ہزیریں اس پوری کاکات میں کس قدر، یکساں ہوتی ہیں۔ وہاں پانی، دھوپ، بارش اور یہ محبت کا پتہ..... صرف لفظ اور لہجہ ہی بدلتا ہے۔ باقی ہر کتبہ ایک ہی ہی رہتی ہے۔ کاکات کے ہر ذرے کی طرح محبت بھی شاید وحدت ہی کی قائل ہوتی ہے۔ درد، تڑپ، رنجش اور تنک کی وحدت۔ روح کو آری سے دھنوں میں چیر دینے کی یکسانیت، قطرہ قطرہ کر کے جان نکالنے کی مماثلت۔ جانے ہم نے دنیا کی ہر اہل اور درد دینے والی پنڈروں کے اتنے مختلف نام کیوں رکھ ڈالے ہیں۔ ہم ایسی سب ہی اذیتوں کا ایک ہی نام "محبت" کیوں نہیں رکھ دیتے؟ سانول بھی اس وقت اپنے سر کے زخم اور کھائل وجود کے درد سے زیادہ، عشق کے زہریلے ڈنک کے اثر سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں نوری کی منت ہی کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنی ماں سمیت کسی نہ کسی بہانے سے سانول کے کمرے کے آس پاس ہی بیٹھ رہی ہے۔ اگرچہ مردوں کی موجودگی کے جب وہ سانول کے پاس تو نہیں آسکی، لیکن میں نے ہر لمحہ اس کی بے چین آنکھوں اور بے تاب روح کو سانول کے سر ہانے

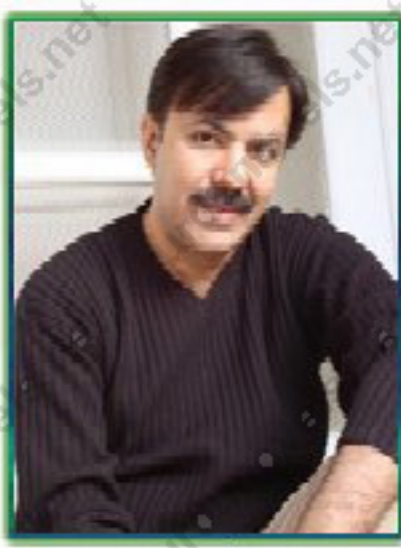
ہی موجود رہا۔ شاید اب بھی نہیں قریب کسی دیوار سے پرے۔ اپنے من کے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے جیتی ہو۔ سانول دم بخود سامیری بات سنتا رہا۔ اس کا محبوب اس قدر قریب موجود تھا، یہ سن کر اس کی حالت مزید بھائی سی ہو گئی۔ دیواروں سے پار جھانکنے کی اتنی شدید خواہش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی آنکھوں سے جھلکتی نہیں دیکھی تھی، لیکن دیوار کا تو دوسرا نام ہی رکاوٹ، پابندی ہے اور ہم انسان خود ہی تو ایسی کئی دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں۔ اپنے لیے اپنے ہندوں کے لیے۔۔۔۔۔

سانول کے گھر سے مزار کی جانب لوٹتے ہوئے جانے کیوں مجھے سیکڑے کو اٹھالے جانے والے چار نقاب پوش یاد آتے رہے۔ ان میں اور سانول پر حملہ کرنے والے نقاب پوشوں میں کوئی ایسی مماثلت تھی، جو میرے ذہن کی کھڑی بلاتی رہی۔ کہیں وہ سانول کو بھی سیکڑے کے حائلے میں میری رہنمائی کرنے کی سزا دینے تو نہیں آئے تھے۔ یہ کیسا معما تھا، جو سمجھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ مزار کے صحن میں سلطان باپا تہج پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد فراغت پائی تو کہنے لگے ”تمہارا دوست آیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اسے روٹی ڈال دی تھی، لیکن شاید اسے تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔“ وہ شاید کابلے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سانول پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو بولے ”ہاں۔۔۔۔۔ ایسا ممکن ہے۔۔۔۔۔ سانول کو کبھی اب احتیاط کرنی چاہیے۔ نقد پر شاید پھر بھی ایک موقع اور دے دیتی ہے، لیکن سپادشمن کبھی نہیں۔“ میں نے اس عجیب اصطلاح پر انہیں حیرت سے دیکھا ”کیا دشمنی بھی خالص اور ناخالص کے پیمانے پر تولی جاتی ہے۔ کیا دشمن بھی کبھی سچا یا بھوٹا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے دوسری تہج ختم کر کے بھ پھونک ماری ”سچائی اور خالص پن کی جتنی ضرورت دشمنی کے جذبے میں ہوتی ہے، اتنی تو شاید دوستی میں بھی نہ ہوتی ہو۔ دشمن خالص اور معیاری نہ ہونے اعلیٰ ظرف و حریف کے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم منگول نسل کے کچھ لوگ شاید آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، جو دشمنی اور انتقام کو ایک اعلیٰ جذبہ سمجھتے ہیں اور دشمن ان کے لیے جینے اور آگے بڑھنے کی تحریک کا باعث ہوتا ہے، اسی لیے ان کا ایک قول ان میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔“ سلطان باپا کسی آہٹ کی آواز سن کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پیپ ہو کر باہر صحران کی جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے کروات ہولی ”کون سا قول۔۔۔۔۔؟“ سلطان باپا نے غور سے میری جانب دیکھا اور قول دہرایا ”دشمن زندہ رہے۔۔۔۔۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں پوچھی سناکت سا بیٹھارہ کیا۔ برآمدے کے قریب رک کر وہ میری جانب پلٹے ”لیکن یاد رہے۔۔۔۔۔ یہاں اس بستی میں ہمارا واسطہ شاید کسی اعلیٰ ظرف و دشمن سے نہ پڑے، لہذا اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔“ سلطان باپا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور میں بیٹھ کی طرح ان کے الفاظ کی بحول جھلیوں میں کھوکھو رہ گیا۔ میں آج تک محبت ہی کو طاقت ور ترین انسانی جذبہ میں شمار کرتا تھا، لیکن آج میرے اندر کئی دروازے مزید کھل گئے تھے۔ واقعی، کتنی بڑی بات کہہ گئے تھے، سلطان باپا، دشمن زندہ رہے۔ جانے یہ قول دعا تھا یا بدعا۔ حسرت تھی یا نفرت کی انتہا۔ میں ساری رات کابلے کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہاں نہیں ملتا۔ صبح کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تو بھی نیند میں بے چینی تھی۔ بیٹھ کی طرح کسی ان ہونی کا خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ صبح نہ جانے سلطان باپا کو کیا سوچھی کہ خود ہی بول پڑے۔ ”چلو میاں! تمہارے دوست کی عیادت کرا آئیں۔ اسی بہانے وہاں اکرام صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ زیادہ تر سلطان باپا کی سبکی کوشش ہوتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک بد وقت حراز پر موجود رہے اور ویسے بھی وہ زیادہ تر بستی کی جانب جانے سے گریز ہی کیا کرتے تھے، لیکن آج نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ انہوں نے خود ہی سانول کے گھر چلنے کی فرمائش کر دی۔

ہم سانول کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو کافی بھیر تھی۔ چ چلا کہ سانول کے باپ نے ان کے ہوش میں آنے کی خوشی میں شکرانے کے طور پر نماز مانگنے کا ارادہ کیا ہے اور اسی لیے بستی کے سب ہی مرد وہاں پہلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ”بڑے اور چھوٹے ہر صاحب“ کو بیک وقت اپنے درمیان پایا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ کال گزرتی ہی واحد جامع مسجد کے مولوی صاحب بھی کچھ دیر میں آ پہنچے۔ نیاز کے چاچا ابھی دم پر تھے اور بٹنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بستی کے چند بزرگوں میں کال گزرتی ہی کے سہ انکے کال اور سوکھے کی بات چل پڑی۔ کسی جانب سے ایک بوڑھے نے تشویش زدہ انداز میں سب کی توجہ اس جانب والی کہ بستی کے آس پاس قریبی جو بڑا اور تالا بے تین سال پہلے ہی قفل ہو چکا تھا، لیکن اب وہ دروازے کے پانی کے ذخیرے بھی و حیرے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر چند ایک دن میں علاقے میں بارش نہ ہوئی، تو کال گزرتی میں چھپنے کے پانی کا شدید بحران پیدا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر حافل میں کچھ دیر کے لیے ہٹاٹا سا چھا گیا اور پھر سب ہی اپنی اپنی ہولیاں ہولنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قاعدہ داروں کی منہ کر کے ان سے مزید کچھ قرض لیا جائے اور ایک آخری کوشش کے طور پر شرعی سمے، وہاں پانی پلنے کی کچھ امید ہے، وہاں پھر سے کنواں کھود کر پانی تلاش کیا جائے، لیکن اکثریت نے اس منظورے کو یکسر رد کر دیا کہ ایسی بات کوششیں پہلے ہی ناکام ہو چکی ہیں اور قرض کا بوجھ پہلے ہی اتنا بڑھ چکا ہے کہ مزید ایسی کوئی بھی حاصل، صرف وقت کے ذریعے ہی کا باعث ہوگی۔ اچانک کوئی کئی کونے سے ہوا ”تو پھر بڑے پھر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بارش کی دعا کریں۔۔۔۔۔ اب اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ سب ہی جانب سے سلطان باپا کے سامنے فریاد پیش کی جانے لگی۔ ایک شور مچا دیا۔ مولوی صاحب نے بھی بارش کے لیے دعا کی درخواست دائر کر دی۔ سلطان باپا نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا اور دھیمے لہجے میں بولے ”اگر آپ سب کا یہی مشورہ ہے، تو پھر دعا بھی، ہم سب اجتماعی طور پر ہی کریں گے۔ آج عصر کی نماز کے بعد بڑے میدان میں پوری اعلیٰ کے مرد نماز استسقاء کے لیے جمع ہو جائیں۔ ہم سب پیش امام صاحب کی معیت میں ہا دعا صحت نماز ادا کر کے اللہ کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے۔“ سلطان باپا کی بات سن کر نوجوان طبقے نے تو زور و شور سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن بزرگ کچھ خاموش ہی رہے۔ میں نے پاس بیٹھے اکرام صاحب سے آہستہ سے اس خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواہر میرے کان میں جو مرگوشی کی، اس سے میں صرف اتنا ہی مطلب اخذ کر سکا کہ جبروت کے علم میں لائے بنا بستی کے باہر ایسا کوئی بھی عوامی ہنگامہ، اس کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہے، لہذا بزرگ یہی چاہتے ہوں گے کہ قلعہ داروں کو بھی باقاعدہ دعا میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ تب تک سلطان باپا مجھے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کر چکے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بستی کے تمام مرد عصر کے وقت باہر والے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں گے۔ ہم محفل کو کھینچوں کی طرح جھپٹاتے اور آئیں میں مرگوشیاں کرتے چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے، جانے ان میں سے کوئی بعد میں جبروت سے باقاعدہ اجازت لینے یا دعا میں شرکت کرنے کی درخواست لے کر قلعہ کی جانب گیا یا نہیں۔ ہم بہر حال، عصر سے کچھ پہلے بستی کے مضافاتی میدان میں پہنچے تو دعا کے لیے اچھے خاص لوگ موجود تھے۔ دیکھے اسی دن راستے میں سلطان باپا نے بارش کے لیے خصوصی طور پر مانگی جانے والی دعا اور نماز استسقاء کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ شاید یہی وہ واحد اور منفرد انتہا ہے، جو سیدھی جنتیوں کے بہانے ہاتھ کی پشت آسمان کی جانب بلند کر کے دعا کی صورت میں کی جاتی ہے۔ میرے لیے ایک بالکل نئی بات تھی۔ پہلی کے لوگوں، بشمول امام مسجد نے سلطان باپا سے کئی بار درخواست کی کہ وہ دعا صحت کی امامت کریں، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ بستی کی جامع مسجد کے امام کا حق ہے۔ بالآخر امام صاحب ہی امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد سب نے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر کے دعا مانگی اور مولوی صاحب نے اپنی چادر پلٹ دی۔ دعا کے بعد نماز رخصت ہونے لگے تب اچانک میری نظر بے سادگ و صوب کا قبر پر مارتے آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ سورج اب بھی اپنی اسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دور دور تک کسی بدلی تو کیا، کسی مٹی یا ریت کے ٹکڑے کے آج بھی نمایاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سلطان باپا کے چہرے پر کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن وہاں

حسب معمول صرف سکون کا ذریعہ تھا۔ وہ تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر اور لا پرواہ ہو گئے تھے، جیسے خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سالپکا، کہیں یہ اہل یقین ہی تو کسی دعا کی قبولیت کا اصل کلیہ نہیں۔ کہیں ہماری دعائیں اسی لیے تو رد نہیں ہو جاتیں کہ ہم اندر سے بے یقین اور بدول ہوتے ہیں۔ ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں، خود اسی کی سخاوت اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے، تو پھر دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا۔ یہ تو اعتبار اور توکل کا سودا ہے، اور سچ ہی تو ہے کہ انسان ہی سدا کا خسارے میں ہے۔

رات کو بھی کئی بار میں نے اٹھ کر آسمان کو دیکھا، میرے اندر کا تول مول کرنے والا سوداگر، آج بھی یقین اور بے یقینی کے پلڑے دلیل اور جواز کے پتھروں سے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب جب مجھے پہلی چھپکی آئی، تب تک آسمان بالکل صاف تھا۔ ایمان اور بے یقینی کی جنگ میں سوداگر کے شک کی جیت ہوئی اور میں تھک کر سو گیا، لیکن صبح بہت سے بچوں کے شور سے میری آنکھ اچانک کھلی، تو پہلی نظر سیدھی آسمان پر پڑی۔ پورا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کے تمام بچے کاغذ اور پلاسٹک کی پتلیں، لمبی لمبی ڈوروں سے باندھے صحرا میں چلتی تیز ہوا کے دوش پر اڑائے پھر رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، صحرا میں بادل..... کتنا عجیب، تضاد آمیز، لیکن خوش گوار تجربہ تھا۔ سلطان بابا بھی صحن میں نکل آئے۔ میں نے ان سے پوچھ ہی لیا ”آپ کو اس قدر یقین کیسے تھا۔ مجھے تو جوفت میری دسترس میں، میرے سامنے موجود ہوتی ہے، اس کے پانے کا بھی کامل یقین نہیں ہوتا، ورنہ آپ ایک ایک ان ہونی پر بھی اس قدر اعتبار کیسے جمع کیے رکھتے ہیں۔“ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا ”سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں..... اور یقین جانو کہ تم اس کامل یقین کے بہت آس پاس ہو۔ بس، ثابت قدمی ہی آخری شرط ہے۔“ سلطان بابا کی بات ختم ہوتے ہی پہلی بوند نے میری پیشانی چوم کر سلامی دی اور پھر تو چند ہی لمحوں میں وہ جل تھل ہوئی کہ کال گڑھ کی برسوں سے پیاسی اور سوکھی زمین کے ساتھ ساتھ میرا اندر بھی پوری طرح جل گیا۔ کچھ بارشیں ہمارے اندر بھی تو برتی ہیں۔ کال گڑھ کے لوگوں کو خوشی سے چلاتے اور اچھلتے کودتے دیکھ کر میرے من میں بھی بوندوں کا جلتنگ بجنے لگا۔ کال گڑھ کی بارش صرف بیس منٹ کے لیے تھی، لیکن میرے اندر کا ساون بہت دیر تک برستا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بستی کے تمام لوگ مزار کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سلطان بابا کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے آئے تھے کہ ان کی دعا سے کال گڑھ کے نصیب کی بدلی آج کھل کر بری تھی، لیکن سلطان بابا نے مسکراتے ہوئے بات انہیں پر الٹ دی ”میں نے تو اللہ سے صرف اتنی دعا کی تھی کہ کال گڑھ میں جو بھی تجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، اس کے صدقے بارش بھیج دے۔ اب تو یہ تم ہی سب مل کر کھو جو کہ تم میں سے اللہ کا وہ سب سے پیارا کون ہے؟“ یہاں بستی میں سب ہی کے من کی کلی کھل رہی تھی، مگر کوئی ایسا بھی تھا، جو قدرت کو اپنی سلطنت میں دخل اندازی کرتے دیکھ کر تملہا رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اسی روز احساس ہو گیا تھا کہ جبروت کبھی سلطان بابا کے لیے لوگوں کی آنکھوں کی یہ محبت و عقیدت برداشت نہیں کر پائے گا اور اسی خدشے کا اظہار اسی شام سانول نے بھی کر دیا۔ جب میں اس سے ملنے اس کے گھر پہنچا، تو مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا، گھر میں چہل پہل بھی کم تھی۔ سانول نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سر ہانے بٹھالیا۔ اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور زخم بھی بھر رہا تھا، لیکن اس کے باپ نے اسے اپنی قسم دے رکھی تھی کہ اب وہ تنہا صحرا میں بانسری بجانے کبھی نہیں جائے گا۔ سانول اس بات پر بھی کافی جھنجھلایا ہوا تھا، لیکن فی الحال اس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جس دن سے اس پر حملہ ہوا ہے، بستی کا بوڑھا کھوجی بھی اپنے گھر سے غائب ہے۔ اس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا ہے اور بستی میں کوئی نہیں جانتا کہ کھوجی کہاں چلا گیا ہے۔ میں بھی چونکا، تب ہی وہ بوڑھا اتنے دنوں سے مجھے بھی دکھائی نہیں دیا تھا، نہ ہی وہ سانول کی مزاج پر سی کے لیے اس کے گھر آیا تھا۔ مطلب، میرا شک ٹھیک تھا کہ ان نقاب پوشوں کا تعلق ضرور سیکنہ کے اغوا سے بھی رہا ہوگا۔ سانول نے میرے خدشات دو چند کر دیے تھے، لیکن میں اسے اپنی پریشانی بتا کر مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھنٹہ بھر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد اٹھنے لگا، تو سانول نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جاؤں۔ آج نوری کے گھر سے اس کے لیے خاص طور پر گڑ کے چاول بن کر آئے تھے۔ میں نے مسکرا کر اسے چھیڑا کہ تب ہی آج وہ باتیں بھی گڑ کے شیرے جیسی میٹھی کر رہا ہے۔ ہائے یہ جذبہ..... پل میں ہمیں کتنا کڑوا اور دوسرے پل ہی کتنا شیریں کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی الٹ پلٹ بچاتے ہیں ہمارے اندر کہ ہم خود اپنا اصل بھی بھول جاتے ہیں۔ میں بھی سانول کی آنکھوں سے پھوٹی محبت کی وہ میٹھی آنچ پورے کمرے میں پھیلتی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ سانول کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سلطان بابا مزار پر میرا انتظار کرتے ہوں گے، لہذا میں کل پھر آؤں گا اور نوری کے گھر سے آئے گڑ کے چاول بھی ضرور کھاؤں گا۔ میں سانول کے کمرے سے باہر نکلا، تو چند عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے، گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سانول کی ماں بھی تھی۔ میں سر جھکا سلام کر کے آگے بڑھنے لگا، تو سانول کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ”شالا چھوٹا پیر بیوے.....“ کائنات کی ساری مائیں شاید ایک ہی مٹی سے گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنسوؤں، دعاؤں اور خدمت کی مٹی سے..... مجھے ممایا دا آگئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ میرے عقب سے ایک سہمی اور ڈری ہوئی سی نازک سی آواز ابھری۔ ”چھوٹے پیر جی.....!!“ میں ٹھٹھک کر پلٹا اور حیرت سے برآمدے کے ستون کی آڑھ میں نوری کو اپنا سراپا سیٹھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بھی علاقے کی ریت کے مطابق لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا اور میں اس کے وجود کی لرزش اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتا تھا۔ باقی عورتیں اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں۔ اور اس وقت صرف ہم دونوں ہی صحن میں موجود تھے۔ اس نے مجھے روک تو لیا تھا، پر خود اس کا بس چلتا تو اگلے لمحے ہی وہاں سے ہوا ہو جاتی۔ میں نے ہلکے سے کھٹک کر اسے متوجہ کیا، وہ ہڑبڑائی گئی ”وہ جی..... چھوٹے پیر جی.....“ آپ اس سے کہیں ناک وہ شہر چلا جائے۔ یہاں اس کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ آپ کہو گے تو نہ نہیں کرے گا۔ بہت سنتا ہے آپ کی۔“ مجھے نوری کی تشویش کا اندازہ تھا ”آپ اطمینان رکھیں، میں سانول سے بات کروں گا۔“ میں بات ختم کر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ عورت کا دامن کچھ یوں بھی سدا ہی سے کورا ہوتا ہے، لیکن ان علاقوں میں تو زور سے چلتی ہوا بھی اسے داغ دار کر دیتی ہے۔ وہ معصوم لڑکی سانول کی محبت میں شاید چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی، لیکن مجھے ریت اور رواج کی حدیں یاد تھیں۔ ساری بستی ہی کو چند دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سانول کی مجھ سے گاڑھی چھنتی ہے اور وہ ضدی لڑکا، میری بات کا بہت مان رکھتا ہے۔ یہ اسی مان کا بھروسہ تھا، جس نے نوری کو آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ سانول سے کہوں کہ کچھ عرصے کے لیے یہاں سے دور چلا جائے۔ دشمن اگر ان جانا ہو تو وہ دہرا خطرناک ہو جاتا ہے اور ہمیں اس وقت ایسے ہی کسی چھپے ہوئے دشمن کا سامنا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم صحرا کے اونچے نیچے ٹیلے پار کرتا ہوا مزار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے داہنی طرف کے ٹیلے کے پیچھے سے چند غرائیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ غراہٹ بھی رک گئی۔ میں نے کالے کو آواز لگائی، لیکن کالا ہوتا، تو ایسے چپتا ہی کیوں۔ میں نے پھر قدم بڑھائے ہی تھے کہ ٹیلے کے پیچھے سے دو خوف ناک قسم کے کتے ایک دم ہی میرے سامنے آ گئے۔ یہ جبروت کے کتوں کے ٹولے میں سے تو نہیں تھے، لیکن ان کے تیور بھی اس وقت کچھ ویسے ہی تھے۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ بچپن سے میرے اندر چھپا کتوں کا خوف ایک دم ہی میرے پورے وجود پر طاری ہو گیا ہے اور میں ٹھیک اسی طرح اپنی جگہ جمند ہو گیا، جیسے بچپن میں کسی کتے کے غرانے پر اپنے پیروں سے جان نکل جانے پر ہو جاتا تھا۔ کتوں نے زقند بھرنے کے لیے اپنے جسم کو تولا، میری رنگوں میں بے گرم خون نے پل بھری میں میرے سر سے لے کر میرے پاؤں کے تلوؤں تک کا دورانیہ طے کر لیا اور تب اچانک ہی کسی طرف سے کالا دوڑتا ہوا آیا اور میرے پیروں کے قریب آ کر لوٹنے لگا۔ میں ابھی تک ساکت ہی کھڑا تھا۔ کالے کو یوں میرے پاس فلا بازیاں کھاتے دیکھ کر دوسرے دو کتوں کے تنے جڑے بھی کچھ ڈھیلے ہو گئے۔ شاید کالے نے صحرا میں بھی اپنا گروہ بنالیا تھا اور باقی دو بھی اسی کے ساتھی تھے۔ میں نے ایک گہری سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا، جانے یہ جانور آپس میں کون سی بولی بولتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ ان کے لفظ کیسے ہوتے ہوں گے۔ ابھی ابھی کالے نے میری جان کے دشمن بنے ان دو خوف ناک کتوں کو یہ کیسے سمجھایا ہوگا کہ یہ تو میرا دوست ہے..... تم بھی اسے کچھ نہ کہنا اور کتنی جلدی وہ کالے کی بات مان بھی گئے، ہم انسانوں کی طرح کسی کج بحثی یا کھرا میں پڑے بنا، انہوں نے کیسے اپنے دوست کی بات مان لی، شاید اس دور کے انسانوں کو بہت سی باتیں ان جانوروں سے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سالپکا، کہیں یہ لفظ صرف ہم انسانوں ہی کی مجبوری تو نہیں ہوتے۔ رابطے کے کئی اور ذرائع بھی تو ہوتے ہوں گے، جیسے ان جانوروں کا آپس میں رابطہ، اور پھر وہ رابطہ، وہ جذبہ اور وہ پیام ہی کیا، جسے لفظوں کی یا زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہو؟ بات تو تب ہے، جب بنا کچھ کہے ہی وہ ہمدم، سب جان لے۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالے کا اپنے ساتھیوں کو بھیجا گیا، وہ خاموش پیام تھا۔ شاید یہ لفظ ہم کم نظروں ہی کی پہچان ہوتے ہیں۔ انہی خیالوں میں گم میں مزار کے سامنے والا بڑا ٹیلہ طے کر کے جیسے ہی نیچے اتر تو میرے پاؤں جیسے ریت میں گڑ کر رہ گئے۔ مزار کے باہر جبروت کی جیب کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے جبروت یہاں کیا لینے آیا تھا۔..... (باقی آئندہ)



.....ہاشم ندیم.....

”عبداللہ“ ٹکٹ کے معروف و منفرد ذرا با راسخ ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ٹی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا ممبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پڑوسی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے محاذی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، حقیقی حقیقی کی نئی نئی مغزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب ساقی انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر وہ راز کھلتے نہیں۔ اسی منہ آزی، نیا کے سر بستہ جیہ اں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑا ہے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، پکے مختلف انداز، نئے سب فائنل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ آئی ٹیل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی خطاب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

مجھے جہروت کی جیب مزار کے باہر کھڑی دیکھ کر جو پہلا جھٹکا لگا تھا، میں اسی کے زیر اثر تقریباً دوڑتے ہوئے مزار کے پیر وئی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے جہروت کا خاص کارندہ، اکرم لیے لیے قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکلا اور مجھ پر ایک لگاؤ غلط ڈالنا ہوا، جیب میں سوار ہو گیا، جہاں ڈرائیور سمیت ایک دوسرا محافظ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جیب آگے بڑھ گئی۔ سلطان بابا محسن ہی میں اپنی خصوصیات پر بیٹھے بیٹھے کھمارے تھے۔ میں پھولی ہوئی مانیس لیے ان کی جانب بوجھا۔ یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟ ”دوسرا کون آئے تھے..... لیکن ڈھکے چھپے گفتگوں میں.....“ میں مزید الجھ گیا ”پارمی بات بتائیں.....؟“ سلطان بابا انھیں کھڑے ہوئے ”جہروت کا پیغام لائے تھے کہ یہاں اس کا مکہ چلتا ہے، لہذا آئندہ کوئی بھی اجتماع کرنے سے پہلے اس سے اجازت ضرور لے لی جائے۔“ میں نے تشویش بھری نظروں سے سلطان بابا کی جانب دیکھا، گویا میرے خدشات ایک ایک کر کے جگ نما ہوتے ہوئے تھے ”تو آپ نے کیا جواب دیا.....؟“ وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارا تو گزرا ہی جا چکا ہے۔ ”گو یا انہیں سانول کا مجھ سے مانا بلانا بھی پند نہیں تھا۔ سلطان بابا کے لیے سے نکاہر اور ہاتھ کا طبل جگ بیچ چکا ہے اور اب جلد یا بدیر ہماری جہروت سے حقیقی ملاقات ہونے والی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سلطان بابا کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے، لیکن میری قسمت میں آرام کہاں..... پھر وہی رات، وہی بے خوابی، وہی مہری ہلک راتوں کی محفل اور وہی مہرے ساتھی تارے..... نکلتے ہیں، پرانے زمانوں میں کا من اور جادوگر ان تاروں کی چال سے حال اور مستقبل کی کروت کا اندازہ لگا کر رہتے تھے۔ میں بھی بہت دیر تک ان شرارتی تاروں میں اپنے مقدر کا گارنا کھو ہوتا رہا، لیکن وہ مجھے کیسے دکھائی دیتا، جو گردش میں سدا رہتے ہوں، انہیں تو لکھ ہی اپنے دامن میں جکھ نہیں دیتا۔ ایسے ستاروں کا آسمان بھی شاید کوئی دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔

اگلے روز میں مزار سے باہر سانول کی زور زور سے باتوں کی آواز سے چٹکا جلدی سے اٹھ کر مزار کی منڈیر سے باہر بھاگتا تو سانول اپنے باپ کے ساتھ لڑتا جھگڑتا اور بیٹھ کر تازہ مزار کی جانب بوجھا چلا آ رہا تھا۔ اس کے باپ نے محسن میں داخل ہوئے ہی سلطان بابا کو سلام کے بعد اپنا دکھڑا مانا شروع کر دیا کہ ”وہ اپنے لڑکے کے ہاتھوں بے حد پریشان ہے۔ ابھی کل ہی اس کی حالت کچھ نہ خلی ہے اور آج ہی سے اس نے دوبارہ گھر سے نکلنے کی ضد شروع کر دی ہے۔ اب بڑے جی رہی ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ اپنے بوڑھے باپ کو اس عمر میں چون اوار نہ کرے اور اس کی بات مان کر شہر چلا جائے۔“ سانول نے اپنے باپ کو سلطان بابا کے سامنے فریاد سناتے چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مزار کی منڈیر کی طرف چلا آیا۔ میں نے سب سے پہلے اسے جہروت کے رات والے پیغام کی روداد سنائی، رفت میں کروہ مزید پریشان ہو گیا۔ ”ادو..... یہ تو بہت فکر کی بات ہے، پھر بڑے جی صاحب نے انہیں کیا جواب دیا.....؟“ وہی جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ سلطان بابا جس مصلحت سے کال گڑھ آئے ہیں۔ اسے پورا نیچہ بنا دو یہاں سے کوچ نہیں کریں گے۔“ سانول نے وہی سوال کیا ”لیکن اپنا کیا مقصد ہے ان کا۔ اس ویران اقی میں ان درندوں سے دشمنی مولنے کے کیا طے گا انہیں؟“ میں نے کبھی ہی سانس لی۔ ”یہ تو وہی جانیں۔ ویسے بھی میں ان سے زیادہ سوال نہیں کرتا۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف ان ہی کو دے رکھا ہے میں نے، لیکن تم اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ وہ سب تمہاری بھلائی کے لیے ہی تو کہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ اسی میں تمہارے اپنوں کی خوشی ہے۔“

سانول نے ٹھک کر سر پٹا ”تم جانتے ہو، میں ایک پل کے لیے بھی اس سے دوڑ نہیں جاسکتا۔ اس کے بنا تو میری بالسرری سے بھی سر نہیں اٹکتا“ اور اگر تمہاری دھن اور تمہارے من کی تان بھی تم سے یہی الجھا کرے تب.....؟“ سانول نے چونک کر میری جانب دیکھا ”کیا مطلب.....؟“ میں نے گزشتہ شام نوری سے ہوئی ساری بات بتادی۔ سانول مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دل کیر بھی ہو گیا۔ ”وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ میں جی جی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ وہ جس کے لیے میں سارے زمانے سے لڑتا پھرتا ہوں۔ وہ بھی زمانے کے ساتھ مل گئی ہے.....“ میں نے سانول کو ڈانٹا ”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ وہ تم سے شہر بہت کرتی ہے، جب ہی تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہے۔ اب اور خند نہ کرو۔ اور پھر تم خود بھی تو یہاں قلعہ داروں کی غلامی سے چڑتے ہو، تو پھر اپنی نوری کو پانے کے لیے یہ عارضی جدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔ سوچنا وہ بھی تمہاری جدائی میں اتنی ہی پریشان ہوگی جتنا تم، لیکن وہ بے چاری تو لڑکی ہونے کی وجہ سے گئی سے اپنا درد بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم ہی سمجھا اس کو۔“ سانول نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ آخر کار کھلیے بھری بڑھ کے بعد اس نے ہتھیرا ڈال دیے اور میں اس کا ہاتھ پکڑے، اس کے باپ کے پاس چلا آیا۔ ”آپ کو مبارک ہو، سانول نے شہر جانے کی ہامی بھری ہے۔“ سانول کے باپ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ پہاڑ اتنی آسانی سے غر ہو گیا ہے۔ اس نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ سلطان بابا منکرائے ”خیر ان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے عبداللہ میاں ایسے کرشمے دکھاتے رہتے ہیں۔“ ”بھئی میں تو کہتا ہوں کہ اس کا نام عبداللہ کی جگہ ساحر ہونا چاہیے تھا۔ لگتا ہے تمہارے بیٹے پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔“ سلطان بابا کی اس شرارت پر ابھ صحت سانول اور اس کا باپ بھی منکرا دیے۔ مزار سے لگتے ہوئے

سانول نے دیر سے میرے کان میں کہا۔ ”لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں نوری سے ملاقات کیے بنا، یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اور یہ ملاقات کل شام ہی ہوگی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کل کسی طرح مجھے گھر سے تنہا نکلنے کی اجازت دلوا دو۔ باقی انتظام میں خود کروں گا۔“ میں نے مسکرا کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پائی۔ ”تو تم نے بھی سووے بازی سیکھ لی ہے۔ ٹھیک ہے، کل عصر کے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔“

سانول کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مزار کی بیرونی دیوار سے پرے کالے کی مخصوص غراہٹ گونجی۔ میں روٹی اور پانی لے کر باہر آیا تو دور کالے کی پشت پر، میں نے اس کے دونوں دوستوں کو بھی ٹیلے کے اوپر کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے لیے روٹی ڈالی اور انہیں بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی آکر اپنے دوست کے ساتھ شریک ہو جائیں، لیکن شاید فی الحال وہ دونوں کچھ شرمیلے تھے۔ میں اندر سے اور روٹی لے آیا اور پانی میں بھگو کر خود دھو کر مزار کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے مزار کی طرف بڑھتے دیکھ کر کالے کے دوست بھی ٹیلے سے اتر آئے۔ اگلے روز عصر کے بعد میں سانول کے گھر پہنچا، تو وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ سانول کو میرے ساتھ گھر سے باہر نکلنے دیکھ کر اس کے ماں باپ کے دل میں جو توڑا بہت تذبذب تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے جتنی سے باہر نکلے ہوئے اس سے پوچھا ”اب کیا ارادہ ہے۔ کیا سیدھے نوری کے دروازے پر جا بیٹھو گے؟“ سانول زور سے سے ہنس پڑا ”نہیں! جو سودا میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا، وہی نوری کے سامنے بھی اس کی کھلی کے ذریعے پیغام کی صورت بھیج دیا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں، تو آج شام اسے مجھ سے ملنے کے لیے مزار کے پھیلے ہوئے ٹیلے پر آنا ہی ہوگا۔“ میں نے حیرت سے سانول کو دیکھا۔ ”تو کیا وہ مان گئی۔ اس نے تمہیں کوئی جواب بھی دیا کہ نہیں۔۔۔۔۔؟“ سانول مسکرایا ”نہیں۔۔۔۔۔ جواب تو کوئی نہیں آیا اس کی طرف سے، لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آئے گی۔“ میں نے فور سے سانول کی جانب دیکھا۔ ”تمہیں اتنا یقین کیسے ہے؟“ سانول اپنی ہی دھن میں مگن تھا ”ساری بات ہی یقین کی ہے پھوٹے ہوئے جی۔۔۔۔۔“ میں زور سے چوکا۔۔۔۔۔ میرے ذہن میں سلطان بابا کا جملہ گونجا ”سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے یہاں۔۔۔۔۔“ کیا ہمارے یقین میں واقعی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے مجبور اور معاشرے کے قیدی مجاہد کو بھی گھر سے نکال کر اس ویران تپتے صحرائے ہمارے سامنے کھڑا کر سکتا ہے۔۔۔۔۔؟ اگر زمین والوں پر اس یقین کا اتنا گہرا اثر ہے، تو پھر عرش پر اس والے کی آمد کا کیا حال ہوگا، جو ہمارے ایک قدم کے بدلے ستر قدم ہماری جانب بڑھاتا چلا آتا ہے۔۔۔۔۔؟ اور پھر میں نے دور ہی سے مزار سے پرے ٹیلے پر نوری کی سرخ اور دھن کو سانول کے کامل یقین کی صورت میں لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید اپنی کسی کھلی کے ساتھ آئی تھی، جو پہلے پرانی ایک خاص رنگی بوٹی چننے میں مشغول تھی، جسے جوڑوں کے درد کی دوا میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ صحت بھی ہمیں کتنے بہانے سکھا دیتی ہے۔ شاید محبت خود دنیا کی سب سے بڑی ”بہانے باز“ ہوتی ہے۔ میں مزار کی منظر کے قریب ہی رک گیا۔ سانول کو نوری کی جانب آتے دیکھ کر اس کی کھلی نے نوری کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور سختی ہوئی کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ ٹیلے اور مزار کی منڈیر میں کافی فاصلہ تھا۔ اچانک تیز ہونے ریت کے چند شریکوں کو ہچکچا دیا اور وہ نیند سے جاگ کر صحرائے ایک دوسرے کے پیچھے لپک کر ”کوٹھا چسپاکی“ کھیلنے لگے۔ سانول ریت میں بیڑھنا سا نوری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نوری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھ سے ریت کے ایک شریکوں نے کہا ”جانتے ہو، وہ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں؟“ ”ہاں۔۔۔۔۔“ میں جانتا ہوں۔ سب ہی پھمزنے والوں کی بولی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کچھ کھلے، کچھ شلوے۔۔۔۔۔ کچھ دعوے اور کچھ وعدے، کبھی نہ پورے ہونے والے وعدے۔۔۔۔۔“ سانول بھی نوری سے کچھ ایسے ہی وعدے کر رہا تھا۔ جانے مجھے اتنی دور سے بھی ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری دور ہی ہو۔ سانول اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے تو خود ہی اپنے سے دور سیجھ کے جتن کرتی ہیں اور پھر خود ہی جدائی کا سوچ کر رو پڑتی ہیں۔ اچانک ہی ڈہرا کی یاد نے میرے وجود کے ہر روم پر اپنا قبضہ جمالیا۔ وہ پورا صحرا جیسے ڈہرہ کی یاد کا اک دریا بن گیا۔ کیا اسے بھی میری یاد آتی ہوگی۔ کیا وہ بھی نوری کی طرح آنسو بہاتی ہوگی۔ زمانہ چاہے صدیوں ہی پر محیط کیوں نہ ہو، محبوب سے ہوئی ملاقات ہمیں ہمیشہ ملی بھری کی لگتی ہے۔ سو، نوری اور سانول کی ملاقات کے وہ چند پل بھی پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ نوری اپنی کھلی کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر سختی کی جانب چل پڑی اور جاتے جاتے پلٹ کر ٹیلے پر کھڑے کم سم سے سانول کو دیکھتی رہی، جس کی آنکھ سے ٹپکنے اس آنسو کی چمک، میں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں یہاں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ خود نوری بھی بار بار پلو سے اپنی کھلی پلکیں پونچھ رہی تھی۔ ایک اور الو واغ۔۔۔۔۔ ایک اور عذاب۔۔۔۔۔ جو سانول اور نوری کی جدائی کی صورت میں میری رون کو پھیلنے پڑ رہا تھا۔

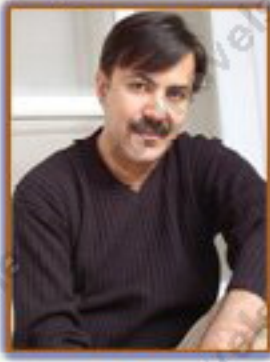
نوری کے جانے کے بعد بھی سانول وہیں ٹیلے پر کھڑا اس جانب دیکھتا رہا، جہاں ریت پر نوری کے قدموں کے نشان گھنے تھے۔ میں نے اس کی تنہائی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت صرف اس کا جسم ہی اس ٹیلے پر موجود ہے۔ اس کی روح تو نوری کی آنکھوں سے ٹپکنے آنسوؤں کو چھنے، ان سے وضو کرنے کے لیے نوری کے ساتھ ہی صحرا پار کر گئی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد سانول بھی اپنی محبت کے غروب ہوتے آفتاب کی طرح ٹیلے سے چھ اتر آیا۔ وہ بہت مضطرب لگ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ انکی وصل کے لیے کبھی کبھی یہ عارضی جدائی ضروری ہوتی ہے۔ سانول کو انکی صبح روانہ ہونا تھا۔ وہ رات دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اسے گھر تک چھوڑ آیا، لیکن انکی صبح میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ چل کر اسے وداع کرنے سے منع کر دیا۔ بتول اس کے، وہ پہلے ہی بہت اداس تھا اور اگر میں اسٹیشن تک ساتھ آیا، تو کہیں وہ اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ وہ صبح سویرے ہی مزار پہنچ گیا تھا۔ اس کی گاڑی دو پہر کی تھی۔ میں نمودا سے رخصت کرتے ہوئے بہت اداس تھا۔ اس کے ساتھ کال گڑھ میں اتنے دن کیسے کٹ گئے، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ جاتے ہوئے مجھ سے گلے مل کر وہ رو پڑا۔ میں نے جلدی سے اس کے آنسو پونچھے ”ارے۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔؟“ ”تم مجھے بہت یاد آؤ گے عبداللہ، میں روز تمہیں ایک خط لکھا کروں گا اور تم جواب میں مجھے اس کہتی، اس صبح اور نوری کی خبر لکھنا۔“ میں نے ماحول بدلنے کے لیے اسے چھیڑا۔ ”اچھا تو گویا مجھ میں بھی اسی کی باتیں۔۔۔۔۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم میرے لیے مجھ لکھا کرو گے، پھر اپنے ایسے نصیب کہاں؟“ سانول میری بات سن کر مسکرا دیا۔ ”اگر میرا خط اس تک پہنچ پاتا تو یقین کرو میں اسے ہر خط میں عبداللہ کی باتیں لکھا کرتا۔ میں نے نوری کو پیغام کروا دیا ہے کہ تم سے اسے میری خبر خیریت پتا چلتی رہے گی اور اگر اسے کوئی ضروری پیغام دینا ہو، تو وہ بھی تمہارے ذریعے مجھے دے سکتی ہے۔ میں ڈاک بابا سے بھی خاصا اٹھا کر کے آیا ہوں کہ مزار والی ڈاک کا خاص خیال رکھے۔“ میں نے سانول کو اطمینان دایا کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں اس کے ساتھ رابلے میں رہوں گا۔ جانے سے پہلے وہ خصوصی طور پر سلطان بابا کے گھر سے میں جا کر ان کی دعا بھی وصول کر آیا تھا۔ سانول کے جانے کے بعد ایک دم ہی جیسے ساری فضا اداس اور میری تنہائی اور وحشت دو چند ہو گئی تھی، دل پھر سے ہوکنے لگا تھا۔ گا بے دل سے دھواں اٹھتا ہے۔۔۔۔۔ ابھی رہتا ہے اس مکان میں کوئی۔۔۔۔۔

اگلے روز نیکینہ کے بوڑھے نانائے سلطان بابا سے ملنے چلے آئے۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اب میرا گھبراہٹ چھپ جانے کو دل کرتا تھا۔ مجھ سے اب ان کی فریاد برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بڑھیا کا آج یہ اصرار تھا کہ اگر سلطان بابا نیکینہ کی اولاد میں پر تین بار دم کرنے اور دعا کر کے بھولیں گے، تو وہ ضرور واپس لوٹ آئے گی۔ سلطان بابا نے شاید اسی کے اطمینان کی خاطر، اس سے کہا کہ وہ نیکینہ کی وہ پھولوں والی چادر ہمیں چھوڑ جائے، وہ ضرور نیکینہ کی بازیابی کی دعا کریں گے۔ وہ دونوں یوں خوش ہوئے، جیسے واقعی انہیں نیکینہ مل گئی ہو۔ مزار سے نکلے ہوئے بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی، تو اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی کہ خدا میری ہر جہاد پوری کرے اور ٹھیک اسی لمحے میرے من کی صرف ایک ہی مراد تھی ”یا خدا اس لاچار بڑھیا کو اس کی نواسی سے ملا دے۔۔۔۔۔“ کچھ دیر میں سورج ڈوب گیا۔ آج میں کالے اور اس کے دوستوں کے لیے پہلے ہی پانی اور روٹی باہر رکھ آچکا تھا، تاکہ اس کے دوست میری وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ تو وہی دیر بعد ہی ان کی غراہٹوں کی آوازیں بھی باہر سے بلند ہونے لگیں، لیکن خلاف معمول ”کااا“ مزار کے سامنے آکر بھونکنے لگا۔ اس نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، جانے کیا بات تھی۔ جب تو اتر سے آتی آواز نہ کی تو مجبوراً مجھے اٹھ کر مزار سے باہر جانا پڑا۔ وہ مزار کے مرکزی دروازے سے کچھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ پھر اندھیرے میں اس کے سامنے ریت پر یڑے صلیب کپڑے پر میری نظر پڑی، تو میں چونک کر آگے بڑھا۔ وہ شاید کہیں سے یہ کپڑا اٹھا لایا تھا اور مجھے یہی دکھانے کے لیے بار بار بھوک کر باہر بلا رہا تھا۔ اگلے، یہ تو میرا ہی

گرتا تھا۔ جو دونوں پہلے ریت کے شدید طوفان کی وجہ سے مزار کی لکھی سے اڑ کر نہ جانے صحرائیں کہاں کھو گیا تھا۔ لیکن یہ کالے لگو کہاں سے ملا۔ مجھے سانول نے بتایا تھا کہ جبروت کے سب ہی پالو کتے انتہائی حد تک سدھائے ہوئے اور اپنی حیات میں کمال حد تک ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ تو پھر ضرور کالے نے لڑتے میں میرے جسم کی باس پائی ہوگی، تب ہی وہ یہ لڑتا یہاں اٹھا آیا۔ کہتے ہیں، کتے کی سونگھنے کی حس اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ سیکڑوں لوگوں میں سے اپنے مالک کے جسم کی بو شناخت کر لیتا ہے۔ آج میں نے اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اور پھر اپنا کھنک بنی میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور میں اندر کی جانب دوڑا، ایک مبہمی امید نے میرے اندر جیسے جلیاں سی بھر دی تھیں۔ میرے کمرے میں ابھی تک نیکنی کی وہ اوڑھنی پڑی تھی، جو آج اس کی نانی سلطان بابا کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اگر سیکڑا سی صحرائیں کہیں بھٹک رہی ہے، تو شاید کالا اس کے دوپٹے میں بھی، خوش بو کو پا کر اس کا بھی کوئی کھوج نکال لائے۔ میں اوڑھنی لے کر اسی رفتار سے دو بارہ بھاگتا ہوا باہر آیا اور کالے کے سامنے اس پٹلی ہوئی چادر کو ڈال ڈیا۔ وہ کچھ دیر چاروں طرف گھوم کر اسے سوگھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ ہمیں اس اوڑھنی والی کی تلاش ہے۔ کالا اوڑھنی سوگھ کر پھر سے میرے اوپر دوڑا، پتھر لگانے لگا، شاید اسے سری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے چادر زمین سے اٹھا کر اس کا ایک گولا سا بنایا اور اسے دور صحرائیں اچھال دیا۔ کالا فوراً بھاگتا ہوا چادر کے قریب پہنچ کر بھونکنے لگا۔ اس بار شاید وہ میرا ہمدردی کا بیان کیا تھا۔ اب وہ زور زور سے ہونک کر چادر کے گرد چکر کاٹ کر صحرائی جانب دوڑ جاتا اور پھر واپس اپنی جگہ آ کر بھونکنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کا دورانیہ بڑھنے لگا، گردن تیز ہو کر میری نگوں میں انگارے سے بھر گئی۔ میں صحرائیں کالے کے پیچھے لپکا۔ وہ جس طرح خاص سدھائے ہوئے کتوں کی طرح کچھ قدموں کے بعد وک کر میرا انتظار کرتا اور پھر بھاگنے لگتا، اس سے ساف ظاہر تھا کہ وہ اس اوڑھنی والی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں اس کے نقش قدم پر دوڑتا ہوا صحرائی پار کر رہا تھا۔ کالے کا رخ ہستی کی جانب تھا اور کچھ ہی دیر میں ہم نصف شب کے وقت خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے کال گڑھ کی دیوار نگیوں میں وصول اڑا رہے تھے۔ کالا بنار کے آگے بڑھتا گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا اور قدم جواب دے رہے تھے۔ پھر بھی میں ایک ان جانی قوت کے زیر اثر، کالے کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر ہستی کے آخر میں کالے کے قدم ایک جگہ ہم سے گئے اور اس نے ہونک ہونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں بھی اپنی جگہ سناٹ سا ہو گیا۔ کالا اپنے نگوں سے جس دیر کو ہار بار کھینچ رہا تھا، وہ جبروت کے قلعے کی چار دیواری تھی۔ مطلب سیکڑا دیوار کے اس پار موجود تھی۔ اس وقت میرا بھی دل شدت سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میرے ناخن بھی بڑھ جائیں اور میں کالے کے ساتھ مل کر اس پتھر کی دیوار کو کھینچ کھینچ کر ڈھا دوں یا اس میں نقب لگا کر اس آہنی قلعے کے اندر گھس کر سیکڑا کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں، لیکن اس وقت ہم دونوں ہی شدید بے بس تھے، بلکہ شاید ٹھیک اسی لمحے اس چادر کے اختیار کی حدیں مجھ سے کہیں بڑھ کر رہی تھیں۔ تحکے قدموں سے ہم دونوں صحرائی طرف لوٹ گئے۔ میں جب مزار کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا، تب سلطان بابا چھدی کی نماز ادا کر کے اٹھ ہی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں نیکنی کی چادر دیکھ کر کچھ چونکے۔ ”کیوں میاں؟ کس کھوج میں رہے رات بھر؟“ میں نے انہیں ساری روادستادی۔ پوری بات سن کر انہوں نے گہری سانس لی۔ ”لگتا ہے کوئی بڑا امتحان سر پہ ہے۔۔۔۔۔۔ یا اللہ ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔“ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور میں بھی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر سیکڑا واقعی جبروت کے قلعے میں نہیں قید ہے، تو اسے نکالنے کے لیے پوری فوج درکار ہوگی، کیوں کہ اس علاقے میں پٹا ہانے کے لیے بھی جبروت کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اسی سوچ میں غبر ہی نہیں ہوئی کہ جانب کب سورج نکلا اور میرے وجود میں دھوپ کے نیڑے گڑنے لگے۔ میں جب بچ لگا، جب میرے ماتھے سے ہتا پسینہ پل پل مزار کے گھن میں گچھی ریت پر گر کر جذب ہونے سے پہلے ہی فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ سلطان بابا کے ٹوکے پر میں تپتی دھوپ سے مٹ کر گرم سائے میں جا بیٹھا۔ لیکن ابھی شاید میرے مقدر میں بہت کڑی دھوپ باقی تھی۔ کچھ ہی دیر میں مزار کے باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اکرام صاحب اور نوری کے والد، کسی دوسرے بزرگ کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان سب کے چہرے سٹے ہوئے تھے اور ماتھے پر پڑی ٹٹلیں اندر کا حال بتا رہی تھیں۔ سچ ہے کہ چہرے کا آئینہ شیشہ ہوتا ہے اور دل کا آئینہ چہرہ، لیکن آج ان سب کا آئینہ دھندلایا ہوا تھا۔ نوری کا باپ بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بابا کے استفسار پر مشکل اس کے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا ”جبروت نے نوری کا رشتہ مانگ لیا ہے۔“ میرے ہاتھ میں اکرام صاحب کو دینے کے لیے پتھر، پانی کا گلاس چھوٹے چھوٹے بچا۔ جملہ کیا تھا، ایک ایسا شدید دھماکا تھا، جو پل بھر میں پورے صحرائوں میں گھس کر گیا۔ میں نے بے ساختہ چلا اٹھا۔ ”لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری ہستی جانتی ہے کہ نوری، سانول کی منگیت ہے اور سانول صرف اسی رشتے کی تحلیل کی خاطر انہی نکل ہی محنت مزدوری کے لیے شہر گیا ہے۔ پھر یہ سب کچھ.....“ میرے لفظ میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ نوری کا باپ تو اس قدر روپا ہوا ہو چکا تھا کہ اس سے جواب میں کچھ کہانی نہیں گیا، البتہ کچھ نگوں بعد اکرام صاحب ایک لمبا سا سانس لے کر بولے۔ ”کاش ہم سانول کے ساتھ ہی نوری کو بھی دو بول بڑھا کر شہر رخصت کر دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نوری کو سانول کے گھر والوں نے اس کے لیے مانگ رکھا تھا، لیکن ابھی تک باقاعدہ کوئی رسم تو ادا نہیں کی گئی تھی، ان کی تو منگلی بھی نہیں ہوئی اور ایسی صورت میں کسی بھی طرف سے لڑکی کے لیے رشتہ آ سکتا ہے، ہاں ہستی والے تو اس زبانی رشتے کا بھی سد احرام کرتے، لیکن کسی کی نیٹ ہی اگر بری ہو ہو تو پھر اس کا کیا علاج.....؟“ میں نے چونک کر اکرام صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے سلطان بابا کو جو تفصیل بتائی، اس کے مطابق جبروت شاید بہت پہلے سے اس رشتے کی تاک میں تھا اور اس نے مناسب موقع پر یہ تیر چلا لیا تھا۔ دینے بھی وہ یہ تکلف صرف نوری کے ماں، باپ کے اطمینان کے لیے کر رہا تھا، ورنہ ہستی میں جس کسی گھر میں جب کبھی قلعے کی طرف سے کوئی رشتہ آتا تھا، تب اس کے بعد نہ تو کسی کو اٹھار کی جرأت ہوتی اور نہ ہی کبھی ہستی میں سے کسی دوسرے گھر نے جبروت کے مانگے ہوئے رشتے پر کندھا لے لے ہستی کی تھی۔ اس لیے اگر کبھی جبروت کی طرف سے ہستی میں کسی گھر کی بری کی طرف پھڑکتا، تو وہاں ماتم اپنے ذمے ڈال دیتا تھا اور پھر بہت سے لیے اس گھر میں موت کا نانا چھا جاتا تھا، میں نے جلدی سے اکرام صاحب سے پوچھا ”سانول کے باپ کا کیا کہنا ہے.....؟“

”وہ بے چارہ کیا کہتا گا۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے یہ سنتے ہی۔ غریب کا استعجاب کیا ہوتا ہے، صرف بددعا اور جل کڑھ کر اپنے اندر رہی کو مار دینا، ۱۱ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اسے اپنے بیٹے کی فکر بھی گھبائے جا رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سانول یہ سنتے ہی اپنے پاؤں ہستی دوڑا چلا آئے گا اور سانول کا باپ یہ بھی نہیں چاہے گا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو لے، لہذا اس کی پوری کوشش ہوگی کہ یہ غیر سانول تک بھی نہ پہنچے، کیوں کہ یہاں جس نے بھی قلعے داروں سے جھگڑا مول لیا۔ اس کے کاندھے بیٹے کے لیے مر کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔“ اکرام صاحب کی بات ختم ہوتے ہی مزار میں طاعا سا چھا گیا۔ صرف اس پاس چلتی لوکی سائیں سائیں اور ریت کے گولوں کے رقص کا شور فضا میں باقی رہ گیا۔ کچھ باتوں کی نگینیں کا اس میں ایک دم نہیں ہوتا، لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اس صاحب کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ہمیں دھیرے دھیرے اپنی بے بسی اور اس حادثے کے مضمرات کا پتا چلتا ہے۔ ٹھیک یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ میرے پاس سانول کا پتا نہیں تھا اور اس کے گھر والے اب کسی حال میں مجھے اس کی کوئی خبر نہ دیتے۔ شاید نوری کو شہر میں سانول کے رہنے کی جگہ کی کچھ خبر ہو، لیکن میں نوری سے اس کا پتا کیسے لے سکتا تھا، وہ تو سات پردوں میں گھبی ہوئی تھی۔ میں تو صرف سانول کے پہلے چلا ہی کا انتظار کر سکتا تھا، جس کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، لیکن تب تک کو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ جانے نوری کا کیا حال ہوگا۔ وہ بھی تو کسی بے بس چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہوگی۔ میں اپنی ہی سوچوں میں غم تھا کہ سلطان بابا کی آواز نے مجھے ڈرا دی دیا۔ ”آپ لوگوں نے اب کیا سوچا ہے۔ کیا پوری ہستی میں کوئی بھی ایسا نہیں، جو اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کر سکے؟“ ان تینوں بزرگوں کے سر فدا مت سے جھٹک گئے۔ ”کاش کسی میں اتنی جرأت ہوتی۔ ہم تو بس آپ سے دعا کی التجا کرنے آئے ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں اس ظالم شخص کے قہر سے بچالے۔“ سلطان بابا کی آواز بلند ہوگئی۔ میں نے انہیں اتنی چیز آواز میں بات کر لے پہلے بھی نہیں سنا تھا۔ ”یہ دعا کانہیں، عمل کا وقت ہے۔ خدا بھی ان کی حالت سمجھی نہیں بدلتا، جو خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرے ہوں۔“ تیسرے بزرگ نے جلیبی مرتہ گھلگھلو میں دھل دیا۔ ”آپ بہا فرماتے ہیں، لیکن اس ہستی کی تیسری نسل تک قرصوں میں بنی ہوئی ہے۔ ان کی رو میں تک جبروت کی غلام ہیں۔ ان بوسیدہ جسموں سے آپ ایسی کوئی توقع نہ رکھیں۔ شاید ہم سے زیادہ بے بس کوئی اور نہ ہو۔“ سلطان بابا نے تسبیح رکھ دی اور گرج کر بولے ”ٹھیک ہے..... اگر ساری ہستی کی روح غلام اور جسم بوسیدہ ہو چکے ہیں، تو پھر یہ فریضہ بھی اب مجھے ہی انجام دینا ہوگا۔ چلو عبداللہ..... مجھے جبروت کے قلعے لے چلو۔ وقت آ گیا ہے کہ اس سے دوبارہ بات کر لی جائے۔“ سلطان بابا نے پاؤں اپنی کھڑاؤں میں ڈالے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں بزرگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

اِک خال بسر نوجوان کا فسانہ جو خدا کو اپنی شہہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دو برحاضر کا بے حد مقبول و معروف سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گروہ بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑنا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز نکلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سرپرست مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناسل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

n o v e l a b d u l l a h @ j a n g g r o u p . c o m . p k

اکرام صاحب نے، جواب تک۔ سلطان بابا کے اس اچانک فیصلے سے بوکھلائے ہوئے تھے، مدد مانگنے کے انداز میں یوں میری جانب دیکھا، جیسے میں واقعی سلطان بابا کو روک ہی تو لوں گا، لیکن میں خود اپنے حواس میں کب تھا اور پھر میرا کام تو صرف تعمیل تھا، لہذا میں سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں ان کے پیچھے پیچھے مزار سے نکل پڑا۔ راستے میں نوری کے والد نے ایک بار پھر سلطان بابا سے درخواست کی کہ اس طرح براہ راست جبروت کی مخالفت میں کھڑے ہو جانا شاید ٹھیک نہ ہو، لیکن سلطان بابا کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ آج نہیں تو کل، اس سے کبھی نہ کسی کو تو بات کرنی ہی ہوگی، تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔ بستی قریب آئی تو سلطان بابا نے رک کر ان تینوں بزرگوں کو مخاطب کیا۔ ”میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں، لہذا بستی کی اس سرحد سے آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ تینوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ نوری میرے لیے بھی بیٹی ہی کی طرح ہے، لہذا آپ سب یہ اطمینان رکھیں کہ میرا کوئی بھی فیصلہ میری اپنی ذات کے لیے ہوگا اور نہ ہی آپ کو مزید کسی مشکل میں ڈالے گا، البتہ جو مشکل پہلے سے سر پر آن پڑی ہے، اس کا تذکرہ اب ضروری ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم کو چپ چاپ سنبھالنا ظالم سے بھی بدتر ہے۔“ کچھ دیر کے لیے ماحول پر۔ ناگنا سا چھا گیا، صرف فضا میں اڑتی جلیوں اور کال گڑھ کے تاریخی آسمان میں بھٹکتے گدھوں کا شور باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اکرام صاحب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر کسی کو تو پائل کرنی ہی ہوگی۔ آپ بستی کے سکے نہیں، لیکن پھر بھی آپ صرف ہم سب کی خاطر یہ زبان بندی توڑنے کے لیے یہاں تک چلے آئے۔ میں اور لڑکی کا باپ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔“ تیسرے بزرگ کو انہوں نے بڑی مشکل سے بستی کے باہر ہی سے رخصت کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم سب کال گڑھ کے بازار میں جبروت کے قلعے کے سامنے کھڑے تھے۔ بازار میں لوگوں نے نوری کے باپ کو ہمارے ساتھ جاتے دیکھا، تو وہ تجسس کے مارے ہمارے ساتھ ہی چل پڑے۔ کال گڑھ کی آبادی مختصر سی تھی اور ظاہر ہے کہ جبروت کے نوری کے لیے پیچھے گئے رشتے کی ان سب ہی کو خبر ہوگی، لیکن جب انہوں نے سلطان بابا کو قلعے کے سامنے رکتے دیکھا، تو ان سب کے قدم وہیں اپنی اپنی جگہ جمتے چلے گئے اور کچھ ہی دیر میں، میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے باپ سمیت ایک ایسے گول مجمع کے درمیان کھڑے ہوئے تھے، جو ہم چاروں سے کچھ فاصلے پر یوں کھڑا تھا، جیسے ان سب کو کوئی سانپ مونگھ گیا ہو۔ اندر سے قلعے کے دیو بیکل چوہی دروازے کے دربان نے بھی باہر کوئی غیر معمولی بات محسوس کر کے دروازے کے ایک پٹ میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا اور پھر ہمیں یوں راستے میں کھڑا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ”کیا بات ہے، یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے یہاں.....؟“ دربان کی جھانک سے جمع میں کھینچوں کی ہنسنات ہٹ جیسا ایک شور گونجا اور سب ہی لوگ چند قدم مزید پیچھے ہٹ گئے۔ سلطان بابا ٹھہری ہوئی آواز میں بولے ”مجھے تمہارے مالک سے بات کرنی ہے۔ جا کر اسے اطلاع کرو کہ باہر کچھ ملاقاتی آئے ہیں۔“ دربان کے چہرے پر حیرت کا تاثر ابھرا، اسے شاید اس لمحے اور اس بے باکی کی عادت نہیں تھی۔ ”مالک سے ہر کوئی یوں نہیں مل سکتا۔ مالک اسی سے ملتا ہے، جس سے اس کی مرضی ہو۔ ویسے بھی وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، شکار کے لیے صحرائی طرف گیا ہوا ہے، شاید کل تک وہ یہی ہوگی۔ تم لوگوں کو اگر ماننا بھی ہے، تو پہلے مالک سے وقت طے کرنا ہوگا، پھر آنا.....“ دربان اپنی بات ختم کر کے نخوت سے منہ بناتا ہوا واپس اندر پلٹ گیا۔ بھیڑ کے لیے اب مزید کوئی دل چسپی یہاں باقی نہیں رہ گئی تھی، لہذا لوگ بھی ادھر ادھر چھٹنے لگے۔ بہر حال، ہماری آمد کا نصف مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔ دربان جبروت کی واپسی پر اسے یہ اطلاع ضرور دے گا کہ مزار کا بزرگ مثنوی اس سے ملنے کے لیے قلعے کے دروازے پر دستک دے چکا ہے۔ اب ہمارے پاس انتظار کے موا کوئی اور چارہ نہیں تھا، لہذا میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے والد سے رخصت لے کر واپس مزار کی جانب پلٹ آئے۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ اگر میں کسی طرح نوری کے گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا چاہوں کہ وہ لوگ۔ حاملہ ہنسنے تک نوری کو لے کر کہیں ردپوش ہو جائیں، تو کیا یہ عارضی حل انہیں قابل قبول ہوگا، لیکن پھر خود میرے ہی دماغ نے اس خیال کو رد کر دیا۔ پہلے تو نوری کے گھر والے میری ایسی کوئی بات سنیں گے ہی کیوں؟ اور پھر اگر میں کسی طرح انہیں قائل کر بھی لوں تو کیا جبروت نے ایسے کسی متوقع اقدام کے لیے پیش بندی نہیں کر رکھی ہوگی۔ میں جس قدر سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھندا نوری کے گرد جنگ ہوتا نظر آ رہا تھا اور شاید یہ اسی پھندے کی گتھن ہی تھی کہ جس نے نوری جیسی سبھی ہونی چڑیا کو بھی اپنے ہتھیارے میں پھنسا پھنسا کر پھنسا کر دیا۔

عصر سے کچھ دیر بعد میں نے جب اسے اپنے شکستہ قدم باپ کے ساتھ صحرا عبور کر کے مزار کی جانب آتے دیکھا، تو پہلے تو کچھ دیر تک میں اسے بھی سراب ہی سمجھتا رہا، لیکن پھر جب وہ ایک حقیقت کی طرح مزار کی دلیلیں عبور کر کے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی، تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں بے یقینی کے عالم میں ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا عصر کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اس وقت مزار کے گتھن میں صرف

میں تھا یا آس پاس چلتی گرم لو کی سرگوشیاں۔ نوری کے باپ نے سلام کے بعد نونے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ بد نصیب آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے، میں اسے لے کر یہاں بھی نہ آتا کہ اب تو اس کے گھر سے باہر نکلے قدموں سے بھی ڈر لگتا ہے، لیکن بالآخر ایک مجبور، لاچار باپ اپنی لاڈلی کی آخری فرمائش پوری کرنے چلا آیا ہے۔ نوری کی حالت میری سوچ سے بھی زیادہ اتر تھی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں رات بھر کے اشکوں کی کہانی سنارہی تھیں۔ وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی ”چھوٹے پیر جی..... آپ کسی طرح سانول کو اطلاع کروادیں، ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔“ گویا اس نے مجھ سے وہی مانگ لیا، جس کی توقع میں اس سے کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نوری سے سانول کے شہر کا پتا پوچھا، تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ایک مزارا سا کاغذ میرے حوالے کر دیا۔ اس پر سانول ہی کی کچی تحریر میں قریبی شہر کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کسی مسافر خانے کا پتہ درج تھا، لیکن یہ قریب ترین شہر بھی کال گڑھ سے پورے ایک دن کی مسافت پر ریل کے راستے سے منسلک تھا۔ میرے جی میں آیا کہ نوری کے باپ سے کہوں کہ ابھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اور میرے ساتھ کال گڑھ سے نکل پڑے۔ جہر و ت کی واپسی سے پہلے ہم ٹرین کے ذریعے سانول تک پہنچ سکتے تھے، لیکن سلطان بابا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر بھی تو میں کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے نوری کے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم مزار کی دیوار سے پرے خلا میں گھور رہا تھا۔ میں نے اسے پکارا تو وہ سٹپٹا سا گیا۔ ”یہاں سے اگلی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی.....؟“ میرا سوال سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں کون سا منصوبہ کھلا رہا ہے۔ ”نہ چھوٹے پیر جی، کال گڑھ سے باہر پیر لگانے کا مطلب ہمیشہ کے لیے یہاں سے علاقہ بدر ہونا ہے، پھر میری سات سلسلیں بھی دوبارہ یہاں بسنا چاہیں، تو یہ ظالم ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“ ”سوچ لو! تمہیں اپنی اگلی سات سلسلیں بچانی ہیں یا اپنی اگلی بیٹی کی زندگی..... فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے، لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ بیٹی زندہ رہے گی تو.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ نوری کے باپ نے بے بسی سے سر پٹا اور پھر آدھے گھنٹے کے طویل وقفے کے بعد اس نے نظر اٹھائی، تو وہ ایک ایسے ہارے ہوئے جواری کی نظر تھی، جس نے اپنا سب کچھ آخری داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ طے یہ پایا کہ رات ساڑھے گیارہ بجے والی گاڑی کو پکڑ جائے گا۔ نوری کی ماں کو اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کے ساتھ اوٹنوں کے قافلے کی ہم راہی میں آج شام اس کی بہن کے پاس کسی دوسری بستی کے لیے روانہ کر دیا جائے گا اور نوری صرف اپنے باپ کے ہم راہ رات دس بجے سے پہلے مجھے بستی کے باہر ریلوے اسٹیشن کی راہ پر ملے گی۔ میں انہیں گاڑی پر سوار کروا کر واپس کال گڑھ لوٹ آؤں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جیل پور والے خان صاحب کے نام ایک خط بھی نوری کے باپ کے حوالے کر دوں گا اور انہیں مکمل تفصیل اور پتا لکھ کر سمجھا دوں گا کہ وہ شہر پہنچنے ہی سانول کو لے کر آگے جیل پور کے لیے روانہ ہو جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ خان صاحب کو ان مظلوم لوگوں کو پناہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ نوری کے باپ کو اپنے دوست کا شف اور پایا کے تمام ٹیلی فون نمبرز بھی احتیاطاً ایک الگ کاغذ پر لکھ کر دے دوں گا، تاکہ کسی ہنگامی صورت میں وہ پہلا ٹیلی فون میسر آتے ہی ان سے بات کر سکے۔ میں نے نوری کے باپ کا کاغذ ہاتھ پر لے کر اسے ہمت دلائی اور انہیں رخصت کیا، تاکہ وہ گھر جا کر اس ”ہجرت“ کی تیاری کر سکیں۔ نوری اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے خاموش کھڑی رہی، لیکن واپس پلٹنے سے پہلے وہ شکر گزاری کے بول بولنے کی کوشش میں رو ہنسی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چٹک چٹکیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہمارے احساس کو منتقل کرنے کے لیے کس قدر کم یاب ہو جاتے ہیں یا شاید بعض جذبے اور احساسات ہوتے ہی ایسے ہیں کہ دنیا کی بہترین لغت بھی ان کے احاطے کے لیے نا کافی ہو جاتی ہے۔ ان کے جاتے ہی میں نے کمرے میں جا کر عبادت میں کم، سلطان بابا کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، پھر صرف اتنا ہی بولے ”لھیک ہے، اگر ان سب پر یہ زمین اتنی ہی تنگ ہو گئی ہے، تو پھر ان کا یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے۔ تم سے جو مدد ممکن ہو، ضرور کرو۔“

رات نو بجے تک میں اپنی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ خطوط کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے بعد میں سلطان بابا سے اجازت لے کر بستی کی جانب چل پڑا۔ اچانک ہی مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اپنا گھر باہر چھوڑنا، اپنی جائے جنم ترک کرنا، کس قدر مشکل اور اذیت ناک عمل ہوتا ہے، شاید اسی لیے مذہب میں ہجرت کا اس قدر اعلیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو گویا ایک بار پھر سے جنم لینے کے مترادف ہی ہوتا ہے۔ میں بستی کے باہر اسٹیشن کی راہ کو جانے والی صحرائی پگڈنڈی پر پہنچا، تو مجھے مزار سے نکلے ٹھیک آدھ گھنٹے بیت چکا تھا۔ چاند پوری طرح کھل کر آسمان سے نور برسا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ چاندنی مجھے کھٹک رہی تھی۔ اجالے کا واسطہ شناخت سے ہوتا ہے اور جب مقصد ہی، اپنی شناخت کو دوسروں سے اوجھل رکھنا ہو، تو اچالا کبھی کبھی انسان کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ ہم انسان بھی کس قدر مطلبی ہوتے ہیں۔ کبھی میں اسی چاند کی چاندنی کے لیے مہینہ بھر انتظار کے کرب میں مبتلا رہتا تھا اور ٹھیک ہر چاند کی چودھویں رات کو اپنے تمام دوستوں سمیت ساحل پر، یا کھلے سمندر میں کسی بحری جہاز کے عرشے پر ہلٹا کھڑا کرنے اور محفل سہانے کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ تب یہ چاندنی مجھے کس قدر رومان پرور محسوس ہوتی تھی اور آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ پورے صحرا کے آسمان پر ایک سیاہ چادر ڈال دوں یا کال گڑھ ہی پر کوئی چھتری تان دوں، تاکہ بستی چھوڑنے والوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے، لیکن ایسی چھتریاں اگر کہیں میسر ہوتیں تو جانے کتنے سیاہ صیغے اپنے مقتدر کے سورج پر تاننے کے لیے ہزاروں خرید نہ لاتے۔ کچھ ہی دیر میں ٹیلے سے پرے کچھ آہٹے کی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا، تو دور ٹیلے سے پرے نوری اور اس کا باپ تھڑے قدموں سے ریت کا دریا عبور کرتے نظر آئے۔ نوری کے ہاتھ میں شاید اس کے کپڑوں کی ایک گھڑی تھی، جسے اپنے سینے سے لگائے اور لمبا سا گھونگھٹ نکالے، وہ اپنے باپ کی تیز رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، جو ہر چند قدم بعد رک کر اپنی بیٹی کو جھڑک کر تھڑ چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ ٹیلے تک پہنچے، تو نوری کا سانس بری طرح پھول چکا تھا، لیکن اپنے باپ کے خوف سے وہ اپنی ابھی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی تمام تفصیل نوری کے باپ کو سمجھائی اور خط اس کے حوالے کر دیے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور ابھی ہمیں گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا، اس لیے میں ان دونوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔ اب وہاں صرف صحرا تھا، چاندنی تھی اور ہمارے ریت میں دھنستے قدموں کی چاپ.....

میری کوشش تھی کہ ہم صحرا کے مرکز کے بجائے آس پاس ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔ ہر آہٹ پر ہم تینوں بری طرح چونک جاتے اور ریت کی غیر معمولی سربراہت سے بھی ہمارا دم اٹلنے لگتا۔ اسٹیشن اب تھوڑی دور رہ گیا تھا، لیکن منزلوں کا تعلق بھلا فاصلوں کے گھٹنے یا بڑھنے سے کب ہوا ہے اور پھر میری کہند تو ہر بار تب ہی ٹوٹی تھی، جب دو چار ہاتھ باقی تھے یا کم کو۔ اچانک ہی صحرا میں جیپ کے زوردار انجن کی فرائے بھرتی آوازوں کو فنی کہ ہم تینوں کی اچھل کر رہ گئے۔ جیپ کسی قرین ٹیلے کے پیچھے کی چھپا کر کھڑی کی گئی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے تیز میڈ لائٹس کی روشنی کے دائرے میں ہمارے پاؤں جم کر رہ گئے۔ نوری کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے چند حیا کی ہوئی آنکھوں سے روشنی کے دائرے سے پرے جھانکنے کی کوشش کی۔ فضا میں چند بھڑے لہجے ابھرے اور جیب میں بیٹھے چار بیولوں میں سے ایک ترجم میں بولا۔ ”کہاں جا رہے ہو چھوٹے پیر جی..... کہو تو ہم چھوڑ آئیں۔“ وہ سب لوگ پھر زور سے ہنستے اور ایک ہی دلا جیپ سے نکل کر روشنی کے سامنے آ گیا۔ وہ اکرم تھا، جبر و کنا خاص کارندہ۔ میرے سینے میں جیسے ایک تیز سا گڑھ کر رہ گیا۔ میں جسے غافل سمجھ رہا تھا، وہ مجھ سے زیادہ ہوش دھواس میں غائب ہوا۔ جبر و ت نے پہلے ہی نوری کے گرد و پہرا بٹھا رکھا تھا اور اسے شاید مزار سے شروع ہوئی، اس کہانی کی ہر تفصیل کی خبر تھی۔ وہ صرف ہم سے کھیل رہا تھا اور کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ جب ہمیں رنگے ہاتھ پکڑ سکے اور میں نے یہ موقع اسے پلیٹ میں رکھ کر فراہم کر دیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے نوری پر ایک بھر پور نظر ڈالی اور زور سے ہنسا ”کیوں پیر جی، تم اسے

بھگ رہے تھے یا یہ نہیں لے کر بھاگ رہی تھی۔ ویسے معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ جوانی پزیر ہی ایسی ہے کہ انسان خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔“ وہ چاروں پھر سے زوردار قہقہہ لگا کر بنے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہم تینوں کو ہانک کر جیب میں بٹھا کر واپس کال گڑھ کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نوری اور اس کے باپ کے چہرے پہلے پڑ چکے تھے، خاص طور پر نوری کی حالت بہت بری تھی، مجھے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کے سردار کی منظور نظر نہ ہوتی، تو شاید وہ اس سے مزید بد تمیزی کرتے، لیکن شاید انہیں اتنا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں قابو کر کے قلعے تک پہنچا دیا جائے۔ نوری کے باپ اور میری مشکلیں، البتہ وہ پہلے ہی کس چکے تھے۔

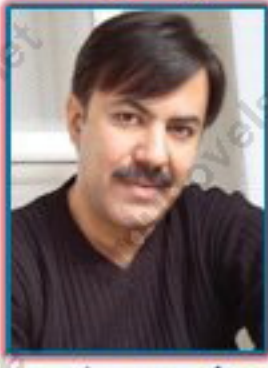
جیپ قلعے میں داخل ہوئی، تو جس احاطے میں ریچھ کی لڑائی ہو رہی تھی، اس کے بائیں جانب ایک تنگ سی راہ داری سے ہوتے ہوئے گاڑی قلعے کی پچھلی جانب ایک صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف بلند ستیروں کے ستونوں والے برآمدے تھے اور چاروں جانب کمروں کی قطاریں۔ پھر اوپری منزل میں روشنی ہوئی اور ایک کرخت چہرے والا بوڑھا ہاتھ میں بڑا سا گیس لیمپ لیے برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اوپری سے چلا کر بولا۔ ”لے آئے ہو انہیں۔ بند کرو، الگ الگ کمروں میں۔ صبح سردار لوٹ کر ان کا فیصلہ کرے گا۔“ اکرم کے ساتھ کھڑے کارندے نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور دوسرے نے نوری کے باپ کو دوسری جانب دھکا دیا۔ اوپر سے بوڑھا چلا یا ”لڑکی کو چھوٹی سرکار کے پاس لے جاؤ اور بوڑھے کو بند کر دو۔“ نوری چلائی ”میں کہیں نہیں جاؤں گی“ لیکن اتنی دیر میں نہ جانے اندھیرے میں کہاں سے دو عورتیں برآمدہ میں اور نوری کو کھینچتے ہوئے ایک جانب لے گئیں۔ قلعہ نوری کی چیخوں سے کچھ دیر کے لیے گونجا اور پھر نوری کی آواز اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی۔ مجھے اور نوری کے باپ کو پہلے ہی چاروں کارندے قابو کر چکے تھے۔ نوری کے باپ نے بہت دہائی دی، فریاد کی، لیکن ان لوگوں پر بھلا ایسی فریادوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہم دونوں کو کال کوٹھڑی نما چھوٹے چھوٹے علیحدہ کمروں میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال کر واپس جا چکے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جبروت فی الحال کال گڑھ میں موجود نہیں تھا اور کل اس کی واپسی متوقع تھی، لیکن وہ اس قدر شاطر تھا کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی نوری کے پہرے کا تمام بندوبست کر کے گیا تھا۔ نوری اور اس کے بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی اور پھر وہاں سلطان بابا بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے، اور جب میں رات بھر مزار نہیں پہنچوں گا، تو وہ بھی تو پریشان ہو جائیں گے۔ سچ ہے کہ تقدیر ہماری تدبیروں سے ایک چال ہمیشہ آگے ہی رہتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس چھوٹے سے تہ خانے نما کمرے میں صرف ایک مختصر سا روشن دان موجود تھا، جس میں لگی لوہے کی سلاخوں سے باہر آسمان پر چمکتا چاند مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے کسی گول روٹی کو چھری سے چار حصوں میں افقی رخ پر تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے مجھے اسی چاند کی روشنی سے شکایت تھی اور اب اس اندھیری کوٹھڑی میں پھر اسی کی چاندنی اپنا نور بکھیر کر میری وحشت کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلو اچھا ہے کہ قدرت کی نعمتیں بھی انسانوں کی طرح ہماری ناشکری پر ہم سے روٹھ نہیں جاتیں، ورنہ آج تک ہم میں سے نہ جانے کتنے بارش، ہوا، بادل، دھوپ، خزاں، بہار اور اسی جیسی نہ جانے کتنی سوغاتوں سے محروم ہو چکے ہوتے، کہ انسان کی تو فطرت ہی شکوہ ہے۔ میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے کہ ری کے سخت ریشے کلائیوں کی جلد میں پوسٹ ہوئے جا رہے تھے۔ میں اسی طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ اندھیرے میں دیوارنٹول کر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سامنے والی دیوار کی جانب ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں دو دیاسلائیوں کی جلتی ہوئی نظر آئیں، میرے جسم کو پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک ایک سردی لہر جھنجھوڑ گئی۔ یہ کسی جہازی ساز کے چوہے کی دو آنکھیں تھیں، جو اندھیرے میں جگمگ رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے پیروں کے قریب بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے جن چیزوں سے شدید کراہیت محسوس ہوتی تھی، جھپکلی اور چوہا، ان میں سرفہرست تھے، کہاں تو ان جان داروں کی صرف کمرے میں موجودگی کے احساس ہی سے میری رگیں تن جاتی تھیں اور میں ایک لمحہ بھی وہاں نہیں گزار سکتا تھا اور کہاں آج میرے قدموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ایک ایسی ہی مخلوق میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑھے بیٹھی تھی۔ شاید میں نے، جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائی تھی، وہیں اس چوہے کا گھریا راستہ تھا، لیکن اب میری مجبوری یہ تھی کہ اپنے بند ہاتھوں کی وجہ سے میں گھٹنے ٹیکے بغیر دوبارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر میں گھٹنے ٹیکنے کی کوشش کرتا، تو ڈر تھا کہ کہیں وہ پکلا نہ جائے، لہذا میں یونہی ساکت بیٹھا رہا اور ہم دونوں اسی طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ شاید وہی لمحہ تھا، جب ”جبر“ کی صحیح تعریف مجھے سمجھ میں آئی۔ جبر صرف قید و بند کا نام نہیں، نہ ہی صرف جسم کا پابند سلاسل ہونا جبر کہلاتا ہے۔ اصل جبر تو روح کی اسیری ہے، ہماری روح اور ہمارے اندر کو کسی ایسے کام کے لیے پابند کرنا، جو ہماری سرشت اور فطرت کے خلاف ہو، پھر چاہے روح کی وہ بندش، کسی عالی شان محل میں کم خواب کے بستر پر ہو یا پھر کسی ایسی کال کوٹھڑی میں، جہاں آج میں بند تھا۔ قدرت نے آج مجھے ایک ایسے جان دار کے ساتھ اس زندان میں لا ڈالا تھا، جس کی موجودگی کے احساس ہی سے میری آنتیں الٹنے لگتی تھیں، اور آج وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز دھوکئی جیسی سانس کی آواز بھی میں سن سکتا تھا۔ اس سے بڑا جبر میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں یہ خوف ناک قلعہ، جبروت کی قید، اس رات کی تنہائی اور یہ کال کوٹھڑی، سب ہی کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اصل امتحان اس چوہے کی، جسم کو مٹس کرتی ہوئی موجودگی میں، ساری رات بتانا تھا۔ شاید کچھ اسی طرح کے جبر کا شکار وہ چوہا بھی تھا۔ ہم دونوں اسی خیال سے گھنٹوں اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے کہ اگر پہلے نے حرکت کی، تو دوسرا بھی رد عمل ظاہر کرے گا اور اسی جبر میں وہ ساری رات گزر گئی۔ رُوسو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بظاہر آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمران دیکھی زنجیروں میں بندھے گزار دیتا ہے۔ آج مجھے ان دیکھی زنجیروں کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ جانے کب چاند ڈوبا اور کب کال گڑھ کے اس ناراض سورج نے اپنی بھٹی سلگائی، باہر قدموں کی چاپ سن کر میری بتی رات کا وہ ساتھی، شب گرد جلدی سے دوڑ کر قید خانے کی ایک ابھری ہوئی اینٹ کی اوٹ میں جا کر چھپ گیا۔ آنے والے جبروت کے دو غلام تھے۔ انہوں نے گھسیٹ کر مجھے کھڑا کیا اور کوٹھڑی سے باہر دھکیلا۔ زندان سے نکلنے سے پہلے میری نظر چوہے کی نظر سے ٹکرائی۔ میرے دل نے کہا ”شکر یہ دوست، تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔ اگر قسمت میں کچھ سانسیں مزید لکھی ہیں، تو اب بڑے سے بڑے جبر کا سامنا بڑی آسانی سے کر سکوں گا۔“ وہ دونوں غلام مجھے دھکیلے ہوئے اسی احاطے کی طرف بڑھنے لگے، جہاں میں نے جبروت کا پہلا تماشا دیکھا تھا۔ جیسے جیسے ہم تنگ راہ داریوں سے گزرتے ہوئے قلعے کے بیرونی احاطے سے نزدیک ہوتے گئے، ویسے ویسے کسی جہوم کی کھیموں جیسی جھنسنات کا شور بڑھتا گیا۔ ایسے لگتا تھا، جیسے لوگوں کا ایک بہت بڑا جہوم دیواروں کی پرلی جانب جمع ہو رہا ہے۔ میں فی الحال برآمدوں کے اندھیرے سایوں سے گزر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے آخری غلام گردش کے ختم ہونے پر، کھلے احاطے میں آگ برساتے سورج کی روشنی میں، پہلا قدم رکھا، تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ احاطہ لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا، اور سب ہی لوگ اسی طرح ایک گول دائرے میں کھڑے تھے، جیسے ریچھ کے تماشے والے دن وہ سب یہاں جمع تھے۔ ایک جانب نوری کا باپ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہاتھ لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند چہروں کی آنکھوں میں، جنہیں میں ہستی میں سانول کی بیماری اور نماز استسقاء کے موقع پر دیکھ چکا تھا، تاسف اور بے بسی کی ایک لہری تھی، البتہ جبروت کے کارندے ہماری حالت پر خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک جانب سے شور سا اٹھا اور لوگوں کے بیچ ایک رستہ سامنا گیا۔ مجمع میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور میرا دل الٹنے لگا۔ اکرم اور دو نئے کارندے سلطان بابا کو لیے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان بابا کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کی حالت کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دی۔ سلطان بابا نے اندر آتے ہی رعب دار آواز میں سارے جہوم کو سلام کیا اور اطمینان سے تسبیح گھماتے ہوئے ٹھیک میرے سامنے دوسری جانب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے بندھے ہاتھ اور حالت دیکھ چکے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور مجھے لگا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے پوچھا ہو ”کیسے ہو عبداللہ میاں۔۔۔۔۔؟“ میں نے بھی اسی غیر مرئی رابطے سے سر ہلا کر انہیں اپنے اچھے ہونے کا اطمینان دلایا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر زیر لب دعا دی، لیکن جانے کیوں مجھے ان کی پلکوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے جلدی سے نظر جھکالی کہ یہ لوگ کہیں میری بھیگی پلکوں کو اس قید اور تکلیف کا شاخسانہ نہ سمجھ لیں۔ کاش دل کی کاٹ سے نکلے آنسوؤں کا رنگ عام درد کے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔۔۔۔۔

اچانک بھیڑ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پہرے داروں نے جلدی جلدی اپنی جگہ سنبھالی اور پھر احاطے میں بچے تخت کے پیچھے سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا جبروت نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی وہ سرد، سفاک اور قہر بھری نظر میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔ میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی اور کچھ دیر ہم دونوں یونہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ مجھے اس کی نظر میں چھپی چنگاریاں فضا میں بکھرتی سی محسوس ہوئیں۔

(باقی آئندہ)

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناسل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

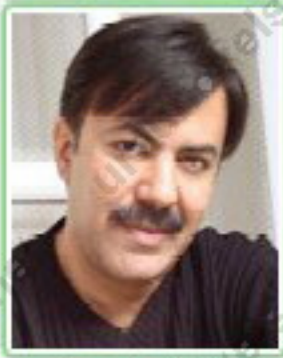
novelabdullah@janggroup.com.pk



..... ہاشم ندیم ☆ قسط نمبر 9

اچانک وہ زور سے دھاڑا ”تو تم ہو عبداللہ..... جسے سولی چڑھنے کا شوق اس ہستی تک کھینچ لایا ہے۔ ویسے ایک بات ہے، تمہاری ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ جبروت کی پسند کو بھگالے جانے کی کوشش کرنے والا یا تو کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے یا پھر وہ، جسے خود کشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوچا ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ چکر..... لڑکی کی رضامندی بھی شامل تھی تمہارے ساتھ بھاگنے میں یا تم ہی نے اسے ورغلا یا تھا.....؟“ مجھے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی سلطان بابا کی تسبیح کے دانے گرنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا، ”میں اسے بھگا کر نہیں لے جا رہا تھا، لڑکی کا باپ بھی میرے ساتھ تھا اور وہ شہر جانا چاہتے تھے، کیوں کہ لڑکی کو تمہارا رشتہ منظور نہیں۔ ساری ہستی یہ بات جانتی ہے۔“ میری بات سنتے ہی جبروت کے منہ سے غصے کے مارے کف پہنے لگا، اسے شاید اتنے براہ راست جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ زور سے چلایا ”سب بکو اس ہے۔ مزار کے متوتی اور مجاور کے بھیس میں تم لوگ یہ دھندے کرتے ہو۔ بردہ فروشی کے لیے یہی جگہ ملی تھی تم لوگوں کو..... میں جانتا ہوں ہماری ہستی کی عورتیں بہت معصوم ہیں، ضرور اس کا باپ بھی تمہارے بھکاوے میں آگیا ہوگا۔ بہر حال، لڑکی بھی تمہارے ساتھ جرم میں برابر کی شریک ہے اور میری عدالت تم دونوں کو.....“ اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سلطان بابا کی آواز گونجی ”کوئی بھی عدالت فیصلہ دینے سے پہلے ملزم کو صفائی کا پورا موقع دیتی ہے، تو پھر یہ تمہاری کیسی عدالت ہے، جو خود ہی وکیل ہے اور خود ہی منصف.....“ جبروت چونک کر پلٹا۔ یہ آج کی دوسری ان ہوتی تھی، کیوں کہ آج تک جبروت کے دربار میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ سکے۔ وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا ”اوہ..... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ..... میں بھول گیا تھا کہ گروہ کا سرغنہ بھی یہیں موجود ہے۔ اتفاقاً ایک بارش کیا برس گئی۔ تم نے تو خود کو اس ہستی کا مسیحا ہی سمجھ لیا۔ چلو کیا یاد کرو گے، جبروت کی عدالت تمہیں، تمہارے ساتھی کی وکالت کا موقع بھی دیتی ہے، پھر نہ کہنا، کال گڑھ میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔“ جبروت نے داد طلب نظروں سے مجھے کی طرف دیکھا، جہاں کچھ بزرگ عداوت کی وجہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جبروت جھوم کی خاموشی سے چڑسا گیا، اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ ہستی کے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس تماشے سے خوش نہیں ہیں۔ اب یہ خود اس کی اپنی انا کا مسئلہ بھی بنتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی اگر ہمیں عبرت کی مثال نہ دیتا، تو اس کی سلطنت کے قلعے میں یہ پہلی نقب ہوتی، جو ایک کم زور اور بے بس بوڑھے کے ہاتھوں لگتی، لہذا اسے اپنے تیور کڑے کرنے پڑے۔ وہ زور سے چلایا ”لیکن یاد رہے کہ اگر تم دونوں اپنی صفائی میں کچھ ثابت نہیں کر سکے، تو پھر میں تم دونوں کا وہ حال کروں گا کہ تمہاری اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔ تو بولو، کیا ثابت کرنا چاہتے ہو.....“ سارے مجھے کی توجہ سلطان بابا کی جانب ہو گئی۔ یہ ان سب کے لیے بھی ایک انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا کہ انہوں نے آج تک لوگوں کو جبروت کے قدموں میں گرتے اور گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ سلطان بابا کی تسبیح لگا تار گھوم رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے ”عبداللہ کی صفائی کے لیے لڑکی اور اس کے باپ کا بیان ہی کافی ہے۔ لڑکی تم سے رشتہ نہیں کرنا چاہتی اور اپنے باپ کے ساتھ، شہر جا کر اپنے منگیتر سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ تم اسے نہیں روک سکتے، یہ لڑکی کا حق ہے۔ اسے شہر جانے دو۔“ جبروت نے زور کا قہقہہ لگایا ”بہت خوب! اسے کہتے ہیں مدعی سُبُت اور گواہ چُست۔ جس لڑکی کے حق کے لیے تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو، اس کا باپ تو وہاں کونے میں سر جھکائے کھڑا ہے۔ چلو کوئی تو ہے، جو جبروت کو بھی نصیحت کر سکے۔ مرنے سے پہلے کوئی اور حسرت ہو، تو وہ بھی بیان کر دو۔ کوشش کروں گا، تمہارے ہر حکم کی تعمیل ہو۔“ کاردندوں نے اپنے آقا کی حس مزاح پر مسکرا کر اسے داد دی۔ سلطان بابا نے جبروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ”ہاں..... ایک خواہش اور ہے میری، اگر پوری کر سکو تو، مجھے اس بزرگ جوڑے کی نو اسی سیکنہ کا چٹا ہٹا دو۔ انہیں اس عمر میں مزید در بدر اور خوار نہ کرو۔“ جبروت ہنستے ہنستے ایک دم ہی چپ ہو گیا اور اس نے اپنی قبر بھری نگاہ سلطان بابا کی انھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں جھوم کی طرف دوڑائی۔ بھیر جبروت کی انھنی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم درمیان سے یوں چھٹی، جیسے کوئی تیرکمان سے نکل کر ان کی جانب لپکا ہو۔ لوگ دونوں طرف اس طرح بٹے، جیسے کوئی ساکت پانی میں لکیر کھینچ دے۔ لوگوں کی آخری قطار میں سیکنہ کے نانا، نانی کھڑے تھے۔ پتا نہیں، وہ پہلے ہی سے اس بھیر کا حصہ تھے یا پھر جب سلطان بابا کو لایا جا رہا تھا، تو وہ بھی اس وقت ان کے ساتھ آ گئے۔ جبروت کی ساری زندہ دلی پل بھری میں ہوا ہو گئی اور وہ شدید طیش کے عالم میں چلایا ”بس! بہت سن لی تمہاری بکو اس، تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے وعظ سن کر یہاں کے لوگ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا ان داتا کون ہے۔“ ”نہیں، یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ساری کائنات کا ان داتا صرف ایک ہی ہے“ سلطان بابا نے آسمان کی جانب انگلی اٹھائی ”اب بھی وقت ہے، اپنے گناہوں سے تائب ہو کر معافی مانگ لو، سچی توبہ کر لو۔ اس کی رحمت تمہارے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ابھی تمہارے سانس چل رہی ہے، لہذا توبہ کا وقت بھی باقی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا لو۔“ جبروت کے صبر کا پیمانہ اب بالکل ہی لب ریز ہو چکا تھا۔ آج تک کسی نے اس کے سامنے یوں سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی، لیکن آج اسے ہماری آنکھوں سے اپنا خوف مفقود دکھائی دے رہا تھا، جب کہ اس کی حکومت کی تو اصل بنیاد ہی یہ ”خوف“ تھا۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور عجیب سا انکشاف ہوا۔ ”خوف“ کا واسطہ دراصل ”پوشیدگی“ سے ہوتا ہے، جو چیز ظاہر اور واضح ہو جائے، وہ اپنا اصل خوف اور ڈر کھودیتی ہے اور شاید ٹھیک اسی وقت یہی کلیہ جبروت کے ذہن کے کسی کونے میں بھی سر اٹھا رہا تھا۔ اسے سمجھ آ گیا تھا کہ مجھ سے اور سلطان بابا سے کسی قسم کی مزید بحث، اس کا خوف، اس کی رعایا کے دلوں سے مزید کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے، لہذا اس نے دربار ختم کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”تمہاری تبلیغ کا وقت ختم ہوا۔ افسوس تم اپنے ملزم کا دفاع نہیں کر سکے، لہذا میری عدالت اس لڑکے کو کال گڑھ کی لڑکی کو ورغلا کر بھگالے جانے کا مجرم سمجھتی ہے، لیکن میں اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا آخری موقع ضرور دوں گا۔ کل صبح سورج نکلنے ہی عبداللہ کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے چھ پالتو کتے بھی اس کے پیچھے چھوڑے جائیں گے۔ اگر ملزم میرے شیروں کی گرفت میں آئے بغیر یہ صحرا پار کر کے اسٹیشن تک پہنچ گیا تو بے قصور سمجھا جائے گا اور باعزت بری ہوگا۔ دوسری صورت میں یہاں

اس وقت ایک پرمند پانی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی، ایک خاک ہسرو جوان کا فحشاء..... جو خدا کو اپنی شہد رگ سے کچھ درد تلاش رہا تھا



.....☆ ہاشم ندیم ☆.....

مورج نکلنے تک میں وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے پاؤں آخری ممکن حد تک ٹکڑ کر رکھنے اپنے سینے کے ساتھ اس وقت تک جوڑے رکھے، جب تک مجھے لینے والے وہاں پہنچ نہیں گئے۔ میں اس مظلوم لڑکی کے لیے اور تو کچھ نہ کر پایا، لیکن اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اس کے مدفن پر اپنے پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھوں۔ باہر آئیں بلند ہوئیں، تو میں نے خانو کو الوداع کہا۔ ”میں جارہا ہوں دوست، اگر تم یہاں سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے، تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ کفارے کی آس تو آخری سانس تک رہتی ہے۔“ میری بات پوری ہونے سے قبل ہی پہرے دار آہٹے، خانو کی آخری آواز، جو میرے کانوں تک پہنچی، وہ ”رب برا کھا“ تھی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے جیب میں دھکا کر بستی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ پوری بستی کے مرد وہاں موجود تھے، جبروت کے کارندے اور محافظ بھی اسلحہ سنبھالے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ سلطان بابا کو بھی وہاں لے آئے۔ اب شاید صرف جبروت اور اس کے کتوں کا انتظار باقی تھا۔ سلطان بابا میری جانب بڑھے، پہرے داروں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے قلعہ ختم کی اور مجھ پر پھونک دیا۔ ”جب تک ہماری ایک بھی سانس باقی ہے، موت، زندگی کی خود سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے، یہ دنیا صرف ابتدا ہے۔ انتہا کا سفر اس جسم سے پرے شروع ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔“ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، ورنہ میں انہیں آگے بڑھ کر گلے لگا لیتا۔ مجھے اپنے ان آخری سفر سے پہلے اس زاوراہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے شاید میری آنکھوں کی تحریر پڑھ لی اور خود ہی بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا، ”جیتے رہو۔“ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی اس دعا کی اہمیت آج مجھ سے زیادہ بھلا اور کسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں جبروت اپنی مخصوص جیب میں اپنے لاڈلے کتوں سمیت دُور صحرا سے نمودار ہونا نظر آیا۔ ریت سے اٹھتی کرم لہروں کے پس منظر میں اس کی جیب شفاف پانی میں تیرتی نظر آ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ جبروت ایک بہت بڑا شہدہ باز ہے۔ وہ ایسے کھیل صرف اپنی تفریح طبع کے لیے کھیلتا ہے، پھر چاہے وہ رحم اور سیکھ کا معاملہ ہو یا ثوری اور عبداللہ کا قبیضہ۔ دونوں جگہ وہ پوری طرح متاثر تھا کہ ہاں کسی مجاہد کے بھی، مجھے اور رحیم کو وہیں صحرا میں ختم کروا سکتا تھا، بغیر کسی عدالت اور فیصلے کے ڈھونگ کے بھی وہ ہماری جان لے سکتا تھا۔ یہاں اُسے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر آس پاس کے علاقے کی پولیس اور قانون خاموش تھا، تو ضرور اس کے پیچھے بھی اس کا اثر و رسوخ شامل ہو گا۔ کال گڑھ تو ایک بنگلہ تھا اور اس بنگلہ میں صرف جبروت ہی بادشاہ کا قانون چلتا تھا۔ جانے ان نسلوں سے غلام چلے آتے لوگوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں یا نہیں۔ غلامی زنجیروں میں بندھے رہنے کی کاٹا نہیں ہوتا۔ غلامی تو ایک خاص روئے کا نام ہے، جو ذہنوں کو سوز کر لینے سے وابستہ ہے اور جبروت کو پتا تھا کہ ذہنوں کو سوز کیسے کیا جاتا ہے۔ روموں کا تو پتا نہیں، ہرچہ مومنوں کو تسخیر کرنے کے لیے وہ خوف کے ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اُسے لوگوں کو ہیران اور خوف زدہ کر کے مزہ آتا تھا۔ یہ سارا تماشا اس نے اپنے بخون کی سیرابی کے لیے ہی لگا رکھا تھا۔ دو تین سال پہلے میں اور میرا دوست کاشف، لندن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گئے تھے تو ہمیں پکا ڈلی کے علاقے میں ایک عجیب کلب کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہاں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہوئے دیکھا۔ وہاں لوگ اسے ایڈرٹالین رش (Adrenaline Rush) کا کھیل کہتے تھے۔ ہمارے قسم میں موجود ایک ماڈل (ہارمون) کے بچے کا تعلق شدید خوف سے ہوتا ہے، مغرب میں جہاں لوگ ہر قسم کے تعیش اور تجربے سے گزر چکے ہیں، ان کے لیے زندگی ایک بے کیف ماحول بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے میں کچھ من چلے اپنے جسم میں خون کی روانی بحال رکھنے کے لیے عجیب و غریب قسم کے مشاغل اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی بہت بلندی سے چھلانگ لگا لیتا ہے، کچھ سانس بند کرنے کی کوشش میں جان سے جاتے ہیں، کچھ بوالور کے ایک جیمبر میں گولی رکھ کر فریگر دبانے کا کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ وائٹ گولڈ (ہیرڈن کی ایک نئی قسم) کے سٹوف کو اپنے خستوں کے ذریعے، اس طرح دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں کہ پھر وہ سدا کے لیے کسی اور جہاں کے باسی بن جاتے ہیں، لیکن اس ایڈرٹالین رش کا یہ جان لیوا نشہ باقی تمام نشوں کا سر تاج بن جاتا ہے۔ وہ غم و کدوموت کے منہ میں دھکیل کر اس قضا کو کل پل اپنی رگوں میں اترتا ہوا محسوس کرنے میں ایسی سدا بہار لذت پاتے ہیں، جو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ جبروت بھی ایسے ہی کسی لٹے کا شکار اور رسیا تھا۔ یہ بات مجھے اُسی دن محسوس کر لینی چاہیے تھے، جب میں نے اسے کچھ سے اپنے کتے لڑاتے اور خون کے چھینٹے اڑتے دیکھ کر یہ جانی انداز میں خوشی مناتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹھیک ایسی ہی خوشی، وہ اس وقت بھی محسوس کرتا ہو گا، جب اس کے پالتو ڈھکاری صحرا میں اپنے ڈھکاری کا بھائی کر کے اس کے خون آلود کپڑے اپنے جڑوں میں دبائے واپس اپنے آقا کے پاس دوڑے چلے آتے ہیں۔ مغرب ایسے جنونیوں کی داستانوں سے بھرپور ہے، جو صرف مہمان کی خاطر قاتل بنے اور پھر کبھی جیک دی رپر کبھی فریڈلکسٹائن اور کبھی فریڈی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ٹھیک اُسی طرح اس وقت میرے سامنے جیب سے اُتر کر اپنے کتوں کو وہ الہانہ پیار کرنے والا یہ بخونی شخص بھی کسی ایسی ہی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا، جسے خود کو جابر سے جبروت بنانے میں جانے کتنے سال لگے ہوں گے۔ کہتے ہیں، نام بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ تو میں اپنے سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔ جبروت اپنے کتوں کو پیار کر کے میری طرف بڑھا۔ ”ہاں تو تم تیار ہو، مقابلے کے لیے۔ اب بھی وقت ہے، اگر تم اپنے جرم کا اقرار کرو اور مجھ سے معافی مانگ لو تو تمہاری سزا میں کمی کی جاسکتی ہے، سولوی جی.....“ جبروت کی آنکھوں میں صرف اور صرف تھنک تھی۔ میں نے چند لمحوں کی جانب غور سے دیکھا۔ ”اگر میں نے تم سے معافی مانگ لی، تو تمہارا یہ کھیل ادھورا رہ جائے گا، پھر شاید میں نہیں، تو کوئی اور اس نمون کی بھیئت چڑھ جائے گا، کیوں کہ تمہیں تو بہر حال یہ ٹوٹی ٹنڈا کرنا ہی ہے، کیوں کہ صرف اسی صورت تمہارے اندر بھڑکی یہ لہو کی پیاس، شاید کچھ دنوں کے لیے بجھ پائے گی۔ ہو سکے تو آج یہاں سے فراغت پانے کے بعد شہر کے کسی بڑے ماہر نفسیات سے مل لینا۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔“ وہ کچھ دیر میری جانب عجیب سے انداز میں دیکھتا رہا، پھر سراسر قاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یا تو تم واقعی بہادر ہو یا پھر موت کو اتنے قریب پا کر یہ خوف خود تمہارے ذہن سے مٹ گیا ہے۔ مجھے بھی روتے روتے گولڈر اٹے اور بیروں میں پڑتے دشمن اچھے نہیں لگتے، لہذا میں انہیں بھی مارتا تو ضرور ہوں، لیکن عزت کی موت نہیں۔ تم نے الہت آج اپنے لیے ایک ہاوقار موت مٹی ہے۔ اطمینان رکھو، تمہاری موت کے بعد بھی کال گڑھ میں تمہارا نام غیرت مند دشمنوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔“ جبروت اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہجوم اور سلطان بابا پر الوداعی نظر ڈالی اور صحرا میں دوڑ شروع کرنے کے نشان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے غزاتے، گھبروتے اور اپنے خوں خوار جڑوں سے رال نکالتے قد آور کتوں کے بے حد قریب سے گزرا گیا، تاکہ وہ

میرے جسم کی بُو کو اپنے دماغ کے ٹکڑوں میں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ جس وقت میں ان چھ کٹوں کے قریب سے اپنا جسم اُن کے جڑوں سے کٹ کر تے ہوئے گزر رہا تھا، میری رگوں میں ایک عجیب سی جھنجھٹ پیدا ہو رہی تھی، شاید میرے اندر بھی اُسی ایڈرنالین نامی ہارمون کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا، جس کی لذت پانے کے لیے جبروت تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری اور اس کی کیفیت میں فرق صرف اتنا تھا کہ میری کیفیت میرا موقع خون بہنے کی وجہ سے تھی، جب کہ جبروت کا ایڈرنالین دوسروں کا خون بہتے دیکھ کر اس کے اندر دوڑتا تھا۔ اُس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا ”اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان کٹوں کے پٹے کھول دیے جائیں گے۔ تم یہاں سے ٹھیک اپنی سیدھ میں دوڑو گے تو ایک گھنٹے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے۔ بس، شرط صرف اتنی ہے کہ میرے یہ پالتو شیر اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ جائیں۔ اور ہاں بے فکر رہو۔ یہ سدا ہائے ہوئے ہیں، لہذا یہ اسٹیشن کی قمارت دیکھتے ہی دُور سے پلٹ جائیں گے۔ تو کہو، تم تیار ہو؟“ میں نے سر ہلا کر ”ہاں“ کہا اور جبروت کا اشارہ پاتے ہی سحرائیں دوڑا گا دی۔

پہلے دو تین منٹ تو مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا، لیکن جیسے ہی میں نے پہلا نیلا پارکر کے خاؤ کی ہدایت کے مطابق اپنے منہ کے اتارے، ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے ہزاروں ننھے ننھے انکارے میرے ٹکڑوں سے ہوتے ہوئے دھون کے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے اور میں نے بے اختیار اپنی ہتھیلیوں سے اپنے ٹکڑوں کو یکے بعد دیگرے اس آگ کی پیش سے بچانے کی کوشش کی، لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ میں یہ سب کچھ کر پاتا۔ میرے ذہن میں بار بار خاؤ کا ایک جملہ گونج رہا تھا ”یاد رکھنا، جنہیں ہر حال میں بس دوڑتے ہی رہنا ہے۔“ میں نے شدید تکلیف سے کراہتے ہوئے مجبوراً اس آگ کے سمندر میں دوبارہ پاؤں ڈال دیے۔ سحر کے پہلے پانچ منٹ ہی نے میرا وہ حال کر دیا تھا، جو کسی ایسے ذہنی حال شخص کا ہو سکتا تھا، جو اس پتے پر ایک زار میں برسوں سے بھٹک رہا ہو۔ میرے ہونٹ خشک ہو کر پھٹنے لگے۔ سانس دھونکی کی طرح چلتے، سلق میں ہزاروں کانٹے پھنس گئے۔ بے اختیار میں نے منہ سے سانس لینے کی کوشش کی تاکہ سلق میں گئی آگ کو کچھ ٹھنڈک ملے، لیکن پہلے ہی سانس میں اڑتی ریت کے ٹکڑے سے ہزاروں فوڑے کسی خاردار تار کی طرح میرے ٹکڑے سے ہوتے ہوئے سانس کی ٹالی میں انک کے ارنجھے زوردار کھانسی کا پھندہ لگا۔ میں کرتے کرتے پھا۔ خانو کی آواز پھر ذہن کے کسی گوشے سے نکرائی ”منہ سے سانس لینے کی کوشش کبھی نہ کرنا“ میں نے اپنے ہونٹ سختی سے جھنجھکی لیے۔ پانچواں ٹیلہ پار کرتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پاؤں کے ٹکڑوں میں پہلے منٹ میں کھاتے اتارتے ہی جو چھالے بنے تھے، وہ ایک ایک کر کے پھٹنے لگے اور مجھے ہر چھال پھٹنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے میرے بیروں پر ہزاروں نشتہ لگا کر مجھے ان گھلے دھموں کے ساتھ نمک کے سمندر پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ نمک میرے گھلے منہ والے دھموں سے خون میں مل کر اسے جلا رہا ہو، کھولا رہا ہو۔ اس شرش نمک کی کڑواہٹ مجھے اپنے حلق میں، سارے جسم میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ دسویں منٹ کے ختم ہوتے ہی، وہ پتے بہنم جیسا سحر امیر سے ساتھ کھیل کھیلنے لگا۔ مجھے اپنے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹھانیں مارتا ایک وسیع سمندر دکھائی دیا۔ اسے اتنا بہت سا پانی۔ میں اپنی سست بھول کر اس جانب لپکا۔ میرے اندر بیٹھا خانو چلا ”براہ راست سورج کو نہ دیکھنا.....“ لیکن کچھ لمحے پہلے ہی میری نظر اس قہر برسات کو لے کر غیر اختیار طور پر پڑ چکی تھی۔ یہ سامنے بہتا سمندر اور شفاف لہریں، اسی سورج کی چمکتی کرنوں سے ملی میری نظر کا شائبہ نہ تھیں۔ مجھے زور کا ایک جھلر آیا اور میں اپنی ہی جھومک میں لڑھکتے ہوئے ٹیلے سے نیچے جا کر۔ میری آنکھوں میں ریت پڑ گئی اور کچھ دیر کے لیے میں اندھا سا ہو گیا۔ اچانک دُور کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ میری ساری جسمیں جیسے ایک ساتھی، بیدار ہو گئیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ جبروت نے اپنے نکتے میرے تقاب میں کھول دیے ہیں۔ اگر مجھے یہاں یہ آواز سنائی دے رہی تھی، تو اس کا سانس مطلب یہ تھا کہ میں اتنی دیر تک دوڑنے کے باوجود ابھی آغاز کے مقام سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ سامنے ہی میری حلقی آنکھوں نے ساتویں ٹیلہ کے آثار دیکھے اور میرے شدید جھکے، ٹوٹے اور شکستہ جسم نے ایک اور کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ٹھاٹھ نے کیا کہا تھا۔ ساتویں ٹیلے سے دائیں یا بائیں.....؟ شاید دائیں.....؟ نہیں نہیں، بائیں جانب، لیکن..... شاید دائیں.....؟ میں سر ہٹ دوڑتا رہا تھا، لیکن میرا ذہن جیسے سن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتواں ٹیلہ ریت کی ایک ڈمیری سے بڑا ہوتے ہوئے ایک چھوٹی پہاڑی میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر جیسے ہی میں دوڑتے ہوئے اس کے اوپر چڑھا، تو میرے ذہن نے میکانیکی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ دائیں جانب..... اور میں مشینی انداز میں داہنی طرف مڑ گیا۔ شدید پیاس سے میرا اندھا حال ہو رہا تھا، بس ایک بُو بند پانی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی، پھر چاہے مجھے موت ہی کیوں نہ آجائے۔ اچانک میری نظر دُور صحرائیں چمکتے ایک پتے پر پڑی، جو دھوپ کی کرنوں میں جھلک رہا تھا، لیکن یہ طلائی پتہ، یہاں.....؟ اور پھر وہ جھلکنا تاکہ بڑا ہوتا گیا۔ ارے..... یہ تو لوہے کی ایک بڑی سی پرات تھی۔ کہیں، وہ میرے خدا، یہ تو چھوٹا سا جو بڑا تھا، پارٹ کے پانی سے بنا ایک چھوٹا سا جو بڑا، جو ایک بڑے ٹیلے کی آڑ میں معمولی رخ پر اس طرح بنا تھا کہ دھوپ براہ راست وہاں نہیں پہنچ پاری تھی۔ کیا دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ کیا اس صحرا سے عرش بریں کچھ زیادہ ہی قریب تھا یا پھر میرا آخری وقت قریب آ رہا تھا کہ فرشتوں نے میرے حساب کتاب کے تحت سمیٹے سمیٹے میری آخری دعائیں بھی سمیٹی شروع کر دی تھیں؟ میں کسی دیوانے کی طرح دوڑتے ہوئے جو بڑے قریب پہنچا اور میرا شدید بچی چاہا کہ اپنا سر اُس گدے پانی میں ڈال کر وہیں پڑ جاؤں۔ اس وقت وہ چھوٹا سا جو بڑا، کیا، میں پورا دیر یا بھی ایک ہی گھونٹ میں لپی جانا چاہتا تھا۔ ”خبردار..... گھونٹ بھر پینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دل بند ہو جائے گا۔“ میں نے سر جھکا ”نہیں، اب اور کوئی نصیحت نہیں۔ اس شدید پیاس کے عالم میں سرنے سے تو بہتر ہے کہ میں دو گھونٹ لپی کر ہی سر جاؤں۔“ اُس وقت مجھے ادراک ہوا کہ لوگ سرنے سے پہلے پانی کیوں مانگتے ہیں۔ میری سُوں میں بہتا ٹون گاڑھا ہو کر میرے اندر موجود پانی کا آخری قطرہ تک پکڑ چکا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کھینچی پر پھنکی میری بس اس زور سے پھٹے گی کہ سارے صحرا کو لال کر جائے گی۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں میں پانی بھرا اور خاؤ پھر جسم سے کود کر میرے سامنے کسی کے ہندھے ہاتھوں کی صورت آن کھڑا ہوا ”نہیں عبداللہ، نہیں، یہ پانی نہیں سونٹ ہے۔“ دفعتا میری ہتھیلی میں کوئی بوئی سوئی زور سے گونجی۔ تکلیف سے میری آنکھیں ٹپٹپٹے ٹپٹے رہ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن کے کنارے میں ابھی تک جو بڑے لگا گیا پانی ٹپک ٹپک کر رہا تھا۔ ایک لمبی اور سوئی سی کالی جو تک میری ہتھیلی کی جلد میں باس تک اسے نوکیلے دانٹ گاڑ چکی تھی اور ایک دوسری ہو تک چلتی ہوئی میری کلائی کے قریب ٹون پھر سنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر پانی پینک دیا۔ کلائی والی جو تک تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی گر گئی، لیکن ہتھیلی والی سرمئی ہو تک، میرے سیاہ مقدر کی طرح میرے گوشت سے چھلکی ہی رہی۔ درد، جلن اور جھپن کی ایک کھٹی لہر میری انگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی، پورے بازو میں پھیل گئی۔ میرا ہاتھ نیلا پڑنے لگا اور میں نے بے اختیار شدید تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ گرم حلقی ریت میں گھونپ دیا۔ جو تک کی نازک اور لہلہ سی نائیلی جلد سے شدید تپتی ریت نکرائی، تو بھلی سی ایسی آواز بلند ہوئی، جیسے پلٹے ہوئے انگاروں پر کوئی پانی کا چھینٹا مار دے۔ جو تک تپ کر اُچھلی اور اس کا نوکیلا ڈنک میری ہتھیلی سے نکل گیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے رومال نکال کر پانی میں جھگو پیا اور اسے اپنے خشک خنکتے ہونٹوں سے لگا لیا۔ میرے ہونٹوں کی جلی ہوئی جلد کو ذرا سی نمی منتہر آتی، تو ان کی حالت مزید خراب ہو گئی اور ٹون کی پتلی سی چند ٹکیریں رومال کی سطح پر اٹھ آئیں۔ دوسری طرف یہی گار رومال میں نے پھر سے پڑھیرا اور تیسری مرتبہ اسے جھگو کر کے اپنے سر پر باندھ ہی رہا تھا کہ مجھے میری تعداد کی آوازیں ملانی دینی لگیں۔ ہاں..... یہ وہی بھولتے ننٹوں کے دوڑنے اور طرزانے کی آواز تھی۔ مطلب وہ قریب تر ہو رہے تھے، میں اُنھ کو بھانکا۔ فی الحال وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے اور مجھے ایک لکڑیاں یہ بھی لگا کہ ساتویں ٹیلے کے بعد اگر وہ اپنی جو تک میں مزید کچھ آگے بڑھ گئے، تو انہیں پلٹنے میں دو چار منٹ مزید لگیں گے، کیوں کہ اس وقت صحرائیں چلتی گرم کو کا کر بھی اسی سمت تھا، جس طرف میں دوڑ رہا تھا، لہذا ان تک میرے جسم کی بُو نہ پہنچتے پہنچتے بھی کچھ وقت ضرور لگے گا، لیکن اب خود میری اپنی رُوح دھیرے دھیرے میرے اندر سے برکنا شروع ہو چکی تھی۔ اگر میں پچھلے چھ مہینوں سے سلطان بابا کے ساتھ اتنا بیدل نہ چلا ہوتا اور میں نے جبل پور کے لیرے کے دوران پہاڑی والی درگاہ کے دشوار راستے روزانہ کی بارطے نہ کیے ہوتے، تو میں بھینا بہت پہلے ہی گر چکا ہوتا، کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی میں اسپورٹس کے بعد صرف ایک گھنٹہ روزانہ اسکو اش کا کھیل ہی میری واحد ورزش رہ گیا تھا اور آج اس صحرا نے مجھے ”دوڑ“ کا اصل مطلب سمجھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں، میں نے ریت کے ٹکڑوں کے عقب سے اُس پہلے عفریت کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا شک صحیح تھا۔ ساتویں ٹیلے کے بعد وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے اور یہ پہلا تھا، جس نے میری بُو پالی تھی۔ میرے قدم تیز ہو گئے، لیکن اس کی غرائشیں بتدریج قریب آنے لگیں۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میری ابھی سانسیں خود ایک غراہٹ میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر بھی تو ایک درندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اُن آخری لمحات میں میرے اندر کا درندہ بھی بیدار ہو گیا۔ اب میں مبدلہ یا ساغر نہیں..... صرف ایک انسان باقی رہ گیا تھا، جسے اپنی جان بچانے کے لیے ایک ٹوٹی معصیت کا سامنا تھا۔ پتھر کے دور کے انسان کی تمام جہلیں ایک دم ہی میرے اندر

اگر لڑائی لے کر جاگ چکی تھیں اور اب دوڑتے ہوئے میری نظر چاروں جانب کچھ ایسا تلاش کر رہی تھیں، جسے میں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ غزائیں اب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ریت پر دوڑنے کی دھمک اور دھپ دھپ کی آوازیں، میرے حواس معطل کیے دے رہی تھیں۔ میرا دشمن بہترین سدھائے ہوئے شکاری کی طرح ہٹا بھونکے اور حتی الامکان آواز نکالے بغیر میرے تعاقب میں تھا۔ اچانک ریت میں دہلی ایک خشک ٹہنی نما لکڑی پر میری نظر پڑی اور میں اسے اٹھانے کے لیے جھکھا اور یہی میری غلطی تھی۔ لکڑی اندر تک ریت میں پھنسی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ جھٹلنے کے باوجود وہ پوری طرح باہر نہیں نکلی، لیکن اسی اثناء میں پہلا دشمن میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے دوڑتے ہوئے بناؤ کے مجھ پر زقہ بھری اور ٹھیک اُسی لمحے وہ لکڑی ریت سے نکل آئی، جسے میں وحشیانہ انداز میں طاقت لگا کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے غیر اختیاری طور پر وہ خشک لکڑی پوری قوت سے فضا میں لہرائی اور پتا نہیں کتنے کو وہ چھڑی کتنی زور سے لگی کہ اس کے منہ سے ایک سسکی کی آواز نکلی۔ میں ایک جانب اور وہ دوسری جانب جاگرا، لیکن اس نے پلٹ کر جھپٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا، لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری تھی، لہذا اب مجھے اپنے شکستہ بازوؤں ہی پر بھروسہ کرنا تھا، لیکن وہ بھاری بھر کم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرنا، تو میرے ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اس کے ٹوٹی پنچے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں مر چیں بھر گئیں۔ اس کی غزائیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوحنی سے بہتی رال کا دھارا سین میری بائیں آنکھ کے اوپر لپک رہا تھا۔ اس کے کھلے جبروں کے چاروں کونوں سے جھانکتے، وہ چار لمبے نوکیلے دانت سین میری شہ رگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نظریں، وہ جھپٹایا ہوا تھا، اسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اس کی نظر نے میری نظر سے کہا ”زیادہ مت تڑپو..... اپنی جان مجھے سونپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا.....“ میرے اندر کا دردندہ غزایا۔ ”نہیں، اتنی آسانی سے نہیں.....“ اچانک ہی مجھے اس بے بس رچھ کے پینترے یاد آ گئے۔ وہ رچھ اس طرح کے کئی عفریتوں سے ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہوئے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی کے دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے زخروں کو ان کٹوں کے جبروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب ان سدھائے ہوئے کٹوں کا پہلا نشانہ مقابلہ کی شہ رگ ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر بیٹھا میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگرے پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتنے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی، بلکہ اس کی مستقل غزائیں اور سانس کی خراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر کتنے کی آواز سے یہ وحشیانہ صفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمارے ہاتھوں بیروں میں سے آدھی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید یہی اثر سانپ کی مچھنکار اور کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک اس کے چہرے کو اس کا گاد باکر، اپنے چہرے سے دور رکھنے میں کامیاب تھا، لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام یابی عارضی ہے، کیوں کہ میرے بازو شل ہو رہے تھے اور اس کے پنچے میرے مارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑے جا رہے تھے۔ اچانک میری منٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اس کی قابل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اس کی گرفت کم زور پڑ گئی۔ میں نے پوری قوت لگا کر اسے اپنے اوپر سے اچھال کر دور پھینک دیا۔ میرا لڑتا جھپٹنے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً اسے جسم سے علیحدہ کیا اور اپنے کھچے کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح گس کر باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہ رگ تھی، تو مجھے سب سے پہلے اسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی، تب تک میرا دشمن اپنا جسم جھنک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ پھاڑتا اور پھر میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اسی اثناء میں پچھلے نیلے کی جانب سے اس کے گروہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے ٹوٹی سے وحشیانہ آوازیں بلند کیں۔

میرے آخری لمحے شروع ہو چکے تھے۔ میری پوری کوشش کے باوجود میری رفتار مدہم پڑ چکی تھی اور قدم ریت میں دھلنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے تین طرف سے وہ تین کتے، میری جسم کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے اڑے چلے آ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے سلطان بابا نظر آئے ”موت صرف جسم کا مقدور اور روح کی زندگی کی ابتدا ہے۔“ موت کے بارے میں ہم سب ہی ساری زندگی سوچتے ہیں، سنتے ہیں بات کرتے ہیں، لیکن ٹھیک اسی لمحے میں، میں نے خود پر موت کو وارد ہوتے محسوس کیا، ”اچھا تو یہ ہے وہ فسانہ، جس کا سارے شہر میں چرچا تھا۔“ اچانک مجھے سانول کی بانسری سنائی دی۔ وہ دُور سے ہاتھ ہلا ہلا کر مسکراتے ہوئے، مجھے بلارہا تھا، نہیں..... سانول کی بانسری نہیں..... یہ تو اس پیانو کی آواز تھی، جو پاپا ہمیں بچپن میں روزانہ ڈنر کے بعد میری اور ماما کی فرمائش پر سناتے تھے۔ ماما اور پاپا سفید ملبوسات میں اُسی بڑے سے کالے پیانو کے پاس کھڑے مجھ سے کہہ رہے تھے، ”بس کرو صاحب، اب گھر واپس آ بھی جاؤ۔ کتنا انتظار کرواتے ہو تم۔“ کچھ ہی دیر میں اُسی پیانو کے سامنے زہرہ سیاہ لباس میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ”ساحر کیا میری ہر محبت ہمیشہ یونہی تشنہ رہے گی؟“ میں نے گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو کاشف اور میرے باقی سارے دوست کالج میوزک شو کی تیاری کے لیے ڈرم اور گٹار بجا رہے تھے۔ کاشف چلایا ”اوئے ساحر کے بچے! آج پھر پریکٹس پر نہیں آئے تم۔“ نہیں یہ کالج کا ڈرم تو نہیں تھا، یہ تو وہی ڈھول تھا، جو جبروت کے ہر کارے رچھ اور کٹوں کی لڑائی کے دوران پیٹ رہے تھے۔ کتنے..... ہاں..... میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں..... میں ریت پر اوندھے منہ گر ا ہوا تھا، تینوں کتے میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے کراہ کر روٹ بدلی۔ سورج کی آگ برساتی کرنوں کا زوردار چائنا میرے گالوں کو ٹھسٹا گیا۔ ڈوبتی آنکھوں سے میں نے تین طرف سے بڑھتی موت کو گلے لگانے کے لیے سورج کو آخری الوداع کہا، لیکن یہ کیا.....؟ کتنے میرے قریب آ کر رک سے گئے۔ کیا وہ مجھ سے میری آخری خواہش پوچھ رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے سر کی پچھلی جانب بھی کچھ غزائیں بکھڑ ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ باقی تین کتے بھی آن پہنچے تھے، لیکن اس وقت میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھ لیتا۔ سامنے والے تین دشمنوں میں سے ایک نے غزا کر اپنا جسم تولا۔ اس کی ہڈیاں زقہ لگاتے سے پہلے جسم کے اندر چھنیں۔ اس نے اپنا سارا بوجھ اپنے پچھلے بیروں پر ڈالا اور ہوا میں میری جانب اُچھلا۔ میں نے آسمان پر پکھلتے سورج کو اُس کے وجود کے پیچھے پیچھے دیکھا۔ مجھ پر دشمن کے قہر کا سایا ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گرنا، ایک عجیب بات ہوئی۔ ابھی دشمن کا جسم ہوا ہی میں معلق تھا کہ ایک اور جسم زوردار چنگھاڑ کے ساتھ غزاتے ہوئے دشمن کے جسم سے لپٹا، بکرایا اور اُسے اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے مجھ سے دُور لے جا کر ریت پر گر گیا۔ چند لمحوں کے لیے چھپا سورج پھر سے میری پلکوں میں نہر چھیاں گھونپ گیا اور میری آنکھیں پھر سے پُختہ حیا گئیں۔ غزائیں اب باقاعدہ چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ میں نے بمشکل پلٹ کر روٹی اور حتی الامکان سر اٹھا کر اپنے اس محسن جسم کو دیکھنے کی کوشش کی، جس نے ہوا ہی سے میری جانب اُڑ کر آتی قضا کو اُچک لیا تھا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دشمن کو ہوا ہی میں دبوچ لینے والا ”کالا“ تھا۔ وہ اور اس کے گروہ کے باقی دو ساتھی سین تانے میرے اور میرے تین دشمنوں کے درمیان صحرا میں کھڑے تھے۔ اس وقت دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظروں نظروں میں قول رہے تھے، غزا رہے تھے، دھمکا رہے تھے۔ میں کراہ کراٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا، اس وقت میں کالے اور دشمنوں کے گروہ کے درمیان ہوتی گفتگو سمجھ سکتا ہوں۔ دشمنوں کا سر غنہ بولا ”تم ہمارے پرانے ساتھی رہے ہو، اس لیے ہم تمہارا لحاظ رکھ رہے ہیں۔ ہٹ جاؤ، ہمارے راستے سے..... ہمیں اس کی شہ رگ چیر کر اپنے آقا کے پاس لے جانی ہے۔ وہی آقا، جو کل تک تمہارا بھی مالک تھا۔“ کالا جواباً غزایا ”نہیں..... وہ کبھی میرا مالک تھا، لیکن اب یہ بھی میرا دوست ہے۔ میں تم کو اس کی جان نہیں لینے دوں گا۔ تم لوگ واپس پلٹ جاؤ.....“ سر غنہ بھونکا۔ ”بس بہت ہو چکا..... کچھ ہی دیر میں میرے تین مزید ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پرانے انسان کے چکر میں ہمارا اپنا پڑا نا ساتھی اپنی جان سے جائے۔ ہم نے بہت سے مقابلے ساتھ جیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی جنگیں ایک ساتھ لڑی ہیں۔ اپنی یہ آخری جنگ ہمارے خلاف نہ لڑو۔ یہ انسان بڑے کم ظرف اور احسان فراموش ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اپنے ساتھ، اپنے ان دو بے وقوف ساتھیوں کی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہ تو ہماری طرح سدھائے ہوئے ہیں، نہ ہی لڑنا جانتے ہیں ہٹ جاؤ.....“ کالے نے جسم تولا..... ”اگر یہ آخری جنگ ہے تو میں اپنی یہ آخری لڑائی ایک غذا اور احسان فراموش بن کر نہیں..... بلکہ ایک دوست بن کر لڑوں گا۔“ اس نے دُور سے باقی تین کٹوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں لگیں۔ سر غنہ نے فاتحانہ انداز میں کالے کی جانب دیکھا ”اچھا تو پھر ٹھیک ہے..... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ.....“

(باقی آئندہ)



.....ہاشم ندیم.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سرستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

اس جنگ میں اپنے ساتھ مزید تین ساتھیوں کو پا کر میرے اندر زندگی کی نئی رمت جاگی۔ باقی تین دشمن ابھی کچھ فاصلے پر تھے، لیکن صحرا میں ان کے وحشیانہ انداز میں بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب آرہی تھیں۔ سامنے والے تین دشمنوں نے پینتر بدل کر مجھ پر چھپنے کی کوشش کی، لیکن کالا اور اس کے گروہ کے باقی دو جانباز اب میرے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی دشمن تین سے چھ ہوئے، تب شاید میرے یہ تین وفادار بھی کچھ نہ کر پائیں، کیونکہ ان میں سے صرف کالا ہی باقاعدہ سہد حایا ہوا تھا اور وہی اس خوش لڑائی کے کڑ جانتا تھا، بہتر یہی تھا کہ ان تین دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر میدان جنگ تبدیل کیا جاتا رہے اور پھر مجھے تو ہر حال میں آگے ہی بڑھتے رہنا تھا۔ سو، میں ایک بار پھر ہمت مجتمع کر کے اٹھا اور دشمنوں سے پہلو بچاتے ہوئے صحرا میں سڑک کی سمت دوڑنے لگا۔ دشمنوں کے سرغنہ کو کالے نے کچھ دیر الجھائے رکھا، پھر دشمن کو بھی سمجھ آگئی کہ کالے اور اس کے ساتھیوں سے بھڑنے کی صورت میں ان کا اصل شکار ہاتھ سے نکل جائے گا، لہذا وہ بھی لڑائی چھوڑ کر کچھ وقفے سے میرے پیچھے لپکے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ سب سے آگے میں، میرے پیچھے پہلے تین دشمنوں کا گروہ، ان کے پیچھے کالا اور ساتھی اور سب سے آخر میں نئے تین تازہ دم دشمن..... یہ زندگی و موت کی دوڑ اب دھیرے دھیرے میری روح کے ریٹے ادھیڑ رہی تھی۔ شدید ترین تھکے ہوئے انسان کی روح شاید سانس بند ہونے سے نہیں، بلکہ تیز تر چلتی سانسوں کے ذریعے ہی جسم سے نکلتی ہے۔ اچانک میرے پیروں کے نیچے زمین سخت ہوتی گئی اور پھر میرے منہ سے ایک طویل کراہ نما چیخ نکل گئی۔ میرے ننگے پیر میں ہاتھ کی انگلی جتنا ایک کاٹنا اس طرح گھسا کہ تلوے کو چیرتا ہوا اوپر سے نکل گیا۔ میں اسی قدم لڑکھڑا کر گر اور پاؤں جیسے شل سے ہو گئے۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کیں اور کانٹے کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر پاؤں سے علیحدہ کر دیا۔ اچانک میرا دھیان نیچے میں اٹکے اپنے جوتوں کی جانب گیا، جو میں نے شروع ہی میں خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جسم کے ساتھ کس کر باندھ لیے تھے۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے۔ زمین سخت ہو رہی تھی، جس کا مطلب تھا کہ اب سڑک کہیں قریب ہی تھی۔ کتوں کی آوازیں بھی پچھلے ٹیلے تک آ پہنچی تھیں اور پھر پہلے تین کا دشمن گروہ، میرے سر پر آن پہنچا۔ اس بار سرغنہ نے پیچھے سے میری گردن میں جھڑے سے وار کیا، لیکن میرے گلے میں بندھی قمیص کے جھتکڑوں کی وجہ سے اس کے دانت ماس میں ٹھیک طرح سے کھب نہیں پائے، لیکن میں اس کے دھکے سے اپنی جھونک میں سامنے جا گرا، تب تک میرے ساتھی بھی پہنچ چکے تھے۔ کالے کا ایک ساتھی، جو میری پہرے داری کے لیے میرے سر کی جانب کھڑا ہو گیا تھا، اسے سرغنہ نے ایک زوردار پنجہ مارا اور خون کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگو گئے۔ کالا بھی نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا، لیکن اب دشمنوں کی تعداد چھ ہو چکی تھی۔ میں جب دوڑتے ہوئے آخری ٹیلے پر پہنچا، تو بہت دور کالی تارکول کی سڑک کسی باریک دھاگے کی طرح نظر آرہی تھی۔ میں نے ٹیلے کے دوسری جانب اترتے ہوئے آخری مرتبہ پیچھے نظر ڈالی، تو کالے سے میری نظر کرائی۔ مجھے یوں لگا، جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہوں ”ہم نے اپنا نمک حلال کر دیا دوست! اب آگے تم جانو اور تمہاری قسمت.....“ لیکن سارا روٹا ہوا تھا تو اس مقدر کا تھا، تارکول کا باریک دھاگا دھیرے دھیرے چوڑا ہو رہا تھا، لیکن میرے پیچھے تین عنفریت اب بھی اسی رفتار اور جوش سے دوڑے چلے آ رہے تھے، ان میں سے ایک کے زخروں سے لگاتار خون بہہ رہا تھا۔ دفعتاً وہ لڑکھڑایا اور وہیں صحرا میں گر کر رہنے لگا۔ خود میری حالت بھی اس بل جیسی تھی، جسے زندہ جلتے انگاروں کے اوپر سٹخ میں پرو دیا گیا ہو۔ اب مجھ میں ایک قدم بھی مزید دوڑنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی، لیکن دشمن تھا کہ میری جان بخشے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ اچانک میرے پیروں کے نیچے کسی نرم اور کھلجی سطح کا احساس ہوا اور میرے جوتے چپکنے سے لگے۔ ارے یہ تو وہی سڑک تھی، جسے میں اب بھی بہت دور دیکھ رہا تھا۔ یہ سڑک صحرا کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی اور اس کے جس ٹکڑے کی طرف میں بھاگ رہا تھا، وہ اسی سڑک کا تسلسل تھی، لیکن یہ ٹکڑا ریت کے طوفان کی وجہ سے شاید نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ میرے جوتے اسی سڑک کی گرمی اور دھوپ سے پچھلے تارکول کی وجہ سے چپک رہے تھے۔ خانو کی آواز پھر سے میرے کانوں میں گونجی۔ ”اگر تم اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، تو سمجھو کہ تم نے آدھی جنگ جیت لی۔“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دونوں دشمن کف بہاتے، رال پکاتے اور اپنے مضبوط پنجوں سے بھاگتے، اسی رفتار سے میرے تعاقب میں آ رہے تھے، بلکہ یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے پیچھے دووں کی پچی کھی سانس بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھیں، ویسے بھی اس ایک زندگی کے لیے ان پیچھے دووں کے تمام غلیوں کو جس قدر مشقت سرانجام دینی تھی، جھپٹے دو کھنٹوں میں وہ اس سے کہیں زیادہ محنت کر چکے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نظر آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ شاید وہ میری آخری دعا کا وقت تھا، پتا نہیں، ہم ہمیشہ دعا کرتے وقت ہر بار اپنی نظر آسمان کی جانب کیوں اٹھاتے ہیں، اپنے دل کی جانب کیوں نہیں دیکھتے، کیا یہ بھی ہمارے کمزور ایمان کی نشانی نہیں ہے۔ کیا وہ صرف آسمان ہی پر بیسرا کرتا ہے۔ میری اس آخری اٹھی نظر نے بھی اسی لمحے مجھے میری ”بے ایمانی“ کی سزا دے دی۔ میرا سر سورج کی تیز روشنی دیکھ کر زور سے چکرایا اور جب تک میری نظر پلٹ کر زمین کی طرف آئی، میری آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں کسی مدہوش سے نوش کی طرح لڑکھڑایا اور اگلے ہی لمحے نرم، کھلجی سڑک پر چاروں خانے چت پڑا تھا، میری کہنیاں اور گھٹنے جھل کر سیاہ ہو چکے تھے۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ جسم کا ایک ایک ریشہ اس قدر شدید تھکن سے پھوٹا تھا کہ اب مجھے دوڑتی، غراتی، رال پکاتی اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی وہ موت بھی ایک لمبے اور آرام دہ سکون کا ایک وقفہ ہی لگ رہی تھی۔ ہم زندگی بھر اس بے وفاز زندگی کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دیتے ہیں، ایذا دیتے ہیں، لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ صحرا میں آج اس دو گھنٹے کی دوڑ اور اس لمحے میری طرف بڑھتی موت نے زندگی کا سارا فلسفہ خوب اچھی طرح مجھے سکھا دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح کے ان سب انسانوں کو، جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیو اور بچینے دو کے اصولوں کو بھول چکے ہیں، ایک بار صحرا کی اس دوڑ میں لاکھڑا کروں اور جب وہ بھی میری طرح ٹھہر جائے ہو کر گر پڑیں، موت اپنے خونیں جہڑے ان کی ہڈیوں میں پیوست کرنے لگے، تو ان سے بھی ایک ہی سوال پوچھوں، ”کیا یہ بے وفاز زندگی واقعی اس قابل تھی، جس قدر تم نے اسے پیار دیا؟“ میرے دشمن بس اب چند لمبے دور تھے، میں

نے ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں سے ان میں سے اگلے والے کو مجھے یوں زمین پر بے بس گرا دیکھ کر خوشی سے ہوتے ہوئے سنا، انہیں بھی تو عرصے بعد کوئی ایسا دشمن میسر آیا تھا، جس نے آج ان کے مساموں سے بھی پسینہ چھلکا دیا تھا۔ آخری لمحے میں، میں نے اس کے خونیں جڑے کو ایک خاص زاویے پر گھلتے اور اس کے چار لمبے نوکیلے دانتوں کو خاص میکانزم کے تحت آگے نکلتے ہوئے دیکھا، ظاہر ہے کہ اس قاتل جہلت کا خاص نشانہ میری شہہ رگ ہی تھی، میرے دل نے کہا ”خوش آمدید“ اور ٹھیک اسی لمحے فضا میں فائر کی ایک آواز گونجی، دشمن کی اپنی شہہ رگ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا اور مجھ سمیت سڑک کے ایلٹے تار کو ل کورنگ گیا۔ زمین پر خون گرنے سے ایسی آواز ابھری، جیسے شدید گرم اور پتے ہوتے تو بے پروائی ٹھنڈا پانی چھڑک دے۔ فضا میں ایک نعرہ گونجا ”اللہ اکبر“ اور دوسرے فائر کی آواز آئی۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا پہلا دشمن، بالکل میرے مقابل گرا ہوا تھا اور اس کی گردن سے بہتے خون کی دھار، ہم دونوں کے چہروں کے درمیان ایک چھوٹے سے سرخ جو ہڑ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میری طرح اس کی سانس بھی تیز، لیکن اکھڑی ہوئی تھیں اور ہم دونوں کی اس الجھی سانس کے بہاؤ سے سڑک پر پڑی ریت اور دھول اڑا کر ہمارے چہروں کو خاک کر رہی تھی۔ دشمن کی نبض بھی ڈوب رہی تھی اور آنکھیں میری طرح پلکوں کے بوجھ سے بوجھل ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظر آپس میں ٹکرائی، مجھے لگا، جیسے اس نے مجھ سے کہا ہو ”الوداع اے دشمن! تم نے بھی خوب دشمنی نبھائی۔“ لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھے اور پھر دشمن کی آنکھیں بھی میری آنکھوں کے ساتھ ہی بند ہو گئیں، آخری چند لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی معصومیت دکھائی دی، جو کسی بچے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ واقعی خدا ہمیں اس دنیا میں شفاف اور معصوم ہی بھیجتا ہے، مگر ہم رفتہ رفتہ خود کو مسمیٰ اور داغ دار کرتے جاتے ہیں۔ نفرت، نفیبت، جھوٹ، حسد، برائی اور بے وفائی کے داغ ہماری روح اور جسم سیاہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم خود کتنا ظلم کرتے ہیں اپنی اس روح پر، اپنے جسم پر، کبھی معاشرے کے دھارے میں بہہ کر اور کبھی تو صرف اوروں کی دیکھا دیکھی، ہم اپنے نفس کے غلام بن جاتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو پھر بھی جسم کے گناہ روزانہ وضو کر کے اور روح کے گناہ رات کو سوتے وقت توبہ کر کے دھوئے کی کام یاب یا ناکام سعی کر رہی لیتے ہیں، لیکن ان میں سے وہ، جو میری طرح ان تمام داغوں سمیت ہی دنیا سے رخصت ہونے کو ہوں، انہیں ان آخری لمحوں میں کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف یہی داغ سمیٹنے کے لیے بھیجا جاتا ہے؟ کیا سزا اور جزا کا فیصلہ صرف ان داغوں کی گنتی کم یا زیادہ ہونے ہی پر منحصر ہوگا؟ ”نہ اپنی فحش آئے نہ اپنی فحش چلے.....“ مجھے اس سڑک پر پڑنے ان آخری لمحوں میں ایک عجیب سا اور اک ہوا کہ ہم میں سے زمین پر بسنے والے ہر ذی روح کا سرفرس ”معصوم سے معصومیت“ تک واپسی کی ایک کہانی ہی ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنی انگریزی کی پروفیسر مار تھا سے ایک اصطلاح ہمیشہ سنتا تھا۔ ”Back to the innocent“ لیکن ”معصومیت کی طرف واپسی“ کی اس اصطلاح کا مطلب مجھے اس روز کچھ میں آیا، ہم کامل معصوم پیدا ہوتے ہیں، لیکن گناہ ہمیں غیر معصوم اور عاصی بنا دیتے ہیں۔ دراصل مذہب ہم پر وارداتی اس لیے ہوا ہے کہ وہ ہمیں پھر سے معصوم بنادے اور تمام عمر مذہب کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ ہماری اس ”معصومیت سے معصومیت تک“ کی واپسی کی راہ کو ہم وار کر دے۔ دراصل اس دنیا کا سارا کھیل اور بکھیر اسی معصومیت کی طرف واپسی کا ہے۔ اسی لیے بڑھاپے کو ”دوسرے بچپن“ کا نام دیا جاتا ہے اور شاید ٹھیک موت کی گھڑی میں چند لمحوں کے لیے ہم سب پھر سے معصوم ہو جاتے ہیں۔ تب ہی ہماری کوئل روح کو تحلیل ہونے کا موقع ملتا ہے، ورنہ گناہوں سے لیسڑے اس کثیف جسم کے پنجمرے سے اس نورانی بیوے کا ٹکنا ناممکن ہو جاتا۔ روح جس معصوم وجود میں داخل ہوتی ہے، اسی معصوم وجود کی شفاف حالت ہی میں ہمارے جسم کو چھوڑتی ہوگی۔ کیا میری روح بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میرا جسم تو ابھی گناہوں کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوا تھا، ابھی اتنا ہی کثیف تھا، جتنی بوجھل میری پلکیں تھیں، تب ہی تو آنکھیں کھلنے میں اتنی ہی دیر لگی۔ میرے سر پر سبز آسمان تھا، کیا وہاں فلک کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اچانک میرے کانوں میں آواز گونجی ”اٹھ گیا بھئی جوانا، شاباشے“ میں نے چونک کر دائیں طرف آواز کی جانب دیکھا، رہنبر زکا ایک سپاہی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ اوہ..... تو میں زندہ تھا اور جسے میں سبز آسمان سمجھ رہا تھا، وہ بیراشوٹ کے کپڑے سے بنے ہرے خیمے کی چھت تھی۔ میرے ذہن میں خانو کا آخری جملہ گونجا ”اگر یہ سڑک تمہیں سرحد پر بنی کسی فوجی چوکی تک پہنچا دے، تو سمجھ لینا کہ یہی تمہاری جیت ہے۔“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے پورے جسم میں شدید درد کی ایک ٹیس اٹھی، سپاہی جلدی سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ”اوئے آرام سے جوان آرام سے، پورے چھ گھنٹے بعد تم ہوش میں آئے ہو۔ میرا نام خوالدار شیر محمد ہے۔ ہم چھ سپاہی ہیں، اس چوکی کی دن کی ڈیوٹی پر..... میں ہی شفٹ انچارج ہوں اور اس وقت میں ہی چوکی سے باہر کھڑا علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، جب میں نے دور سے پہلے تمہیں اور پھر تمہارے پیچھے ان کتوں کو دوڑتے دیکھا۔ واہ بھئی..... عجب دوڑتھی وہ بھئی..... اور جب تک میں بھاگ کر اندر خیمے سے اپنی بندوق لے کر آیا، تم زمین پر گر چکے تھے، ٹھیک لمحے پر اپنی بندوق اور اپنا نشانہ آزمانے کو ما۔ خدا نے سرخو کیا، ورنہ مجھے بندوق پر لگے دوہر جینی نشانے پر کبھی بھروسہ نہیں رہا، لیکن مجبوری تھی، کیوں کہ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ بہر حال میں نے اللہ کو یاد کیا اور گولی چلا دی۔ مجھے تمہارے اور اس کتے کے گھڑی سے قریب آتے سروں میں سے کتے کے سر کو علیحدہ رکھ گولی چلائی تھی اور یقین کرو کہ ایک لمحے کے لیے بھی اگر میری انگلی کا پ جاتی، تو مجھے ورنہ میرے کی ماں سے بہت صلواتیں ملنی پڑتیں۔“ خوالدار زور سے ہنسا ”وزیرا، وزیر محمد میرا پانچ سال کا بیٹا ہے.....“ میں نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ ”مجھے کہیں بہت جلدی پہنچا ہے۔“ وہ تو تمہاری دیوانہ وارد و زہی سے پتا چل رہا تھا۔ ویسے تو میں نے قریب یونٹ سے ڈاکٹر کو بلوایا تھا۔ وہ دو گھنٹے پہلے آ کر تمہیں ضروری انجیکشن وغیرہ لگا چکا ہے اور تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر گیا ہے، لیکن اس نے جاتے جاتے یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک ہفتے تک بستر سے اٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا..... ویسے یہ ماجرا کیا تھا.....؟“ میں نے جلدی جلدی شیر محمد کو ضروری تفصیل بتائی کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ شیر محمد حیرت سے منہ کھولے میری بات سنتا رہا اور پھر بات ختم ہوتے ہی اس کی زبان سے جبروت کے لیے ایک موٹی سی گالی نکل گئی۔ ”اوئے..... پر تم اکیلے واپس وہاں پہنچ کر بھی کیا کرو گے جوان..... وہاں تو پھر اس کی پوری فوج بیٹھی ہوگی، تمہارے استقبال کے لیے..... بلکہ شاید اب کتوں کے واپس نہ لوٹنے کی وجہ سے وہ ان کی تلاش میں صحرا کی خاک چھانسنے کے لیے باہر بھی نکل آئے ہوں۔“ خوالدار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آئی جی نصیر صاحب کا خیال آیا۔ کمال آباد اگرچہ یہاں سے تین دن ٹوہین کے فاصلے پر تھا، لیکن ان کے حکم پر کسی قریبی ضلع کی پولیس بھری مدد کو کال گڑھ آسکتی تھی۔ میں نے جلدی سے شیر محمد سے پوچھا ”کیا میں یہاں سے کمال آباد ایک فون کر سکتا ہوں۔“ ”ہاں جی! کیوں نہیں، ایک کیا دس فون کرو۔“ اس نے خیمے میں رکھے ایک پرانی وضع کے لوہے کے ڈبے کو اٹھا کر دو تین مرتبہ اس کی چرخی گھمائی۔ دوسری جانب سے شاید کسی آپریٹر نے اٹھایا۔ شیر محمد نے مجھ سے کمال آباد کا نمبر پوچھا، میں نے اسے بتایا کہ مجھے نمبر تو زہانی یاد نہیں ہے، لیکن کمال آباد میں آئی جی نصیر کا کوئی بھی نمبر ملا دیں۔ آخر کار پانچویں کوشش پر دوسری جانب سے گھر کے نمبر پر پہلے کسی آپریٹر نے فون اٹھایا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سلطان بابا کے حوالے سے عبد اللہ بات کر رہا ہوں اور مجھے نصیر صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کچھ دیر بعد دوسری جانب سے نصیر صاحب کی ٹھکی ہوئی آواز سنائی دی، وہ شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ تعارف کروانے سے پہلے ہی مجھے پہچان چکے تھے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی، تو ان کے لہجے میں فکر مندی کے ساتھ ساتھ رواپتی پولیس

والوں کی تیزی بھی درآئی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر قریب ترین ضلع کے ایس پی اپنی تمام تر مہیا ملک کے ساتھ کال گڑھ کے لیے نکل چکے ہوں گے اور جب تک میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچوں گا تب تک وہ بھی مجھے وہیں میرا انتظار کرتے ملیں گے۔ انہوں نے سختی سے مجھے منع کیا کہ میں تمہا دوبارہ کال گڑھ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ جب میں نصیر صاحب سے بات کر کے خیمے سے باہر نکلا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر کچھ فاصلے پر میرے دونوں دشمنوں کی لاشوں کو دو سپاہی ایک گہرا گڑھا کھود کر ورنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حوالدار نے اپنے انچارج کپتان صاحب سے شہدے ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی جیب میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچانے کی اجازت لے لی تھی۔ جیب روانہ ہونے سے پہلے وہ سپاہی کو درجہ پہلی سینوں پر بیٹھ چکے تھے، شیر محمد خود را نیوٹنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم اسی تارکول کی سڑک سے ہوتے ہوئے واپس صحرائ کی جانب روانہ ہو گئے۔ سورج کی تپش ابھی باقی تھی اور جب جیب نے صحرائ کی طرف موڑنا تو مجھے جبروت کے جاہازوں میں سے وہ تیسرا بھی ایک جانب پڑا دکھائی دیا، جو میرے تعاقب میں سڑک تک پہنچ کر جان ہار گیا تھا۔ شیر محمد نے اسے غور سے دیکھا، لیکن کچھ کہے نہ، جیب آگے بڑھا دی۔ کچھ گھنٹے قبل ہی قاتل صحرائی سانس گھونٹنے کے لیے کسی اور انداز میں مجھ پر نکلا تھا اور ابھی اس وقت اس جیب میں گزرتے ہوئے یہ سب کچھ کتنا مختلف اور کتنا مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے دوڑتے دوڑتے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جیب ریت کے ٹیلوں سے اتنی چڑھتی کال گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھی اور پھر ایک نیلہ اترنے ہی میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”روکو..... جیب روکو.....“ حوالدار نے چونک کر جلدی سے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ میں تیزی سے کود کر نیلے کی گچھلی جام دوڑا اور پھر میرے قدم ریت ہی میں دھنس کر رہ گئے۔ شیر محمد اور سپاہی میرے پیچھے ہی بھاگے چلے آئے اور پھر ان کی لگا ہوں نے بھی میری نظروں کے تعاقب میں وہ انتظار دیکھ لیا۔ سامنے ہی کالا اپنے دو ساتھیوں سمیت بے جان پڑا تھا اور چند قدموں کے فاصلے پر ادھر ادھر تین دشمنوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا کالے کے پاس پہنچا۔ میرے دوست نے زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے شدید جہد جہد کی تھی۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے رو پڑا۔ حوالدار حیرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ حیرت انگیز نظارہ نہیں دیکھا جو ان..... صاف لگ رہا ہے کہ یہ تین کتے اس دوسری خاص نسل کے تین کتوں سے شدید لڑائی کے بعد ہارے تو ضرور ہیں، لیکن جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ تینوں کو بھی لے گئے ہیں..... کیا یہ تین تمہارے محافظ تھے۔“ میری آواز بے شکل نکلی ”نہیں۔ یہ تین میرے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے لیے اپنی جان دی ہے۔“ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سچ سچ کر دوں۔ حوالدار میری حالت سمجھ چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور خود بھی جیب کے پیچھے سے ترپال کے نیچے رکھے ٹیلوں میں سے ایک اٹھا لیا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ میں نے کالے کو الوداعی سلامی پیش کی اور انہوں نے میرے تینوں دوستوں کو منوں ریت تلے ڈبا دیا۔ میں نے شیر محمد کی جانب دیکھا۔ اس نے مجھے نگے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں جو ان احم اپنے دشمنوں کو بھی یوں پزارہے نہیں دو گے۔ یہی بڑے دشمن کی نشانی ہوتی ہے۔“ کچھ ہی دیر میں اتنے ہی گہرے گڑھے میں میرے تینوں دشمن بھی رہے نہیں ہو چکے تھے۔ وہ میرے دشمن تھے، لیکن وفادار تھے۔ میں نے حوالدار سے سروک کے قریب پڑے جسم کو بھی واپسی پر ورنے کی درخواست کی۔ اس نے جیب آگے بڑھاتے ہوئے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر مجھے بے فکر رہنے کا کہا۔

جب ہم کال گڑھ کی سرحد سے کچھ فاصلے پر تھے، تو میں نے ایک جیب کے بادل کو تیزی سے واپس پلٹے دیکھا، لیکن شام کے بیچنے اور فاصلے کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے گاڑی پہچان نہیں سکا۔ حوالدار کا خدشہ صحیح تھا۔ کتوں کے واپس نہ پھٹنے پر جبروت کے ہر کارے صحرائ میں ان کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ انہوں نے پہلے انٹین تک کا سارا راستہ چھان مارا ہوگا، لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں ساتویں میلے سے وائیں جانب مز پکا ہوں گا اور اتنے وسیع صحرائ میں جہاں ریت ہر پل قدموں کے نشان مٹا رہی ہو، صرف اندازے پر کسی کی تلاش انتہائی مشکل کام تھا، تب ہی انہیں اتنا وقت لگا تھا۔ جب ہم کال گڑھ کی پورنی حد تک پہنچے، تب تک احمد شیر اچھا چکا تھا اور دور سے پولیس کی جھپٹوں اور ایک بڑے ٹرک کی جلتی جھتی تپاں قریب آتی نظر آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پولیس کے جوانوں کا ایک ہم غفیر ایک ایس پی اور ڈی ایس پی کی قیادت میں وہاں آپہنچا۔ افسروں نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ آئی جی صاحب کی خاص ہدایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ شیر محمد نے مجھ سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے زور سے نگے لگا لیا اور بولا ”مجھے یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے، جو ان دورہ میں بھی تمہارے استاد سے طے ضرور چلتا تمہارے ساتھ“ میں نے اسے دھستہ کرتے ہوئے دھیرے سے اس سے کہہ دیا۔ ”جب تم وزیر کے ماں سے نوں پر بات کرو تو اسے بتانا کہ تمہارا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے۔“ جیب میں بیٹھتا ہوا شیر محمد زور سے فس پڑا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ایس پی نے وہیں ریت پر کھڑی کی ایک چھڑی کی مدد سے میری معلومات کے مطابق کال گڑھ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنالیا اور قلعے کا جغرافیہ اور آنے جانے کے تمام ممکنہ راستے اپنی فورس کو اچھی طرح ذہن نشین کروادیے۔ آدھے سپاہی ڈی ایس پی کی قیادت میں دوسری جانب سے صحرائ کی طرف نکلنے راستوں پر پھرے کی چوکیاں بنائے ہوئے، کال گڑھ کا خاصہ کر کے ہونے بڑھتے گئے، جبکہ ایس پی صاحب میرے ساتھ آدھے سپاہی کے لیے کال گڑھ میں داخل ہو گئے، کبھی کبھی نصیب ہمارا پوری گنتی اٹنی کر دیتا ہے، ہر موقع پر جس ثابت ہو جاتی ہے، شاید آج بھی جبروت کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس قید خانے میں خانو مجھے صحرائ کے دوزخ سے نکلنے کے راستے اور گڑھا دے گا اور میں اس کے جاہازوں کو کالے اور اس کے دو ساتھیوں کی مدد سے بچھاؤں گا۔ صحرائ پار کر جاؤں گا اور ایک سرحدی چوکی تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ چوکی والے بھی اپنے فرائض کی حد بندی کی وجہ سے اتنی جلدی میری مدد نہ کر پاتے، کیوں کہ یہ پولیس کا کیس تھا۔ ایسے میں جبروت نے یہ بھی کہاں سوچا ہوگا کہ مزار پر رہنے والے یہ دو فقیر، اتنی پہنچ بھی رکھتے ہوں گے کہ ایک میلی نوں پر ضلع کے ایس پی کو تمام لوازمات کے ساتھ کال گڑھ آنے پر رضامندی کر سکیں گے، کیوں کہ عام حالات میں اس سارے انتظام کے لیے کم از کم مہینہ دوڑکار ہوتا، لیکن اس کی تمام توقعات کے برعکس میں اس وقت ایس پی سمیت قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دربان کو دروازہ کھولنے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اندر سے کچھ حراست ہوئی اور چند کارندوں نے پولیس پر قاتل کھولنے کی کوشش کی، لیکن آدھے گھنٹے کے اندر ہی قلعے کے اندر موجود دس بارہ محافظ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے راہ داریوں میں دوڑتا ہوا قید خانوں کی طرف بڑھ گیا۔ نوری اور اس کے باپ سمیت گیارہ مزید قیدی اس زندان سے برآمد ہوئے، لیکن میری نظریں سلطان ہا ہا کی تلاش میں ٹھٹھکی رہی تھیں۔ میں نے ایک ایک کال گھنڑی میں خود جھانک کر دیکھا، لیکن ان کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ قیدی آزاد ہونے کے بعد قلعے کے صحن میں جمع تھے اور خوشی سے نعرے لگا رہے تھے، قلعے سے باہر کال گڑھ کی ساری ہستی، رات ہونے کے باوجود جمع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے گھڑوں کے لیے رو رہے تھے، چلا رہے تھے۔ جبروت کے ظلم کا سورج آج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا، لیکن خود جبروت نہ جانے کہاں غائب تھا۔ اکرم اور اس کے دو مزید خاص ہرکاروں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میری مانیں ڈکنے لگیں، کہیں اس نے سلطان بابا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔

نوری بھی اپنے باپ سمیت، صحن ہی میں کھڑی رو رہی تھی۔ میں واپس دوڑتا ہوا ایس پی کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ سلطان بابا کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ایس پی وائیں پولیس پر اپنی فورس کو ہدایت دینے میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں قیدیوں کے جھوم سے ایک قیدی باہر نکلا اور اس نے مجھے نگے لگا لیا ”میں جانتا تھا..... تم کامیاب واپس لو لو گے.....“ آواز سنتے ہی میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ خانو تھا۔ میں بھی رو ہانسا ہوا گیا۔ ”یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے خانو..... لیکن میرے سلطان ہا ہا نہ جانے کہاں ہیں۔ سارا قلعہ چھان مارا ہے لیکن.....“ خانو چلا ”.....“ ”خانو چلا“ ”خانو کی بات سنتے ہی مزید ایک لمحہ شائع کیے بنا، کچھ چابیوں کو خانو کے ساتھ اس سرنگ کا پنا لگانے کے لیے دوڑا دیا۔ میں نے بڑھنے کی کوشش کی، تو مجھے روک دیا گیا۔ ”آپ رک جائیں۔ وہاں خطرہ ہو سکتا ہے.....“ میرے بس میں ہونا، تو سب سے آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ جانا۔ کچھ ہی دیر میں ایک چابی ہانچا ہوا دوڑ کر واپس آیا اور اس کی بات من کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ زور سے چیخا ”سرنگ مل گئی ہے صاحب، وہاں ایک بوڑھا اونٹن ہے منہ پڑا ہے.....“

اک خاک برسو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رنگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



.....باشم ندیم.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ ہندو راصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

اس سپاہی کی بات سن کر مجھے یوں لگا، جیسے ابھی آسمان پھٹ کر ہمارے سروں پر آگرے گا۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا، تو کسی دوسرے سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن میں اُسے دھکیل کر قلعے کی اس غلام گردش کی طرف بھاگا، جہاں خانو سرگ دکھانے کے لیے باقی سپاہیوں کو لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے اندر جاتی سیڑھیاں نظر آگئیں، جو بہ ظاہر کسی تہہ خانے کا راستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے جبروت جیسے ہر قلعے دار کو اپنے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں نے تاریخ میں بھی ایسے بہت سے بادشاہوں کا تذکرہ پڑھا تھا، جو اپنے محل سے فرار کا ایسا کوئی پوشیدہ راستہ ضرور بنا کر رکھتے تھے۔ کیا جبر اور اقتدار ہمیشہ ہی سے چور راستوں کا محتاج رہا ہے؟ سرگ کے اندر سپاہیوں کا جھگڑا سنا تھا۔ انتہائی تنگ ہونے کے باوجود نہ جانے اس سرگ میں ہوا کہاں سے آرہی تھی۔ میں نارنج کی روشنی میں بنے دائروں سے ہوتا ہوا، وہاں تک پہنچا، جس جگہ کی سپاہی نے نشان دہی کی تھی۔ ہاں، وہ سلطان بابا ہی تھے، ہوش و حواس سے بیگانہ، نہایت زرد رنگت اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے۔ کچھ سپاہی ان کے ہاتھ پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو اٹھا کر باہر کھلی فضا میں پہنچا دیا گیا۔ بد ظاہر انہیں کوئی چوٹ لگی نظر نہیں آرہی تھی۔ ایس پی صاحب نے جب کسی سپاہی کو اپنی گاڑی سے میڈیکل بکس لانے کا حکم دیا، تو عقدہ گھلا کہ وہ ڈاکٹر پہلے ہیں اور سی ایس ایس آفیسر بعد میں۔ انہوں نے سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک انجیکشن بھی لگا دیا۔ انہیں بھی بہ ظاہر گھٹن اور تھکن کے علاوہ، کوئی خاص علامت دکھائی نہیں دی، لیکن انہوں نے مجھے تلقین ضرور کر دی کہ پہلی فرصت میں انہیں کسی بڑے اسپتال میں مکمل طبی معائنے کے لیے ضرور لے جاؤں۔ قلعے میں ابھی تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سپاہیوں کے ساتھ زنانہ پولیس بھی تھی، جس نے قلعے کی تمام خواتین کو اندرونی احاطے میں جمع کر کے انہیں تسلی دی کہ فی الوقت اُن میں سے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کریں، البتہ واضح رہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی اور میں وہیں سلطان بابا کے سر ہانے پریشان بیٹھا بار بار ان کا ہاتھ چھو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ حدت سی محسوس ہوئی تو میں جلدی سے ایس پی صاحب کو بلا لایا، انہوں نے تصدیق کر دی۔ ”ہاں..... کچھ بخار سا تو ہے، لیکن اتنی تھکن کے بعد یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔“ میں نے ان سے جبروت کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے بتایا کہ سارے علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا ہے، لیکن فی الحال اُس کی حراست کی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے بھیڑ میں سیکنہ کے نانائو کو دیکھا، تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر کہیں چھپ جاؤں، لیکن وہ تو خود ہی مجھے تلاش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے، ان کے پاس وہی ایک سوال تھا، جس کے بارے میں سوچ کر ہی میری سانسیں گھٹنے لگتی تھیں۔ اچانک جھوم میں خانو مجھے ایک جانب کھڑا نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ جلدی سے میری جانب بڑھا۔ ”تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے نا؟.....“ ”ہاں، اور اسی لیے میں نے خود کو پولیس کو اپنے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جبروت کے خلاف ”سلطانی گواہ“ بنانے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ مجھے جبروت کے ہر گناہ کا اقرار بیان کی صورت میں بھری عدالت میں کرنا ہوگا اور میں اس کے لیے تیار ہوں، بلکہ پولیس اگر مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بنائے، تب بھی عدالت میں بیان ضرور دوں گا۔“ میں نے غور سے خانو کی طرف دیکھا۔ ”نہیں تم ضرور سلطانی گواہ ہی بنو گے، لیکن یہ تمہارا کفارہ نہیں ہوگا۔ تمہارا اصل کفارہ تمہاری رہائی کے بعد شروع ہوگا۔ بولو، منظور ہے؟“ خانو نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ ”تمہارے لیے خانو کی جان بھی حاضر ہے۔ تم صرف کفارے کی بات کرتے ہو؟“ میں نے اسے دور کھڑے بوڑھے جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بتایا ”یہ بوڑھا اور بڑھیا اسی سیکنہ کے نانا اور نانی ہیں، جو اسی قلعے کی کھولی نبرسات میں دفن ہے۔ تمہارا پہلا کفارہ یہی ہے کہ تم انہیں لے جا کر سیکنہ کی قبر دکھاؤ اور اس بڑھیا کے شانوں پر پڑی وہ آدمی پھٹی ہوئی پھولوں والی چادر اس بد نصیب کی قبر پر ڈال دو۔“ خانو کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ یوں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اس کے قدموں تلے کوئی کچھو کھل آیا ہو۔ ”نہیں نہیں! مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میرا سر کاٹ کر اُن کے قدموں میں ڈال دو، لیکن.....“ ”لیکن کیا.....؟“ ابھی تو تم دعویٰ کر رہے تھے کہ کفارے کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ گے، پھر اس پہلی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی تمہارے پاؤں کیوں چلنے لگے.....؟“ وہ بے بسی سے تاملایا ”نہیں، یہ بات نہیں ہے، لیکن میں ان کا سامنا کیسے کروں گا؟“ میں نے اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا ”تمہیں صرف آج نہیں، ساری عمر اُن کا سامنا کرنا ہے، کیوں کہ تمہارا اصل کفارہ اب ان لاچاروں کی کفالت ہی ہے۔ اب تم ہی کو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ زندگی بھر کے گناہ دھونے کا اس سے بہترین موقع بھلا اور کیا ہوگا؟“ خانو نے شدید کش مکش کے عالم میں سیکنہ کے بزرگوں کی جانب دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اُسے ان کی جانب دھکیل دیا۔ بڑھیا اپنے آس پاس سے گزرنے والے ہر شخص سے یہی پوچھ رہی تھی کہ کیا قلعے کے سارے قیدی رہا ہو چکے ہیں اور کیا ان میں سے کسی نے ان کی سیکنہ کو گھیس دیکھا؟ خانو دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا تھا، بوڑھی آنکھوں نے اس سے بھی یہی سوال پوچھا۔ خانو نے پتا کچھ کہے، ان دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اندرونی راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ خانو کے قدموں میں واضح لرزش مجھے اتنی دور سے بھی نظر آرہی تھی، لیکن یہ لڑکھڑاہٹ اُن قدموں کی تھی، جو آج زندگی میں پہلی مرتبہ کفارے کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جانے ہمارے قدم تب اس طرح کیوں نہیں لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے، جب ہم گناہ کے راستے پر بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے قدرت ہم کم زور و کم حوصلہ انسانوں کو اس قدر ثابت قدم اور مضبوط

کیوں سمجھتی ہے۔؟ سچ ہے کہ انسان کا مقدر یہ عمر بھر کی پھسلن ہی ہے۔ کم ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اس ازلی ڈھلان سے پھسلے بنائی سیدھے پیچے اتر جاتے ہیں۔ خانو کو ان کوٹھڑیوں کی جانب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بڑھیا کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ساتھ ہی بوڑھے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی، تو ساری ہستی والے اُس جانب دوڑے، میں وہیں گم صم ساسطان بابا کے سر ہانے بیٹھا رہا کہ میں جانتا تھا کہ ان بد نصیبوں پر کیا قامت گزر چکی ہے۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ میں نے سیکنہ کے نانائانی کی آس سدا کے لیے توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیا بُرا تھا، اگر میں انہیں ان کی عمر کے آخری چند برسوں میں اسی بھرم ہی میں جینے دیتا کہ ان کی لاڈلی نواسی گم شدہ ہے، لیکن زندہ ہے۔ ہم میں سے کتنے بہت سے انسان اپنی پوری زندگی ایسے ہی کسی جھوٹے بھرم میں گزار دیتے ہیں کہ ”وہ مجھے چھوڑ گئی، لیکن بے وفات تھی“، ”وہ واپس لوٹا تو پھر میرا ہی ہوگا“، ”یہ دنیا ہماری نہیں تو کیا، آخرت تو ہماری ہی ہے“ یا پھر ”اگلی زندگی کس نے دیکھی ہے، جتنا بھی جینا ہے، یہیں جی لیں۔“ تو اگر ایک بھرم اور بڑھ جاتا، تو ایسا کیا گناہ ہو جاتا، لیکن میں اس عمر بھر کی اذیت سے بھی واقف تھا، جو کسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار کی صورت میں جھیلنی پڑتی ہے۔ انتظار تو خود پل پل وارد ہوتی موت کا نام ہے اور میں اُن دنوں کی بوڑھی آنکھوں کو انتظار کی اس اونچی صلیب پر مزید نہیں لٹکانا چاہتا تھا، ورنہ شاید ان کی پلکیں موت کے بعد بھی کھلی رہ جاتیں۔

کچھ دیر میں سلطان بابا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے ان پر ٹھکا ”اب کیسے ہیں آپ..... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی، ہوا کیا تھا؟“ میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ”ابھی تک بہت جلد باز ہو۔“ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے بتایا کہ جبروت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صرف بارہ گھنٹے کے قلیل وقفے میں ضلع بھر کی پولیس نفری لے کر قلعے کے دروازے پر آ پہنچوں گا۔ جیسے ہی اُسے پولیس کی آمد کی اطلاع ملی اور صحرا سے آئی جیپ والوں نے اُسے بتایا کہ صحرا میں صرف اور صرف پولیس ہی کی گاڑیاں نظر آرہی ہیں، تو اس نے سب سے پہلے حکومت میں موجود اپنے اُن اعلیٰ عہدے داروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو اس کے در پردہ ہمدرد تھے، لیکن حسب معمول اس موقع پر سب ہی نے کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کر لی۔ ایک آدھ نے پولیس کے دربار کی گھنٹی بلانے کی کوشش کی بھی، تو وہاں نصیر صاحب کی ہدایات کا قائل پڑا پایا۔ جبروت کے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فورس کال گزھ میں داخل ہو چکی تھی۔ تب ہی اس نے سلطان بابا کو طلب کیا اور جھنجھلا کر ان سے پوچھا کہ آخر وہ ہیں کون؟ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان بابا کوئی جواب دے پاتے، پولیس کی گاڑیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں اور مجبوراً جبروت کو افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جاتے جاتے اُس نے اپنے ہر کاروں کو سلطان بابا کو بھی ساتھ ہی لے جانے کا حکم بھی دے دیا، لیکن اس بھاگ دوڑ میں سلطان بابا کو وہ چار دھتکے سینے پر اتار دے گئے کہ وہ بھاگنے والوں کے حیرتوں کے لیے زحمت بن گئے۔ جبروت آگے نکل چکا تھا، پیچھے والوں میں سے کسی نے ان کے سر پر وار کیا اور وہ لوگ انہیں بے سدھ پڑا چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے۔ شاید ان کے ذہن میں کہیں یہ اطمینان بھی ضرور ہوگا کہ اس ٹخہ میں مُرگم میں یہ ضعیف شخص ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی جان دے دے گا، کیوں کہ عام حالات میں اُس تہہ خانے کی دیواروں میں ٹخے، اس مُرگم کے دروازے کو ڈھونڈنے میں ہمیں شاید ہفتوں لگ جاتے، لیکن ایک بار پھر یہاں خانو کا کفارہ جبروت کی تمام چالوں اور گناہوں پر بازی لے گیا اور چند لمحوں بعد ہی ہم نے انہیں کھوج لیا۔ میں نے انہیں مختصر اسیکینہ کے بارے میں بتایا، تب تک اندر سے سیکنہ کے بڈ حال نانائانی کو کچھ لوگ بہارادیے ہوئے باہر نکال لائے۔ خانو بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ ایس پی صاحب کو سلطان بابا کے ہوش میں آنے کی خبر ملی تو انہوں نے فوراً آئی جی صاحب کو کنٹرول لائن کے ذریعے اطلاع کروادی۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ میرے شدید اصرار کے باوجود سلطان بابا نے مزید آرام کرنے سے منع کر دیا اور مؤذن کو وہ ہیں قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اذان دینے کی ہدایت کی۔ وہ بہت بڈ حال سے لگ رہے تھے، لیکن انہوں نے وہیں قلعے کے پختہ صحن کو دھلوا کر چادریں بچھوائیں اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ آج یہیں قلعے میں فجر کی جماعت کروائیں، قلعے کی دیواروں نے صدیوں بعد یہ نظارہ بھی دیکھا۔ امام کی قرأت کی آواز اس چار دیواری میں گونجی تو ہستی کے سب ہی کمین خم دیدہ ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ ظہر کی نماز کے بعد سیکنہ کی آخری رسومات یہیں قلعے میں ادا کی جائیں گی۔ بوڑھا جوڑا بھی اسی حق میں تھا کہ اب اسی کوٹھڑی کو سیکنہ کی قبر کے طور پر رہنے دیا جائے، البتہ وہاں باقاعدہ مٹی کی ڈھیری اور قرآن و دعا وغیرہ کا انتظام کروادیا گیا۔ میرا ذہن پھر سے جسم اور رُوح کے اُن دیکھے تعلق کے الجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود اپنے نیچے ادھیڑنے لگا۔ رُوح کا عکس کیسا ہوتا ہوگا؟ کیا ہمارے ظاہری جسم کی شاہت کا بھی اس عکس پر کچھ اثر پڑتا ہوگا یا پھر وہ ہوا کے کسی جھونکے کی طرح بے رنگ، بے شکل ہوتی ہوگی اور مجھے سیکنہ کا جو عکس صحرا میں نظر آیا تھا، وہ تو اس کی موت کے بعد دکھائی دیتا تھا، گویا وہ عکس رُوح کے بغیر کی تصویر تھی۔ ہم خواب میں جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے ہیں، وہ بھی تو بے جان ہی ہوتی ہیں۔ جس شخص کو میں اپنے خواب میں چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا دیکھتا ہوں، وہی اُس وقت اپنی رُوح سمیت کہیں اور جیتا جاگتا موجود ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ذہن کے پردے پر ہمارا رُوح جو فلم چل رہی ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ کبھی ہمارا اس شخص کے جسم اور رُوح سے کوئی خونی رشتہ بھی رہا ہو۔ ہم بالکل ان جان اور سننے چہرے بھی اپنے خواب میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان کا خاکہ کیسے تراش لیتا ہے؟ اُن میں سے کئی چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں ہم باقی پوری زندگی کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاتے، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خواب کا شٹا سا میرہ مل بھی جاتا ہے، تو کیا ہم عالم ارواح میں پہلے اُس چہرے کی رُوح سے مل چکے ہوتے ہیں؟ سلطان بابا کی حالت اُس وقت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں مزید سوال پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا، لیکن خود میں الجھتا ہی چلا گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں، جو مستقبل کی جھلکیاں اپنے خواب میں دیکھ لیتے ہیں، ان میں سے بعض تو جاگتی آنکھوں سے چند لمحوں میں آنے والے کسی واقعے کی کچھ تفصیل، کبھی کچھ اشاروں میں اور کبھی باقاعدہ چہرے، نام اور جگہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، لیکن انہیں وہ انہی چہرے اور انجان جگہیں کس طرح خواب میں دکھائی دی جاتی ہیں، ضرور میرا اور سیکنہ کی تصویر کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ میرے لیے بے ظاہر ان جان ہونے کے باوجود ان جان نہیں تھی۔ میرا پورا دن اسی سوچ بچار میں گزر گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ سلطان بابا جس قدر ہو سکے، آرام کریں، لیکن ہستی والوں نے ہمیں مزار واپس لوٹنے ہی نہیں دیا اور ٹوری کا باپ ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ میں نے ہستی کے ڈاکے کے ذریعے شیر محمد کو بھی ایک رقعہ بھجوا دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنی یونٹ کا ڈاکٹر لے کر کچھ دیر کے لیے کال گزھ آجائے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کروا سکے اپنا پورا اطمینان کر لوں اور پھر وہ ”شاہ شے جوانا شاہ شے“ کرتا ہوا عصر کے بعد اپنی جیپ میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچ بھی گیا۔ ڈاکٹر نے نہایت تفصیل سے سلطان بابا کا معائنہ کیا، وہ ان کے سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ فکر مند نظر آ رہا تھا، ان نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھ کر دے دیے کہ وہ دن آرام کے بعد جب سلطان بابا سفر کے قابل ہو جائیں، تو فوراً شہر کی کسی بڑی لیبارٹری سے یہ ٹیسٹ کروا لیے جائیں۔ تب تک اس نے سلطان بابا کو سختی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

مغرب کے بعد شیر محمد اور ڈاکٹر کو رخصت ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مکمل اندھیرا چھاتے ہی سرحد کی جانب سے شدید فائرنگ کی آواز نے ہم سب کو چوکانا دیا۔ پولیس کی نفری بھی ابھی تک کال گزھ میں موجود تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایس پی صاحب نے آکر ہمیں وہ خبر سنائی، جو ایک خدشے کی طرح میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں صبح سے کھٹک رہی تھی۔ جبروت اور اس کے چار ساتھی سرحد پار کرنے کی کوشش میں سرحدی ریٹائرز سے بخود گئے اور میری توقع کے عین مطابق جبروت نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایک بار سلطان بابا نے بتایا تھا کہ معافی اور توبہ کی توفیق بھی مقدروالوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ورنہ آنکھوں پر لوہے کے پردے اور کافور میں سیسہ پھلکا دیا جاتا ہے۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ شاید یہی سب کچھ جبروت کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اس کی اتنا اُسے کفارے کے راستے پر بڑھنے سے روک رہی تھی۔ موت دونوں جانب ہی اس کا مقدر

تھی۔ وہ گرفتاری دے دیتا، تب بھی صرف سیکڑہ کا قتل ہی اُسے پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا اور شاید خود کو اپنی مرضی سے دار کے حوالے کر دینے سے قدرت اس کے چند گناہ و دھوبھی ذاتی، لیکن اس نے گناہوں کی کالک ماتھے پر لیے ہی اس جہاں سے جانے کی ٹھان لی تھی۔ پولیس کنٹرول کے ذریعے ہمیں پل پل کی خبر مل رہی تھی کہ اب جبروت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا ہے۔ اب اس کے ساتھی بھاگ رہے ہیں اور پھر اس کا پہلا محاذ بگڑا پھر دوسرا اور اب جبروت کو آخری تنبیہ کی جارہی ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آجائے اور پھر مکمل خاموشی..... ایک آخری فائر کی آواز گونجی اور پھر پولیس کے وائز لیس سیٹ چیخ پڑے، ہر جانب ایک شور مچ گیا۔ جبروت نے خود کو کپٹنی پر گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بستی کی ساری آبادی، جو پولیس کے صحرا میں قائم کردہ عارضی کنٹرول روم کے گرد جمع تھی، گنگ سی رہ گئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا، ظلم کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پہلے تک، جوان سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا تھا، آج ایک بے جان لاش کی صورت ریت پر بے بس پڑا تھا۔ سرخ رنگ اور خون کی دھار، تو اس کا پسندیدہ کھیل تھا اور آج جاتے جاتے بھی وہ یہ کھیل کھیل ہی گیا۔ سلطان بابا کو خبر پہنچی، توان کی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا ”اناللہ وانا الیہ راجعون.....“ وہ ابھی نوری کے گھر ہی میں آرام کر رہے تھے اور پھر اگلی صبح سورج نکلنے ہی پہلے سانول اور پھر اس کا باپ یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ سانول مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا باپ بھی شرمندہ سا پیچھے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے چپ کر دیا۔ سانول کے باپ نے پوری بستی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ وہ جبروت کے ڈر کی وجہ سے کھل کر بستی والوں کا ساتھ نہیں دے گا، نہ ہی اُس نے اپنے بیٹے کو جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے اور اس تمام معاملے کی خبر ہونے دی، کیوں کہ اسے خدشہ تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے جُوبے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔ وہ خوف زدہ تھا اور زمانے میں خوف سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ کال گڑھ والوں کے سر سے جبروت کے خوف کے بادل چھٹے، توان کی زرد رنگت میں بھی دھیرے دھیرے سرخی شامل ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ صرف سانس لینے کی مجبوری سے نکل کر جینے کے سنے دیکھنے لگے تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اگلے دن بستی والوں سے رخصت لے کر سلطان بابا کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں داخل کروادوں، تاکہ ان کے تمام ٹیسٹ ہو سکیں۔ ویسے بھی کال گڑھ میں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا بستی والوں کے سامنے اظہار کیا، سب ہی بگڑ گئے۔ سانول تو باقاعدہ لڑنے کے لیے آکھنچا کہ اگر سلطان بابا کا بستی معاہدہ ہی کروانا ہے، تو وہ خود میرے ساتھ شہر جا کر دو چار دن میں تمام کام مکمل ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آجائے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ ہمارے پاؤں میں چکر تھا، جانے قدرت نے ہمارا اگلا پڑاؤ کہاں لکھا تھا اور اب مزید کون سا امتحان درپیش ہوگا۔ اسی شام سانول کے باپ کی درخواست پر نوری کو باقاعدہ نشانی پہنانے کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ شام ہی سے بستی کے سب ہی گھروں کی دیواروں کی ٹنڈیر پر دیے جلادے گئے۔ یہ اس صحر کا پہلا چراغاں تھا، جو قلعے کی دیواروں کے باہر خود بستی والوں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ مردوں نے برسوں سے صندوقوں میں پڑی اپنی سفید لٹھے کی گھیر دار شلواریں نکلو کر انہیں مانع لگا کر تیاری کی۔ بوسکی کی دو گھوڑوں کے نشان والی قمیصیں اور سر پر نیا صافہ یا سرخ پگڑی، عورتوں نے بھی اپنے بازو کہنیوں سے اوپر تک چوڑیوں سے بھر لیے۔ سرخ، نیلے، پیلے، اودے اور سفید بڑے گھیر والے پلو اور ناک میں چمکیلے ٹوکے۔ جانے ایسی رسموں کا مہندی سے ایک خاص تعلق کیوں مجزا ہوتا ہے۔ شاید رنگ اور خوشی کا آپس میں کوئی گہرا ناتا ہوگا۔ اسی لیے تو جہاں خوشی بکھرتی ہے، وہیں بہت سے رنگ بھی ڈرتے ہیں۔ میں خود تو ابھی تک اس ”خوشی“ نامی جذبے یا احساس کی گھسٹی ہی نہیں سلجھا پایا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ ہی سے زیادہ خوشی مزید افسردہ کر دیتی ہے۔ شاید میرے اندر خوشی جھیلنے کا ظرف ہی نہیں تھا اور کسی ایسے احساس کا جشن کیا منانا، جو چند گھنٹوں سے لے کر بس چند گھنٹوں تک ہی آپ کا ساتھی ہو۔ شاید خوشی کا واسطہ ہی اس کی اس کم یابی کی جھلک سے مجزا ہے۔ بڑی سے بڑی خوشی ہمیں بس کچھ دیر کے لیے ہی تو مکمل سرور رکھ پاتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے یہ سرور ایک اطمینان میں ڈھلنے لگتا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہی کسی احساس کی تکمیل کی طمانیت میں تھیل ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں کروٹ لے کر سو جاتا ہے، پھر جب تک ہم خود اس لطیف احساس کو نہ ٹوٹیں، یہ اپنے آپ نہیں جاگتا، لیکن اس کے برعکس ”غم“ ہر لمحہ بوند بوند ہو کر ہمارے دل کی زمین پر پگھلتا رہتا ہے۔ ہمیں خوشی کو کچھ دن کے بعد یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ غم ہمیں کبھی بھولتا نہیں۔ کسی وفادار دوست کی طرح ہر پل ہمارے وجود کے اندر رہتا ہے، خوشی اپنے ساتھ ہمیشہ رخصت ہونے کا تصور لاتی ہے، جبکہ غم کا کاٹنا ایک دائمی چٹھن، کاٹ اور جلن لیے، دل کے اندر ہی پیوست ہو جاتا ہے، تو پھر نہ جانے ہم ہمیشہ خوشی کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں، اُس بے وفا کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے ماتھے پر ”الوداع“ لکھوا کر آتی ہے، اُسے کیوں اٹھا کر سدا کے لیے اپنے سینے سے نہیں لگا لیتے، جو عمر بھر ہماری چوکھٹ پر پڑا ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

سانول بھی آج اس بے وفا خوشی کے دار کا شکار تھا۔ جب میں مزار کی دہلیز پر پڑے غم کی چوکھٹ پار کر کے بستی کے لیے نکلا، تو شام ڈھل چکی تھی۔ غم مجھے جاتے دیکھ کر بولا ”جاؤ، اُد، اس دو گھڑی کی ساتھی سے، میں یہیں پڑا رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ پردیکھو، کہیں دیر نہ کر دینا کہ میرا تمہارا تو سدا کا ساتھ ہے۔“ سلطان بابا کی دیکھ بھال کے لیے پیش امام صاحب نے مسجد سے دو طلبا کو مزار بھیج دیا تھا، کیوں کہ سلطان بابا اس شور شرابے سے گھبرا کر آج شام ہی واپس مزار لوٹ آئے تھے۔ میں جب سانول کے گھر کے قریب پہنچا، تو دور ہی سے مجھے عورتوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ صحرائی گیت کے بول سانول کو مبارک باد دے رہے تھے ”کہ آج تم سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا۔ تمہاری محبوب سولہ سنگھار کیے اور اپنے ماتھے پر تمہارے نام کی بندیا لگائے، کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے..... لیکن خدا مارے ان پوڑیوں والیوں کو..... یہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں..... شاید وہ تمہاری محبوب سے جلتی ہیں۔“ عورتیں زور سے ہنسیں اور کسی دوسری جانب سے کوئی اور ٹولی گنگنائی، یہ چوڑی والیوں کا جواب تھا ”ہاں ہاں..... ہم کیوں جلدی کریں؟ ہمارے تو دل جل رہے ہیں..... بستی میں ایک ہی تو چھیل چھبھلا تھا، جس کی بانسری سننے کے لیے ہم ساری صحرا میں جمع ہوتی تھیں..... خدا کرے آج اس زور کی آندھی چلے کہ صحرا کا شہزادہ اپنا راستہ بھول کر چوڑی والیوں کی بستی میں آجائے.....“ سب عورتیں ہنس پڑیں۔ جانے یہ صحرائی گیت اور نپے کون لکھتا ہوگا۔ جانے ایسے کتنے گم نام شاعر ہوں گے، جنہیں دنیا کبھی جان ہی نہیں پائی، لیکن ان کے الپ اور گیت سدا کے لیے امر ہو کر ان صحراؤں، بستیوں اور گاؤں گلیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

سانول کی منگنی کی تقریب کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لڑکے والیاں ترکی بہ ترکی لڑکی والیوں کے سوانوں کا جواب دے رہی تھیں۔ مرد قہقہے لگا رہے تھے، صحرا کے بنے ہوئے خاص سونف اور شکر کے مشروب سے ساری تقریب کی خاطر مدارات کی جارہی تھی۔ بچے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے، ہر طرف نور، رنگ، شور اور قہقہے تھے۔ سانول کو عورتوں کے جھرمٹ میں باہر لایا گیا، تو سب ہی اسی جانب دوڑے۔ کچھ ایسا ہی منظر نوری کے صحن کا بھی تھا۔ اس وقت نوری کے چہرے پر شام کی لالی اور صبح کے نور جیسے دو موسم بہ یک وقت جھلما رہے تھے۔ یہ لڑکیاں ایسے مواقع پر اتنے بہت سے رنگ بہ یک وقت کیسے سمیٹ لیتی ہیں۔ اب عورتوں کے تیروں کا رخ میری جانب ہو گیا تھا۔ ایک نے لے لگائی ”جانے لوگ کس کے غم میں جوگی بن بیٹھے ہیں۔ کاش آسمان پر اڑتی یہ نیلی چنگ مزار کے مجاور تک میرا پیغام بھی پہنچا دے.....“ سب زور سے ہنسنے، دوسری ٹولی نے تان چھیڑی۔ ”مزار کے مجاور کی آنکھوں کا سرمہ جانے کس کان سے آتا ہے..... اگر وہ چاہے تو ہم سب اپنی اپنی سرے داناں مزار کی چوکھٹ پر چھوڑ آئیں.....“ سانول میرے قریب ہی بیٹھا ہنس ہنس کر اس صحرائی بولی کا ترجمہ مجھے سنارہا تھا۔ لفظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں..... ان گیتوں کا مطلب سدا ایک سانی ہوتا ہے۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور ایک طالب، جسے میں مزار چھوڑ آیا تھا، گھبرا ہوا سا اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس کی کچی پکی اردو سے میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ سلطان بابا کو خون کی قے ہوئی ہے اور ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے جسم میں سے جیسے کسی نے پل بھری میں ساری جان نکال دی۔ میں نے سانول سے کہا کہ وہ یہیں رہے، لیکن مجھے ابھی مزار لوٹنا ہوگا، لیکن سانول بھی میرے پیچھے ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دیگر بہت سے لوگوں سمیت مزار کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔

(باقی آئندہ)



”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

سلطان بابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ چند لمحوں ہی میں وہ پرسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ رات کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی سو گھنٹہ باقی تھا، لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سواری کا تھا۔ گھنٹہ بھر کی تو یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی مسافت تھی، لیکن کسی مریض کو ہنا کسی سواری، یہ صحرا پار کرانے میں ہمیں صبح ہو جاتی۔ لہذا طے یہ ہوا کہ ہم دو، دو کی ٹولیوں میں اونٹوں پر سفر کریں گے۔ بستی میں سواری کے لیے پانچ اونٹ موجود تھے۔ عام حالات میں ان کے پیچھے دو پہیوں والی ٹھیلہ گاڑی بھی لگا دی جاتی تھی، لیکن اس وقت وہ پیسے ریت میں دھنس کر چلنے کی وجہ سے تاخیر کا باعث بن سکتے تھے، لہذا ہمیں اونٹوں کے مضبوط قدموں ہی پر انحصار کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دس آدمی پانچ اونٹوں پر سوار، صحرا میں دوڑے جارہے تھے۔ سلطان بابا میرے ساتھ تھے، سانول اور اس کا باپ ایک اونٹ پر اور نوری کا باپ اور خوش امام صاحب ایک ساتھ سوار تھے۔ خانو، اکرام صاحب اور بزرگ بقیہ اونٹوں پر تو اترے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جب ہم بستی کی سرحد سے گزر رہے تھے، تو سب ہی مرد اور عورتیں مجھے اور سلطان بابا کو الوداع کہنے کے لیے باہر نکل آئے۔ میں نے صحرا میں پلٹ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا، جیسے ہوا دھیرے سے میرے کان میں تکیہ کے آخری پیغام کی سرگوشی کر کے ہولے سے گنگنائی ہو ”الوداع.....“

ہم تیزی سے صحرا عبور کر کے اسٹیشن تک پہنچ تو آئے، مگر جس وقت میں نے دور صحرا میں ریلوے اسٹیشن کی اجاڑ عمارت اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جلتی میٹالی سے گیس جی دیکھی، تب تک ہمیں گھنٹہ بھر سے کہیں زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو کاٹنا بد لٹے والے نے خوش خبری سنائی کہ آج گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے، اس لیے ابھی کال گڑھ نہیں پہنچی۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں پلیٹ فارم پر بیٹھے، لکڑی کے تختے نما بیچ پر لٹا دیا، نہ جانے کن فکروں میں وقت گزر گیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں نم اور چہرے افسردہ تھے۔ سانول میرے ساتھ شہر جانے پر مقرر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے واپس جانے پر آمادہ کیا، سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھیڑ کے باوجود مجھے سلطان بابا کو لٹانے کی جگہ مل ہی گئی۔ یہاں سے قریب ترین شہر، رحیم پور بھی کم از کم بارہ گھنٹے کی مسافت پر تھا اور میں سارا راستہ یہی دعا کرتا رہا کہ ہمارے وہاں پہنچنے تک مزید کوئی ان ہونی نہ ہو جائے۔ بارہ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب جب ٹرین نے رحیم پور کے بڑے سے پلیٹ فارم کو چھوا، تو میں نے سب سے پہلے گھر فون کر کے ماما، پاپا سے بات کی اور انہیں کچھ پیسے بھیجے کہ کہا۔ شہر کے سب سے بڑے اسپتال کا پتا میں پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے آئی جی نصیر کو کیا، کیوں کہ انہوں نے ایس پی کے ذریعے سلطان بابا کی پل پل کی خبر دینے کی ہدایت کی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں رحیم پور میں ہوں، تو فوراً اپنے ایک ریٹائرڈ سینئر کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر انہیں بھی ضرور مطلع کر دوں۔ یہ صاحب پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اب رحیم پور ہی میں اپنا فارم ہاؤس اور مالے کیون کے باغات کا کام سنبھالے تھے۔ میں نے بے دھیانی میں تمام تفصیل کاغذ کی ایک چٹ پر لکھ کر جیب میں ڈال لی۔ اس وقت میری تمام توجہ اس جانب تھی کہ کسی طرح جلد از جلد سلطان بابا کو اسپتال پہنچا دوں، اسٹیشن کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لے کر میں لٹم لٹم اس بڑے نئی اسپتال تک پہنچا اور یہاں ایک بار پھر میرا حلیہ میرے آڑے آ گیا۔ باہر کھڑے دربان کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے اسپتال کی فیس بھرنے والا ہوں۔ تب قریب سے گزرتے ایک معرڈا کنٹرولر روک کر میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دلوائے۔ پہا قدم پہلے ہی اسپتال کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا۔ وہ کوئی بھلا انسان تھا، اس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور گارڈ کو ڈانٹا کہ ”نکتی بارشع کیا ہے، یوں مریضوں کو گیٹ پر روک کر بحث نہ کیا کرو۔“ میں سلطان بابا کو ان ہی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف بھجوا کر خود استقبال کی طرف دوڑا۔ ڈاکٹر پریشی لڑکی کو میں نے پاپا کا اور اپنا نام بتایا کہ کیا اس مدد میں کوئی رقم اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی ہے۔ اس نے مستعدی سے جانچ پڑتال کے بعد مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ پپا نے اتنے پیسے بھیج دیے تھے کہ اگر ہمیں مہینہ بھر سے زیادہ بھی یہاں رہنا پڑتا، تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ ”اب تو مسیحا بھی گراں ہو گئے“ اگر انسان کی جیب میں مناسب رقم نہ ہو تو یہ مسیحا بھی اس کا مقدر نہیں۔ سلطان بابا کے سر کے بہت سے ایکسریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ کے بعد انہیں ایک گمشادہ کمرے میں داخل کر لیا گیا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں تھے اور انہیں مستقل یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں خواہ مخواہ انہیں اتنے مہنگے اسپتال میں کیوں لے آیا ہوں، بقول ان کے، وہ بھلے چنگے تھے اور اب ہمیں وہاں سے چل پڑنا چاہیے تھا، لیکن ڈاکٹروں کی رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے سر کی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور ان کے کلیے کے مطابق اب تک سلطان بابا کا چلنا پھرنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ صبح بڑے ڈاکٹروں کا ایک ہینل بابا کی تمام رپورٹس کی جانچ کرے گا اور پھر کوئی حتمی بات کی جائے گی۔

اس تمام ہنگامے میں شام ہو چکی تھی اور جب مجھے سلطان بابا کی گمرانی پر مامور نرس نے یہ اطلاع دی کہ یہاں رات بھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، تو مجھے ایک دوسری تشویش نے آگھیرا۔ میں سلطان بابا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا، لیکن اسپتال کے اصول بھی اٹل تھے۔ ابھی میں اسی کش مکش میں مبتلا تھا کہ ایک بزرگ، جو ٹیکس سے سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، ہونٹوں میں پائپ دبائے ہوئے بکھلائے ہوئے سے دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔ سلام کے بعد دھیرے سے نرس پوچھنے لگے ”کیا عبداللہ صاحب کا یہی کمرہ ہے، مہرنامہ شیخ اقیار ہے۔“ اچانک میرے ذہن میں بھی نام کونجا

”اوہ! یہ تو وہی حضرت تھے، جن کا پتا صبح نصیر صاحب نے بطور خاص لکھوایا تھا۔“ میں جلدی سے درمیان میں آکر کمرے کے دوسرے حصے میں آ گیا اور انہیں سلام کیا ”جی..... میرا نام عبد اللہ ہے۔“ وہ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھنکے اور پھر جلدی سے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے ملنے لگے ”اوہ! معذرت چاہتا ہوں، دراصل میرے ذہن میں کسی بزرگ کا خاکہ تھا۔ مجھے نصیر نے کچھ دیر پہلے ہی فون کر کے تمام تفصیل بتائی ہے۔ وہ بزرگ کیسے ہیں، جن کی طبیعت ناساز تھی؟“ میں انہیں اندر سلطان بابا کے پاس لے گیا۔ وہاں انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا کہ وہ اور نصیر صاحب ملازمت میں ایک دوسرے سے سنیا رٹنی میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود، بہت قریب تھے اور یہ تعلق شیخ صاحب کی ملازمت سے فراغت کے بعد بھی بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے سلطان بابا سے درخواست کی کہ ان کے لائق کوئی بھی خدمت ہو، تو ضرور تحکم کریں۔ سلطان بابا نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ یہاں تک آ گئے، یہی ان کے لیے باعث تسلی ہے۔ شیخ صاحب نے جھکتے ہوئے اسپتال کی فیس کا پوچھا، نوزس نے انہیں بتایا کہ مینیجری ہنگامی ادائیگی ہو چکی ہے۔ وہ ڈرا سے حیران ہوئے، لیکن چہرے کے تاثرات چھپا گئے۔ ہمارے ظاہری حلیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی حیرت، بجا تھی کہ کاغذ کے ان مخصوص ٹکڑوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اسٹن میں نرس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مریض کے پاس رہنے کے اوقات ختم ہو چکے ہیں۔ سلطان بابا کو اب بھی میری ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ رات رات کہاں بسر کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں قریب ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ وہ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا لیتے رہیں۔ شیخ صاحب، جو دروازے کے قریب ہی کھڑے تمام بحث سن رہے تھے، جلدی سے بولے ”آپ اس نوجوان کی فکر نہ کریں۔ میرا اتنا بڑا گھر کس دن کام آئے گا۔ عبد اللہ میاں کو میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا اور صبح ٹھیک وقت پر دوبارہ یہاں پہنچا بھی دوں گا۔“ سلطان بابا میرے چہرے پر پیش و پیش کے آثار دیکھ کر کچھ گئے کہ میں ان تکلفات میں پڑنے سے کترار ہا ہوں۔ انسان جب تک اکیلا اور اپنے بس میں ہو تو آزاد رہتا ہے کسی اور کے کرم پر ہو تو جکڑ جاتا ہے۔ میں جب تک اپنے گھر میں بھی تھا، تب بھی مجھے گھر کی پابندیاں اور ممّا، پاپا کی نصیحتیں کبھی مخصوص اوقات کا پابند نہیں کر سکی تھیں۔ بیرونی کپٹ کی ایک چابی ہمیشہ میری گاڑی کی چابی کے محفلے میں موجود رہتی تھی، تاکہ جب کبھی میں آدھی رات کو اپنی منگشت کے بعد گھر پہنچوں تو مجھے ہارن بجا کر دروازہ نہ کھلوانا پڑے۔ مجھے بند دروازوں، لگے بند سے نظام الاوقات اور ایسی ہر پابندی سے خدا واسطے کا بیر تھا، جو میرے اندر کی آزاد دنیا کو قید کرنے کی کوشش کرتی اور شاید وہ آوارہ گرد ساحر، اب بھی مجھ میں کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ سلطان بابا میرے ساتھ ہوتے تو بات اور ہوتی، کیوں کہ ان کی موجودگی میں، میں کہیں بھی آزادی محسوس کرتا تھا، لیکن یوں تب شیخ صاحب کے ساتھ جانے میں مجھے بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ اتنا بڑا صاحب بھی میری ہچکچاہٹ جان گئے اور مسکرا کر بولے ”بھئی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نصیر آج کے بعد مجھ سے کبھی بات نہ کرے تو ضرور کہیں اور ٹھہر جانا، کیوں کہ وہ پکا پولیس والا ہے، ایک بار روٹھ جائے تو منانا مشکل ہے۔ جب اسے پتا چلے گا کہ میرے شہر میں اس کے مہمان کہیں اور قیام کر رہے ہیں، تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا سوچے گا.....؟“ سلطان بابا نے بھی میرا ہاتھ دبا کر مصلحت سمجھانے کی کوشش کی۔

ہم اسپتال کی پارکنگ میں آئے، تو ان کی بی بی ایم ڈبلیو کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور کچھ ہی دیر میں ہم ان کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنے خاندان کا غائبانہ تعارف بھی کروایا۔ ان کی اہلیہ چار سال پہلے داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ گھر میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا لڑکا کاروبار کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہفتے سے بیرون ملک تھا، اس کی آمد دو ہفتے میں متوقع تھی۔ بیٹے سے چھوٹی دونوں بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھیں اور سب سے چھوٹا بیٹا ابھی بی اے کا طالب علم تھا۔ میں چپ چاپ ان کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ کافی زندہ دل انسان معلوم ہوتے تھے، جو اپنی اولاد کی ہر چھوٹی بڑی دل چسپی میں پوری طرح شامل ہو اور اپنے گھر ہی کو اپنی گھل کائنات سمجھتا ہو۔ میں نے اپنے بارے میں مکمل تفصیلات بتانے سے اجتناب کیا اور اتنا ہی بتایا کہ ماں باپ کے بعد اب سلطان بابا ہی میرے اپنے اور بزرگ ہیں۔ اسی اثناء میں ان کا گھر بھی آ گیا۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جدید طرز تعمیر کا ایک شاہکار۔ اتنے دن صحرا میں گزارنے کے بعد اتنا زیادہ ہنرہ اور ہرے بھرے درخت دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے اچانک ہی دنیا بیک اینڈ وائٹ سے تبدیل ہو کر رنگین ہو گئی ہو۔ جلتی ہوئی لو کی جگہ گاڑی سے اترتے ہی بھگی ہوئی نرم ہوا کے جھونکے نے میرا چہرہ چوم لیا۔ دونوں گھر اندر سے دوڑے چلے آئے اور آگے بڑھ کر ہاتھ سے میرے کپڑوں کا تھپتھا ہوا تھا۔ شیخ صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ مجھے ان کیسی میں لے جائیں۔ اب میرا قیام وہیں ہوگا۔ انہوں نے رات کے کھانے کے لیے میری پسند پوچھی، تو میں مال کیا کہ جو بھی بنا ہو، وہی میری پسند ہوگا۔ میں لوکروں کے پیچھے ان کیسی کی طرف بڑھنے لگا، تو انہیں کچھ یاد آیا۔ ”ارے ہاں، عبد اللہ میاں! ان کیسی کے دوسرے کمرے میں اپنے شہر یا میاں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ہی دارالحکومت سے تعریف لائے ہیں۔ میرے بہت گہرے دوست کے صاحب زادے ہیں۔ تمہارے ہی ہم عمر ہیں، امید ہے کہ تم دونوں کا وقت اچھا گزرے گا۔ تم نہادھو کر فریٹش ہو جاؤ..... ہم کھانا ان کیسی ہی میں کھائیں گے“ میں ان کیسی پہنچا تو بنگلہ کا ایک پورا حصہ۔ مہمان خانے کے طور پر پچھلے حصے میں موجود تھا۔ جس کا اپنا پورچ اور باٹچہ بھی اسی حصے میں واقع تھے۔ ان کیسی میں چار کمرے تھے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ اس کے علاوہ تھا۔ میرے لیے جو کمرہ کھولا گیا، اس کے ساتھ والے کمرے میں پہلے سے روشنی تھی اور تیز موسیقی کی آواز بند دروازے سے باہر آرہی تھی۔ گھر کافی کشادہ اور ہر طرح کے آسائشی لوازمات سے سزُن تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہاں ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ستانے لگا۔ شاید اتنے بہت دنوں تک تنگ و تنار یک اور ویران جگہوں پر رہتے رہتے، میں اب اسی ماحول کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اپنی آسائش اور آرام کے پیمانے ٹھوڑے اندر ہی بناتے ہیں۔ کبھی یہ آرام وہ بستر میرے آرام کا پیمانہ تھا اور اب ایک رات پہلے تک صحرائی جلتی ریت پر بھی میں سکون سے سو جاتا تھا۔ بات تو بس ڈرا اس پنگے من کو بہلانے کی ہوتی ہے اور ہم میں سے جو کوئی بھی، یہ من بہلاوے کا کٹر جان لے، دراصل وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ دیر بعد شیخ صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے ان کیسی پہنچ گئے۔ مجھے لو کہنے بتایا کہ وہ اور شہر یا صاحب کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ایک کلین شیونو جوان نے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ ”ہلو! مجھے شہر یا کہتے ہیں“ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما ”میں عبد اللہ ہوں“ شہر یا ر مسکرایا۔ ”عبد اللہ تو ہم سب ہی ہیں، یعنی اللہ کے بندے۔“ شیخ صاحب زور سے ہنستے ”ارے بھئی اس کی بات کا برا نہ مانا، دراصل لفظوں سے کھیلنا ہی شہر یا ر میاں کا پیشہ ہے۔ قلم کار جو ٹھہرے۔ آج کل یہاں بھی اپنے کسی منصوبے کے لیے کہانی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔“ میں بھی دھیرے سے مسکرایا ”پھر تو ان سے ڈرنا چاہیے، کہیں ہماری ہی کہانی نہ بنا ڈالیں۔“ ان دونوں ہی کو شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے دونوں چوٹکے اور پھر دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ کھانے کے دوران بتا چلا کہ شہر یا ر ایک لکھاری ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، سونے کا بیج منہ میں لے کر پیدا ہوا، لیکن عملی زندگی میں باپ کے کاروبار میں ہاتھ نہانے کی خواہش کو رو کر کے قلم سے روشہ ہو چکا۔ موضوعات کی یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایک جگہ بیٹھ کر لکھنے کے بجائے کہانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ شہر یا ر کو بھی مختصر اساطیر ہا ہا کے ہارے میں بتا دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر شیخ صاحب ہم دونوں سے رخصت ہو کر آرام کے لیے چلے گئے، میں اور شہر یا ر بھی شب بھر کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میں مشاء کی لمبا زانو کمرے کے بعد بھی بہت دیر تک ٹھنکے کی اس دیوار لمبا بڑی ہی کٹھن کی تھوڑی سی بیٹھا رہا، جہاں سے ان کی کسی کی پشت پر موجود باغیچے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ باغ میں ہر تین چار گز کے فاصلے پر بننے کے سفید وودھیا قلعے لگائے گئے تھے، لہذا اس وقت بھی وہاں دن جیسا ہی ساں تھا، میری تو جد بھی اسی لان کی انتہائی نفاست سے تراشی گئی باڑھ اور بیلوں کی جانب ہی تھی کہ اچانک مرنے پڑی بھوٹی سی شیشے کی تپائی پر پڑا فون بج اٹھا۔ میں زور سے چوٹا، رات

کے ساڑھے بارہ بجتے کو تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟ اچانک میرا ذہن اسپتال کی طرف گیا اور کسی ان جانے و سونے کی پھنکار سے ڈر کر میں نے جلدی سے ریسیور اٹھالیا۔ ”جی.....“ دوسری جانب خاموشی تھی۔ میں نے قدرے زور سے کہا ”جی فرمائیے“ دوسری جانب سے ایک نازک سی نسوانی آواز ابھری ”جی..... آپ کون؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔“ دوسری جانب سے کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ شاید کوئی راگ نمبر تھا۔ میں گہری سانس لے کر اٹھنے ہی کو تھا کہ گھنٹی دوبارہ بجی، جی میں آیا کہ ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دوں، لیکن نہ جانے اس فون کی دوسری لائن کہاں تھی۔ اسی طرح مصروف کر دینے سے کوئی ضروری فون بھی تو جوک سکتا تھا۔ میں نے دوبارہ ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب وہی آواز تھی ”جی..... شہریار.....؟“ اوہ تو یہ شہریار کے لیے فون تھا۔ میں نے جواب دیا ”نہیں..... شہریار صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔ میں یہاں مہمان ہوں۔“ دوسری جانب پھر وہی جلتنگ بجا۔ ”اوہ..... معاف کیجیے گا، آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی۔ آپ فون رکھ دیں اور اس بار گھنٹی بجے تو آپ نہ اٹھائے گا، شہریار خود اٹھالیں گے۔ دراصل اس نمبر کی دو ایکسٹینشنز ہیں۔“ میں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو تین گھنٹیوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ شاید دوسری جانب سے شہریار نے فون اٹھا لیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہی مجھے پھر سے وہی گھنٹن ستانے لگی، حالاں کہ اے سی کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار خنکی چھائی ہوئی تھی۔ میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور شہریار نے اندر جھانکا ”ویسے تو آدھی رات کے وقت یہ سوال کرنا خود بد تہذیبی کے زمرے میں آتا ہے، لیکن اجازت ہو تو اندر آ جاؤں، مجھے بھی نیند نہیں آ رہی، تمہاری نیند شاید بار بار اس فون کی بجتی گھنٹی نے اڑا دی ہے۔“ میں خوش دلی سے مسکرایا ”نہیں! میری نیند ازل سے اڑی ہوئی ہے، شاید میرے اندر ہی کوئی گھنٹی لگی ہوئی ہے، اندر آ جاؤ۔“ شہریار نے میری کرسی کے سامنے والا صوفہ سنبھال لیا ”واہ، خوب کہی، ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ سچ کہوں تو مجھے تو تم بھی کوئی رائٹری دکتے ہو“ میں ہنس کر نال گیا۔ الٹا شہریار سے سوال کر دیا ”تم کہانی کی تلاش میں یہاں آئے ہو، تو پھر کچھ کام بانی ہوئی کہ نہیں“ شہریار نے ایک لمبی سی سانس لی ”اب کیا بتاؤں، پچھلے چند دنوں سے میں خود ایک کہانی بنا ہوا ہوں۔“ کیوں..... خیریت.....؟“ ”ہاں، فی الحال تو خیریت ہی ہے۔ دراصل ڈیڈی نے مجھے یہاں کسی اور مقصد کے لیے بھیجا ہے۔ کہانی تو بس ایک بہانہ ہی ہے۔ مجھے شیخ انکل کی دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بطور ہم سفر انتخاب کرنا ہے۔ یہ ڈیڈی کی خواہش ہے۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن انہوں نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ چوں کہ ابھی تک کوئی مہ جیس میری نظروں میں سمائی نہیں، لہذا اس چناؤ کے لیے اپنی پہلی تلاش اسی گھر سے شروع کروں اور یہیں سے میری الجھن کا آغاز ہوتا ہے۔“ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا ”اس میں الجھن کیسی۔ شیخ صاحب کی دونوں صاحب زادیوں سے مل کر دیکھ لو، اور پھر دونوں میں سے جو بھی دل کو بھائے، اس کے لیے ہاں کہہ دو اور پھر تمہیں تو ”نہ“ کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ دل نہ مانے تو اپنے ڈیڈی کو اطلاع کر دیتا۔“ شہریار نے پھر ایک آہ بھری ”یہی تو مشکل ہے۔ مجھے ان میں سے بڑی والی بھاگنی ہے۔ کیا کہوں کہ وہ میری غزل ہے یا خیام کی رباعی، درد کا کوئی قطعہ ہے یا غالب کے خطوط کی نثر نگاری.....“ میں مسکرا دیا۔ ”تو پھر الجھن کیا ہے، پہلی فرصت میں گھر والوں کو اطلاع کر دو کہ وہ آ کر تمہارے لیے اس کا ہاتھ مانگ لیں“ شہریار جلدی سے بولا ”وہ ہے ہی کچھ ایسی، ابھی کچھ دیر پہلے تم نے فون پر اس کی آواز سنی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ لٹریچر تو جیسے وہ تمام کا تمام گھول کر پی چکی ہے، دنیا کا کون سا موضوع ہے، جس پر وہ بات نہیں کر سکتی، لیکن صرف فون پر، جیسے ہی وہ سامنے آتی ہے، سمجھو زبان کھو جاتی ہے اُس کی“ ”تو کیا اسے پہلے پتا تھا کہ تمہارے ان کے ہاں ٹھہرنے کی اصل وجہ کیا ہے.....؟“ شہریار مسکرایا ”ہاں میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے انکل کو کچھ اشارہ ضرور دیا ہوگا اور خود انکل بھی اپنی اولاد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اپنی دونوں بیٹیوں کو میری آمد کا مقصد بتا دیا ہوگا۔ ان کے آپس میں شرارت آمیز اشارے تو یہی بتاتے ہیں، لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اس سے تنہائی میں ایک بار مل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ بار ایسا موقع ملا بھی، تو میرے کان وہ سب کچھ سننے کے لیے ترستے ہی رہے، جو میں فون پر اس کی میٹھی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فون پر دونوں بہنیں بہ یک وقت موجود ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دونوں ہی زور سے ہنس بھی دیتی ہیں۔ مطلب انہوں نے کبھی یہ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ دونوں ہی دوسری جانب لائن پر موجود ہوتی ہیں۔“ مجھے شہریار کی حالت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ اس نے شکوہ کیا ”ہاں! تم بھی ہنس لو، اپنی صورت حال ہی کچھ ایسی ہے کہ آتے جاتے سب ہی ہماری کھنٹی اڑاتے ہیں۔“ میں نے اسے چھیڑا ”تم خواخواہ کہانی کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہو، ایک سنسنی خیز تجسس سے بھرپور کہانی تو خود تمہارے آس پاس چل رہی ہے۔“ شہریار نے قریب پڑا کٹن اپنے سر کے پیچھے رکھا ”ٹھیک کہتے ہو، یہ تو خواتین کے کسی رسالے کے لیے پورے ایک ناول کا پلاٹ ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آئے مہینے بھر سے کچھ زیادہ ہونے کو آ گیا ہے۔ اب مجھے اس سے ایک تو تفصیلی ملاقات میں بہت سے سوالوں کا جواب لینا ہے اور میرے پاس اس کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔“ میں نے غور سے شہریار کی جانب دیکھا ”ویسے کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم نے مجھے اپنی اس محبت کی کہانی میں شامل کرنے میں کچھ جلدی کی ہے۔ میں ابھی تک تمہارے لیے ایک اجنبی ہی تو ہوں“ شہریار مسکرایا ”ہم بھی لکھاری ہیں میاں! چلتے پھرتے کرداروں کے اندر تک جھانک لیتے ہیں۔ مانا کہ ہمیں ملے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں، لیکن تم میرے لیے پہلے لمحے کے بعد ہی اجنبی نہیں رہے تھے۔ تم وہ نہیں ہو، جس کا مجھیں تم نے بھر رکھا ہے“ میں نے چونک کر اسے دیکھا ”اچھا.....؟ اتنی جلدی یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا تم نے“ شہریار میری جانب ہی دیکھ رہا تھا ”کھانے کی میز پر زیادہ تر انا لین اور چائینیز ڈشز موجود تھیں، اگرچہ تم نے چھری کا نسنے کا استعمال، حتی الامکان کم سے کم کیا، لیکن تمہیں ان لوازمات کا استعمال کرتے دیکھ کر کوئی بھی با آسانی بتا سکتا ہے کہ تم وہ نہیں، جو دکھائی دیتے ہو۔“ میں نے حیرت سے شہریار کی طرف دیکھا۔ واقعی کمال کا مشاہدہ تھا اس کا، اتنی چھوٹی سی بات کا بھی اس نے کس قدر غور سے جائزہ لیا۔ میں نے اسے داد دی ”واہ بھئی..... مجھے نہیں پتا تھا کہ آج کل کے نئے لکھاری بھی اس قدر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ تم نے مجھے متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی“ شہریار زور سے ہنسا ”تو پھر ہو جاؤ نا متاثر۔ کوئی تو ہمارا بھی فین ہو“ میں بھی ہنس پڑا۔ ”چلو تو پھر آج سے میں تمہارا پہلا پرستار ہوں، لیکن یہ بتاؤ کہ اب اس معے کا کیا کرو گے، جس نے تمہاری راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔“ شہریار نے سر کھجایا ”معملاً تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ انکل کی عادت ہے کہ وہ شام کی چائے سب کے ساتھ ہی کھی لان میں، تو کبھی کن روم میں پیتے ہیں، ہو سکتا ہے کل تمہارا سامنا بھی ان دونوں سے ہو جائے، پھر تم ہی بتانا کہ فون پر اتنا اچھا بولنے والی، سامنے آتے ہی اس قدر خاموش کیوں ہو جاتی ہے“ شہریار بہت دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا، لہذا اگلی صبح مجھ سے فجر قضا ہو گئی۔ آٹھ بجے کی تو سربھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔ نوکر نے مجھے کمرے سے نکلنے دیکھ کر جلدی سے ناشتا میز پر لگا دیا۔

کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے اسپتال چھوڑ آیا۔ شیخ صاحب دوسری گاڑی میں صبح سویرے ہی کسی ضروری کام سے نکل چکے تھے، البتہ ڈرائیور کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھے شام چار بجے کے قریب گھر واپس لینا آئے۔ میرے ذہن میں شہریار کی رات والی بات گونجی۔ سلطان بابا کی حالت آج کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ دوپہر بارہ بجے تک ان کے تمام ضروری معائنے بھی ہو گئے، جن کی رپورٹ کل ملنا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھر واپس بھیجنے کی بات کی، تو انہوں نے منع کر دیا کہ اگر شیخ صاحب نے کہا ہے تو پھر میں شام کو گھر سے ہواؤں، پھر چاہے تو رات گئے تک اسپتال میں ان کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے ڈرائیور سمیت گھر واپس پہنچا، تو دربان نے بتایا کہ شیخ صاحب لان میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شام کی چائے پر شہریار اور ان کا چھوٹا بیٹا وقار بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں چائے لگا دی گئی۔ اتنے میں اندر سے جدید وضع قطع کے لباس میں ایک شوخ سی لڑکی نکلی۔ شیخ صاحب نے تعارف کروایا ”عبداللہ میاں! یہ ہماری بڑی صاحب زادی ہیں، شاہانہ..... ہماری شانی“ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ شانی کے پیچھے پیچھے ایک اور سیدھی سادھی، بچ کی مانگ نکالے سانولی سلونی سے لڑکی بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہماری جانب آ گئی۔ وہ شاہانہ کی بالکل الٹ دکھائی دیتی تھی۔ سادہ سا کرتا پاجامہ، لمبی سی پٹیا بنائے، وہ اس ماحول سے یک سر مختلف نظر آئی۔ شیخ صاحب نے پھر تعارف کروایا ”اور بھئی..... یہ ہیں ہماری چھوٹی صاحب زادی

..... دھانی.....“ (باقی آئندہ)

اُک خاکِ بسرو نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رنگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



.....☆ ہاشم ندیم ☆.....

اگر ان دونوں کا تعارف خود شیخ صاحب نہ کروائے، تو شاید میں بھی انہیں سکی نہیں نہ مانا، ان دونوں کے برتاؤ، چال و چال اور رکھ رکھاؤ میں مشرق و مغرب عتنا فاصلہ اور دن اور رات جیسا فرق تھا، البتہ خود اعتمادی دونوں میں یکساں اور ہاکی تھی۔ چائے کے دوران دونوں بہنوں نے مجھ سے سلطان بابا کی طبیعت کا پوچھا اور اپنی اور شیخ صاحب کی جانب سے خواہش ظاہر کی کہ جب وہ بہتر ہو جائیں، تو کچھ دن ان سب کے ساتھ ہمیں ان کے گھر پر قیام کریں۔ میں صرف انتہائی کہہ سکا کہ میں ان کی فرمائش ضرور سلطان بابا تک پہنچا دوں گا۔ شہر یاری تمام توجہ شاہ پر تھی، مگر نہ جانے کیوں، وہ چائے پینے کے دوران بھی کھو یا کھو یا سا لگ رہا تھا۔ میں چائے ختم کر کے شیخ صاحب کی اجازت سے وہ بارہ اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ باقی سب بھی اٹھ چکے تھے۔ شہر یار نے مجھ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں اسپتال پہنچا، تو سلطان بابا کے کمرے میں تین چار سینئر ڈاکٹروں کا ہتھکھڑا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ فرس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک ڈاکٹر کمرے سے نکل نہ جائیں، میں بیرونی کمرے میں انتظار کروں۔ دس منٹ کا وہ مختصر عرصہ، مجھ پر دس صدیوں جیسا بھاری گزرا، پھر جیسے ہی پہلے ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا، میں تیزی سے اس کی جانب لوٹا۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر صاحب۔“ ڈاکٹر مسکرایا۔ ”اوہ ہاں..... ڈھونڈ دری۔ بس معمول کا چیک اپ تھا۔ اب آپ لوگوں سے اسپتال والوں نے اتنی فیس لی ہے، تو ہمیں بھی کچھ سرگرمی تو دکھانا پڑے گی نا۔“ ان کی بات سن کر میں بھی مسکرا دیا۔ طبیب کے پاس سر پائس کے لیے دو اور اس کے چار داروں کے لیے مسکراہٹ سے بڑھ کر اور بھلا کیا سوغات ہوگی۔ خوش دلی اور اخلاص سے ہماری ایک مسکان کی خود اپنی ایک مسکراہٹ ہوتی ہے اور بہت سے گھٹائل تو ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا فقط علاج ہی بس ایک مسکراہٹ ہوتی ہے اور اس لیے مجھے بھی یہ احساس ہوا کہ طب کے شعبے میں شاید وہاں سے بھی زیادہ اور پہلی ضرورت خوش اخلاقی ہے۔ سلطان بابا اپنے ہسٹری پر جیسے سے ٹھیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ اسپتال میں بندہ داخل تو اپنی مرضی سے ہوتا ہے، لیکن پھر اس کی ”رہائی“ ان ڈاکٹروں کی مرضی ہی سے ہو پاتی ہے۔ اب یہ روز بہ روز نئی حکمتیں تراشیں گے، مجھے یہاں روکنے کے لیے.....“ مجھے ان کی ”رہائی“ والی اصطلاح پر ہنسی آئی۔ ”ہاں..... ابھی باہر بوڈا ڈاکٹر صاحب ملے تھے وہ وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پیسے لیے ہیں تو انہیں حلال بھی تو کرنا ہے۔“ ہماری بات سن کر بابا بھی مسکرا دیے۔ ”ٹھیک ہے یہاں! اگر لو اپنی ضد پوری، لیکن یاد رہے..... جب جب جو جو ہوتا ہے، جب جب سو سو ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا، ہر بار کی طرح ان کا یہ مخصوص جملہ ایک بار پھر میرے اندر سب کچھ ٹپٹ کر گیا۔ اب تو مجھے اس جملے سے ہاتھ دھو خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ سلطان بابا نے جب بھی اسے ادا کیا، کوئی نہ کوئی ان ہونی ضرور پیش آئی۔ پھرے لوں سے آخر بہت دیر سے ان کا سوال پھل ہی پڑا۔ ”آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے، پھر آپ اپنے لیے شفا یابی کی دعا کیوں نہیں کرتے۔“ کال گڑھ میں آپ کو جو شہر یار جوٹ گئی، آپ نے اس سے بچاؤ کی دعا پہلے سے کیوں نہ کی؟“ وہ میرا سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، جیسے میں نے قبل از وقت کوئی بات پوچھ لی ہو۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑی اور کہا۔ ”میں ہمیشہ اپنے لیے اتھارے لیے، بلکہ سب کے لیے یکساں دعا مانگتا ہوں۔ سب کے لیے اللہ سے اس کا فضل، کرم طلب کرتا ہوں اور ہر اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں، جس کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہو..... لیکن یاد رہے، بہتری کس بات میں پوشیدہ ہے، اس کی خبر تو بس اسی کو ہے۔ جانے اس سر کی پوٹ اور پھر یہاں اسپتال تک پہنچنے میں اس کی کون سی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر، بہت قریبی منہ پر نظر رکھنے والے پیدا کیے گئے ہیں، البتہ انسان کی ہر وہ بات اسی پر کچھ چھوڑنی چاہیے..... رہی بات خود اپنے جسم کو گھٹائل ہونے سے بچانے کے لیے دعا کرنے کی، تو یاد رکھو، اس جسم کی اپنی جگہ حد میں ہیں اور موت ان جسمانی حصوں کو پار نہ جانے کا نام ہے۔ یہ جسم دنیا کی سب سے فانی شے ہے۔ اس دور میں اس بدن کے عروج اور پھر زوال کا دور آپ اوجھا سناٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوتا ہے۔ اس لیے، میرا جسم اپنی عمومی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں ستر کے حد کو چھونے والا ہوں اور اس دوران میرے جسم میں موجود خون کے غلبے، ہماری رگیں، پیسے اور جسم کے بنیادی اجزاء اپنی عمومی مشقت پوری کر چکے ہیں، اب ان اجزاء کے ساتھ میرے جسم کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ خصوصی ہوگا۔ یہاں ایک بات اور دھیان میں رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ موت کا تعلق کبھی براؤ راحت جسم کے زوال سے نہیں ہوتا۔ موت جسم میں موجود روح کے نکلنے کا نام ہے، جو نکلنے نکلنے سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لے سکتی ہے اور بہت سے ایسے انسان ہمارے آس پاس موجود ہیں، جو اپنے جسم کے اس مخصوص رویے کی وجہ سے بے آسمانی اتنی عمر کا سفر بھی طے کر لیتے ہیں، جبکہ بعض مادہاتی صورتوں میں میں بائیس سال کے جوان جسم سے بھی روح ملی بھر میں نکل جاتی ہے تو ثابت یہ ہوا کہ جسم کی اپنی بھی ایک خاص یہ عمارت اور مدت ہے، وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں..... انیس پانچویں ڈیٹ، جو کسی حادثے کی صورت میں خود اور طبعی مدت پوری کرنے کی صورت میں ساتھ سے ستر سال کے اندر ہمارے جسم کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں ہماری روح کا اس بدن میں مزید قیام مشکل ہو جاتا ہے۔“ میں غور سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بہت بڑا امر اب میرے ذہن کے در پہلوں سے اٹھتا ہے آتے جاگس پلٹ گیا، جیسے کچھ مجھ میں آنے سے پہلے ہی سب کچھ آپس میں الجھ گیا ہو۔ سلطان بابا نے کچھ وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ ”اسی لیے ہمارے معاشرے میں عام طور پر لوگ اپنے جسم کے اس عمومی رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے دینی اور دنیاوی معمولات کا خاکہ بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ایک عام رویے کا انسان چالیس پینتالیس سال کی عمر کے بعد مذہب کو زیادہ وقت دینے لگتا ہے، کیوں کہ اس کے لاشعور میں گہیں یہ بات دہی ہوتی ہے کہ عمر کی آخری دھائیاں شروع ہو چکی ہیں، تو بہتر ہے کہ اب اوپر والے کو بھی راضی کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپا یہ تمام کیفیات بھی صرف ہمارے جسم ہی پر وارد ہوتی ہیں۔ ان کا ہماری روح سے کوئی تعلق نہیں، البتہ روح کا ہر تاؤ ہماری ان جسمانی حدود میں پر منحصر ہے۔ نگاہ پر وہ وقت طے کرتی ہے، جب ہماری روح کو ہمارا یہ جسم چھوڑنا ہوتا ہے اور پھر کوئی نہ کوئی بہانہ، ہماری، چہرے، حادثہ یا سادہ طبعی موت اس روح اور جسم کی دائمی جدائی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی ہمارا ایمانی ہے کہ ہر ذی نفس کو موت کا ذاتی ٹھکانا ہے اور پھر موت کے بعد اسے روزِ حشر پھر سے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور جب ہماری زندگی کا دوسرا اور اصل دور شروع ہوگا، اس لیے ہمیں اس دنیا کے لیے اسی قدر محنت کی تاکید کی گئی ہے، جتنا ہمیں یہاں رہنا ہے۔“ سلطان بابا اپنی بات ختم کر چکے تھے، لیکن میرا ذہن سب معمول کچھ نئے سوالوں میں الجھتا چلا گیا۔ تو کیا ہماری معصوم روح، صرف ہمارے جسم کے کیے گئے گناہوں کی سزا بھگتی ہے؟ کیا گناہ اور ثواب کا اختیار صرف ہمارے ایک بنیادی عضو ”ذہن“ کی کارستانیوں کا شکار ہے؟

رات اٹھ بجے نرس نے دوبارہ آکر مجھے کل والی بات کی یاد دہانی کروائی کہ تیار داروں کو رات گزارنے کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب خود بھی آپہنچے اور چند منٹ سلطان بابا کے ساتھ بیٹھنے کے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم نے اسپتال کے اصولوں کے مطابق روانگی اختیار کر لی۔ شیخ صاحب نے راستے میں بتایا کہ آج نصیر صاحب نے انہیں فون کر کے سلطان بابا کی تفصیلی خبریت معلوم کی تھی اور مجھے نہ جانے کیوں، ان کی باتوں سے کچھ ایسا محسوس ہوا، جیسے آئی۔ جی صاحب نے انہیں کچھ میرے بارے میں بھی بتایا ہے اور شاید وہ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ اسپتال کی ادائیگی بھی میرے گھر والوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ بہر حال، انہوں نے مصلحتی اس موضوع کو چھیڑنے سے گریز ہی کیا اور مجھے ایک بڑی مشکل سے بچالیا، کیوں کہ اب میں کسی بھی طور اپنے روایتی حسب نسب اور ماضی کے کسی بھی حوالے کو اپنی ذات کا تعارف نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے، تو ان کا چھوٹا بیٹا وقار کار پورچ سے ذرا پرے، اپنی ڈی ٹی ایس بیوی بانیٹ کی ریلیں چیک کرنے کے لیے اس کے پیچھے پیسے کو اسٹینڈ کے ذریعے اونچا کر کے ہائیڈروکلک بجلی لگا رہا تھا۔ پورے گھر میں موٹر سائیکل کی تیز آواز نے جنگمہ سا برپا کر رکھا تھا۔ میں ایک لمبے ہی میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر، خود اپنے گھر کے احاطے میں پہنچ گیا اور چند لمبے ہی میں وقار کی جگہ پرانے ساحر نے لے لی۔ ہر اتوار کو میں اور کاشف میرے ہی گھر میں، اپنی اپنی ہائیکس کھول کر اسی طرح ان کی صفائی کیا کرتے تھے اور پورا گھر سر پر اٹھائے رکھتے۔ وہ دون گھر کے تمام نوکروں کی شامت کا دن ہوتا، کیوں کہ ہمیں ہر دو سرے پل کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی اور نہ ملنے پر یادیر سے لانے پر کوئی نہ کوئی نوکر ہمارے قصاب کا شکار بن کر رہی رہتا۔ پھر شام کو جب پایا گھر واپس آتے تو ان کی عدالت میں ہماری شکایتیں لگتیں اور کبھی مجھے اور کبھی کاشف کو جرم ماند بھرنا پڑتا۔ یہ وقت بھی کیسی کیسی کر دینیں بدل جاتا ہے۔ کاشف ہمارا حافظہ بھی گزرتے وقت کی کردت کے ساتھ ساتھ کسی سلیٹ کی طرح صاف ہوتا رہتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے اپنی جگہ رکا دیکھ کر شیخ صاحب آگے جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔ ”کیوں عہد اللہ سب ٹھیک تو ہے؟“ میں جلدی سے سر ہٹھک کر اپنی دنیا میں واپس آیا اور آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے نوکروں سے کہا کہ وہ تازہ دم ہو کر ایکسیٹیوٹی میں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے، میں نہ چاہے ہوئے بھی اپنے قدم وقار کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پایا۔ اس نے ہائیڈروکلک تیل کی لمبی گلاس نمائندگی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور پچھلے پیسے کی ڈسکس میں بنے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جانب آنک دیکھ کر اس نے ایکسیٹیوٹی چھوڑ دیا، لیکن پیسہ اب بھی تیزی سے محسوس رہا تھا۔ میں نے تیل کی جگہ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ”جب تک پیسہ عمل طور پر رک نہ جائے اور بانیٹ کا آئین ٹھنڈا نہ ہو جائے، تیل نہ دینا، ورنہ یہ آئل صرف پیسے کی ڈسک تک محدود نہیں رہے گا، پورے آئین میں پھیل جائے گا، پھر کئی دن تک بانیٹ بار بار ہوک ہوئی رہے گی۔“ وقار کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے میری بات سن رہا تھا، پھر اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اوہ! تو یہ وجہ تھی کہ بانیٹ پوری ریس نہیں اٹھا رہی تھی اور میں پچھلے تین دنوں سے سر کھپا رہا ہوں اور ڈسک کو جام کچھ کر تیل دیے جا رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر آئل کی بوتل اسے واپس کر دی۔ وقار بھی جلدی سے ہاتھ پونچھ کر میرے ساتھ ہی ایکسیٹیوٹی کی طرف چلے گا اور اپنی بانیٹ کے بارے میں بتانے لگا کہ ابھی دو ماہ پہلے ہی اس کے ڈیڈ نے اسے یہ بانیٹ لے کر دی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہر ہدایتی کتابچہ (Manual guide) نہیں ملا، کیوں کہ بانیٹ سمندر کے ذریعے کھلے بحری جہاز پر پہلے پورٹ اور پھر یہاں تک پہنچی تھی، لہذا بہت سے ضروری لوازمات بھی غائب تھے۔ انہی باتوں کے دوران شیخ صاحب بھی پہنچ گئے، لیکن آج شہر یار نہ جانے کہاں غائب تھا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ شام کو کسی دوست کے ہمراہ کہیں باہر نکل گیا تھا، لیکن کھانا لگنے تک شہر یار بھی پہنچ گیا۔ وقار بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اب تک وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا پھر کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی وہ پوچھ بیٹھا۔ ”عہد اللہ بھائی، کیا آپ مولوی ہیں؟“ شیخ صاحب نے اسے گھور کر دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ”ہاں، لیکن جیسے عیم حکیم ہوتے ہیں، ویسے ہی میں فی الحال آدھا مولوی ہوں۔“ وقار اور شہر یار بھی مسکرا دیے۔ وقار کی کچھ ہمت بندھی۔ ”آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں۔ آپ کو ان کی یاد نہیں آتی؟“ شیخ صاحب نے اسے ڈانٹا۔ ”وقار ایہ کیا بہتہ مچی ہے؟“ میں نے شیخ صاحب کو روک دیا۔ ”کوئی بات نہیں، اسے پوچھنے دیں۔ ہاں تو مجھے میرے گھر والے تو یہاں سے بہت دور رہتے ہیں اور مجھے ان کی یاد بھی بہت آتی ہے۔“ ”تو پھر آپ کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے، جب ان کی بہت یاد آتی ہے۔ کیوں کہ میں تو اپنے گھر سے ایک رات بھی دور نہیں رہ سکتا۔“ ”رہ تو میں بھی نہیں سکتا تھا، پر کیا کروں، میرا کام ہی ایسا ہے ناں، الہا جب گھر والے بہت یاد آتے ہیں، تو تھوڑا سا رولینٹ ہوں۔ اس طرح دل کچھ بھل جاتا ہے۔“ وقار زور سے فیس پڑا۔ ”ارے، آپ روتے بھی ہیں، لیکن آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔“ ”تو کیا ہوا، بڑے روتے نہیں کیا؟ میں تو سمجھتا ہوں، بڑوں کو چاہے چھپ کر ہی سہی، چھوٹوں سے زیادہ رونا چاہیے۔ اس طرح ان کا دل کبھی خست نہیں ہوگا۔ میری مالو تو تم بھی ابھی سے پریکٹس شروع کر دو۔ ہر غم کا ڈر دل سے نکل جائے گا۔“ اب شیخ صاحب اور شہر یار بھی ہماری اس ”معصوم“ بحث سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وقار نے جھنجھکے ہوئے اپنے دل کا ایک اور شک زبان سے اگل دیا۔ ”آپ تو ہم جیسے ہی ہیں، لیکن شام کو شاہانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ جو لوگ یوں اپنا گھریا چھوڑ کر اس راستے پر نکل آتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔“ شیخ صاحب کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ گیا۔ شہر یار نے بھی چوٹ کراؤ پود کیا۔ شیخ صاحب غصے سے بولے۔ ”وقار، مائیکرو اور اون بزنس“ میں نے ہاتھ اٹھا کر شیخ صاحب کو روکا۔ ”تم انتہا پسندی کسے کہتے ہو۔؟“ وقار کچھ تھپکا۔ ”وہی جو لوگ زبردستی اپنی منوائے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے ہاتھ میں کھڑا پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”دیکھو، یہ پانی کا گلاس تقریباً بھرا ہوا ہے۔ اس کے ساٹھے میں بھٹی گھٹائی تھی، اتنا پانی اس میں موجود ہے۔ اگر میں اس گلاس میں مزید پانی ڈالوں گا تو وہ پھٹک کر میز پر گر جائے گا اور اس سے تمہیں، تمہارے ابو اور شہر یار کو پریشانی ہوگی۔ بالکل اسی طرح، جیسے تمہاری ڈی۔ ٹی۔ ایس بانیٹ کی رفتار کی حد ایک سو اسی کی ہے؟ لیکن اگر شہر کی عام سڑکوں پر تم اسے ماضی، سڑکی رفتار سے زیادہ چلاؤ گے، تو لوگ ڈر کر ادھر ادھر بھاگیں گے۔ ہو سکتا ہے، تم کسی کو زخمی بھی کر دو۔ بس یہی انتہا پسندی ہے۔ ہر وہ حد، جس سے گزر کر تم دوسرے انسانوں کے لیے کسی بھی طرح کی پریشانی کا باعث بن جاؤ، وہ انتہا پسندی ہے۔ ہم نے آج کل اس صفت کو نہ جانے کیوں، صرف مذہب ہی سے وابستہ کر دیا ہے۔ انتہا پسندی ایک رویے کا نام ہے، تم اپنی حد سے بڑھ کر بانیٹ دوڑا کر بھی انتہا پسند بن سکتے ہو۔ شہر یار تیز ہارن بجا کر بھی اس فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب دن میں آٹھ گھنٹے کے، جانے جس گھنٹے اپنے کا رو بار پر صرف کر کے بھی انتہا پسند نہ ہو سکتے ہیں، لیکن میرا راستہ تو میری اپنی کمونج کا ہے۔ میں کچھ گھنٹے کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ میرا مقصد اپنے نظریات کسی پر مسلط کر کے اسے پریشان کرنا نہیں ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی تک صرف مختلف نظریات کو جانچنے اور پرکھنے کی حد تک ہی محدود ہوں۔ جانے اس مختصر زندگی میں، مذہب کی بنیادی باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھ پاؤں گا یا نہیں۔ کسی انتہا تک جانا تو بہت دور کی بات ہے۔ ویسے بھی مذہب ہمیں ہر چیز میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے، حتیٰ کہ خود عبادت میں بھی اسی اعتدال کو مد نظر رکھنے کا حکم ہے، تو پھر بھلا مذہب ہمیں کسی بھی انتہا پسندی کی طرف کیسے لے جاسکتا ہے۔؟“

میری بات سُننے کے بعد بھی کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر میں نے خود ہی وقار سے پوچھا کہ کوئی اور سوال تو اس کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا؟ وہ خوش دلی سے مسکرا دیا۔ ”نہیں عہد اللہ بھائی۔ میں آپ کی باتیں سننے سے پہلے واقعی ایسے لوگوں سے بہت کتراتا تھا، لیکن آج آپ نے مجھے احساس دلایا ہے کہ شاید ہم خود ہی مذہب کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مذہب ہمیں کبھی اس طرف نہیں دھکیلتا۔ ہمیں خود اپنے رویوں پر قابو پانا ہوگا۔“ شیخ صاحب کے سننے ہوئے احساس ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے خوش ہو کر بیٹے کی پیٹھ چھتی۔ شہر یار بھی مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے شہر یار سے عشاء کی نماز کے لیے مہلت طلب کی۔ ”ٹھیک ہے، جناب، لیکن نماز پڑھتے ہی میرے کمرے میں چلے آنا۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے فیس کر اسے دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں تمہاری ضروری باتوں کا دائرہ کہاں تک محدود ہوگا، تم چلو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔“ نماز کے بعد میں شہر یار کے کمرے میں داخل ہوا، تو کمرہ خالی تھا۔ دھویں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے ادھ جلتے سگریٹ رائیڈ ان میں اب بھی سلگ رہے تھے، کچھ لمحوں کے لیے تو میرا دم ہی گھٹ سا گیا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے لگا جاؤ سگریٹ نوش ہو گے۔“ شہر یار نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ ہر وقت اتنی سگریٹ نہیں چھوکتا۔ بس کبھی کبھی ذہن کسی پلاٹ یا قتلے پر الجھ جائے، تو پھر یہ ٹوئین ہی میری سوچوں کی رکی ہوئی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔“ مجھے آج تک یہ بات کبھی نہیں آئی کہ یہ کتوا دھواں تم جیسے

لکھاریوں کے اندر جا کر ایسا کیا جادو کرتا ہے کہ لفظ اور خیال آنسوؤں کی طرح باہر نکلنے لگتے ہیں؟“ شہر یار زور سے ہنسا ”پتا نہیں، ہو سکتا ہے اندر جا کر یہ دھواں، اُن کا بھی دم گھونکتا ہو، تو خیال باہر کو پلکتے ہوں، کیا تم بالکل بھی سگریٹ نہیں پیتے.....“ مجھے اپنے ماضی کی شائیں، کلب اور ان میں بھرا دھواں یاد آ گیا ”کبھی پیتا تھا، دن میں ایک آدھ پکٹ بھی پھونک جاتا تھا۔ اب نہیں پیتا، تم یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا خیال انک گیا ہے تمہارے اندر، جسے اس دھوئیں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ شہر یار نے گہری سی سانس لی، لیکن جواب دینے کے لیے اس کے لب کھلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شہر یار نے جلدی سے فون اٹھالیا۔ دوسری جانب سے شاید کسی نے سلام کیا۔ شہر یار نے جواب کے بعد کہا ”زبے نصیب..... کہیے، آج کون سا امتحان لیں گی ہمارا.....؟“ میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، لیکن شہر یار نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھالیا۔ مجھے ان کی گفتگو کے دوران وہاں بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا، لیکن شہر یار نے میرا دوسرا اشارہ بھی نظر انداز کر دیا اور دوسری جانب کی بات سن کر کہا۔ ”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر بعد بات کریں۔ دراصل میرے کمرے میں ایک مہمان دوست ہے۔“ دوسری جانب کی بات سن کر شہر یار نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، کل بات کریں گے اور ہاں آپ کے سوال کا جواب ادھار رہا۔“ فون رکھ کر وہ میری جانب پلٹا۔ ”کافی چلے گی.....؟“ ”نہیں! میری کیفین سے کچھ زیادہ بنتی نہیں۔ تم نے خواہ مخواہ فون بند کر دیا۔ ہو سکتا ہے، وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو ویسے بھی جانے ہی والا تھا۔“ شہر یار کسی گہری الجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ”پتا نہیں کیوں، تم سے ہر الجھن بانٹنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر اسٹریو ویسے بھی بہت کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ جو بھا جائے، وہی اپنا پین جاتا ہے۔“ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کچھ الجھے ہوئے سے لگتے ہو؟“ ”ہاں..... ایک عجیب سی بات ہے، شاید میرا وہم ہی ہو، لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ شانی جس طرح کھل کر ہر موضوع پر مجھ سے فون پر بات کرتی ہے، سامنے آنے پر وہ اس کے بالکل برعکس پُپ سی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل تو میں اسے روایتی شرم و حیا کے زمرے میں تو لے رہا، لیکن ایک آدھ مرتبہ ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی ملا، تو وہ بس ہوں، ہاں ہی کرتی رہی۔“

میں غور سے اس کی بات سنتا رہا۔ ”تم ایک لکھاری ہو۔ لفظ تمہارے آس پاس عقیدت سے دوڑا نو ہوئے بیٹھے رہتے ہیں، لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی تمہاری طرح گفتگو کے فن میں طاق ہو۔ ہو سکتا ہے، اسے خاموشی کی زبان زیادہ بہتر لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ لڑکیاں چپ رہ کر زیادہ بولتی ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ ”تخلیے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔“ تو ہو سکتا ہے، اسے بھی یہ لفظ غیر ضروری اور اضافی محسوس ہوتے ہوں۔“ شہر یار اب بھی بے چین تھا۔ ”ہاں! ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ لفظ ہی تھے، جو ہمیں اتنا قریب لانے کا باعث بنے۔ اسے یہ بھی پتا ہے کہ اچھے لفظ اور ان سے بننے اُن چھوئے خیالات ہی میری کمزوری ہیں۔ پھر بھی وہ بولنے میں اس قدر احتیاط، بلکہ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کرتی ہے.....؟“ ”یہ سوال تم نے شانی سے کیوں نہیں پوچھا۔“ ”پوچھا تھا، اُس نے بھی کم و بیش وہی تمہارا جواب دہرا دیا کہ تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔“ اس رات شہر یار نے مجھے تفصیل سے شیخ صاحب کے خاندان کے بارے میں بتایا کہ ان کا بڑا بیٹا امجد اور چھوٹی بیٹی دھانی نقش و نگار کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں، جب کہ بڑی بیٹی شاہانہ اور چھوٹا بیٹا وقار اپنی مرحومہ ماں کے خُسن اور رنگ و روپ سے جڑے ہوئے تھے، اسی لیے شانی اور دھانی کے نقش اس قدر مختلف تھے، لیکن اس چہرے اور دھوپ چھاؤں جیسے رنگ کے فرق سے قطع نظر، شیخ صاحب کی تمام اولاد میں بے حد ایک اور محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں بہنیں، تو جیسے ایک جان دو قالب تھیں، البتہ شانی کے مقابلے میں دھانی اپنے باپ سے زیادہ جڑی ہوئی تھی۔ اس کا نام بھی شیخ صاحب نے دھانی کی فصل کی کٹائی کے وقت اس کی پیدائش پر رکھا تھا۔ سنا ہے اس سال شیخ صاحب کی گاؤں والی زمینوں پر چاول کی فصل نے برسوں کے ریکارڈ توڑ دیے تھے، اور پھر دھانی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، دھانی رنگ بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ بنتا گیا۔ اسکول میں دھانی رنگ کے دائرہ، پنسیلیں، پھر کالج بیک اور پھر یونیورسٹی میں لباس میں دوپٹے، ہاتھ کی چوڑیاں، میجر بینڈ یا پھر پرس..... کوئی ایک چیز دھانی ضرور ہوتی تھی۔ یہی حال گھر کی کلتری، پردوں اور صوفوں کی کلرا سکیم، حتیٰ کہ اس کے اپنے کمرے کے رنگ اور اس کی اپنی شخصیت پر بھی حاوی تھا۔ وہ خود بھی اس رنگ جیسی پُر سکون، بھبری ہوئی اور سادگت تھی، البتہ شانی اس کے برعکس تیز گلابی رنگ جیسی تھی۔ شوخ، چلبلی اور تھرکتی ہوئی۔ پورا گھر اس کی وجہ سے حرکت میں رہتا تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی تھی، نہ ہی کسی کو زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے دیتی تھی۔ دونوں بہنوں کے ان مزاجوں کے فرق ہی نے دراصل شیخ صاحب کے گھر کے توازن کو ایک خوب صورت انداز میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ بیٹے بھی باپ کے فرماں بردار تھے، البتہ گھر کا تمام انتظام بہنوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہر یار آیا تو کسی کہانی کی تلاش میں تھا، لیکن شیخ صاحب کے ہاں مہمان ہوتے ہی وہ خود ایک کہانی کا حصہ بنتا گیا۔ اس کا استقبال کرنے والی دھانی تھی، جس نے اپنے گھر کے گیٹ پر اسے خوش آمدید کہا، لیکن..... جس نے شہر یار کے دل کے گیٹ پر پہلی دستک دی، وہ شانی تھی، لیکن یہ سب کچھ ایک دم ہی نہیں ہو گیا۔ پہلے تعارف میں تو کوئی بھی شاہانہ کے ملکوتی خُسن سے متاثر ہو سکتا تھا، لیکن شہر یار کو شانی کی دستک سننے میں دو ہفتے سے بھی زیادہ لگ گئے۔ انکیسی میں وہ اس کی دوسری رات تھی، جب فون کی گھنٹی پہلی بار بجی۔ دوسری طرف جو بھی تھی، اس نے اپنا نام نہیں بتایا، بلکہ یہ کسوٹی بھی اس نے شہر یار ہی پر چھوڑ دی کہ یہی اسے پہچانے کہ وہ کون ہے، کیوں کہ یہ دعویٰ بھی تو شہر یار ہی کا تھا کہ لکھاری لوگوں کی آنکھوں سے ان کے دل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور شہر یار کو اگلے روز ہی شانی کی آنکھوں میں چھپا وہ گلابی پیغام دکھائی دے گیا، جو شاید پہلے ہی دن سے اس کی گھنیری پلکوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، لیکن شہر یار نے مزید کئی دن لیے، رات والی اس آواز کو اس کی پہچان بتانے میں۔ شاہانہ کو خوشی ہوئی کہ اس کی نظروں کا پیغام شہر یار کے دل تک پہنچنے میں کام یاب ہو گیا۔ پھر راتوں کے فون کی یہ شہر زاد، کچھ ایسی شروع ہوئی کہ لفظوں کی دنیا میں رہنے والا شہر یار جیسا لفظ گر بھی، ان ملائم لفظوں اور کول جذبوں کا شکار ہوتا چلا گیا، جو دیر رات گئے تک وہ فون پر اس کی سماعتوں میں انڈیلتی تھی۔ وہ دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ شہر یار اسے اپنے افسانوں کے موضوعات پر بحث کی دعوت دیتا اور اس سے ایک قاری کے طور پر پہلی رائے بھی لیتا، لیکن مسئلہ وہاں سے جڑ پکڑنے لگا، جب ایک آدھ مرتبہ شہر یار کو شانی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ فون پر شاہانہ کی منفرد سوچ اور گفتگو میں الفاظ کے نئے زاویوں کی عکاسی سن کر خود بھی ایسے کسی موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا، پہلی مرتبہ اس وقت یہ ملاقات ہوئی، جب تمام گھروالے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور شام کی چائے پر باغ میں وہ اور شاہانہ تنہا تھے اور دوسری مرتبہ جب شیخ صاحب کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں اچانک ڈرائیور سمیت شہر سے باہر جانا پڑا اور شہر یار گھر کی دوسری گاڑی میں شاہانہ کو اس مقام سے گھر واپس لے کر آیا، جہاں سے مقررہ وقت پر ڈرائیور نے اسے لانا تھا، لیکن شہر یار کے تشنہ کان شانی کے لبوں سے کچھ سننے کی آرزو ہی کرتے رہے اور وہ بس چھوٹے چھوٹے جملوں میں ”ہوں، ہاں“ کر کے شہر یار کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اسی بات نے شہر یار کو الجھا رکھا تھا، حالاں کہ وہ در پردہ اپنے خاندان کو شاہانہ کے لیے اپنی رضامندی سے بھی آگاہ کر چکا تھا، لیکن وہ ایک مرتبہ شانی سے کھل کر بات کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھا، کیوں کہ اگلے ماہ اس کے گھروالے باقاعدہ اس پر ریش کو شہر یار کے لیے مالکتے آرہے تھے اور شاید شہر یار کے والد اس سلسلے میں شیخ صاحب کو بھی شہر یار کی مرضی سے آگاہ کر چکے تھے۔ شہر یار نے غالباً اپنے پانچویں پکٹ کے آخری سگریٹ کو رکھ میں تبدیل کیا ہی تھا کہ باہر سے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

میں شہر یار کو تسلی دے کر جب اپنے کمرے میں آیا، تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال دھیرے دھیرے گھر کرنے لگا تھا۔ شہر یار کی نظر شاہانہ ہی پر کیوں تکی؟ دھانی بھی تو اسی گھری میں رہتی تھی۔ ہماری نظر ہمیشہ روشن اور ابلے چہروں ہی میں کیوں الجھتی ہے۔ یہ خوب صورتی کیا بلا ہے؟ اگر یہ دیکھنے والی نظری پر منحصر ہوتی ہے، تو پھر ہماری نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لیے بھی پہلی ہی جھلک میں اس طرح کیوں نہیں دھڑکتا، جیسے وہ کسی ماہ و ش کی پوری پلکیں گرنے سے پہلے ہی اس کے لیے دوزانو ہو چکا ہوتا ہے، تو پھر کہیں یہ قدرت کی بے انصافی تو نہیں کہ اس نے کچھ آئینے تو اتنے شفاف اور کچھ ہلکے دھندلے بنا ڈالے اور اگر چہروں اور رنگ و روپ میں یہ تفریق پیدا کرنی اتنی ہی ضروری تھی، تو پھر ہماری نظر اور ہمارے دلوں میں یہ فرق نہ ڈالا ہوتا، کیوں ہمارے سدا کے سودائی اور پاگل دل کو ان شفاف آئینوں میں جھانکنے کی لت ڈال دی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا، میں نے یہ سوچ کر فون نہجے دیا کہ شہر یار خود اٹھا لے گا۔ گھنٹی لگا تا رنجی رہی، پھر بہت دیر بعد بند ہو گئی۔ شاید شہر یار نے اٹھا لیا تھا، پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور شہر یار آنکھوں میں خینک کا خمار لیے بیچوں بیچ جائیاں لیتا کھڑا نظر آیا ”عبداللہ فون اٹھاؤ..... تمہارے لیے کال ہے۔“ میں چونک گیا۔ ”میرا فون..... اس وقت.....“ شہر یار پلٹ گیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے فون اٹھایا ”جی کون ہے.....؟“ دوسری جانب کچھ خاموشی کے بعد آواز ابھری۔ ”جی..... میں دھانی بول رہی ہوں.....“

.....(باقی آئندہ)

اک خاک بسرنو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



.....ہاشم ندیم.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بٹنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربست مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناسل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ ”جی.....؟“ وہ کچھ دیر بعد ہلکے سے کھنکار کر دوبارہ بولی ”میں شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی دھانی بول رہی ہوں“ میں سنبھل چکا تھا ”جی فرمائیے.....“ وہ کچھ الجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ ”وہ دراصل مجھے کچھ وضاحت کرنا تھی۔ بعض باتیں سفر کرتے ہوئے اپنا اصل زاویہ کھو بیٹھتی ہیں اور مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔“ مجھے حیرت ہوئی ”جی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے اس تمہید کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ کچھ ہچکچائی ”تمہید تو میں نے باندھی ہے، اب باقی بات آپ کو شانی بتائے گی۔ یہ لیس، اُن سے بات کریں۔“ چند لمحوں بعد تم ویش بالکل ویسی ہی آواز فون پر ابھری ”آداب! دراصل کل وقار نے رات کے کھانے پر مجھ سے منسوب کر کے آپ سے کچھ ایسی بات کہی، جو میں نے اس مضمون میں ہرگز نہیں کہی تھی، نہ ہی میرا مقصد آپ کو ہدف تنقید بنانا تھا۔ میں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بات کی تھی۔ ڈیڈی بھی ہم سے بہت خفا ہوئے۔ آپ کو جو ذہنی تکلیف ہوئی، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا، ”یقین کریں وہ بات تو بس یونہی ہنسی مذاق میں بحث کا حصہ بن گئی اور میں تو بھول بھی چکا تھا۔ آپ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں۔“ ”شکر ہے۔ آپ کے بزرگ اب کیسے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اور دھانی بھی ڈیڈی کے ساتھ جا کر انہیں دیکھ آئیں۔“ ”جی ضرور، کیوں نہیں۔ انہیں بہت خوشی ہوگی۔“ پیچھے سے کسی سرگوشی کی آواز آئی ”شانی جھپکتے ہوئے بولی ”دھانی کہہ رہی ہے کہ آپ ڈیڈی کا دلی ضرور صاف کر دیجیے گا، ہماری جانب سے۔ ہم ان کی ذرہ برابر غلطی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ مجھے ہنسی آگئی ”تو گویا یہ تمام گفتگو شیخ صاحب کی ناراضی دور کرنے کے لیے تھی۔“ میں نے انہیں مطمئن کیا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔“ میں نے بات ختم کر کے فون واپس رکھ دیا اور یہی سوچتا رہا کہ نہ جانے یہ لڑکیاں ایسے کانچ کے من کے ساتھ اس پتھریلی دنیا میں کیسے گزارہ کر پاتی ہیں۔

اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کچھ مضحل سے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا، رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے۔ میں بے چین ہو کر جلدی سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بابا کی اس حالت کی وجہ پوچھی، اس نے مسکرا کر تسلی دی۔ ”ایسا ہو جاتا ہے۔ انہیں ہائی ڈوز اینٹی بائیوٹکس دی جا رہی ہیں، ایسے میں طبیعت کا بوجھل ہو جانا قدرتی عمل ہے اور پھر ان کی خوراک بھی بہت کم ہے۔“ میری پریشانی دور ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ”لیکن انہیں ہوا کیا ہے۔ اب تو اُن کے تمام معائنے بھی ہو چکے ہیں۔“ ڈاکٹر نے ان کی فائل کھولی اور آسان لفظوں میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہمیں دو محاذوں پر بہ یک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ ان کے داہنی جانب آخری تین پسلیوں کو اندر کی جانب کسی زوردار دھکے کی وجہ سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اثر اندر جگر کی بیرونی سطح تک ہوا ہے۔ ہمیں ان خراشوں کو بھرنا ہے اور دوسری اہم بات ان کی سرکی چوٹ ہے۔ ہمارے دماغ کی شریانوں میں خون کی روانی میں ایک لمبے کی رکاوٹ بھی شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور خون کا زیادہ دباؤ عارضی یا مستقل فالج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ خون کے بہاؤ میں یہ رکاوٹ خون سے بنے ریت کے ایک ذرے سے بھی باریک تو تھڑے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ تو تھڑا اگر شریانوں سے چمک جائے تو اُسے تھوڑے دیر میں اور اگر خون کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے، تو اسے طب کی زبان میں ایبوس کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم فی الحال تو کسی ایسے چمکے یا بننے والے تو تھڑے سے بچے ہوئے ہیں، لیکن کبھی کبھی بھی وقت گزرے کے ساتھ ساتھ ایسی پیچیدگیاں ظاہر بھی ہونے لگتی ہیں، تو بس فی الحال ہماری اتنی سی جنگ ہے، ان کی بیماری کے ساتھ اور یہی کوشش ہے کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ماہر ہاتھوں میں ہیں۔“ ڈاکٹر نے کسی مستند تجربے کار کی طرح مجھے تسلی دی، لیکن اس کی باتیں سننے کے بعد میرا رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہا۔ میں واپس کمرے میں پلٹا تو سلطان بابا نے میرے چہرے کی جتنی پر بکھری سیائی کو غور سے پڑھا ”ٹم بھی آگئے، ان ڈاکٹروں کی باتوں میں۔ مطمئن رہو، جب تک سانس باقی ہیں، یہ بیماری میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور جب سانس پوری ہوئی، تو ان ڈاکٹروں کی پوری دنیا کی مکمل سائنس مل کر بھی مجھے ایک زائد سانس نہیں دے پائے گی، پھر اس جھیلے میں کیوں پڑتے ہو؟“ میں نے انہیں غور سے دیکھا ”میرا بھی ٹھیک یہی یقین ہے، لیکن اس کے باوجود ہم آخری لمحے تک ہر ممکن دوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دوا کرنا بھی تو ایک طرح کی دوا ہے۔ یہ بھی تو امید اور آخری لمحے تک اس کا کرم یا فضل ہو جانے کا ایک استعارہ ہوتی ہے، لہذا آپ مجھے دوا کی دُعا کرنے سے نہ روکیں۔ میرے ہونٹوں سے ادا ہوتی دُعا آسمان کی سمتوں تک جاتی ہے، تو میری دوا کی یہ دُعا آپ کی نگوں میں بستے خون کے ٹپوں میں گھل کر اپنی فریاد اس زندگی کے مالک کو پیش کرتی ہے کہ تیرا ایک بندہ تیرے آسرے پر اس دوا کی کرامات پر یقین کیے بیٹھا ہے۔ اسے مایوس نہ کرنا۔“ میں نہ جانے کتنی دیر تک بولتا رہا۔ سلطان بابا خاموشی سے میری بات سنتے رہے، پھر انہوں نے سراٹھایا تو ان کی پٹلیں ہلکی ہلکی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر جلدی سے ان کی جانب بڑھا ”ارے..... یہ کیا، میری کوئی بات ناگوار گزری کیا؟“ انہوں نے مہربانہ مضبوطی سے تمام لیا۔ ”نہیں، یہ آسو بھی اس کی شکر گزاری کے ہیں۔ آج پہلی بار عبداللہ نے سلطان کو سبق دیا ہے۔ آج شاگرد اس مقام پر ہے، جہاں استاد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ جیتے رہو، خوش رہو۔“ میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”یہ میں نہیں، میرے اندر خود آپ بول رہے تھے۔ میرے پاس تو خود اپنا کچھ بھی نہیں۔ یہ نام بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔“ میں بہت دیر ان کے سر ہانے بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ انہیں غنودگی سی ہونے لگی اور وہ گہری نیند سو گئے۔

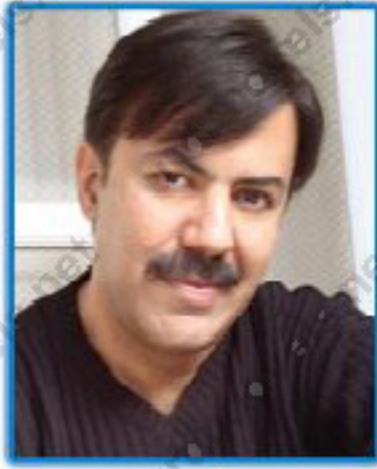
ظہر کے وقتے میں نے دھیرے سے ان کا کندھا ہلاتا کرتا رہا کہ لیے چکا دیا۔ شام چار بجے گھر کے باہر چمچا آئیں اُنکھیں اور پھر شیخ صاحب اپنی دونوں ہتھیلیوں اور شہر یار کے ہمراہ گھر کے میں داخل ہوئے۔ سلطان بابا ان سب سے مل کر کافی ہنسا ہنسا ہو گئے۔ انسان سے انسان کا یہ رشتہ بھی کس قدر اچھا ہے۔ کبھی ذہر تو کبھی ٹریاٹی۔ جبروت کے ڈہرنے بابا کو اچھا لگا۔ اس بستر تک پہنچا دیا تھا اور شیخ صاحب اور ان کے خاندان کے دروازے ٹریاٹی نے پہلے بھر میں ان کے دروازے پر کتے رنگ کھلا دیے تھے۔ جب شیخ صاحب نے شہر یار کا ان سے یہ کہہ کر تعارف کروایا کہ وہ بہت جلدان کی فرزندہی میں آئے والا ہے تو سلطان بابا نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ ”کیوں نہیں، نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو یا صرف صفحہ ہی سیاہ کرتے رہتے ہو۔“ شہر یار جو نہ جانے کس خیال میں کھویا کھڑا تھا اس اچانک حملے سے بالکل ہی ٹھہرا گیا۔ ”جی..... وہ..... میرا مطلب ہے.....“ ہم سب شہر یار کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ سلطان بابا نے اُسے ڈھائی ”بیٹے رونا اور ہاں نماز پڑھا کرو۔“ کھنکھناتے ہوئے اس نے کہا کہ ”زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا زیادہ ۱۰۰ سالہ الہام سے ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں جذب کی کیفیت چھو کر ناچا ہو تو پانچ وقت ان کے دربار میں حاضری دینے کا پابند کر لو تو کو۔“ شہر یار نے جلدی سے یوں عادتِ حلدی سے سر ہلایا، لیکن آج ہی سے اُن کی نصیحت پر عمل شروع کر دے گا۔ سلطان بابا نے خاص طور پر دھائی اور شانی سے بھی ان کی مصروفیات کا پوچھا اور انہیں بھی ڈھائی۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ سلطان بابا کا کمر ان کے لئے ہوئے سامان سے بھر چکا تھا لیکن ڈاکٹر نے پرہیز کی پابندی بتا کر ان سب کی آنکھوں پر پانی بھیر دیا۔ آخر بچے سے کچھ پہلے شیخ صاحب کے گھر کا دوسرا رشتہ جو روز مجھے لینے آتا تھا، وہ بھی آج تھا۔ میرا دل آج سلطان بابا کو گھوڑ کر جانے کو بالکل بھی نہیں چاہا تھا۔ لیکن رات کی ڈیوٹی والی نرس بھی خلیج گئی تھی، لہذا مجھ پر سب کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ شہر یار میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور شیخ صاحب ہماری گاڑی کے دروازہ کو اپنی گاڑی کے پیچھے آئے تاکہ اگر دھائی اور شاہانہ کے ساتھ بڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں گاڑیاں اُسکے پیچھے اہٹال سے نکلیں تو خلاف معمول شیخ صاحب والی گاڑی نے گھبرائی مخالف سمت موڑ کاٹ لیا۔ شاید وہ گھر جانے سے پہلے گھبراہٹ میں ہوتا تھا۔ میں نے اپنی سوچوں میں گم شہر یار کو پھینکا۔ ”معمولاً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر چاہنے والوں کے چہرے کھلے رہتے ہیں، لیکن تمہاری حالت اُس کے برعکس کیوں ہے؟“ شہر یار نے کبھی ہی شہزادی آدھری ”جہاں بہت جہاں بدل بھی مل گیا ہوگا۔“ ٹر پڑتے ہوئے انھیں آخر یہ نتیجہ نکلیا ہے۔ ”کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے غالب میرے دل کا ہر معاملہ پہلے ہی ساری دنیا پر کھول گیا ہے، اب راکھ گرید لے لے لے تمہیں بھی کچھ حاصل نہ ہوگا اے دوست۔“ میں مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کی گاڑی نے شہر کے ایک مشہور پانچ ستارہ ہوٹل کی ذیلی شاہ راہ کی جانب موڑ کاٹا اور کچھ دیر بعد ہم سب رینٹورنٹ میں کھانے کی میز کے گرد جمع ہوئے۔ شیخ صاحب بولے ”بھی لڑکیوں کی ضد تھی کہ آج رات کا کھانا ہم نہیں باہر کھائیں، لہذا اب آپ سب بلا تکلف اپنی پسند بتادیں۔“ کچھ ہی دیر میں مسجد چروں نے چہرے کھانا سجا دیا۔ ہم سے ذرا فاصلے پر الٹی میں ایک نئی عمر کا موسیقار پیانو پر مختلف فرمائشی ڈانسیں پھیلا رہا تھا۔ اس پاس بیٹھے لوگ کافی ڈنس پر اپنی پسند کی ڈانسیں لکھ کر کر رہے تھے۔ میں نے ڈانس کے لیے جگہ سے اُٹھ کر ڈانس کے سامنے لے جا کر کھڑا ہوا۔ پیانو کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں میں سیلون کی لکڑی سے بنا ایک ٹھہرے رنگ کا بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا، جسے پاپا کبھی ہماری مجلس کے دوران اور کبھی تنہائی میں بجاتے تھے اور میں گھنٹوں عورت سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں جب ہی سے مجھے پیانو بہت ہنرمند اور سلیجے ہوئے لوگ لگتے۔ ہمارے دائیں جانب ٹھیکے کی دیوار پر پانی کا ٹھہرنا کچھ اس طرح سے بہہ رہا تھا، جیسے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کھانے کی میزوں کے ارد گرد روشنی کا انتظام کچھ اس انداز میں کیا گیا تھا کہ ہر شخص ایک مدہم روشنی کے دائرے میں خود کو اس طرح محسوس کرتا، جیسے وہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی تنہا ہے اور شاید تنہائی کا احساس ہی اس ماحول کو آرام دہ اور سکون دینے والے تھا۔ صاحب حیثیت لوگ ایسی جگہوں پر شاید اسی احساس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ کم و بیش یہی ڈانسنے والے ہوتے ہوتے ہیں۔ وہ تنہا یہاں بیٹھ گئے جانے والے کھانے کی نہیں، یہاں گزارے جانے والے وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ دھائی اور شاہانہ نے بھی مختلف ڈانسیوں کی فرمائش شروع کر دی۔ پیانو شاید شیخ صاحب کی ذاتی حیثیت سے واقف تھا، لہذا اب اس کی پوری توجہ ہماری میز کی جانب تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں بیٹا اسٹیوڈنٹر کے اسی نغمے کی ڈانسنے بہت شوق سے بجاتے تھے۔ ”ہیلو۔ کیا میں وہی ہوں، جس کا تمہیں انتظار ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری محسوس اور تمہاری گھٹیاں مسکراہٹ میں کچھ سکھاتا ہوں۔ مجھے ہٹاؤ جسمیں کیسے جیتوں اے دل رہا..... کہ میں اچانک ہوں..... یا پھر سنیں ابھی اُن ہی لفظوں کے طلسم سے شروع کروں..... کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“ پیانو نے ڈانسنے کی تو مارے ہال نے اُسے ڈاؤن۔ اب دھائی کی باری تھی، اس نے چٹ بھٹی، ”لا پرہا سرگوشیاں (Careless whispers)..... میری بھترین دوست ہیں..... لیکن اب میں کبھی رقص نہیں کر پاؤں گا، کیوں کہ میرے بوجھل قدم ہٹانے کے ہیں.....“ بہت دیر تک شانی اور دھائی میں جارج مائیکل، ویم اور مائیکل ٹالک کے پرانے نغموں اور پھر شیر (Chem) ایک اسٹریٹ بوئے اور برنی اسپیئر کے نئے نغموں کی ڈانسنے پر پیانو کو آزمانے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ صاحب بھی کچھ اس طرح مطمئن و مطمئن مسکراتے رہے، جیسے ان کا یہاں سے اٹھنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے اُصلاتی رات کا فسون اب پوری طرح چھایا چکا تھا۔ کھانے والے ہال میں اب بھی بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں اور دیر رات کو لگنے والے آوارہ گرد بھی جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ ہمارے دل اور رات کے روموں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ رات ہمیں بہت حد تک بدل دیتی ہے۔ ہمارے اندر کچھ بہت سے خوابیدہ جذبوں کا ہر اور راست تعلق رات سے ہوتا ہے اور اگر نوٹل قسمتی سے ایسا خواب تاک ماحول میں ہوتا تو یہ جذبے اپنے پوری قوت سے ہماری شخصیت پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ہماری باتیں ٹھلی ہو جاتی ہیں اور ہمارے لیے طالع..... بعض اوقات ہمیں خود ہی سے پیار ہونے لگتا ہے اور ہم اپنے اندر کچھ کئی معصوم بچے کی ہر جذبہ مانتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی روایتی وضع داری کا چھوٹا اتار کر بے باک ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر کی زبانوں پر نہ شخصیت چھم سے باہر نکل آتی ہے۔ کہتے ہیں، نغمے میں بھی یہی تمام خصوصیات ہوتی ہیں۔ گویا ایسے ماحول میں یہ رات بھی ایک نغمے کی طرح ہی ہمارے خون میں غلیل ہو کر ہمیں دنیا دماغیہا سے بے گانہ کر نکلتی ہے۔ شاید رات خود ایک بہت بڑا اثر ہے۔ پیانو نے تار بامیزے ”عزف لفظ..... اور بس یہی لفظ ہی تو ہیں ہمارے پاس..... تمہیں دینے کے لیے.....“ اچانک ہی دھائی نے کھمے کھمے سے شہر یار سے پوچھا۔ ”آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں، کچھ نہیں بھی تو بتائیے اپنی آنے والی تحریر کے بارے میں۔“ شہر یار کچھ چونک سا گیا۔ ”آج کل میں ایک ایسے قلم کار کی کہانی لکھ رہا ہوں جس کی تحریر اور لفظوں نے ساری دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس کی جڑی آنے والی کتاب مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ لوگ بے چین ہیں اس کے قلم سے نکھرے لفظوں کی مالا غیلنے کے لیے اس کی تحریر کا انتظار کرتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود اس لکھاری کے

پاس اپنے گھر میں بولنے کے لیے صرف خاموشی ہے۔ اس لکھاری کی شریک حیات کے حصے میں قلم کار کا کوئی لفظ نہیں آتا۔ وہ دونوں بس خاموشی میں باتیں کرتے ہیں۔ ”شاہانہ کی ساری توجہ اب شہر یار کی جانب تھی۔ دھانی نے دل چسپی سے پوچھا ”لیکن ایسا کیوں.....؟ کیا لکھاری کی شریک حیات کو لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یا پھر قلم کار اپنی کسی گزشتہ محبت کے اثر میں کھویا رہتا ہے؟“ شہر یار نے غور سے شانی کو دیکھا۔ ”نہیں۔ لکھاری کی زندگی کی ساتھی تو اس کے لفظوں کے لیے بے تاب رہتی ہے اور خود لکھاری کی پہلی اور آخری محبت بھی اس کی شریک حیات ہی ہے، لیکن اسے کہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے، وہ سب اُس کی محبت کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ تو پھر اپنی زبان سے بھی وہی لفظ ادا کرتا، جو اُس کے مختلف کردار ایک دوسرے کے لیے ہمہ وقت اُس کی کہانیوں میں بولتے نظر آتے ہیں، اُسے یہ ادائیگی کچھ معیوب سی نظر آتی ہے اور کہیں اُس کے دل میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ ان ہی لفظوں اور جذباتوں کی بے ساختہ زبانی ادائیگی کو دکھاوانہ سمجھ لیا جائے، لہذا اپنی شریک حیات اور محبت کے سامنے وہ عموماً خاموش ہی رہتا ہے اور یہیں سے لکھاری کی شریک حیات کی الجھن شروع ہوتی ہے، کیوں کہ بظاہر آس پاس لوگ اور اس لڑکی کی سہیلیاں اس پر رشک کرتی ہیں کہ لکھاری کی شریک حیات کس قدر خوش قسمت ہے کہ اسے ان خوب صورت لفظوں کا ہمہ وقت ساتھ میسر ہے، جنہیں کتاب کی صورت میں پڑھنے کے لیے لکھاری کے پرستار مہینوں انتظار کرتے ہیں اور لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اس کی کتابیں خریدتے ہیں۔ اسی کش مکش اور ذہنی الجھنوں کی یلغار میں ایک دن لکھاری کی محبت اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے کہ اب وہ مزید اس خاموشی کی تحمل نہیں ہو سکتی۔“ شانی اور دھانی بہت غور سے شہر یار کی بات سن رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی پوری طرح متوجہ تھے۔ ان سے شہر یار کی خاموشی کا لمبا وقفہ برداشت نہیں ہو سکا اور وہ جلدی سے پوچھ بیٹھے ”تمہاری اس کہانی کا عنوان کیا ہے؟“ شہر یار نے ہم سب کی جانب نگاہ دوڑائی..... ”میرا ہر لفظ تمہارا ہے“ لیکن میری کہانی کا انجام ابھی باقی ہے۔ آپ سب بھی اپنی رائے دیجیے کہ انجام کیسا ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر کے لیے ماحول پر خاموشی طاری رہی، پھر دھانی ہی نے سکوت توڑا۔ ”انجام تو بہت واضح ہے، لکھاری کو اپنی محبت کی جدائی کے بعد یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ رشتے لفظ مانگتے ہیں۔ جذبہ اظہار چاہتے ہیں اور ”محبت“ ادائیگی کے لیے تخلیق خدہ ہے، لہذا اُسے بھی دل سے یہ دہرائی ہوئی بات کا خوف نکال کر اپنے لفظ اپنی محبت کے نام کرنا ہوں گے، کیوں کہ محبت کبھی پرانی اور باسی نہیں ہوتی۔ لفظ کبھی میلے نہیں ہوتے اور اپنی محبت کے لیے ان کی ادائیگی سدا بہار رہتی ہے، لہذا لکھاری کو اپنی محبت کا اظہار گھل کر کر دینا چاہیے اور اپنی شریک حیات کو اپنی زندگی میں واپس لے آنا چاہیے۔“ شہر یار نے مجھ پر نظر ڈالی ”اور تم کیا کہتے ہو عبداللہ۔“ میں شہر یار سے ایسے کسی سوال کی توقع بالکل نہیں کر رہا تھا، لیکن اب سب کی توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی اور خلاصی ناممکن تھی۔ ”مجھے لگتا ہے دھانی ٹھیک کہہ رہی ہیں، کیوں کہ ہماری زندگی میں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنی طبعی میعاد کے ساتھ دنیا میں وارد ہوتے ہیں اور ہمیں اُسی مدت کے اندر ہی ان رشتوں کو بڑھانا پڑتا ہے، ورنہ مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ جذبے بھی سرد پڑ جاتے ہیں، جو ان رشتوں کی بنیاد اور ان کی رُوح کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خون کے رشتوں کے علاوہ سب ہی رشتوں پر اس ایکسپانری ڈیٹ کی مہر پہلے ہی سے لگتی ہوتی ہے۔“

کہانی کا انجام طے ہو چکا تھا۔ ہم سب گھر واپس پہنچے تو شب نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ راستے میں بھی شہر یار خاموش ہی رہا۔ ہم دونوں انیکسی میں اپنے گھروں کی جانب بڑھنے لگے، وہ اچانک ہی کسی خیال کے اثر سے باہر آیا۔ ”آج تم نے ایک عجیب بات محسوس کی، یا پھر یہ میرا ہی واہمہ ہے.....؟“ میں سمجھ گیا کہ شہر یار کا اشارہ کس جانب ہے۔ ”نہیں..... میں پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا ہوں۔ جس وقت تم اپنی کہانی کا پلاٹ سنا چکے تھے، تب ہی میں نے تمہاری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔ شانی سوچتی ہے اور دھانی اس کی سوچ کو لفظوں کا رُوپ دیتی ہے۔ شاہانہ کے پاس لفظ نہیں ہیں اور دھانی ہی اس کی لغت ہے۔“ شہر یار نے توصیفی نظروں سے میری جانب دیکھا ”اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم کچھ اور ہو۔ اتنی باریک بات جسے جاننے میں مجھے مہینہ بھر سے زیادہ لگ گیا، تم نے دو ملاقاتوں ہی میں کیسے پڑھ لی؟“ ”نہیں..... اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں، تمہاری جگہ اگر میں محبت کے اس سنہری جال میں جکڑا ہوتا، تو شاید مجھے اس سے بھی زیادہ وقت لگتا، یہ بات محسوس کرنے میں۔ دراصل کچھ جذبے ہمارے حواس پر آہنی پردے ڈال دیتے ہیں اور پھر یہ کوئی انہونی بات بھی تو نہیں..... ہم میں سے بہت سے لوگ کسی ایک میدان ہی میں کیتا ہوتے ہیں۔ کچھ لفظوں کو کاغذ پر اتارنے کا ہنر جانتے ہیں تو کچھ اُن کی ادائیگی میں کمال رکھتے ہیں اور لکھاریوں کے ساتھ تو یہ مسئلہ بہت عام ہے کہ بعض بہت بڑے لفظ گر ہونے کے باوجود گفتگو کے معاملے میں ماہر نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ جو سوچتے ہیں، وہ بول نہیں سکتے۔ شاید شانی کا بھی یہی مسئلہ ہے۔“ شہر یار کہیں اور کھویا ہوا تھا ”تو پھر وہ مجھ سے ٹیلی فون پر گھنٹوں کیسے بات کر لیتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ صرف تجھے اور جلوت کا ہے؟“ میں نے غور سے شہر یار کو دیکھا، اُس کی زبان پر وہی بات آکر رُک گئی تھی، جو خود کہیں دور میرے ذہن کے کسی گوشے میں اُٹھتی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا سوال دہرانے سے پہلے لفظ اپنے ذہن میں ترتیب دیے۔ ”ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ، تم جس طویل گفتگو کی نشستوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ تمہاری یہاں آمد کے بعد سے لے کر کب تک اُسی طرح جاری رہیں، جیسے تم انہیں محسوس کرنا چاہتے تھے اور کیا ان میں کبھی کوئی بدلاؤ بھی آیا تھا؟“ شہر یار کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ غالباً وہ میرے سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ اُس کی گفتگو اس وقت مکمل تھی، جب تک میں نے شانی کی آواز کی شناخت کا اعلان نہیں کیا اور اس بات میں قریباً دو ہفتے کا عرصہ حائل تھا۔ میں اور شہر یار ایک ہی نکتے پر پہنچ رہے تھے۔ شہر یار کی شیخ صاحب کی کونھی میں آمد کا مقصد سب کے لیے ایک گھلا راز تھا اور دوسری رات ہی سے شہر یار کو وہ ٹیلی فون آنا شروع ہوا تھا۔ پھر شہر یار اس آواز کے زیر و بم میں کھوتا چلا گیا۔ اس ملائم آواز کے جادو، لفظوں کے خوب صورت چناؤ اور خیالات کے حسین زاویوں نے اُسے کچھ ایسا مدھوش کیا کہ وہ اپنا آپ ہی بھول گیا۔ روز شام کو جب چائے پر شیخ صاحب کے گھرانے سے اس کی ملاقات ہوتی تو وہ شانی اور دھانی دونوں کے چہروں پر رات والی آواز کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ شہر یار کی الجھن بھی اپنی جگہ بجاتی تھی، کیوں کہ دونوں بہنوں کی آواز بالکل ایک جیسی تھی۔ خود میں نے بھی جب شاہانہ اور دھانی سے اس روز فون پر بات کی تھی، دونوں آوازوں میں فرق تلاش نہیں کر پایا تھا اور پھر شہر یار کو شانی کی آنکھوں میں وہ گلابی معطر پیغام دکھائی دے ہی گیا، لہذا یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شہر یار کو فون کرنے والی شاہانہ ہی تھی۔ شہر یار نے اُسی رات وہ کسوٹی حل کر دی، جو پچھلے دو ہفتوں سے اس کے دل میں اچھل پھل مچا رہی تھی اور اس نے فون کرنے والی آواز کو شاہانہ کی آواز کے طور پر شناخت کر لیا۔ شانی نے بھی اپنی ہارسلم کر لی اور اس کے بعد شہر یار کا شوق ملاقات بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک آدھ ملاقات کا موقع میسر بھی آیا، لیکن ساتیس تشدہ ہی رہیں۔ ایک لفظ گر، ایک دوسرے لفظ تراش سے کچھ لفظوں کی بھیک نہ پاسکا۔ پھر دھیرے دھیرے شہر یار کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اب رات کو زیادہ تر وہی بولتا ہے اور دوسری جانب سے شاہانہ صرف اس کے لفظ جوڑتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح گھل کر شہر یار سے نہ تو بحث کرتی تھی اور نہ ہی شہر یار کے نئے افسانوں کے پلاٹ پر کوئی تبصرہ، لیکن شہر یار نے شروع میں اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، تاوقتیکہ کہ اس کی شاہانہ سے تنہائی میں دو ملاقاتیں نہیں ہو گئیں، پھر میں شیخ صاحب کے مہمان کے طور پر انیکسی میں شہر یار کا ہم سایہ بن گیا اور اس کا زیادہ تر رات کا وقت میرے ساتھ اپنی کہانیاں سناتے گزرنے لگا اور آج وہ لمحہ بھی آہی گیا، جب شہر یار نے وہ بات محسوس کر لی، جو شاید عام حالات میں اُسے بہت پہلے سمجھ میں آ جاتی۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک اندرفون کی گھنٹی نے ہم دونوں کے خیالات کی رو توڑ دی۔ شہر یار نے ہچکچا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے اُسے تسلی دی ”سچ ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہم سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ یہ ہماری سوچ اور ہمارے اختیار کیے گئے راستے کا قصور ہوتا ہے کہ ہم اس سچ تک پہنچنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ شاید ہم جان بوجھ کر سچ سے کتراتے ہیں اور وہ راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمیں سچ تک پہنچانے میں بہت دیر لگتا ہے، لیکن میں تم سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم اس سچ کا سامنا بہادری سے کرو گے۔ جاؤ، جا کر فون اٹھاؤ۔ اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔“ میں شہر یار کا شانہ چھتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ صبح ہونے میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ نماز کے بعد میں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

پھر میری آنکھ فون کی گھنٹی ہی سے گھٹی۔ دوسری جانب کونھی کا خانساں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دوسرے پہلے بھی میز پر ناشتا لگا چکا ہے، لیکن جب خلاف معمول میں اپنے وقت پر باہر نہیں نکلا، تو اُسے تشویش ہوئی، لہذا اس نے میری طبیعت کا پوچھنے اور ناشتا لگانے کی اجازت طلب کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ میں باہر نکلا تو شہر یار پہلے ہی سے باہر گھلتی کھڑکیوں کے قریب کھڑا نہ جانے خلا میں کیا گھور رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر وہ میری جانب پلٹا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا عبداللہ۔ سچ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود ہوتا ہے..... ہم خود ہی نہ جانے کہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ میرا سچ بھی میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھ سے شروع میں بات کرنے والی شانی نہیں تھی۔ میں جن سُنبرے خوابوں اور کوئل جذباتوں کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ انہیں الفاظ کی صورت دینے والی خواب گر کوئی اور نہیں، دھانی ہی تھی۔“

ایک خاک ہسر نوجوان کا فسانہ جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



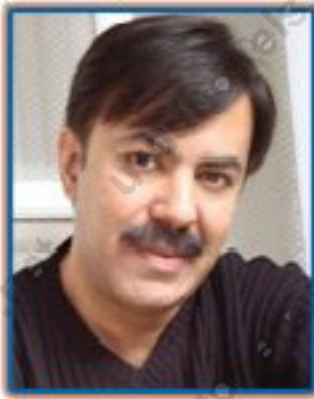
☆ ہاشم ندیم ☆.....

ہماری زندگی میں پیش آنے والے بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا مکمل ادراک ہونے کے باوجود ہم ان کے پیش آنے پر کچھ اس جھٹکے سے چوکتے ہیں، جیسے وہ حقیقت نہیں، کوئی ان ہونی ہو۔ ٹھیک اُس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا، حالانکہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات گزشتہ شام ہی سے گردش کر رہی تھی کہ شانی کی اس پہاؤ تہی اور خاموشی کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی، لیکن شہریار کی زبانی یہ بات سن کر چند لمحے کے لیے میں گنگ سا رہ گیا۔ شہریار کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہیں پایا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا ”تو کیا تم نے براہ راست شانی سے سوال کر ڈالا؟“ نہیں، اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کل رات میری کہانی کا پلاٹ من کر شاید شانی کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ میں رویوں کے اس فرق کو پہچان گیا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ تھی کہ یہ بات بتانے میں اسے اتنی دیر لگی، حالانکہ اس کی اپنی نیت بھی یہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ اذکھل دے گی کہ شہریار کو شروع میں فون کرنے والی شانی نہیں دھانی تھی، اور پھر جب شہریار کی پسندانہ دونوں بہنوں پر کھلی تو شانی نے از خود فون پر دھانی کی جگہ لے لی، کیوں کہ دھانی کے بقول اس کے شہریار کے لیے صرف بطور ایک اچھے لکھاری، پسندیدگی کے جذبات تھے، جب کہ شانی پہلی نظر ہی میں شہریار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی، لیکن وہ دونوں ہی شاید یہ جان نہیں پائیں کہ شہریار لفظوں کا اسیر ہے، اس کی رکوں میں لفظ زندگی بن کر دوڑتے ہیں اور اس کی نسون میں خون نہیں، لفظ رواں ہیں، اس کے دل کو فتح کرنے والی وہ پہلی آواز، جیسی نے حسین لفظوں سے خیال کی سنہری وادیوں تک کا سفر شہریار کی انگلی پکڑ کر طے کیا تھا، وہ صرف چند تھپے بول نہیں تھے، وہ ایک فریکوئنسی تھی، جس نے ان دونوں کو جوڑ کر ایک ایسے نکتے پر پہنچا دیا، جہاں سے ان کا وہ سفر شروع ہوتا تھا، جس کے راستے اور منزلیں سب ایک تھے، لیکن دھانی کے جانے کے بعد شانی وہ فریکوئنسی برقرار نہیں رکھ سکی۔ وہ دو انسان، جن کے درمیان محبت کے تار جڑتے ہیں، ان کے جذبوں کی لہریں ہوا کے دوش پر ضرور کسی ایک اور خاص مقام پر ملتیں ہوں گی، جیسے ریڈیو کی شارٹ ویو، میڈیم لہر کی فریکوئنسی نہیں پکڑ سکتی اور اسی طرح لانگ ویو، شارٹ ویو کی لہروں پر جڑے اسٹیشن پکڑ نہیں پاتی، حالانکہ یہ تینوں لہریں اسی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں، لیکن ان کے دائرہ کار مختلف ہیں، محبت کے جگنو بھی ہر لمحہ ہوا میں تیرتے اور جھگرتے رہتے ہیں، لیکن کس جگنو کی چمک کس اندھیرے دل کا مقدر بن کر اس انسان کی زندگی میں اجالے بھر دے گی، اس کا فیصلہ وہ فریکوئنسی کرتی ہے، جس کے طے و نادنیا کا ہر ملن ادھور مارہ جاتا ہے۔ ہاں البتہ شاید محبت کے یہ جگنو فضا میں خیرے ہوئے اپنی جگہیں بعض مریچ پھل بھی دیتے ہیں۔ ایک لہر کی تہ سے نکل کر سفر کرتے ہوئے، دوسری لہر میں بھی جا ملتے ہیں۔ تب ہی ہمیں بعض اوقات ایسے انسانوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، جو ہلکا پر پہلے ہمارے لیے بہت عام ہوتے ہیں اور ہمارے آس پاس ہی برسوں سے موجود ہوتے ہیں، جی رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک اور عجیب سی حقیقت کا ادراک بھی ہوا۔ ہمارا معاشرہ جہاں شادی کا بندھن ہی ملن کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں اب بھی نوے فی صد رشتے بزرگوں کی مرضی اور دو خاندانوں کے جوڑ کا سبب ہوتے ہیں، ایسی طے شدہ شادیوں میں جہاں دو ہم سر زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کسی بندھن میں بندھ جاتے ہیں، وہاں محبت کے جگنوؤں کا سفر تیز تر ہو جاتا ہے۔ شاید دعاؤں کا ایجنہن اس رفتار کو کمیز دیتا ہے، لیکن شہریار کا سنا ہوا چہرہ اور اس کی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے جذبوں کے جگنو اب بھی وہیں، اسی لہر میں جھمک رہے تھے۔ جہاں کبھی پہلی رات دھانی سے ان کے تار جڑے تھے۔ میں نے فوراً سے شہریار کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چرخوں کو دیکھا ”پھر تم نے شانی سے کیا کہا؟“ ”میں پھٹ پڑا کہ ان دو بہنوں نے میری زندگی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیوں کیا۔ آخر میں نے ان کا کیا پکا زنا تھا۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی ہی مانگتی رہی کہ اس کا مقصد مجھے دھوکا دینا کبھی نہیں تھا۔ اسے خود بھی گزشتہ رات ہوکن میں کھانے کے دوران یہ احساس ہوا کہ میں دھانی کے خیالات اور باتوں سے پہلے متاثر ہوا تھا اور شانی کے حسن سے بعد میں، جب کہ وہ اب تک یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ میں پہلے ہی دن سے اس سے متاثر ہوں۔“ مجھے شہریار کی بات سن کر نہ جانے کیوں بہت دکھ ہوا۔ ”تمہیں اسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اس کا اندر بہت نازک ہے۔ تمہارے دیے ہوئے لفظوں کے گھاؤ بھرتے بھرتے بھر بھی گئے تو ان کے داغ سدا سجاو گتے رہیں گے۔“ شہریار الجھا ہوا تھا۔ ”میں بہت دباؤ میں تھا، خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور بہت کچھ بول گیا۔“ ”دباؤ ہی میں تو خود پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جاننے ہو اصل فائن کون ہوتا ہے، وہ جو شدید دباؤ میں بھی متانت کا دامن تھامے رکھے۔ انسان کی پہچان اس کے طے کے دوران ہی ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو سبھی ٹھہرے ہوتے ہیں، ہمارے اندر کے زہر کو پرکھنے کا پتہ یہ دباؤ اور ٹپٹپٹ ہی تو ہے اور ان ہی چند لمحوں میں کچھ ہٹ ایسے ٹوٹتے ہیں کہ پھر کبھی ”جڑ“ نہیں پاتے۔ اپنا بت سنبھالو شہریار۔“ وہ چڑسا گیا ”تو تم کیا چاہتے ہو، میں ابھی جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔“ ”نہیں، یہ دوسری غلطی ہوگی تمہاری، تم پہلے ہی وقتی اشتعال میں آ کر پہلی غلطی کر چکے ہو۔ زندگی میں بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں، جو مناسب وقت کا تقاضا کرتی ہیں، حالانکہ اس لمحے آپ کے دل و دماغ پر اپنی بھڑاس نکالنے کا جنون طاری ہوتا ہے اور بظاہر آپ کو ایسا لگ رہا ہوتا ہے کہ گنتی برابر کرنے کا یہ موقع اگر آپ کے ہاتھ سے نکل گیا تو شاید ہمیشہ کے لیے دیر ہو جائے گی اور ہمارا جو اپنی جگہ دکھانا ہونے کے بعد انہی ان نکتہ لفظوں کی صورت میں کاٹنا بن کر خود ہمارے دل ہی میں چھپتا رہے گا، لہذا اہم اپنے دل کے بول اپنی زبان سے دہر میں بچھے تیرا کہ دوسرے کے دل میں بیو ست کہہ دیتے ہیں اور ایسا کرنے سے وقتی طور پر ہمیں کچھ سکون بھی ضرور مل جاتا ہے، لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہم اس تمام عمل میں حاصل کیا کرتے ہیں؟ صرف ایک غلطی، کبھی نہ مننے والی کک اور بد قسمتی سے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں عمر بھر کے چھپتا رہے، کیوں کہ دل کے شیشے میں آ یا بال پھر کبھی نہیں اٹھتا۔ اسے نکالنے کے لیے وہ شیشہ پھٹنا چاہ کر رہا پڑتا ہے یا پھر عمر بھر اسی بال کے ساتھ گزارنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ کبھی داپس نہیں پلٹتے اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور خود دیتے ہیں، جو پھر

”کبھی نہیں ملتا۔ اس لیے رویوں میں حد درجے احتیاط ہی زندگی کے ہر بندھن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔“ شہر یار خاموشی سے میری بات سن رہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہوں، ہمارے پاس کسی اجنبی کے ساتھ بھی کوئی دوسرا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بردباری، احترام اور اس کی اور اپنی عزت کا رشتہ تو ہر حال میں قائم رہتا ہے اور دوستی محبت یا خون کے کسی رشتے کی صورت میں تو یہ ذمے داری دینی ہو جاتی ہے۔ میں رات کو اپنے ذمے داری نبھانیں پایا۔ میں اب تک اپنی ہر کہانی اور افسانے کو ایک خوب صورت موڈ پر ختم کرنے کا عادی رہا ہوں، لیکن خود میری اپنی کہانی کا اکتاہد صورت انجام ہوگا، یہ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔“ تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے، کہانی ختم کرنے کا ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ لکھاری کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اسے انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔“ شہر یار نے لمبی سی آہ بھری ”لیکن میری کہانی کا انجام کچھ مختلف ہے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس افسانے کے ہر کردار کو اپنا انجام خود طے کرنا ہوگا۔“ ہماری باتوں کے دوران ناشتا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا، مستعد نوکرتھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے گرم کر کے میز پر بچاتے رہے تھے، میں دو گھنٹ بھر کے اسپتال کے لیے نکل پڑا۔

سلطان بابا کی حالت آج خلاف معمول کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے ”آج اپنی کنڈی کہاں انکا آئے ہو میاں، کبھی اس ذہن کو دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کرو۔“ میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔ جانے وہ اتنی آسانی سے چہرے کی سلیٹ کیسے پڑھ لیتے تھے یا پھر میری جبین کی شکنیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میرے اندر برستی ہر بارش، لفظوں کی صورت قطروں کی طرح ٹپکتی اور پھسلتی رہتی تھی، چہرہ آئینہ ہوتا ہے اور آئینے بوندوں کا بوجھ زیادہ دیر سہا نہیں پاتے، انہیں بہنے کے لیے راستہ دینا ہی پڑتا ہے کہ بہاؤ کا واسطہ ہمیشہ سے شفافیت سے ہے۔ سلطان بابا کو اب اسپتال سے خارج ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہاں سے بہت دور ملک کے مغربی ساحل پر کوئی درگاہ ہے، جہاں ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔ میں چونک سا گیا۔ ساحل اور درگاہ کا نام سن کر مجھے اچانک ہی اپنا شہر اور زہرہ سے ساحل پر ہوئی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ میرا شہر مشرقی ساحل پر تھا اور سلطان بابا مغربی ساحل کی جانب بے ہوئے شہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہی لہروں کے دوسری پار وہ بھی تو رہتی تھی۔ اس سمندر کے دو کناروں کی لہریں بھی تو آخر کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے مل جاتی ہوں گی۔ جانے ہمارے مقدر کی لہریں کب آپس میں جڑ پائیں گی۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سلطان بابا کی آنکھ لگنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے لینے آیا تو میں چاہتے ہوئے بھی اسے واپس نہیں بھیج پایا۔ یہ سلاخیں اور یہ قید خانے ہمیں کیا قید کر پاتے ہوں گے، اہل قید تو مروت اور وضع داری کی ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچا تو ملکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی اور شاید موسم کے انہی تیوروں کے باعث آج بڑے والے شیشے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شہر یار سمیت شیخ صاحب کا سارا خاندان موجود تھا۔ برستے موسم کی مناسبت سے ہلکے پھلکے پکوان میز پر سجائے جا رہے تھے۔ ہمارے اندر موجود ذائقوں کا تعلق باہر کے موسموں سے کیسے جڑ جاتا ہے، یہ میں کبھی سمجھ نہیں پایا۔ دونوں بہنوں اور شہر یار کے رویے میں تناؤ ان کے بے حد چھپانے کے باوجود محسوس کیا جاسکتا تھا۔ شیخ صاحب نے بھی غور سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ”کیوں بھی، کوئی سرد جنگ چل رہی ہے۔ تم تینوں ہی آج بے حد خاموش ہو۔“ وہ تینوں ہی کچھ گڑبڑا سے گئے۔ شہر یار جلدی سے بولا۔ ”امی تو کوئی بات نہیں، بس کبھی کبھی موسم کچھ بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لفظ خود بوندیں بن کر بہہ جاتے ہیں۔“ شیخ صاحب کی زبان سے بے ساختہ داد نکلی۔ ”بھئی واہ، کیا بات کہی ہے، خاموشی کا حق ادا کر دیا۔ کبھی ہم بھی ان برستی بوندوں کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عبد اللہ میاں! تم ہی کچھ کہو، ان تینوں نے تو بارش سے شرط باندھ رکھی ہے۔“ دھانی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ شیخ صاحب تناؤ محسوس کرنے کے باوجود بڑی خوب صورتی سے بات ٹال گئے تھے۔ میں نے بات جوڑی ”مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ موسم ایسے ہوتے ہیں، جو ہم سے تمام گلے شکوے بھلا کر بس اس موسم میں ڈوب جانے کا تقاضا کرتے ہیں کہ موسم بھی تو ایک نعمت کی طرح ہوتا ہے۔ کفرانِ نعمت ہو تو موسم ہم سے روٹھ جاتے ہیں اور پھر بہت دنوں تک وہ ہمارے کمرے کی کھڑکی پر دستک نہیں دیتے۔ بس دبے پاؤں خاموشی سے باہر ہی سے گزر جاتے ہیں۔“ اب چونکنے کی باری شاہانہ کی تھی، جب کہ میرا مخاطب شہر یار تھا، جس نے ہلکے سے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ کے عقب میں گم ہو گیا۔ باہر گرتی بوندوں نے اب باقاعدہ جل تھل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ باہر باغیچے میں ایک کھلی جگہ پر پانی کا جو ہڑسا بننا دیکھ کر میرا بہت شدت سے جی چاہا کہ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا کر اس پانی میں چھوڑ آؤں اور پھر اپنے بچپن کی طرح ہاتھ کی پھستری بنا بنا کر، گھنٹوں خود بھیگ کر اس کشتی کو بھیگنے سے بچا تا رہوں، حتیٰ کہ شام ڈھل جائے اور سرمئی بادلوں کے چمپنی اندھیرے میں ماما کہیں سے مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں نکل آئیں اور میں ان کی انگلی تھامے ہوئے گھر کی جانب جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اپنا سفینہ ڈوبتے دیکھ کر، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو پکارتا رہوں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ”کاغذی سفینوں“ کو تو ڈوب ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ سفینہ کسی نازک رشتے ہی کا کیوں نہ ہو، جیسے اس وقت شانی اور شہر یار کے رشتے کی کشتی ڈوب رہی تھی، ہم کسی کے کتنے بھی قریب کیوں نہ چلے جائیں، کسی کو کتنا ہی اپنا کیوں نہ مان لیں، اگر وہ رشتہ کاغذی ہو تو سفینے ڈوب ہی جاتے ہیں۔ لفظ روٹھ جاتے ہیں۔ ایک لمحہ پہلے وہی انسان، جس پر ہمارا کامل یقین، مان اور بھرم ہوتا ہے کہ بس وہی تو ہے، جو ہمیں اس بھری دنیا میں سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے، اگلے لمحے ہی ہمارے لیے دنیا کا سب سے انجان شخص بن جاتا ہے۔ میں آج تک یہ معاملہ نہیں کر پایا تھا کہ بے انتہا اپنائیت کا وہ بھرم جھوٹا ہوتا ہے یا پھر اچانک ہی بیچ میں درانداز ہو جانے والی اس بیگانگی اور اجنبیت کا یہ احساس سچا۔ ہم پل بھر ہی میں اتنے اپنے اور پھر ایک دم اچانک اتنے بیگانے کیسے ہو جاتے ہیں؟ چائے ختم کر کے میں اسپتال واپس جانے کے لیے اٹھا تو شیخ صاحب بھی سلطان بابا کو دیکھنے میرے ساتھ ہی چل پڑے۔ سلطان بابا ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرائے۔ ”لگتا ہے میرے جوگی کا دل آپ کے ہاں لگ گیا ہے؟“ شیخ صاحب بھی ہنس پڑے۔ ”پتا نہیں، لیکن عبد اللہ میاں کو دیکھ کر تو خود ہمارا بھی جوگ لینے کو جی چاہتا ہے۔“ وہ دونوں زمانے بھری باتیں کرتے رہے اور میں کمرے کی کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر باہر برستی بوندوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ بارش میں سب ہی منظر یکساں ہو جاتے ہیں۔ رم جھم گرتی وہ پھوار باہر کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر سے بھی بہت کچھ دھو ڈالتی ہے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے شہر یار انیکسی میں دکھائی نہیں دیا۔ نوکرنے بتایا کہ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ بھی دوسری گاڑی لے کر کہیں نکل گیا تھا۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی، نوکرنے کھانے کا پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ عشاء کے بعد بھی میں بہت دیر تک شہر یار کا انتظار کرتا رہا، پروہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟ انہی سوچوں میں گم، میں باہر لان میں جلتی سفید گول تبیوں پر جگنوؤں کی یلغار جیسی بارش کی بوندیں گرتی دیکھ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ضرور یہ فون شہر یار کے لیے ہوگا، لیکن وہ تو ابھی واپس ہی نہیں پلٹا، گھنٹی بہت دیر تک بج کر چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی پھر سے لگاتار بجنے لگی۔ میں نے شش و پنج کے عالم میں فون اٹھا ہی لیا۔ دوسری جانب ان دونوں سے کوئی ایک بولی ”ہیلو.....“، ”جی میں عبد اللہ بول رہا ہوں۔“ شہر یار ابھی گھر واپس نہیں لوٹا۔ ”دوسری جانب کچھ لمحوں خاموشی چھائی رہی، پھر وہ بولی۔“ میں دھانی بول رہی ہوں، مجھے دراصل آپ ہی سے بات کرنی ہے۔“ میں نے اپنی حیرت کو ظاہر ہونے سے روکا۔ ”جی فرمائیے.....“ وہ کچھ دیر تک اپنے لفظ جوڑتی رہی۔ ”غالبا شہر یار نے آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ مجھے اسی سلسلے میں آپ کی کچھ مدد چاہیے۔“ میں حاضر ہوں۔ اگر کسی بھی مدد کے قابل ہوں، ”شکر یہ.....“ شانی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کچھ ہی دنوں میں شہر یار کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ ہماری شروع میں کی گئی نادانی کو بس ایک شرارت سمجھ کر معاف

اک خاک بر نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہید رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



☆ ہاشم ندیم ☆

ان دو بہنوں کے لگا تار بہتے آسوجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکے۔ میں تو انہیں کوئی تسلی دینے کی حالت میں بھی نہیں تھا۔ بعض دھماکے کچھ اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ انہیں سلجھانے کی ہر کوشش انہیں مزید الجھانے کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جذباتوں اور رشتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں ہمیں ان جذباتوں، رشتوں اور گتھیوں کو اسی طرح الجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ سو میں بھی ان دونوں کو یونہی الجھا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی میں کبھی کچھ سیدھا نہیں ہوتا، یہ ہم سب کے ساتھ مکمل بھید بھاد رکھتی ہے۔ شہر یار، دھانی اور شاہانہ کی زندگی نے بھی اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ دونوں بہنیں شہر یار کا دل جیت کر بھی رو رہی تھیں۔ ایک اپنے لفظوں سے جیتی اور روپ سے ہاری تھی، تو دوسری روپ سے جیت کر بھی لفظوں سے شکست کھا گئی تھی۔ وہ دونوں ہی فاتح بھی تھیں اور شکست خوردہ بھی..... کچھ ایسا ہی حال محبت کی اس ٹھکان کے تیسرے کردار شہر یار کا بھی تھا۔ یہ محبت ہم لاچار انسانوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ آج دھانی کی فریاد نے مجھے اندر تک لرزا کے رکھ دیا تھا، دنیا کا ہر انسان مرد و عورت کی تخصیص کے بنا، خود کو اپنے من کے آئینے میں حسین تر ہی دیکھتا ہے۔ شاید ہمارے ہمیشہ سے دو چہرے ہوتے ہیں، ایک وہ جو ظاہری دنیا کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ، جو ہم ہر لمحہ خود اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہیں، ہم میں سے بعض اپنے اندر لگے شیشے سے جھلکتے دوسرے چہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں بیرونی دنیا کے آئینوں کی عادت ہی نہیں رہتی اور تب وہ خود کوئی بار چونک جاتے ہیں، جب کبھی ان کا واسطہ باہر لگے کسی شیشے سے پڑتا ہے، کیوں کہ سامنے نظر آتے آئینے میں کھڑا شخص انہیں بالکل اجنبی نظر آتا ہے، تبھی ہم چونک کر کہتے ہیں ”ارے میری تصویر تو بالکل اچھی نہیں آتی۔“ یا ”بھئی میں تو بالکل ہی فوٹوجینک نہیں ہوں“ بعض زندہ تصویر کشی سے کترانے لگتے ہیں، تنہائی میں بار بار خود کو مختلف زاویوں سے شیشے میں دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چاہے ہماری تصویر اچھی نہیں آتی، چاہے ہم ویڈیو میں کتنے ہی بصدے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔ اصل میں تو ہم بہت دل مٹش ہیں، ہمیں ہمیشہ صرف وہی جملے یاد رہ جاتے ہیں، جو کبھی کسی نے ہمارے سراپے کی تعریف میں کہے ہوتے ہیں، ہم وہی رنگ پہننا شروع کر دیتے ہیں، جو کسی کی رائے کے مطابق ہم پر چلتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہماری تمام شخصیت کے بناؤ سنگھار کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پہلا دھوکا دینے والا بھی کوئی اور نہیں خود ہمارے کمرے کا آئینہ ہوتا ہے، جو ہماری دائیں جانب ٹکلی مائیک کو سر کے بائیں جانب دکھاتا ہے اور پھر کبھی کبھی دائیں بائیں کا یہ معمولی سا فرق ہمارے سر کی مانگ کی طرح ہمارے اندر لگے اور باہر کمرے کے آئینے کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ ڈال دیتی ہے۔ مجھے اس دن نہ جانے اپنے بچپن میں کتنی اس معمولی شکل و صورت والی شہزادی کی کہانی بہت یاد آ رہی تھی، جس نے اپنی سلطنت کے کبھی آئینے تو ڈھالنے کا حکم دے دیا تھا۔ کاش ہماری دنیا کے کبھی بیرونی آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کے من کا آئینہ باہر کمرے میں لگ جاتا، تو یہ دنیا کتنی خوب صورت ہو جاتی۔ کون جانے ہمارے بچے کتنے ایسے دل جلے بھی ہوں، جو آئینے توڑنے کی بجائے آنکھیں پھوڑنے کی آس دل میں رکھتے ہوں گے۔ اگر انسانی خوب صورتی کو ماننے کا پیمانہ صرف یہ بے وفائیاں ہی ہیں تو کاش ہم بے بصارت ہی ہوتے۔ میرا ذہن نہ جانے کن بھول بھلیوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اندر ڈاکٹر سلطان بابا کے چند اہم معائنے کر رہے تھے۔ اچانک میں شہر یار کو سوجی ہوئی آنکھیں لیے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا، کیوں کہ میرے لیے اس کی یہاں اسپتال میں آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس کی جانب بڑھا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے، سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“ ”ہاں، بس ایک دوست کی طرف رک گیا تھا رات کو، اب بھی وہیں سے آ رہا ہوں، پتا نہیں کیوں گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا، سو چا کچھ دیر تمہارے پاس ہی بیٹھ جاؤں، سلطان بابا اب کیسے ہیں؟“ ”وہ بہتر ہیں، لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ وہ دونوں تمہارے اس رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، کس کو سزا دے رہے ہو، خود کو یا ان دونوں کو.....؟“ شہر یار نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا سر کرسی کے ٹپک سے نکا دیا۔ ”بہت الجھ گیا ہوں میں..... کچھ مجھ میں نہیں آ رہا.....“ ”کیا مجھ میں نہیں آ رہا، دل کے دروازے پر دستک دینے والی کو تم پہلے ہی واپس لوٹا چکے ہو، اب جو دل کے اندر براجمان ہے، اس کی تو قدر کرو۔“ شہر یار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پیراجی چاہا کہ میں دھانی کے ساتھ ہوئی پوری بات اسے بتا دوں، لیکن کسی کا بھرم رکھنا مقصود تھا، لہذا اختصار کے ساتھ ان دونوں بہنوں کی پریشانی بیان کر دی، لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شہر یار کی آنکھیں کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے گی اور پھر میں اس سے کس رویے کی امید کر رہا تھا۔ خود میں بھی تو کسی مددگار کی ایک چٹختی نظر کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ کہیں میں بھی صرف زہرہ کے روپ ہی کا تو گھائل نہیں تھا؟ اگر زہرہ بھی عام شکل و صورت کی کوئی سیدھی سادی سی لڑکی ہوتی، تو کیا تب بھی میں اسی طرح اپنا چین و قرار لانا بیٹھتا، میں بھی تو کسی کی گہری، کالی جھیل جیسی آنکھوں، گلابی عارض اور گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کے قریب جا کر رکھتا تھا، خود میری منزل بھی تو کسی کے پیگھڑی لبوں کے قریب کا تیل تھا اور خود میرا ساتھ بھی تو کسی کی صراحی دار گردن کے خم سے ہو کر ہی گزرتا تھا، خود میرے خوابوں کی نیند بھی تو کسی کی آنکھوں پر کرنی زلف نے اڑا رکھی تھی، خود میں بھی تو کسی کی کھنیر پی پٹوں کے تپتے سائے تلے ہر دم چل رہا تھا، پھر مجھے شہر یار سے کسی بھی گلے شکوے کا کیا حق تھا، شاید ہر گھائل، روپ کا گھائل ہوتا ہے، ہر ڈنوں، کسی حسن کا اسیر ہے، ہر چاند، کسی کی کلائی کا کلن اور سب تارے کسی کی اڑھنی کا آچٹل تھے۔ اگر ملزماں کی فہرست بنائی جاتی، تو سب سے بڑا بھرم تو میں خود تھا۔

شہر یار بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر سائنس سے فارغ ہوئے تو سلطان بابا نے فوراً ان کے سامنے دوبارہ اپنی ”رہائی“ کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹر دس میں سے ایک فبس کر بولا۔ ”کیوں بابا! کیا آپ کا یہاں ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا؟“ سلطان بابا مسکرائے۔ ”جس نے یہاں دل لگایا، سمجھو وہ نہیں کا ہو کیا ماں.....! آپ مجھے یہاں سے جانے دیں تو یہ وعدہ رہا کہ ہر جتنے ہم خود یہاں حاضری دینے آ جا یا کر میں کے۔“ سبھی ڈاکٹر ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہر یار، سلطان بابا کے پاس جا بیٹھا۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر پر پڑی۔ ہمیں کال گزرتے سے نکلے آج ٹھیک پندرہواں دن تھا۔ اچانک نہ جانے کیوں پل بھر ہی میں مجھے ایسا کیوں لگا کہ کیلنڈر میں بھرے رنگ فائز ہو گئے ہوں تصویر رنگین سے صرف کالی اور سفید ہو کر رہ گئی، پھر میں نے ذرا غور کیا انہیں کالا نہیں، یہ تو ٹیلا اور شاید کچھ پیلا رنگ بھی تصویر میں باقی تھا۔ مطلب یہ کہ صرف سرٹ اور ہڈی رنگ تصویر سے اڑے تھے۔ میں نے ٹھہرا کر زور سے ٹپکیں ہنسیں دھجے کوئی پرانے ٹکڑی دی کے پٹے پٹے رنگ اڑ جانے پر اسے زور سے آس پاس سے تھپک کر ہلا کر بھٹکے سے اس کے رنگ واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک لمبائی اثر تھا اور دوسرے ہی لمحے میری بصارت کے رنگ واپس لوٹ چکے تھے، لیکن ٹھیک اسی لمحے مجھے اپنی نگوں میں تیز مریچوں جیسی جلن اور جھپٹ دور تپتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اور جلن کا احساس اس قدر شدید اور اچانک تھا کہ میری

آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب پڑے پانی کے جگ سے تین چار گلاس پانی بنا کسی وقفے کے حلق سے نیچے انڈیا۔ شہر یار دوسرے کمرے میں سلطان بابا سے باتیں کر رہا تھا، دونوں میری اس بگڑتی حالت سے ناواقف تھے، شاید یہ میرا وہم ہی ہو، لیکن جانے کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے لبوں کے کنارے پر ہلکا سا کف جمع ہو کر تحلیل ہو گیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا تھا، لیکن چند لمحوں ہی میں اس احساس نے میری روح ٹھوڑ کر رکھ دی تھی۔ شکر ہے کہ جس وقت سلطان بابا نے مجھے آواز دی، تب تک میرا ہانپنا ختم ہو چکا تھا، ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے، پھر بھی جب میں درمیانی راستے کا پردہ اٹھا کر ان کے بستر والے حصے تک پہنچا، تب تک وہ میرے چہرے پر کچھ پڑھ چکے تھے۔ ”کیا ہوا میاں! یہ بلدی کہاں سے مل لائے ہو چہرے پر، رنگ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟“ میں نے بات ٹالی۔ ”کچھ نہیں، شاید نیند نہ آنے کی وجہ سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی، اب ٹھیک ہوں میں۔“ وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتے رہے۔ ”کبھی دو گھڑی آرام بھی کر لیا کرو، جنوں حد سے گزر جائے تو وحشت بن جاتا ہے۔“ میں چپ رہا۔ یہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے شہر یار سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے، شیخ صاحب جانے کیا سوچتے ہوں گے، لیکن اس نے ضد پکڑ لی کہ میں بھی کچھ دیر کے لیے اس کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا، سلطان بابا کی آنکھ لگ چکی تھی۔ ہم خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی حسب توقع شیخ صاحب نے شہر یار پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ ٹھیک تو ہے، کہیں ان کی خدمت میں کوئی کمی تو نہیں آگئی، جو شہر یاریوں اکتا کر دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ شہر یار نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ اسے تو بس اپنی کہانی کے ایک اہم موڑ کے لیے ماحول کی کچھ تبدیلی چاہیے تھی اور بس.....! چائے کے دوران شانی اور دھانی نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ ماحول خوش گوار رہے۔ آج گزشتہ روز جیسی پھوار تو نہیں پڑ رہی تھی، لیکن آسمان پر آج بھی سفید بادلوں کے بہت سے آوارہ کھڑے ”کوٹھا چھپائی“ کھیل رہے تھے۔ آج دن بھی جمعرات کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب چھوٹی ماں (میری خالہ) مجھے بادلوں کی کہانی سنایا کرتی تھیں کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کی بھیڑیں اور دبے ہوتے ہیں، جنہیں اللہ میاں دن کے وقت نیلے آسمان پر کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، تو میرے ذہن میں اللہ میاں کا بہت ہی خوب صورت سا تصور ابھرتا تھا۔ شہر یار آج بھی چپ سا تھا۔ دھانی نے غالباً شیخ صاحب کا دھیان بنانے کے لیے ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ جوڑ رکھا تھا۔ شانی بھی بیچ میں ایک آدھ لقمہ دے رہی تھی۔ اچانک ہی دھانی مجھ سے پوچھ بیٹھی۔ ”عبداللہ! آپ بتائیں کہ آپ ایسے موسم کو کیسے انجوائے کرتے ہیں؟“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھرائی۔ ان دنوں کیوں کو شیخ صاحب کی کتنی فکر تھی، کیا سبھی بیٹیاں اپنے باپ کے لیے اسی طرح گھلتی ہوں گی؟ ”میرے ذہن میں تو ایسے موسم کے لیے بہت خصوصی اہتمام کے کئی طریقے آتے ہیں..... مثلاً ایسا شیشے کا بہت بڑا کمرہ ہو، جس کی شفاف دیواروں سے پرے ہم بوندوں کا کھیل دیکھیں، برستے آسمان سے بجھتی زمین تک کا ہر نظارہ ایک ہی فریم میں ہمارے آنکھوں کے سامنے ہو، شیشے کے ہال میں ایک بہت بڑا سا پیانو ہو اور.....!“ شانی اچانک بول اٹھی۔ ”اور اس پیانو پر زیبا بیگم بیٹھیں گنگنار ہی ہوں، کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی.....!“ شانی کی مثال اس قدر بے ساختہ اور عمدہ تھی کہ ہم سبھی زور سے ہنس پڑے۔ شیخ صاحب تو بہت دیر تک اس بات کا لطف لیتے رہے۔ ماحول ہل بھر میں ہی خوش گوار ہو گیا اور شانی اور دھانی کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ وہ رشتے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں، جن کی پروا کرنے کے لیے لوگ موجود ہوتے ہیں، شاید رشتوں کا واسطہ ہی دل جوئی اور دل داری سے ہوتا ہے، ورنہ سارا جہاں اجنبی ٹھہرا۔ چائے کے بعد میں شیخ صاحب سے اجازت لے کر واپس اسپتال جانے کے لیے پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ شانی تیز تیز قدم اٹھاتی میرے پیچھے چلی آئی۔ ”عبداللہ.....! میں اور دھانی دونوں ہی اپنے صبح کے برتاؤ پر بے حد شرمندہ ہیں، دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں بہت جذباتی ہیں اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو تو کیا، ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی، حالاں کہ آپ کو یہ سن کر ہنسی آئے گی کہ جب تک امی ہمارے درمیان موجود تھیں، ہم ایک دوسرے سے دن میں تین چار بار ضرور لڑا کرتی تھیں، لیکن ہمیشہ ان جھگڑوں کا خاتمہ بھی کسی ایک کے آنسوؤں پر ہی ہوتا تھا۔“ ”جی میں سمجھ سکتا ہوں، آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، جانے ان آنسوؤں کی صفت کو عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کر دیا گیا ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت پڑنے پر یہ خزانہ بہا دینا چاہیے، کیوں کہ روتا ہوا انسان اس لمحے بہت معصوم ہو جاتا ہے۔“ شانی کے چہرے پر چھایا تکدر صاف ہو گیا۔ ”آپ ہر بات کا ایک نیا زاویہ اپنے اندر رکھتے ہیں، ویسے آپ کے کھجے کے مطابق تو میں اور دھانی اس دنیا کے سب سے زیادہ معصوم فرد ہوں گے، کیوں کہ ہم دونوں تو بہت روتے ہیں، کبھی امی کو یاد کر کے، کبھی پرانی باتوں پر، کبھی ڈیڈی کی کسی پریشانی پر اور کچھ نہ ملے تو اپنی چوڑیوں کے ٹوٹ جانے یا چھلوں کے کھوجانے پر بھی..... کبھی اپنی پسند کے ایک جیسے دو جوڑوں میں سے کسی ایک کے کپڑے کا رنگ اتر جانے پر تو کبھی دل پسند سینڈل کی ہیل ٹوٹ جانے پر.....! دھانی اور میرے پاس رونے کے بہانے کبھی بھی کم نہیں رہے۔“ میں نے ہنس کر غور سے اس زندہ دل لڑکی کو دیکھا۔ کہاں الجھا بیٹھی تھی محبت کی رنگین لیکن تیز دھار ڈور میں خود کو..... کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کی یہ ڈور ہمارے جذبوں کی پتنگ کو اونچا اور زیادہ اونچا لے جانے کی خواہش جگا کر ہمیں اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ پھر ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب اور کس طرح یہ قاتل ڈور ہماری شہ رگ پر پھر جاتی ہے۔ ہم جب تک سنبھلتے ہیں، خون کا تیز فوارہ ہمیں پورے وجود تک بھگو چکا ہوتا ہے۔ شانی دراصل مجھ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں نے شہر یار تک ان کی معذرت پہنچا دی تھی اور یہ کہ ان دونوں نے شیخ صاحب کو پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن وہ دونوں چاہتی تھیں کہ میں شیخ صاحب سے بات کروں۔ میں کچھ الجھ گیا۔ ”میں.....؟ میرا مطلب ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن کیا آپ نہیں سمجھتی کہ یہ بہت ذاتی بات ہے، کہیں شیخ صاحب میری زبانی یہ سن کر.....!“ ”میں آپ کی بات سمجھ سکتی ہوں، لیکن یقین کریں کہ ڈیڈی آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتے ہیں، مجھے اور دھانی کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات کو غلط نہیں لیں گے، ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں، لیکن ڈیڈی سے چھپا کر ہم مزید ایک اور غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں، آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آپ کو یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہم نے!“ شاہانہ کی سنہری جبیں پر اپنا مدعا بیان کرتے کرتے پسینے کے چند ننھے قطرے ابھرا آئے تھے۔ کیا سبھی لڑکیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”آپ اطمینان رکھیے، میں اسے امتحان سے زیادہ سعادت سمجھتا ہوں، لیکن کیا آپ دونوں کو نہیں لگتا کہ شیخ صاحب سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کو شہر یار سے ایک بار کھل کر بات کر لینی چاہیے.....؟ دل کی گریں بہت مضبوطی سے بھی لگی ہوں، تو ان کا کلام دھاگا آسانی سے کھل جاتا ہے، بعض جذبے وقت کے متقاضی ہوتے ہیں، پوری آنچ مالتے ہیں، کبھی کبھی ذرا سی جلدی اور ہلکی آنچ ہی سے اتار دینے پر کچھ رہ جاتے ہیں اور یاد رہے کہ رشتوں کی یہ آنچ بس ایک باری سلگائی جاسکتی ہے، دوسری مرتبہ یہ سب جلا کر رکھ دیتی ہے۔“ شاہانہ چپ چاپ سر جھکائے میری بات سنتی رہی۔ جذبوں اور رشتوں کی آنچ کی دھک ٹھیک اس لمحے، میں اس کے چہنچہ سے کندن ہوتے گلابی چہرے پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

میں اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کا چہرہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ پتا چلا کہ ڈاکٹروں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی پیچیدگی نظر نہ آئی، تو انہیں جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی بہت رغبت سے کھایا۔ انسان کا من اندر سے شانت ہو، تو پھر سبھی ہارمون شاید مکمل کام کرنے لگتے ہیں۔ انسان کے اپنے اندر بھی یہ یک وقت نہ جانے کتنے جادو منتر چلتے رہتے ہیں۔ رات گئے میں گھر واپس پہنچا، تو ایک عجیب سی خاموشی نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے انکیسی میں جا کر شہر یار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہر یار اندر ہی سے بولا۔ ”کم ان!“ دروازہ کھولتے ہی میری پہلی نظر شہر یار کے سوٹ کیس پر پڑی، جس میں وہ اپنا سامان بھر رہا تھا۔ ”تو تم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے.....؟“ ”ہاں.....! اور کوئی فیصلہ حتیٰ نہیں ہو پا رہا تھا۔“ ”تمہارے اس فیصلے کا شیخ صاحب کو پتا ہے؟“ ”انہیں فی الحال صرف اتنا ہی پتا ہے کہ میں اپنی کہانی پوری ہو جانے پر واپس گھر جا رہا ہوں، لیکن کون جانے کہ یہ کہانی اب کبھی پوری ہوگی یا نہیں.....؟“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ”کیا تمہاری ان دونوں سے کوئی بات ہوئی؟“ ”ہاں.....! دونوں ہی سے فردا فردا بات ہوئی، آج شام کو!“ اتنے میں نوکرنے دستک دے کر بتایا کہ شیخ صاحب لاؤنج میں کافی پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شہر یار کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ

ثانی نے اسے بھی یہ بتا دیا ہے کہ وہ مجھے شیخ صاحب سے بات کرنے پر آمادہ کر چکی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ شہریار سے پوچھا۔ ”تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو، تو مجھے بھی بتا دو کہ شاید میں تمہارا مقدمہ ٹھیک طرح سے شیخ صاحب کے سامنے پیش کر پاؤں۔“ شہریار کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ ابھری۔ ”نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے کہ تم ایک بہترین وکیل کی طرح میرا مقدمہ لڑو گے، فی الحال میں دل اور دماغ کی اس جنگ میں ہار رہا ہوں، تم جاؤ، اگلے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ میں نوکر کے ساتھ لاؤنچ پہنچا، تو کافی کے ٹکے سہائے جا چکے تھے، ماحول پر خجندی طاری تھی، دھانی نے کافی کوس میں انڈیل کر ہمارے ۱۶ لے کی اور نوکر سے باہر نکل گئی۔ شیخ صاحب بھی شاید نوکر کو ذہنی طور پر کسی اہم بات کے لیے تیار کر چکے تھے۔ میں نے آسمان اٹھوں میں انہیں شہریار کے یہاں آنے سے لے کر دھانی کے فون اور پھر ثانی کی پسند ننگ کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ پپ چاپ میری بات سنتے رہے اور جب میں بات ختم کر چکا، تب بھی بہت دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آس پاس کی سرسراہٹیں بتا رہی تھیں کہ دونوں بیکٹیں پاس ہی کسی بلوچہ کمرے میں موجود ہیں۔ شیخ صاحب اپنا پاپ۔ لگا چکے تھے اور ان کے ماتھے پر پنی فلٹیں بھی دھوئیں کے ان سرخوئوں جیسی تھیں، جو اس وقت ان کے پائپ سے نکل رہے تھے۔ بہت دیر بعد ان کے لب کھلے۔ ”تو کیا شہریار اسی لیے یہاں سے جا رہا ہے؟“ ”یہ بھی ایک وجہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ چند دن کا یہ وقفہ ان تینوں کو کسی ٹھیک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گا۔“ شیخ صاحب نے ایک لمبا سانس نکالا بھرا۔ میں جانتا تھا، وہ اس وقت کسی شہید کھٹکھٹ کا شکار تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی، جس میں جیت الٹی کی دو بیٹیوں میں سے کسی کی ہوتی، خود ان کی اپنی ہار جیتی تھی، کیوں کہ یہ از اس پر بھی میاں ہو چکا تھا کہ ثانی سے پہلے دھانی، شہریار کی کنڈی بلا جی تھی اور ان جانے ہی میں تھی، پر وہ بھی اس دور کے کھٹکے کے انتظار میں شہریار کے دل کے باہر گھڑی رہی ہے۔ شیخ صاحب اٹھ کر بیٹھے گئے۔ ”شہریار کی الجھن اپنی جگہ بجا سی، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گی، شہریار اچھا لڑکا ہے اور میں اس کی صاف گوئی سے بھی مزید متاثر ہوا ہوں، اس سے بس اتنا کہنا ہے کہ اس گھر کے دروازے اس کے لیے بند کھلے ہیں گے۔“ گو یا شیخ صاحب نے فیصلے کا اختیار شہریار کو سونپ دیا تھا۔ میں ان سے اجازت لے کر واپس انگلی پھپھا تو شہریار برآمدے ہی میں شیشے کی دیوار کے قریب پڑی آرام دو کرسی پر بیٹھا نہ جانے کون سوچوں میں غم تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر تعجب لگایا۔ ”آگے وکیل صاحب! کہو کیا فیصلہ لے کر آئے ہو؟“ ”تمہاری عدالت نے فیصلے کا اختیار بھی تم ہی پر چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔۔۔ ثانی یا دھانی نام کی جو بھی بیڑی تمہیں پسند ہے، تمہیں اسی کے ساتھ عرقید سادی جانے کی۔“ شہریار کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھرا آئی۔ ”منصف کسی کو عرقید کی سزا سنانے سے پہلے بھی ان اٹھڑیوں یا بیڑیوں سے کیوں نہیں پوچھتا کہ کیا انہیں اس طرز کا زیور بننا قبول بھی ہے یا نہیں؟“ میں نے ہنک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”شام کو پہلے دھانی آئی تھی خود انجیسی میں، مجھے صرف یہ بتانے کہ ثانی کی خوشی اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور یہ درخواست کرنے کے لیے کہ میں اس ابتدائی ایک ہفتے کی ہر بات بھلا کر اگر ثانی کو خود اس کی شخصیت کے تناظر میں دیکھوں، تو ثانی سے بہترین ساتھی مجھے پوری دنیا میں جہاں لے کر ماحول نے سے بھی نہیں ملے گا، وہ اپنی بہن کی خوشی مانگنے آئی تھی۔“ ”تو تم نے کیا جواب دیا؟“ ”مجھے جواب دینے کی مہلت ہی کہاں ملی، ابھی دھانی کو انجیسی سے نکلے دو لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ ثانی کا فون آگیا اور کیسا ستم ہے کہ دوسری بہن نے بھی مجھ سے وہی مانگا، جو اس کے لیے پہلی بہن مانگ کر گئی تھی۔“ ”بہ مطلب۔۔۔۔۔۔ کیا ثانی نے بھی۔۔۔۔۔۔؟“ ”ہاں اس نے بھی صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ اس کے لیے اپنی بہن کے آنسوؤں سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں اور اب چوں کہ وہ اپنی بہن کے دل میں جیسے سہماں کو جان چکی ہے، لہذا اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کے ہنٹوں کی راکھ پر اپنا محل قائم کر لے، لہذا اس نے اپنے آپ کو میرے لیے سدا نامحرم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ بھی مجھ سے اپنی آخری خواہش کے طور پر دھانی کو اپنانے کا کہہ گئی ہے۔“

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہریار اسی طرح شیشے کے پار دیکھتا رہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہوگا، دھانی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تم سے رات کو بات کرے گی۔“ میں نے اپنے کمرے میں جا کر فون اٹھایا، دوسری جانب دھانی ہی تھی۔ ”یہ آپ نے کیا کیا۔۔۔۔۔۔ کیا آپ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آپ کی بہن کا ظہیر بھی اسی مٹی سے اٹھا ہے، جہاں سے آپ کا جنم ہوا تھا، پھر بھی یہ جاننے ہوئے کہ ثانی کبھی شہریار کو آپ کی شرط کے مطابق قبول نہیں کرے گی، آپ نے کیوں یہ جوگ لے لیا؟“ دھانی کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ ”بعض جوگ ازل سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں، میں شہریار کو پا بھی لیتی، تو یہ ان کے لیے ادھوری خوشی ہوتی، کیوں کہ ان کی آدمی خوشی ثانی کی شخصیت میں پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ادھوری خوشی مکمل غم سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے، محبت اگر دو غلطوں کی صورت میں ہو تو کبھی نہ کبھی دائرہ بن کر مکمل ہو جاتی ہے، لیکن اگر یہی محبت نیکوں کی صورت اختیار کر لے تو اس کے تین زاویے کبھی جڑ نہیں پاتے۔ شاید میں کبھی ثانی کو سنا ہی ہوں، آپ نے ہمارے لیے جتنا کچھ کیا، میں شکر یہ ادا کر کے اس کی اہمیت کم نہیں کروں گی، آپ کو اگر وقت ملے تو ثانی سے بات کیجیے گا، ات آپ کی باتیں جلد مجھ میں آتی ہیں۔“ فون رکھ دینے کے بعد بھی میں بہت دیر تک غم میں بیٹھا رہا۔ جانے اس محبت کے اور کتنے روپ دیکھنا باقی تھے۔

اگلی صبح میں کمرے سے باہر نکلا تو شہریار کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ شہریار بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دو معمول انسان اسے نوٹ کر چاہتے تھے، لیکن پھر بھی وہ خالی ہاتھ اس گھر سے واپس جا رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسا بڑے دل کا اور وضع دار انسان بھی میں نے کم ہی دیکھا تھا، ان کے ماتھے پر ایک ٹھن بھی نہیں تھی کہ جس سے کوئی ان کی آرزو دلی کا اندازہ لگا سکے۔ انہوں نے صاف معمول ہتے بولتے شہریار کا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا۔ ثانی اور دھانی بھی اظہار بڑھ چڑھ کر ہر کام میں مصروف رہی تھیں، لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں کچھ تحریر صاف بتا رہی تھی کہ ایک اور محبت کی کہانی جاگزی انجام کے ختم ہو رہی ہے اور اس کہانی کے آخر میں جاوا الیہ نشان ہمیشہ کے لیے اس کہانی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ شہریار گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے آخری مرتبہ ہماری جانب مڑا۔ وقار نے اس سے پوچھا۔ ”شہریار بھائی!۔۔۔۔۔۔! آپ پھر کب آئیں گے، ہم سب آپ کو بہت مہم کریں گے۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں جلد آؤں گا۔“ ثانی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میں نے دھانی کو خود کو سمجھنے ہوئے دیکھ کر لڑکھایا۔ ”اسے جلد آنا ہی پڑے گا، ورنہ بیٹا نو پر بیٹھی گنگانائی زیبا بگم کس سے کہیں گی کہ کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی بچا دی۔“ سب ہنس پڑے۔ شہریار نے ثانی اور دھانی پر آخری نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جانے اس لمحے مجھے سانول کی زبانی سنا ایک صحرائی گیت اس شدت سے کیوں یاد آیا، جس میں محبوب اپنے پھڑے ہوئے محبوب کو دھاتی دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کا محبوب اسے بھول جائے گا، چاہے وہ اکھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلائے، پر وہ جانتی ہے کہ یہ صرف وقتی جوش ہے اور محبوب کی قسمت میں تو ازل سے بھلائی کی موت ہے، کیوں کہ اس کا محبوب اسے بھول جائے گا۔

تے ملوں یاد ہو سی میں آکھیا سی
دلدار بستیا ٹوں نعل وپیس
دل دل قرآن ہے جھ نہ رکھ
نہ قہماں چا، ٹوں نعل وپیس
تجھ سوچ مجھ جے فیصلہ کر
نہ جوش دکھا، ٹوں نعل وپیس
تیرے باہوں میں نی جی سندھ
نہ ظلم سما ٹوں نعل وپیس
دلدار بستیا ٹوں نعل وپیس

(باقی آئندہ)

اک خاک بسر نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



☆ ہاشم ندیم ☆

کبھی کبھی پیار کھودینے کے بعد ہمارے لیے کسی انمول ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کھوئی ہوئی محبت ”کوہ نور“ بن جاتی ہے، کھویا ہوا پیار ”شاہیار“ بن جاتا ہے۔ دھانی اور شاہانہ کی چاہت بھی شاہیار بن چکی تھی۔ شہر یار کے جانے کے بعد اگلے روز سلطان بابا بھی اسپتال سے فارغ ہو کر شیخ صاحب گئے ہاں چلے آئے، ان کا ارادہ جلد کوچ کرنے کا تھا، لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت اور شیخ صاحب کے اصرار پر نہ کرتے ہوئے بھی ایک۔ ہفتہ مزید بیت ہی گیا۔ اب بظاہر ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی، لیکن میرے اندر کی بے چینی اب رفتہ رفتہ کسی لاوے کی شکل اختیار کرنے لگی تھی اور اب تو رگوں کا میری بصارت سے کچھ ٹھنوں کے لیے روکھنا، ہر چوبیس گھنٹے میں ایک مھول کی شکل اختیار کرنے لگا تھا، لیکن کبھی رنگ نہیں روٹھتے تھے، بس چند تھے، جو کسی پرانی تصویر کی طرح درمیان سے غائب ہو جاتے تھے اور یہ چند لمحے مجھ پر کس عذاب کی صورت جیتے تھے، یہ بس میرا دل ہی جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے لگتا تھا، جیسے میری نسوں میں خون نہیں، گرم کھوتا سیال مادہ دوڑ رہا ہو، میری سانس کی گرم بھٹی کی دھواں بن جاتی تھیں اور میں یوں ہانپنے لگتا تھا، جیسے میلوں دور سے دوڑتے ہوئے آیا ہوں، لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میری یہ حالت کسی پر ظاہر نہ ہو، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے سلطان بابا کو مزید دیر ہو۔ وہ پہلے ہی مشرقی ساحل پر بنی کسی مسجد کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی مرتبہ بے چینی کا اظہار کر چکے تھے، اب اگر ایسے میں، میں اپنی بگڑتی طبیعت کا رونا لے کر بیٹھ جاتا، تو وہ ضرور علاج کے غمضے میں پڑ جاتے اور ہمیں نہ جانے مزید کتنے دن یہاں رکتا پڑتا اور پھر میرا کیا تھا، میرے اندر تو جانے ایسے کتنے اور عسیری روح کو جھلسانے کے لیے ہر دم بہتہ رہتے تھے اور پھر خود ہی تھک کر سر دھبی ہو جاتے تھے۔ سو چاہیے تھیں بھی دل کے سرد خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر خود ہی برف ہو جانے گی۔

جنس دن ہمیں شیخ صاحب کی کوفھی سے رخصت ہونا تھا، اس روز بہت سے کالے بادل ہمیں الوداع کہنے کے لیے آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سلطان بابا سے سن رکھا تھا کہ ہم جس مشرقی ساحل کی جانب جا رہے تھے، وہاں بارشیں بہت بڑی ہیں۔ شاید یہ گھمبیرے بادل بھی اسی دلیں سے آئے ہوں۔ مہمان جب راستوں سے نا آشنا ہوں تو میزبانوں کو انہیں لینے، ان کی بستی جانتا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے دھانی، شانی، وقار اور شیخ صاحب کیٹ تنگ آئے، پھر وہی الوداع، پھر وہی رگوں کے سرے تک پھیل جانے والی اداسی..... جب ہمیں اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دن ہر رشتے، ہر جگہ، اس جہان ہی سے رخصت ہو جانا ہے، تو ہم اپنے دل کے دھاگوں کی گرہیں یہاں وہاں کیوں باندھتے پھرتے ہیں۔ سلطان بابا نے تینوں بچوں کو فردا سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی، کبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ دھانی ان سے نظر نہیں ملا پائی، وہ کچھ دیر اس کے پاس ٹھہر کر بولے ”جن کے من کے آئینے اتنے اجلے ہوں، ان کے مقدر کبھی دھندلے نہیں ہوتے، ہم جو کھودیتے ہیں، قدرت اس سے بہتر ہمارے لیے پہلے سے یخن رکھتی ہے، بس اتنا یقین رکھنا۔“ دھانی رو پڑی۔ پھر شانی اور پھر شیخ صاحب بھی اپنی پلکیں پونچھتے نظر آئے۔ مجھے اسی لیے یہ الوداع سدا سے کاٹ جاتے تھے۔ شیخ صاحب بعد تھکے ہم ان کی گاڑی مع ڈرائیور اپنے سفر کے پہلے حصے کے لیے استعمال کریں، لیکن سلطان بابا نے بس کے سفر کو ترجیح دی۔

بس نے ہمیں قریباً چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دریا سے شلک قصبے تک پہنچا دیا، جہاں سے اگلے روز صبح ہوتے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر پہلے مسند کی ایک بڑی شاخ اور پھر کھلے مسند میں پہنچا دیا۔ میرا شہر اسی مسند کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ میں اسٹیشن کے عرسے سے نکلنے والی لہروں کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ جانے ان میں سے وہ کون سی لہر ہوگی، جو اس ساحل کو چھو کر آئی ہوگی، جس سے ذرا پرے میرے دل کے ساحلوں کی حق دار رہتی ہے، پھر اچانک میرے من میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، ان میں کوئی ایسی لہر بھی ہو، جو اس ماحول کو چھو کر آئی ہو، جو اس ماحول کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت پسند تھا، ضرور یہ جھاگ اڑاتی، مسکراتی اور شریر سی ہنستی ہوئی بے باک لہر اس لالہ رخ کی قدم بوی کر کے ہی مجھ تک پہنچی ہوگی۔ میں نے انہیں پڑھا تھا کہ دل کے دریا، مسند سے بھی گہرے ہوتے ہیں ”دل دریا، مسندوں ڈوٹھے“، لیکن زہرہ کی یاد نے ہل بھر میں میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا تھا۔ وہ مجھے اس بات کا احساس دلانا تھا کہ میرے دل کا دریا کب سے مسند میں تبدیل ہو چکا ہے، اور شاید انکسین پانی میری آنکھوں کو ہر لمحہ جلانے کے لیے کہاں سے آتا۔ میری پتلیوں کا یہ وضو شاید ازل سے جاری و ساری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد اسٹیشن پر ایک کھلے پھٹے ساحل پر اتار دیا، جہاں کھڑی مخصوص اوٹ گاڑیوں پر ہمارے سفر کا آخری حصہ طے ہوتا تھا۔ شام ڈھلے جب آدھ پتے سورج کی کرنوں کا سونا پورے مسند کو ایک سنہری قالین میں تبدیل کر رہا تھا۔ میں اور سلطان بابا اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد، جو مسند کی لہروں سے نکل راتی پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی تھی۔ پیش امام کا نام مرتضیٰ تھا، جو ہمارے استقبال کے لیے مسجد کے دروازے کے باہر ہی کھڑے تھے۔ ان کا گھر پہاڑی کے عقب میں واقع چھوٹی سی بستی میں تھا اور ان کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر قریباً نو، دس برس ہوگی، ہمیں پہاڑی ٹیلے کی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے بابا کے پاس آکر ہمارے آنے کی منادی کر چکا تھا۔ جب مرتضیٰ صاحب ہم سے مل رہے تھے تو وہ ان کے عقب میں کھڑا اپنی جہان آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا نے اسے پکارا تو وہ جلدی سے اپنے بابا کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس کا نام اشرف المرتضیٰ تھا۔ جانے دنیا کے کبھی بچوں کی رو میں ایک سی

کیوں ہوتی ہیں۔ صاحب، شہنشاہ، نرم، ملائم، شریلی اور کھلی سی۔ ہم تمام عمر اپنے بچپن والی روح کی شہادت کو اپنے اندر قائم کیوں نہیں رکھ پاتے؟

مرغضی صاحب نے سلطان بابا کو جگرے میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے بھی ہنسی اٹھانے والے گھٹن میں ان کے پیچھے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر وہی بصارت سے رنگ نچوڑ لینے والا دورہ میری سوس میں آگ بھڑکیا۔ ایک چنگاری سی میرے لبوں میں دوڑی اور میں ایک لمحے کے لیے ڈمک سا گیا۔

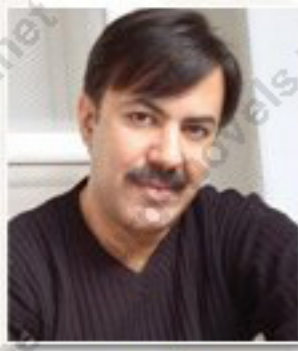
مرغضی صاحب جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ”کیوں تو ہوان! سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“ میں نے بڑی مشکل سے اپنی ننگی سانسوں پر قابو پایا۔

”ہی.....! میں ٹھیک ہوں، بس شاید لمبے سفر کی تھکن ہے، کچھ دیر آرام کروں گا تو سنبھل جاؤں گا۔“ سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا، لیکن چپ رہے۔ کچھ ہی دیر میں مرغضی صاحب نے خود ہی عشاء کی اذان بھی دے دی اور ساحلی بستی سے دس بارہ یکن نماز کے لیے جمع ہوتے گئے۔ سبھی اپنے حلیے سے مجھیرے لگ رہے تھے۔ مرغضی صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان بابا نے جماعت پر دھوانے کی دے داری مرغضی صاحب ہی کو سونپ دی اور ہم نے اس ساحلی مسجد میں عشاء کی پابجاعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد بھی نمازیوں نے فردا فردا سلطان بابا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ رات کا کھانا مرغضی صاحب کے گھر ہی سے آچکا تھا اور اشرف، مرغضی، جو اب دھیرے دھیرے ہم سے مانوس ہونا چاہتا تھا، ایک جانب شرمایا سا بیٹھا، اپنے بابا کو دسترخوان پر چاول اور خشک مچھلی کے ٹکٹین جیسے لکڑی کی پلیٹوں میں سجاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مرغضی صاحب نے ہمیں کھانے کے دوران بتایا کہ یہاں کی آب و ہوا میں شدید سیلن اور نمک کے مخصوص ذرات کی موجودگی کی وجہ سے تو ہے، جاپے یا سلور کا کوئی بھی برتن استعمال نہیں کیا جاتا، کیوں کہ وہ مفتوں ہی میں زنگ آلود ہو کر گرل جاتا ہے، لہذا یہاں کی تعمیر میں بھی زیادہ تر ای مخصوص لکڑی کا استعمال کیا جاتا ہے، جس سے بے برتنوں میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سمندر کی تیز ہوا جگرے کی بناء شیشے کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے پار ہوتے ہوئے ایک عجیب سا ساز بجا رہی تھی، جیسے کوئی ماؤتھ آؤر گن اپنے ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کچھ دیر بعد مرغضی صاحب اپنے بیٹے سمیت رخصت ہو گئے۔ سلطان بابا کچھ دیر سستانے کی غرض سے لیٹ گئے اور میں خاموشی سے جگرے سے باہر نکل آیا۔ باہر میرے بھی دوست تارے، گہرے نیلے آسمان پر اپنی محفل سجا چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکائے۔ میں نے ان میں سے سب سے زیادہ روشن اور چمکتے تارے سے ذہرہ کا پوچھا۔ ”کیسی ہے وہ.....؟“ تارے نے سمندر کی مغربی سمت جھانکا اور اس کر بولا۔ ”وہ بھی تمہاری طرح ادا اس ہے..... اور اپنے گھر کی وسیع چھت پر ایک آرام دہ کرسی ڈالے ہم سے تمہاری باتیں کر رہی ہے، تمہارا پتا پوچھ رہی ہے.....“ جانے کیوں اس لمحے مجھے ان ستاروں کی قسمت پر بہت رفق آیا۔ وہ آسمان کی چھت پر لٹکے پوری دنیا میں چپ چاپ ہیں، خستے چاہیں دیکھ سکتے تھے۔ کاش میں بھی آسمان کا ایک تارہ ہوتا، بہت پہلے دارنہ تھی، ٹھپا لالا اور بدھم ہی تھی، اک آوارہ تارہ.....! نصف رات بیت گئی تھی۔ میں نے پہاڑی پہلے سے اٹھنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کبھی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی ہے۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں میھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ہاں واقعی جس نیلے کی پانی پر میں بیٹھا ہوا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر درمیان کی ایک ٹھگ ٹھگانی سے متصل، ایک اور نیلے کی پانی بھی تھی اور کسی گاڑی کی ٹیک انجن روشن ہو کر دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ مطلب یہ کہ گاڑی پہلے ہی سے وہاں پارک تھی اور اب وہیں جا رہی تھی۔ اس دیرانے میں اتنی رات گئے تھے کہ کون تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ دو گاہ کوئی میری طرح رات، تنہائی، سمندر اور ستاروں سے بات کرنے والا.....!

جگرے کے بعد اگلی صبح میری آنکھ لگی تو پھر اٹھتے اٹھتے بہت دیر ہو گئی۔ سلطان بابا نے بھی جانے کیوں سورج نکلنے سے پہلے جب معمول مجھے نہیں جگایا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو اپنے ارد گرد سلطان بابا، مرغضی صاحب، اشرف اور ایک انجان شخص کو پریشان سا بیٹھا دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں درد کی ایک شدید نہیں اٹھی۔ سلطان بابا نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے یہاں؟“ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ”مجھے کیا ہوا، میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں، بس ذرا سر میں درد ہے، شاید رات کو ٹینڈنہ آنے کی وجہ سے!“ ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انجان شخص نے میری نعل تھامی۔ ”اپنے دورے کب سے پڑ رہے ہیں آپ کو.....؟“ میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گہری سی سانس لی۔ ”نچر کی نماز پڑھ کر جب قم کمرے میں لوٹ رہے تھے، تو اچانک پکرا کر کمرے کی چوکھٹ ہی پر گر گئے تھے، تمہاری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اور شاید ہونٹوں کے کناروں سے کف بھی بہنے لگا تھا، مرغضی صاحب نے فوراً اپنی بستی کے حکیم ریاض السلام صاحب کو بلوایا اور جب سے ہم سب تمہارے سر ہانے ہی بیٹھے ہیں، حکیم صاحب کی تمہارے نالقی میں اٹھ بیٹھی تھی وہاں کا اثر وہاں تو سبھی پر بہت دیر سے!“ میں حیرت سے مدد کو لے سلطان بابا کی رہائی یہ تمام روداد سن رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ میں صبح دروازے کی چوکھٹ ہی پر گر گیا تھا۔ ہاں، کمرے میں آنے تک کی تمام جزئیات میرے ذہن کی سلیٹ پر بالکل واضح تھیں، لیکن اس کے بعد سب کچھ اٹھا۔ میں نے بادل ٹھوکتے حکیم صاحب کو گزشتہ چند روز سے اپنے اندر ہونے والی آتشی ہنگ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ دن میں دو چار مرتبہ ہاتھوں کے لیے میری بصارت بے رنگ بھی ہونے لگی تھی۔ حکیم صاحب پریشانی سے میری بات سنتے رہے اور پھر انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”ایک بات بتائیے، ماضی قریب میں آپ کے ساتھ کسی جانور کے کانٹے یا بچے گوشت تک پیوست ہو جانے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ خاص طور پر کسی کتے سے کوئی لمبھیر تو نہیں ہوئی آپ کی؟“ میں حکیم صاحب کی بات سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ایسا واقعہ ضرور پیش آیا تھا کہ میں کتوں کے جگرے کی کاٹ سے تو کسی طور بچتا رہا، لیکن ان کے چنے میری جلد میں کئی بار پیوست ہوئے تھے، شاید دانت بھی اس دھچکا شستی میں میرا سس چھو گئے ہوں، پر میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اسی روز چند ٹھنڈوں کے اندر اندر مجھے مطلوبہ دووا کیسین کی صورت میں انجیکٹ بھی کر دی گئی تھی، کیوں کہ میں فوجی چوکی کے مسکروں کو کڑتات خوش قسمتی سے پہنچ گیا تھا۔ حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ پر جن کتوں نے حملہ کیا تھا، انہیں اگلے 72 گھنٹے یا پھر چند دن زیر معائنہ رکھا گیا تھا، ان میں سے کسی کی موت تو واقع نہیں ہوئی تھی؟“ میں ایک بار پھر الجھ گیا۔ اب میں انہیں اپنی اس عجیب و غریب جتک کے بارے میں کیا لانا تھا، جس میں میری اور مجھ پر حملہ آور فوج کے سبھی رکن کتے ہی تھے اور بدقسمتی سے سبھی لڑاکوں نے اسی میدان میں جان دے دی تھی۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولا۔ ”دراصل وہ تین چار کتے تھے اور مجھ پر حملے کے دوران ہی انہیں مار دیا گیا تھا، لہذا معاف کیے کی نوبت ہی نہیں آتی۔“ حکیم صاحب نے تشویش بھرا لہجہ سا بھرا بھرا۔ ”اوہ.....! میں سمجھا.....“ سلطان بابا نے حکیم صاحب سے پوچھا۔ ”کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے نا جناب.....؟“ حکیم صاحب کچھ گنگناہے۔ ”عمل بات تو تفصیلی معائنے ہی سے پتا چل سکے گی..... مختصر اکتا جاتا سکتا ہوں کہ بروقت دوا مل جانے کے باوجود شاید بلکہ خدا نخواستہ کچھ

زہریلے مادے ان کے خون میں پرورش پا چکے ہیں، میں اپنی سی کوشش تو ضرور کر رہا ہوں، لیکن بہتر ہوگا کہ انہیں پہلی فرصت میں یہاں سے تیس میل دور پہلے بڑے ساحلی شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو بھی دکھا دیا جائے، میری حکمت میں جو اثر ہے، وہ سب فی ثبوت اللہ آپ لوگوں کے لیے حاضر ہے، لیکن زیادہ دیر نہ کیجیے گا۔" حکیم صاحب اپنی دوا کی ایک اور غوراک پلانے کے بعد اور ہمارے ذہنوں میں اچھل پھیلنے والی دواؤں کی صندوقی افکار چلتے بے۔ سلطان بابا اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر اس میری فکر میں پڑ چکے تھے۔ وہ پھر تک تو وہ مجھ سے باقاعدہ کچھ گفتگو بھی تھے کہ میں نے انہیں پہلے یہ سب کیوں نہیں بتایا۔ مجبوراً ظہر کے بعد مجھے زبردستی ان کے سامنے مسجد ہی میں صاف پر چوڑی مار کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ "میں آپ کا ستر کونسا نہیں کرنا چاہتا تھا، بس اس لیے خاموش رہا، آپ بے فکر ہیں، میں جلد تندرست ہو جاؤں گا۔ ہاں، لیکن اگر آپ اسی طرح روٹھے رہے، تو میں واقعی پورا مریض بن کر بستر پر پڑ جاؤں گا۔" میرا حربہ کارگر رہا اور وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔ "بہت ضدی ہو، لیکن اب ہم یہاں سے تب ہی آگے سفر کریں گے، جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اور پھر میرے ذہن میں بہت عرصے کا انکا سوال زبان سے پھسل ہی پڑا۔ "ہم جن منزلوں کی طرف سفر کرتے ہیں، ان کا تعین آپ کیسے کرتے ہیں.....؟ مثلاً جبل پور، پھر کال گڑھ اور اب مشرقی ساحل کی یہ مسجد..... سفر کا یہ نقشہ کون ترتیب دیتا ہے؟" وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ "کچھ اشارے مل جاتے ہیں، کبھی کسی حاجت مند دوست کا بلاوا آ جاتا ہے، کبھی وقت ملے اور میسر ہو تو نقشہ دیکھنا، امید ہے تمہیں سمجھ آ جائے گی۔" حسب معمول میرے ذہن کی کچھ گریں نکلیں، پر کچھ فی گریں مزید پڑ گئیں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ کہیں سے بھی اللہ میسر ہوا، تو اپنے آج تک کے سفر کا راستہ جو زکریا پرورد دیکھوں گا۔ میری حالت شام تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بگڑتی گئی اور میرے بعد تو گرمی اور جس سے میرا دم اس قدر ٹھنڈے لگا کہ میں گھبرا کر ٹیلے سے پیچے ساحل کی طرف چلا آیا۔ سامنے ہی اشرف نیلی اور زرد دھاریوں والی بڑی سی پٹنگ ہوا میں بلند نیلے دوڑ رہا تھا۔ پٹنگ کو زوری کی ڈھیل ملی، تو وہ دواؤں میں بلند ہوتی گئی۔ میں بہت دیر تک، پٹنگ اور آسمان کا یہ کھیل دیکھتا رہا، دھناتنا اشرف کے ہاتھ میں تھمی چکی ڈور کو ایک جھڈکا لگا اور پٹنگ آسمان میں ڈولنے لگی، ڈور ٹوٹ چکی تھی، اشرف بہت دیر تک ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی پٹنگ کو دوبارہ پکڑنے کے لیے دوڑتا رہا، لیکن کئی پٹنگیں اپنے مالک کے ہاتھ بھا کب آتی ہیں، انہیں تو آسمان چھونے کی خواہش مزید مزید اوجھلاڑا لے جاتی ہے۔ اشرف کی پٹنگ بھی ساحل کی ہوا کے تنگ بادلوں سے بے جا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اشرف منہ بسورتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیا ہوا؟ کٹ گئی پٹنگ.....؟" "ہاں آج پہلی بار میں نے اتنی اونچی اڑائی تھی پر.....!" اشرف ابھی تک افسردہ تھا۔ "کوئی بات نہیں، دراصل تمہاری پٹنگ بادلوں کو پسند آگئی تھی، سوان کا دل بھی چاہا کہ وہ اس سے نکلیں، لہذا تمہاری پٹنگ وہاں چلی گئی۔" اشرف کچھ حیران ہوا۔ "اچھا.....! کیا بادل بھی پٹنگ اڑاتے ہیں؟" میں مسکرایا۔ "ہاں بادل ہی تو پٹنگوں کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں، تب ہی تو پٹنگیں ان سے باتیں کرنے کے لیے اتنا اونچا اڑتی ہیں۔" اشرف کے چہرے پر پھایا ٹھنڈا ردور ہونے لگا۔ "اچھا پھر تو کوئی بات نہیں، بادل تو مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں، میرے بھی دوست ہیں۔" میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ اپنے اندر یہ بادلوں اور پٹنگوں کی دوستی سدا زندہ رکھنا۔ اشرف اپنی دھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ "میں بڑی گاڑی والے صاحب سے کہوں گا، وہ مجھے ایک نئی پٹنگ لادیں گے، فکر کی کوئی بات نہیں۔" "یہ بڑی گاڑی والے صاحب کون ہیں؟" اشرف نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک بہت بڑی سی گاڑی والے صاحب تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن ساحل پر شام کو کچھ دیر کے لیے آتے ہیں، کبھی کبھی ان کے ساتھ شہر کی کوئی سیم صاحب بھی ہوتی ہیں، دونوں کچھ دیر کے لیے دوسری جانب والے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چائے، کافی پیتے ہیں اور کبھی کبھار اپنے ساتھ پٹنگ اور ڈور بھی لاتے ہیں، یہ پٹنگ بھی اسی صاحب نے اشرف کو دی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں گزشتہ رات والی گاڑی کی بیگ لائٹس چمکیں۔ ہو سکتا ہے یہ وہی صاحب ہوں، جن کی تعریف میں اشرف اس وقت زمین و آسمان کے قلابے مل رہا تھا۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگا، تو مرتضیٰ صاحب مسجد والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشرف کو آوازیں دینے لگے۔ اشرف ابھی مجھے اپنے جگری دوست جانو کی کہانی مزید سنانا چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے نظر بچا کر کبھی کبھی آدمی چھٹی کے وقت بھی ساحل پر سپہاں اور گھونگے جمع کرنے آ جاتے تھے، لیکن اپنے بابا کی مستقل پکار سن کر اسے بادل غواستہ اٹھ کر جانا ہی پڑا۔ میں بھی مغرب کی اذان سن کر اوپر مسجد میں چلا آیا۔

عشاء کے بعد گزشتہ روز کی طرح مرتضیٰ صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی چکر لگا گئے تھے۔ نہ جانے ہر بار وہ میری نبض دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر کون سی ان دیکھی تحریر پڑنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رک سے جاتے تھے۔ رات بہت دیر تک سلطان بابا میرے سر ہانے بیٹھے رہے۔ میرا جسم اندر سے ہری طرح جل رہا تھا، بے چینی اتنی بڑھی کہ میں بہت دیر تک ادھر ادھر سر پھٹا رہا، پھر نہ جانے کس پیر میری آنکھ لگ گئی۔ بس مجھے اتنا ہی یاد رہا کہ سلطان بابا دھیرے سے میرے سر ہانے سے اٹھ کر حجرے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے، پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی بالٹی بھر بھر کر کھارائیک ملا پانی میرے چہرے پر پھینک رہا ہو۔ تیسرے چیمبرے پر میں نے کسماتے ہوئے آنکھیں کھولیں، تو سر پر حجرے کی پھٹ کی جگہ کھلا آسمان دیکھ کر چند لمحوں میں شہناہی گیا اور پھر پانی کی ایک تیز لہر نے میرے پہلے سے بھیگے ہوئے تن کو مزید بھگو دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور میں اس وقت حجرے کے بجائے ساحل پر گیلی ریت میں۔ ناہوا ہر سارے بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا.....! میں یہاں کیسے پہنچا.....؟ ابھی رات کو تو میں اپنے کمرے میں ہڈیانی حالت میں اپنے بستر میں کسمار رہا تھا، پھر یہ ساحل، یہ کھلی فضا.....؟ میں ابھی حیرت کے پہلے شدید جھٹکے ہی سے ہاں نہیں اٹھ پاتا تھا کہ اچانک دور سے کچھ لوگ دھوم کی صورت میں مجھے اپنی جانب بڑھتے نظر آئے۔ ان کے پیو لے دھیرے دھیرے وہند لی شیشیوں سے واضح خاکوں میں تھیل ہونے، تو سب سے آگے باوردی پولیس والوں کی ایک ٹولی نظر آئی، پھر ایک سپاہی کی مجھ پر نظر پڑی اور وہ مجھ دیکھتے ہی دور سے چلا آیا۔ "وہ رہا قاتل جناب.....!" پھر کوئی زور سے گرجا "لیکو..... پکڑو..... قاتل جانے نہ پائے۔" سب پولیس والے میری جانب دوڑے۔



☆ ہاشم ندیم ☆

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جگہ ”سڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ دروازے کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سر بستہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناٹکل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

میں ہنگامہ سا یوں ہی اپنی جگہ جما بیٹھا ہوا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے لپک کر میری کاکائی مضبوطی سے تھام لی۔ عقب سے چند اور حوالہ دہ بھی نمودار ہو گئے اور پھر ایک افسر گر جا ”کون ہوتم..... اور اس وقت یہاں ساحل پر کیا کر رہے ہو؟“ میں عبداللہ ہوں۔ سامنے والی چھوٹی پہاڑی پر واقع مسجد میں رہتا ہوں۔ ایک سپاہی میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر بولا ”یہ جھوٹ بول رہا ہے جناب، لاش کے قریب جو قدموں کے نشان ہیں، وہ سیدھے یہاں آکر ختم ہوتے ہیں۔ یہی اس لڑکی کا قاتل ہے۔“ میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے، یہ لوگ کس لڑکی کی لاش کا ذکر کر رہے تھے اور میرے قدموں کے نشان وہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں پوری ہتھی مہل کے گرد جمع ہو چکی تھی۔ افسر کے حکم پر مجھے جھٹکڑی پہنا دی گئی اور پھر تقریباً گھنٹے ہوئے جائے وقوع تک لے جایا گیا۔ کچھ پولیس والے زمین پر پونے سے ایک دائرہ لگائے کھڑے تھے۔ درمیان میں اسنید چادر کے نیچے ایک آڑھتار چھا جسم پڑا ہوا تھا۔ چادر کے نیچے بھی جسم کے زاویوں کے متوازی اسنید چونے کی گلیریں جھانک رہی تھیں۔ دفعتاً زوردار ہوائے بھونکنے سے جسم کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ 23 چوبیس سال کی ایک معصوم لڑکی آنکھیں موندے پڑی تھی۔ چہرے پر چند گہری خراشوں کے علاوہ اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ کر سکے کہ وہ اپنی سانسیں ہار چکی ہے، اس وقت بھی وہ اتنے قریب سے بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی ہی لگ رہی تھی، جیسے ابھی پٹ سے آنکھیں کھول دے گی۔ میں ابھی تک پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد ہی سامنے سے مرتضیٰ صاحب اور سلطان بابا پریشانی کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتے دکھائی دیے۔ میرے ہاتھوں میں جھٹکڑیاں دیکھ کر سلطان بابا کو جیسے کچھ ہونے لگا، وہ لپک کر میرے قریب آئے اور میرے ہاتھ ٹٹول کر کہنے لگے ”یہ جھٹکڑیاں کیسے عبداللہ میاں، یہ سب کیا ماجرا ہے؟“ اتنے میں ایک سرکاری جیپ ساحل پر نمودار ہوئی اور تمام پولیس والے ہوشیار اور مودب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹایا۔ ”اے ہٹو، ایک طرف ہو جاؤ، ایس پی صاحب آرہے ہیں“ ایس پی کے قریب آتے ہی سب پولیس والوں نے کھنا کھٹ سلیوٹ کیے۔ افسر نے جواباً سر ہلایا اور میری طرف چلا آیا۔ اور غور سے میری طرف دیکھ کر بولا ”ہونہہ..... تو یہ ہے وہ لڑکا؟“ سلطان بابا نے کھنکھار کر ایس پی کو اپنی جانب متوجہ کیا ”کیا جرم کیا ہے عبداللہ میاں نے..... آپ نے اسے جھٹکڑیاں کیوں لگا رکھی ہیں؟“ افسر نے غور سے سلطان بابا کو دیکھا ”یہ آپ کا بیٹا ہے؟“ ”بیٹے سے کچھ بڑھ کر ہی ہے میاں..... رشتے صرف خون کے ہی تو نہیں ہوتے۔“ ایس پی نے غور سے بابا کو دیکھا ”خوب..... اور آپ کون ہیں؟“ ”ہم دونوں ہی مسافر ہیں۔ ایک ہی راستے کے۔ فی الحال چند دن کے لیے پہاڑی ٹیلے کی اوپر والی مسجد میں بیہرا ہے، پھر آگے بڑھ جائیں گے میاں۔“ افسر نے گہری سانس لی ”لیکن فی الحال شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ اس لڑکے پر خون کا شک ہے، ہمیں۔ بظاہر دکھائی دینے والے تمام شواہد بھی اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔ ہاں، البتہ آپ میری قسلی کے لیے صرف اتنا بتادیں کہ آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ لوگ اوپر والی مسجد کے حجرے میں مقیم ہیں تو پھر یہ لڑکا اتنی صبح سویرے یہاں ساحل پر کیا کر رہا تھا؟“ سلطان بابا نے لمبا سانس لیا ”میں نہیں جانتا، کیوں کہ میں رات کو عبداللہ کو حجرے ہی میں سوتا چھوڑ گیا تھا۔“ ایس پی نے چونک کر سلطان بابا کو دیکھا ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مشکل مرحلے پر بھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا، لیکن آپ کا یہ سچ عبداللہ کو ہماری نظر میں مزید مشکوک بناتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ کسی اچھے وکیل سے رابطہ کر لیں۔“ پولیس افسر نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگوں کے درمیان سے مجھے دھکیلتے ہوئے پولیس کی جیپ کی طرف چل پڑے۔ مرتضیٰ صاحب تو اسے پریشان تھے کہ ان سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ میں نے چلتے ہوئے پلٹ کر سلطان بابا کو کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن میرے سامنے لفظ نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ بھیڑ میں کھڑے تعلیم صاحب کی نظریں مجھ سے ملیں اور مجھے لگا کہ ان کے اندر جانے کتنے طوفان اندر ہے ہیں، لیکن وہ پولیس کے ڈر سے کچھ بول نہیں پارہے۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے میری نظر آخری بار اس معصوم چہرے پر پڑی، جس کے قتل کا داغ اپنے ماتھے پر سجائے میں پولیس کے گھیرے میں ایک ان جانے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کیا میرا جنوں اب اپنی آخری حدیں بھی پار کرنے کو تھا۔ بسنی والے آپس میں چہ گونیاں کر رہے تھے۔ ریت اڑاتی جیپ مجھے لیے تیزی سے ساحل سے دور ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں سارا منظر دھندلا گیا۔

تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے بعد ایک خستہ حال سی پرانی عمارت نظر آئی، جس پر برسوں پہلے کیا گیا پیلارنگ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔ عمارت کے گیٹ پر پرانے سے ٹین کا ایک زنگ آلود پورڈھول رہا تھا، جس پر لکھے لفظ بغور دیکھنے پر بھی بمشکل نظر آتے تھے، میں صرف اتنا ہی پڑھ پایا ”پولیس تھانہ، تحصیل

مائی“ اور تب تک جیپ تھانے کے پچانک سے اندر داخل ہوگئی۔ ایس پی کے وقوع پر پہنچنے سے پہلے، جس تھانے دار نے مجھ سے بات کی تھی، وہ یہاں کا ایس ایچ اوتھا، مجھے تھانے دار کے کمرے میں لے جا کر دیوار کے قریب کھڑا رہنے کو کہا گیا۔ پتا چلا کہ ایس پی صاحب ہیڈ کوارٹر یعنی شہر والے دفتر میں بیٹھتے ہیں اور یہاں صرف اس قتل کی اطلاع پر پہنچے ہیں، کیوں کہ مرنے والی شاید خود بہت اہم تھی یا پھر اس کا تعلق شہر کے بہت اہم لوگوں سے تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسے مقدمات خود تھانے دار ہی پنہا دیا کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں اس تمام واقعے کے دوران ذہنی طور پر بالکل سُن اور یوں بے فکر اور لاتعلقی سا تھا، جیسے پولیس قتل کے الزام میں مجھے نہیں، کسی بے گانے کو پکڑ کر تھانے لائی ہے اور میں کسی فلم کے پردے پر یہ سب مناظر دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ایس پی صاحب بھی کمرے میں آگئے اور تھانے دار اور چند مؤدب حوالداران کے آس پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پہلی بار ایس پی کے سینے پر لگی چھوٹی سی نام کی تختی پڑھی۔ ان کا نام رحمن تھا۔ ایس پی نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیہ میں سے ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں داب کر ماحس کے لیے نظر دوڑائی۔ تھانے دار نے جلدی سے بڑھ کر سگریٹ سلگا دیا۔ انہوں نے ایک زوردار کش لے کر دھوئیں کا مرغولہ فضا میں بکھیرا اور دھوئیں کی اس نیلگوں چادر سے پرے اپنی گھورتی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ ”ہونہہ..... تو عبداللہ نام ہے تمہارا، اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟“ میں نے مختصر اُنہیں تفصیل بتائی۔ ”کتنا پڑے لکھے ہو؟ میرا مطلب ہے مدر سے کی کون سی سند تک پڑھا ہے تم نے اب تک؟“ ”جی مدر سے کی تو کوئی سند نہیں ہے میرے پاس۔ ابھی کچا طالب علم ہوں.....“ ”میرا جواب سن کر انہیں ذرا حیرت ہوئی، کیوں کہ شاید میری صاف گفتگو سے وہ مجھے دین کا بہت پرانا طالب سمجھ بیٹھے تھے۔“ ”اچھا یہ بتاؤ تم رات کو ساحل پر کیا کرنے گئے تھے، جس لڑکی کی لاش کے پاس تمہارے قدموں کے نشان ملے ہیں، تم نے اسے پہلی بار کب دیکھا تھا؟“ ”میں نے پہلی بار اسے آج صبح ہی دیکھا ہے، جب چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں رات اپنے بچہ سے ساحل تک کیسے پہنچا اور میرے قدموں کے نشان ریت پر کیسے رہ گئے؟“ تھانے دار سے صبر نہیں ہو سکا اور وہ کڑک کر بولا ”کیوں، کیا تم کو نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ سیدھی طرح سے بتاتے ہو یا پھر؟“ ایس پی نے ہاتھ اٹھا کر تھانے دار کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا ”دیکھو، میں نے ابھی تک روایتی پولیس والے حربوں سے خود کو روک رکھا ہے۔ دراصل مجھے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا انتظار ہے۔ شام تک شہر سے رپورٹ آجائے تو میں کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا، لیکن تب تک تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ بعد میں اگر مجھے یہ پتا چلا کہ تم نے کوئی غلط بیانی کی ہے، تو تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔“ ”میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا..... نہ ہی مستقبل میں میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ آپ اپنی تفتیش مکمل کریں۔ اگر میں گناہ گار ہوں، تو بھی آپ کے اختیار میں ہوں۔ جو سزا مقرر ہوگی، مجھے قبول ہے۔“ رحمن صاحب کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نہ جانے کیا تلاش کرتے رہے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ اصل پولیس والے کی نظر کس قدر گہری اور کتنی چھیتی ہوئی ہوتی ہے۔ تب ہی تو انہیں آنکھوں کے راستے روح میں جھانک لینے کا فن آتا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی نے آکر بتایا کہ بستی کے چند بزرگ اور حکیم صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایس پی نے انہیں دوسرے کمرے میں بٹھالے گا کہا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کا حکم دے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صرف ایک سپاہی کو میری نگرانی پر مامور رہنے دیا گیا، البتہ میرے ہاتھ اب بھی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں شل ہونے لگے۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی، پھر اچانک وہی لاوا میرے خون میں پھوٹا اور میری نسون میں چند گاریاں بھر گیا، سپاہی نے پہلے حیرت سے میری پھولتی سانسوں اور بگڑتی حالت کو دیکھا اور پھر مجھے ڈولتا دیکھ کر وہ باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والی پہلی دیوار پر کچھ عجیب سے عفریت نما سائے ابھر کر میری جانب بڑھ رہے ہوں اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جانے کتنی صدیوں بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو حکیم صاحب دھیرے دھیرے میرے گال تھپتھپا رہے تھے۔ میں اس وقت حوالات کے سنگی سل نما چوترے پر لیٹا ہوا تھا اور میرے آس پاس سلطان بابا کے علاوہ، ایک ڈاکٹر اور ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ حوالات کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آتی دھوپ کے زاویے اور کندن رنگت سے پتا چل رہا تھا کہ سورج ڈھلنے کو ہے۔ گویا میری زندگی سے پھر چند گھنٹے کچھ اس طرح سے دبے پاؤں نکل گئے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہو سکی۔ سلطان بابا نے مجھے بتایا تھا کہ روز قیامت جب ہم دوبارہ جگائے جائیں گے، تو ہمیں یوں لگے گا، جیسے ہم صرف دو گھڑی کی زندگی پتا کر آخر تک پہنچے ہیں۔ پچھلے چند دنوں سے میری زندگی کے کئی طویل گھنٹے بھی یونہی دوپہل کی طرح میری بے ہوشی کے دوران بیت جاتے تھے اور جب میں دوبارہ حواس میں آتا تھا، تو مجھے بالکل اسی طرح محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے ابھی دوپہل کے لیے ہی آنکھیں موندی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔“ میں اٹھ بیٹھا ”بہتر ہوں۔ بس سر میں شدید درد ہے۔“ ”ہوں..... تمہارا بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک بلند ہو گیا تھا۔ بلڈ پریشر سمجھتے ہو۔ فشار خون، خون کا دباؤ،“ ”جی سمجھ گیا.....“ رحمن صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ حسب معمول ان کی انگلیوں کے درمیان سلگ سلگ کر راکھ ہو رہا تھا۔ ”تمہیں یہ بیماری کب سے ہے.....؟“ میں نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا، کیوں کہ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بیماری کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری نبض تھامی ”ٹینٹنس (Tetnes) کا علاج تو بروقت ہوا لگتا ہے۔ ٹیکوں کے نشان تو ابھی تک واضح ہیں۔ خدا کرے کہ یہ میرے خدشات کے مطابق Rebbies رہیں۔“ ”کیس نہ ہو، لیکن علامات تو سبھی موجود ہیں۔“ حکیم صاحب نے کچھ کہنے کی کوشش کی ”جناب یہ بچوں کا قصہ ہے۔ میرا مطلب ہے، ہماری طب کی زبان میں اسے ”سگ گزیدگی“ بھی کہتے ہیں۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے، تو انسان اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ کسی نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور اسے ہولے دکھائی دینے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اس کی یادداشت کی سلیٹ مٹ جاتی ہے۔ یعنی کہ.....“ ڈاکٹر کو حکیم کی یہ فاضلانہ تقریر شاید کچھ پسند نہیں آئی، وہ ہاتھ جھٹک کر بولا ”ہاں ہاں..... یہی ساری علامات ہوتی ہیں رہیز کی بھی، لیکن میں نے آج تک رہیز کے مریض کو زندہ نہ دیکھا، جب کہ یہ نوجوان تو بائیس روز گزر جانے کے باوجود چل پھر رہا ہے۔“ بحث طول پکڑنے لگی تو ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ انہوں نے ذرا سخت لہجے میں دونوں کو تنبیہ کی کہ میرے خون کے نمونے شہر کی لیبارٹری کو بھیجا دیے گئے ہیں، لہذا اب رپورٹ آنے ہی پر کوئی رائے دی جاسکتی ہے۔ اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید طب اور جدید میڈیسن (Elopathy) ٹرین کی دوا یہی پٹریاں ہیں، جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جن کی منزل بھی ایک ہوتی ہے، لیکن وہ کبھی مل نہیں پاتیں۔ سلطان بابا اس سارے عرصے میں چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے۔ حوالات میں اندھیرا ہونے لگا تو ایک سنتری نے بیرونی

طاق میں رکھا دیا جلا دیا، جو سلاخوں سے پرے اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کی روشنی تو حوالا تک پہنچ رہی تھی، لیکن وہ قیدی کی دست برد سے پرے رہتا تھا۔ کچھ دیر میں باقی لوگ باہر نکل گئے اور صرف میں اور سلاخوں کے پار بیٹھے سلطان بابا حوالا میں باقی رہ گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ان کی آواز کچھ بھڑائی ہوئی سی تھی۔ ”یہ کیسا مقدر لکھا کر لائے ہو میاں..... کبھی کبھی تو میں خود بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی مستقل جنوں ہی تمہاری تقدیر نہ ہو۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا ”آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ دیوانے سے کوئی پُرسش نہیں، تو پھر دیوانگی تو نعت ہوئی نا۔ اس فرزاگی کے عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔ بس، یہ دعا کریں کہ میری یہ دیوانگی، یہ جنوں کسی کے لیے باعث نقصان نہ ہو۔“ اتنے میں سپاہی نے آنکر اطلاع دی کہ قیدی کو باقاعدہ ”لاک اپ“ میں بند کرنے کا وقت ہو گیا ہے، لہذا ملاقات ختم کی جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس خستہ حوالا کی سلاخوں پر بڑا سالو ہے کا تالا ڈال کر اور دروازے کو مقفل کر کے اسے ”لاک اپ“ بنا دیا گیا۔ سلطان بابا کو میں نے بمشکل بستی واپس جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ وہیں تھا نہ کے آس پاس رات گزارنے کی دھن میں تھے۔ ایس پی صاحب کی مہربانی سے مجھے وہ کھانا کھانے کی اجازت دے دی گئی، جو مرضی صاحب اپنے گھر سے بنا کر لائے تھے، تھانے دار نے مجھے بتایا کہ رحمن صاحب واپس شہر جا چکے ہیں اور اب وہ کل صبح آئیں گے اور کل صبح ہی مجھے ریمانڈ کے لیے باقاعدہ کسی عدالت کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ تھانے میں اب باقاعدہ مجھے مریض سمجھ لیا گیا تھا، لہذا عملے کا رویہ صبح سے کافی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر میں صرف رات کی ڈیوٹی والے تین چار سپاہی تھانے میں باقی رہ گئے اور عمارت سنان ہو گئی۔ بس میں، میرے جنوں اور یہ تاریک قفس باقی رہ گئے۔ کس سے گلہ کرتا کہ جنوں کا تو واسطہ ہی مداسے قفس سے تھا۔ میں تو وہ بد نصیب دیوانہ تھا، جو نا صبح کو اپنے ناخن بڑھ جانے کی دھمائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کھسک کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی اور صبح سے ہوتے اب تک کے واقعات کا از سر نو جائزہ لینے لگا۔ اب تک کی کڑیاں کچھ یوں جڑتی تھیں کہ کال گڑھ کے بے زبان دشمنوں کا زہر میرے خون میں شامل ہو کر اسے بھی زہر کر چکا تھا اور اب میرے اندر انہی بیجیل یوں کی زندگی اور وحشت خون بن کر دوڑ رہی تھی، جو مجھے دن کے کسی لمحے میں خود سے ریگ نہ کر سکتی تھی۔ پہلی رات فجر کے بعد مجھ پر جنوں کا پہلا طویل دورہ پڑا، لیکن اس وقت خوش قسمتی سے میں حجرے میں سلطان بابا کے سامنے ہی موجود تھا، لہذا فوراً حکیم صاحب کو بلوایا گیا اور ان کی میرے حلق میں پچائی گئی دوائے شاید میرا کچھ محرم رکھ لیا، لیکن دوسری رات میرا جنوں مجھے گھسیٹ کر مسجد سے باہر لے آیا۔ نہ جانے وہ مصلوم کون تھی، جو مصلیٰ پر لاش کی صورت موجود تھی اور کون جانے کہ واقعی وہ میرے ہی ہاتھوں اس حال کو پہنچی ہو، کیوں کہ مجھے نہ تو کچھ یاد رہتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں، میں خود اپنے قابو میں ہوتا تھا، لیکن وہ کون تھی، چہرے اور لباس سے تو پڑھی لکھی اور کسی بڑے گھر کی دکھائی دے رہی تھی، پھر اتنی رات کو اس ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی؟ اور اگر میں نے ہی اس کی جان لی تھی تو کیا وہ وہاں تنہا آئی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے سوالوں کے منہ لیے تھے، جو مجھے رات بھر ذہن سے رہے۔

رات پل پل کر کے سرکتی رہی اور کھلے روشن دان سے ریت کے ذرے اڑاڑ کے میرے چہرے، ماتھے اور سر پر گل پاشی کرتے رہے۔ ہاں سچ ہے، دیوانوں کے لیے تو یہ خاک بھی گل جیسی ہوتی ہے اور جو جنوں جس قدر خاک آلود ہو، اتنا ہی گل زار ہوتا ہے۔ فجر کے بعد ایک سنتری چھوٹی سی چیونٹک میں چائے اور صلور کی ایک چھوٹی سی گلاس لیے نمودار ہوا۔ ”لے بھئی مولوی، چائے پی لے..... بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ خون تیرے ہاتھوں ہوا ہے، لیکن باقی سب کہتے ہیں کہ تجھے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اسی دورے کے دوران تو نے اس لڑکی کی جان لی لی..... اب اللہ جانے سچ کیا ہے.....؟“ میں نے سنتری سے پوچھا ”وہ لڑکی کون تھی، جس کے قتل کا الزام میرے سر ہے؟“ سنتری جو خود بھی میرے سامنے سلاخوں کے پار اسٹول پر چائے کا دوسرا گلاس لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ”کیا بھلا سنا نام تھا اس بے چاری کا..... ہاں..... لیلی..... یہی نام تھا، سنا ہے کسی بہت بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اسی کے مالک ریحان کی منگیتر بھی تھی، ویسے ریحان کا نام یہاں سبھی جانتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا سب سے بڑا رئیس ہے۔ وہاں شہر میں اس کی بیسیوں فیکٹریاں ہیں اور وہ خود بھی شہر میں اپنے محل نما بنگلے میں رہتا ہے۔ گورنر اور وزیر اس کے ہاں شام کی چائے پر دعوت ملنا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ تبھی تو ہمارے ایس پی صاحب بھی اطلاع ملتے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس لڑکی کے قتل نے جانے کتنوں کی نیندیں اڑا دی ہیں۔“ میں نے سنتری کو ٹولا ”لیکن وہ شہر سے اتنی دور ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی، وہ بھی تنہا۔“ ”پتا نہیں، سنا ہے اس کی اور ریحان صاحب کی شادی میں بس تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں نے پہلے بھی ان دونوں کو سائل پر گھومتے دیکھا تھا۔ شاید شو شرابے اور رش سے گھبرا کر چلے آتے ہوں۔“ سنتری کی بات سننے ہی میرے ذہن میں اشرف کی بات گونجی۔ اس نے بھی تو کسی میم صاحبہ اور صاحب کا ذکر کیا تھا، جو وہاں اکثر آتے جاتے تھے اور جس نے ننھے اشرف کو چنگ بھی اڑانے کے لیے دی تھی۔ کہیں یہ وہی صاحبہ اور میم صاحبہ تو نہیں۔ سنتری نے بات جاری رکھی۔ ”ویسے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کل شام ہی یہ پتا چل گیا تھا کہ لڑکی کی موت بلندی سے نیچے گرنے سے ہوئی ہے، لیکن اس کے گلے پر بھی خراشیں ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ اوپر پہاڑی پر کسی نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور شاید اسی دھینگا مشتی میں وہ نیچے گر گئی یا پھر اسے دھکا دے دیا گیا۔ بہر حال، جو بھی ہوا، بہت برا ہوا۔ اس بے چاری نے تو شاید اپنی سہاگ کی مہندی بھی اپنے ہاتھوں میں رچانے کے لیے گیلی کر رکھی ہو۔ تین دن بعد ہی تو اس کی رخصتی تھی۔“ سنتری کی بات سن کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ کاش یہ جرم مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سنتری برتن اٹھا کر واپس جا چکا تھا۔ میرے چہرے پر بھی سلاخوں سے بھیج کر آتی دھوپ نے سلاخیں ہی بنا دیں تھیں۔ چہرے کی ہی کیا بات تھی، اس وقت تو خود میرے سارے وجود میں جانے ایسی کتنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر میں باہر کچھ پلچل ہوئی۔ شاید کچھ گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں بھی ابھریں اور کچھ لوگوں کی باتوں کی آواز آنے لگی۔ صبح سویرے جس سنتری نے مجھے چائے لا کر دی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا میری طرف آیا۔ ”چلو حافظ جی..... تمہاری ملاقات آئی ہے۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اگر بستی سے سلطان بابا یا کوئی اور ملنے آیا ہوتا تو اسے سیدھا حوالا کی طرف لایا جاتا۔ میں نے سنتری سے پوچھا ”مجھ سے ملنے کون آیا ہے؟“ سنتری نے حوالا کا تالا کھولا ”ریحان صاحب آئے ہیں۔“ میرے ذہن میں ایک چھٹکا ہوا ”ریحان..... اس لڑکی کا منگیتر.....؟“ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کوئی شخص نہیں ماسوٹ پہنے منہ موڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ کے باوجود اس نے پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا، میں ہلکے سے کھٹکارا۔ ریحان نامی شخص دھیرے دھیرے پلٹا۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں اور میں اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔ (باقی آئندہ)

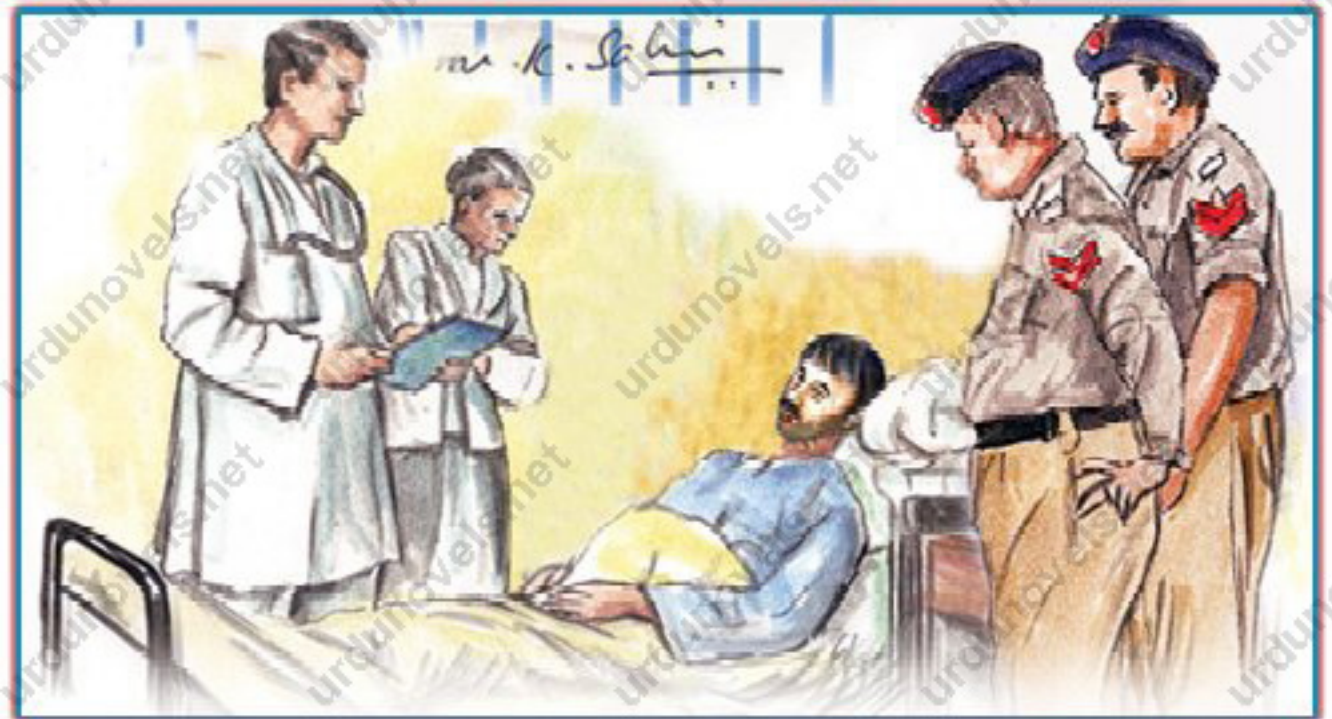
ایک خاک برسو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



.....ہاشم ندیم.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و معروف ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”منڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ مردے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے تجاویز عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز چھلے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بچیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سبب ناظر کے ساتھ..... آپ کی صوابت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ امی ٹیل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہراہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk



کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ میرے سامنے اس وقت وہ شخص کھڑا تھا، جس کی محبت کے قتل کا الزام میرے سر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے نفس اور سچے ہوئے لوگ تم ہی دیکھے تھے۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، ٹائی، لفٹنس، کوٹ اور پتلون کی گھنٹوں لگا کر نہایت سلیقے سے بنائی گئی کریر اور اپورٹڈ چمکتے ہوئے جوتے۔ کبھی میں بھی لندن کے چیرالڈز اسٹور سے اپنا ہر دوسرا پیرا بن خریدا کرتا تھا۔ اس وقت ریحان کے سرمئی سوٹ کی جیب پر بھی وہی مخصوص چھوٹا مونو گرام جگمگا رہا تھا، لیکن اس کا چہرہ اُسی قدر تار پک تھا۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ جس شخص کی محبت لئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں، اُسے اتنا نفیس لباس پہننے اور شیو بنانے کا دھیان بھی کیسے رہ سکتا ہے۔ ریحان کے ہاتھ میں ہونا کا ایک قیمتی سنگار تھا، جس کی میٹھی سی خوشبو کمرے میں چاروں طرف پھیلی چلی تھی۔ اس تمام تر اہتمام کے باوجود اس کی حالت ابتر لگ رہی تھی۔ ٹھین شیو چہرہ، جس پر انسائیت کی نازک سی جھلک دکھائی دیتی تھی، کسی قدر ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے بتا رہے تھے کہ وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا۔ وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ ”تو تم ہو عبداللہ.....؟“ میں چپ رہا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کسی اعصابی بیماری کا شکار ہو؟“ مجھے بھی یہی بتایا گیا ہے، لیکن اگر آپ یقین کر سکتے ہیں تو کم از کم اس بات پر یقین کر لیں کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور مجھے آپ کی منگیتر کی موت پر از حد دکھ ہوا ہے۔“ ریحان کچھ کھو یا کھو یا سا تھا، لگتا تھا، جیسے صدمے سے اس کے دماغ میں ابھی تک شل تھے۔ وہ اس طرح بولا، جیسے کوئی اپنے آپ سے بڑبڑاہٹ کرتا ہے۔ ”جسے جانا تھا، وہ تو تمہارا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ کس کے قصوں کا شاخسانہ ہے، اس بحث سے بھلا کیا حاصل۔ میری دنیا تو اب بڑبڑاتی ہے۔“

اسنے میں باہر کسی سرکاری جیپ کے ہوڑے کی آواز گونجی اور چند لمحوں کے بعد اس نے پی رٹن صاحب اپنے سر سے پولیس والی ٹوپی اتار دے ہوئے جلدی میں اندر داخل ہوئے ”معافی چاہتا ہوں ریحان صاحب..... راتے میں گاڑی کا انجن گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بڑبڑایا“ ریحان کا لہجہ بدستور دہیما تھا ”اٹس اوکے۔ آپ نے پیغام بھیجا تھا میرے لیے.....“ ”اوہ ہاں..... آپ کو زحمت دینے کے لیے معذرت۔ میں جانتا ہوں آپ اس وقت کس کرب سے گزر رہے ہیں، لیکن سرکاری فرانس کی ادائیگی کبھی کبھی ہٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دراصل آپ کو جائے وقوع پر ملی کچھ چیزیں دکھانی تھیں۔ ان کی شناخت اور پولیس کو مطلوب کچھ معلومات کے لیے آپ کو میرے ساتھ جائے واردات تک پہنچا دیا گیا“ ریحان اب قہانے دار کے کمرے میں پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ جس کی ادھوری جھلک میں یہاں حوالات کی سلاخوں سے دیکھ لگتا تھا۔ قہانے دار کے کمرے کا دروازہ نگری کی چوکت سے اُدھڑا ہوا تھا اور چونکے پر پڑی وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی۔ انہی ادھڑے قانون میں سے ایک مستطیل فائدہ مجھے اس وقت سامنے بیٹھے سنگار پیتے ریحان کے چہرے کی ناکھل جھلک دکھار رہا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ یونہی کھو یا کھو یا رہتا تھا یا پھر اس حادثے نے اس کی یہ حالت کر دی تھی۔ اس نے پی کی آواز گونجی ”آپ

کے خیال میں لیلی اتنی رات گئے اس ویرانے میں اکیلے کیوں گئی ہوگی؟“ وہ ہمارا پسندیدہ نگرہ کی مقام تھا۔ میں اور لیلی اکثر وہاں آتے تھے۔ لیلی کو پتہ نہ تھا کہ بہت شوق تھا اور شہر کی گھبراہٹ اور جھوم میں یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہذا ہم اکثر چھٹی منانے وہاں چلے جاتے تھے۔ کبھی نے لیلی کو اپنی گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ ہو سکتا ہے دل گھبرا یا ہو، تو وہ اکیلی ہی اس جانب نکل گئی ہو۔ پہلے بھی جب ہمیں مخالف سمتوں سے یہاں پہنچنا ہوتا تھا، تو میں لیلی کو کہہ دیتا تھا اور وہ بہ آسانی وہاں تک آ جاتی تھی، البتہ رات کو تنہا آنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ ”رہمن صاحب نے ہنگامہ بھرا“ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ واردات کے مقام پر ہمیں بہ یک وقت دو گاڑیوں کے نازروں کے نشانات ملے ہیں۔ پہلی گاڑی تو وہی لیکسز (Lexus) ہے، جو لیلی کے استعمال میں تھی اور چائے واردات ہی پر کھڑی تھی، لیکن وہاں ایک دوسری گاڑی بھی آئی ضرور تھی، جس کے داہیں جانے کے نشانات بھی پکی سرک تک ملے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی کار یا جیپ بھی ہو سکتی ہے۔ ”رہمن صاحب کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے“ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، لیلی کی کسی دوست یا جاننے والے کے پاس کوئی چھوٹی گاڑی نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ چھوٹی گاڑی بھی اسی شام وہاں آئی ہو، لیکن لیلی کی گاڑی آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہو۔ وہ ایک سفر کی مقام بھی ہے اور شہر کے لوگ ہوا خوری کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں۔ کئی بار جب میں اور لیلی وہاں آتے تھے، تو ہم سے پہلے ہی کوئی خاندان، کوئی جوڑا یا منگنے لگا جوان وہاں ٹنک مناتے ہوئے ملتے تھے۔ ایسی صورت میں ہم آگے بڑھ جاتے تھے۔ ”رہمن صاحب نے بھی اپنا مگر پیٹ سلگایا۔“ ہاں..... ہم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ شاید وہ چھوٹی گاڑی لیلی کی گاڑی سے پہلے وہاں سے چلی گئی ہو۔ پھر اعلیٰ سٹی والوں کے بیانات سے رہا ہے، لیکن بد قسمتی سے ایک تو وہ پوائنٹ ہستی سے کچھ فاصلے پر ہے اور پھر ایسی جگہ ہے کہ وہاں عموماً لوگوں کی نظر نہیں پاتی۔ پھر اس ہستی کے لوگ سیر شام ہی خود کو گھروں میں بند کر لینے اور عشاء کے نور ابد سوجانے کے بھی عادی ہیں، جب کہ لیلی کی موت کا وقت رات بارہ بجے کے بعد کا ہے۔ بہر حال، فی الحال تو تمام اشارے اسی نو جوان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو پہلے ہی ہماری حراست میں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے۔“

رہمن صاحب اور رہمن صاحب کے باہر الگ۔ رہمن صاحب کی نظر مجھ سے ملی، مجھے اس جوانی رعنائی کے جھلے اور ضبط پر اس لمبے بے حد رنگ آ یا۔ جانے اس کے اندر اس وقت کتنے طوفان کھل رہے ہوں گے، لیکن چہرے پر مسند و بیجا سکوت طاری تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں چلنا ہی تھا کہ باہر ایک دم شور مچا اٹھا اور پانی ایک ملک نما مجذوب شخص کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لانے اور اسے بھی حوالات میں دھکیل کر بند کر دیا۔ ملک غصے میں اول فول بکنا رہا اور پانی اپنی بولی بولنے لگے۔ پتا چلا کہ ملک اس سے پہلے بھی لوگوں کو اینٹ یا پتھر مار کر ڈھکی کر چکا تھا، لیکن اسے ہماز چھوٹ کے بعد پھوڑ دیا جاتا تھا، پر آج تو اس نے سد ہی گڑھی اور پتھر مار مار کر سارے علاقے کے گھروں کے شیشے توڑ ڈالے۔ تھانے دار، ایس پی صاحب کے ساتھ چائے واردات کی طرف نکل چکا تھا۔ لہذا ملے پایا کہ اس کی واپسی تک ملک کو حوالات ہی میں قید رکھا جائے۔ مجذوب بکنا جھٹکا وہیں سلاخوں کے پاس پندرہ گزی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ملک کو ایک ہولناک سا لگا۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے.....؟“ میں گڑبڑا ہوا ”کیا“ میں..... میں بھی قیدی ہوں“ ملک نے زور کا قہقہہ لگا دیا۔ ”قیدی..... ہونہ..... تو صرف اپنی خواہشوں کا قیدی ہے۔ یہ سلاخیں تو تو نے خود اپنی قسمت میں کھسوا دی ہیں۔“ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے قبل پولیس والوں کو نے ری گا لیاں دیئے والا مجذوب اس وقت بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ اسے میں چائے والا سنتری سلاخوں کے پاس سے گزرا اور فیس کر بولا ”اس کی باتوں میں نہ آنا عبداللہ۔ یہ تو ہے ہی سدا کا بھنوں۔ گھڑی میں تو لہ اور گھڑی میں ماش۔“ کتنی عجیب بات تھی، اس وقت حوالات میں وہی قیدی بند تھے، ان میں سے ایک بھنوں تھا اور دوسرا بوانہ۔ دفعتاً ملک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا بالکل سیرے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور براہ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ”یہ تو مجھے کسی غوثی کی آنکھیں لگتی ہیں۔ سچ بتا، تم کا غوثی کر کے آیا ہے یہاں.....“ میں زور سے چوٹا۔ گویا اس ملک کو بھی میرے لسانے کی خبر ہو چکی تھی۔ اچانک ملک نے زور سے سیرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کی بتا..... کیوں مارا اُسے..... تو اور اتنے غوثی کرے گا.....؟“ میں پُپ رہا۔ ملک بالکل ہی غوثی ہو گیا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے..... یوں در بدر بھٹنے سے تو اُسے پالے گا۔ نہیں، کبھی نہیں..... میرا مطلب یہی ہے سدا کی در بدری ہے۔ تو یونہی سر پک پک کر مر جائے گا، لیکن جب تک اپنے من میں نہیں بھانکے گا، تب تک میرا یہ سطر بھی شتم نہیں ہوگا۔ کبھی یہ سلاخیں تیرا مقدر نہیں گئی اور کبھی بنوں۔ کبھی کتنے تجھ پر ٹھیکیں گے اور کبھی انسان تجھے بھنوں گے۔ ترس آتا ہے مجھے تجھ پر۔ عورت کا عشق تو بھانپنا نہیں پایا۔ اُس کے عشق کی گرد بھی کیا پائے گا۔ صرف نام ہی عبداللہ رکھ لیا ہے۔ نکل کوڑی بھر کا بھی نہیں۔“ مجذوب نہ جانے کیا دھمکے جا رہا تھا اور میرے اندر بہ نیک وقت نہ جانے کتنی آنکھیاں، کتنے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ملک ضرور میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مجھے کلم مُسم بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے چلایا ”تو ایسے نہیں مانے گا..... نہ مان..... کھاتا رہے در بدر کی شو کریں۔ ایک روز یونہی سولی پڑھ جائے گا۔ نہ ہی عورت تیرے ہاتھ آنے کی اور اللہ! ملک مجھ سے روٹھ کر دو بارہ دور سلاخوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ہونٹ پیسے ہی لیے۔ میری حالت پھر سے بگڑنے لگی۔ وہی پٹکار پان میرے دماغ سے نکلیں اور میرے مارے جسم کو جھلسا گئیں۔ سامنے بیٹھا مجذوب ایک بھیڑیے کی شکل اختیار کر کے مجھ پر لپکا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلنے لگی اور میں نے اس حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔

مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ میں کسی اسپتال کی چار دیواری میں تھا اور اس پاس بہت سے ڈاکٹر مختلف آلات لیے میرا سناٹہ کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں کھول کر دیکھ کر سب ہی نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ”تم ٹھیک تو ہو.....؟ تمہیں بخار تو نہیں رہتا ہر وقت۔“ ”تھکن تو محسوس نہیں ہوتی۔“ سر میں دھماکے سے ہوتے ہیں؟ سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ کھانا ٹھیک سے اٹھا جاتا ہے کہ نہیں.....؟ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تو نہیں پڑ جاتے اچانک؟“ میں نے بہ مشکل اپنی کیفیت بیان کی کہ میں اس دورے کے دوران اپنے حواس ہی میں کب ہوتا ہوں، جو اتنا کچھ یاد رکھ سکوں، پھر ایک سینئر ڈاکٹر نے نو جوان ڈاکٹروں کو ڈانٹا اور کمرے کی روشنیاں بند کر کے کوٹھا۔ پھر وہ دیر دیر سے مجھ سے بات کرنے لگا، لیکن اس کی باتوں کا دائرہ بھی اچانک دکھائی دینے والے ہیروں، بے یقینی، بر تشدد و بے اور فلاح کی کلیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اسے میں باہر سے کسی چیز اسی نے آ کر بتایا کہ ایس پی رہمن پوچھ رہے ہیں کہ کیا قیدی کو آج جیل وارڈ ہی میں رات گزارنی ہوگی یا وہ اسے واپس جیل لے جاسکتے ہیں۔ سینئر ڈاکٹر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی راہداری سے موٹر ان کے کمرے تک پہنچ گئے۔ جہاں پہلے سے رہمن صاحب تھانے دار سمیت ہمارے منتظر تھے، ڈاکٹر نے مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن میں کھڑی ہی رہا۔ قید کے اپنے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاید بات صرف قیدی یا قیدی ہونے کی تھی ہی نہیں۔ یہ قواعد و ضوابط ہی تو ہیں، جو ہمیں ہر جگہ قیدی بنائے رکھتے ہیں۔ روسو نے سچ ہی کہا تھا کہ ”ہم بظاہر آزاد پیدا ہوتے ہیں لیکن تمام عمر ان دیکھی ذخیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔“ رہمن صاحب نے ڈاکٹر سے میری بیماری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی میں بولنے ”ظاہر عجیب سی بات لگتی ہے، لیکن سانس اور ایلو شمی کی دنیا میں ہر دن ایک نئی کھوپڑی کا دن ہوتا ہے۔ ہم روزانہ ہیکڑوں پرانی بیماریوں کا علاج دریافت کرتے ہیں، تو ہر پل کوئی نئی بیماری ایک نیا چیلنج

بن کر ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور بیماری بھی کیا، یہ تو دراصل ہمارے خون میں موجود مختلف مرکبات اور مادوں کی ترتیب بگڑنے کا ایک نام ہے۔ ساری زندگی، یہ دنیا اور یہ ساری کائنات ایک ترتیب ہی کا تو مظہر ہے۔ انسانی جسم کے اندر ہمہ وقت ایک بے حد پیچیدہ نظام ایک خاص ترتیب میں چل رہا ہے، جس میں اس نظام کے تحت بننے والے مادوں کی مدت، اوقات اور بناوٹ خود بھی ایک خاص ترتیب اور نظام کے تحت ہوتی ہے۔ ان مادوں میں کسی بھی چیز کی کمی بیشی یا ملاوٹ ایسی ہی کسی حالت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، جسے ہم اپنی زبان میں بیماری کہتے ہیں۔ اس نوجوان کے خون میں بننے والے مادوں میں بھی حیران کن طور پر چند ایسے ذرے ہر یکے مرکب شامل ملے ہیں، جو عام طور پر کسی دندے کے خون میں ملتے ہیں۔ اسے کتے کے کانے کی مکمل ویکسین بھی ماضی قریب میں دی جا چکی ہے۔ انٹینٹینس ٹیکے بھی لگ چکے ہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے یہ کیسا اثر ہے، جواب تک باقی ہے۔ میرے لیے یہ میڈیکل ہسٹری میں ایک نئی دریافت ہے۔..... اسے ریسیز بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی یہ بار بار کے دورے خطرناک علامت ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر جلد ہی ہم اس بیماری کی تہہ تک نہیں پہنچے، تو اس نوجوان کا اعصابی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ فالج یا پھر مکمل دیوانگی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ “میرے ذہن میں فوراً مانگ کی دھمکی گونجی کہ نہ مجھے خدا ملے گا نہ وصال منم..... میں بے اختیار ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا “میرے پاس کتنا وقت باقی ہے ڈاکٹر صاحب.....؟“ ڈاکٹر سمیت رحمن صاحب اور تھانے دار بھی اُچھل پڑے۔ سینئر ڈاکٹر نے یہ ساری گفتگو انگریزی میں شاید اس لیے کی تھی کہ وہ مریشل کے سامنے مرض کی نوعیت بتا کر اُسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن میرا سوال سن کر ان تینوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ میں یہ ساری گفتگو سمجھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر انگریزی میں پوچھا “تم انگریزی جانتے ہو؟“ میں نے اردو میں جواب دیا “جی کچھ شدہ بدھ ہے، اس زبان سے میری۔ آپ براہ مہربانی میرے سوال کا جواب دیں۔ مکمل پاگل پن میں اور کتنا عرصہ باقی ہے میرے پاس.....؟“ رحمن صاحب غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا “دیکھو نوجوان..... ڈاکٹر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ تم جوان ہو، صحت مند ہو اور مجھے تمہارے معائنے کے دوران آج یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ تم بے پناہ قوت ارادی کے مالک ہو۔ مجھے یقین ہے میں اور تم مل کر اس بیماری کو بھی ہرا دیں گے۔ بس، اپنا یقین مت کھوئے دینا۔ آدھی جنگ یقین اور حوصلے سے جیتی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا، ریپنس.....“

ایک اچھے طبیب کی طرح سینئر ڈاکٹر میرا سوال نال غم سے اٹھوا۔ انہوں نے ایس بی صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، لیکن اب مجھے لگا تا معائنے کے لیے شہر کے اس بڑے اسپتال میں لانا ہوگا۔ ہم اسپتال سے باہر نکلے تو جیپ کے قریب کھڑے دو سپاہی جلدی سے ہتھکڑی لے کر میری جانب لپکے، لیکن رحمن صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا “نہیں..... اس کی ضرورت نہیں..... عبداللہ کو میں اپنی گاڑی میں تھانے لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ تھانے دار صاحب کے ساتھ ہماری گاڑی کے پیچھے چلے رہو۔“ حوالدار نے کھٹ سے سیلوٹ کر کے سر ہلایا “بہتر ہٹاؤ.....“ اور رحمن صاحب مجھے لیے اپنی سرکاری جیپ کی جانب بڑھ گئے۔ اسپتال سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ساحلی شہر بھی میرے شہر کی طرح وسیع اور جدید تھا۔ شاید ساحل پر بسنے والے شہروں میں بہت سی مماثلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم جنگلات سے شہر کو چھوڑ کر مضامات میں نکل آئے۔ ہمارے داخلی جانب کچھ فاصلے پر سمندر تھا جس کا رنگ سبز کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ شاید یہی ساحلی سڑک سیدھی “خصیل ماہی“ کے تھانے تک جاتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ مریشلی صاحب نے شہر سے باقی کا فاصلہ تقریباً 30 کلومیٹر بتایا تھا۔ رحمن صاحب خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور ان کا ڈرائیو گارڈ جیپ کے پیچھے کھلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی نشست پر گم صم بیٹھا، اندھیرے میں مندر کی سفید لہروں کو کناروں سے ٹکرا کر فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر آغاز کا انجام “فنا“ ہی تو ہے۔ میری کہانی بھی خاتمے کے قریب ہی تھی شاید۔ رحمن صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا۔ ڈرائیو نے جلدی سے لائٹ دکھا کر ان کا سگریٹ سلگا لیا اور دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھے بنا بولے “اس دن جب میں نے تم سے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھا تھا تو تم نے ٹھیک طرح سے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ آپ نے مدر سے کی سند کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے پاس واقعی مدر سے کی کوئی سند نہیں ہے۔“ رحمن صاحب ہنس پڑے۔ “اچھا تو اب بتادو، تمہارے پاس کون سی سند ہے؟“، “انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے میں نے.....“ وہ اُچھل ہی تو پڑے “واقعی..... تو پھر اتنا پڑھ لکھ کر ان ویرانوں کی خاک کیوں چھان رہے ہو، کوئی اچھی ملازمت کیوں نہیں کی تم نے۔“ میں نے بات نالنے کی غرض سے کہا “اسے بھی میری ایک ملازمت ہی سمجھیں۔ ملازمت صرف تنخواہ پانے کے لیے ہی تو نہیں کی جاتی۔“ رحمن صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنے لفظوں کے بے وقت چناؤ اور ان کے اس طرح اچانک زبان سے پھسل جانے پر خود پر شدید فحشہ آیا، لیکن تیرا ایک بار پھر کمان سے نکل چکا تھا۔ “خوب..... میں تو آج تک ملازمت کو صرف تنخواہ پانے کے ذرائع میں سے ایک سمجھتا رہا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ، لیکن اسے زبردستی ہرگز نہ سمجھنا۔ جی چاہے تو بتادو۔“، “میری گزارش ہے کہ یہ حکم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ فی الحال میں ایک ممکنہ مجرم کی حیثیت سے آپ کا قیدی ہوں اور میرا ذہن بہت الجھنوں پر مٹا ہوا ہے۔ مجھے اپنے رہنما بزرگ کی بھی فکر سٹائے جا رہی ہے۔ جانے وہ کیسے ہوں گے۔ ان کی طبیعت یہاں آنے سے پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“ رحمن صاحب نے دھواں اُگھا “وہ بزرگ بھی تمہاری طرح ادھوری باتیں کرتے ہیں۔ بہر حال اسپتال آنے سے پہلے میں ہستی میں ہی تھا تفتیش کے لیے۔ میری ان سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہارے بارے میں تسلی دی تھی انہیں۔“ میں نے نظر بھری نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ “فکریہ..... آپ ایک مختلف پولیس والے ہیں۔“ رحمن صاحب ہنس پڑے “یہ لقب ہے یا الزام..... چلو یہ بھی قبول ہے تم جانتے ہو، آج بستی کے ایک بچے نے ایسا بیان دیا ہے کہ اگر وہ بچہ ہوا تو پورے کس کا رخ ہی بدل جائے گا۔ تم جس مسجد میں مقیم ہو، وہاں کے پیش امام کے بیٹے نے پولیس کو بتایا ہے کہ اس نے قتل کی رات اسی پہاڑی ٹیلے پر ایک دوسری عورت کو بھی جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسری عورت کسی چھوٹی گاڑی میں سوار تھی، بچہ انہی چھوٹا ہے، اس لیے زیادہ جزئیات نہیں بتا سکا، لیکن اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنی میم صاحبہ کی گاڑی ٹیلے کی طرف باقی دیکھ کر بستی سے نکل کر اس جانب بھاگا تو اس نے راستے ہی میں اس دوسری گاڑی کو بھی اس ٹیلے کی جانب جاتے دیکھا، لیکن اُسی لمحے مسجد اس کے باپ نے نکل کر اسے آواز دے کر واپس بلا لیا اور ڈانٹا کہ وہ مغرب کے بعد اندھیرے میں گھر سے کیوں نکلا ہے۔ بچے نے باپ کے ڈر سے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی میم صاحب ٹیلے پر گئی ہیں اور ان کے پیچھے اُس نے ایک دوسری گاڑی بھی جاتے دیکھی ہے، جتنے کوئی اور عورت پلاری تھی۔ پیش امام صاحب بچے کو گھر لے آئے اور آج جب ہم بیانات لینے کے لیے گئے تو اس بات کا پتا چلا۔“ ایس بی صاحب ضرور اشرف کی بات کر رہے تھے، لیکن یہ دوسری عورت کون تھی؟ میں اور رحمن صاحب دونوں ہی اس سوچ میں گم تھے کہ حوالا کا گیت آ رہی ہے۔

ابھی میں ایس بی صاحب کے ساتھ گاڑی سے اتر کر تھانے کے برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ اندر سے تھانے کا محرر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ جلدی سے سیلوٹ کر کے بولا “جناب پورٹ مارٹم کی مکمل رپورٹ آگئی ہے رلڑکی کے چہرے، رشانے اور کمر پر جو کھر و فحشیں اور خراشیں آئی تھیں، وہ اس رپورٹ کے مطابق کسی درندے کے بچوں کے نشانات تھے۔“ محرر کی بات سن کر ماحول پر ایک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ رحمن صاحب نے یوں مایوسی سے میری جانب دیکھا، جیسے اُن کا کچھ دیر پہلے چلا امید کا چراغ، ایک جھوٹے ہی سے بیٹھ گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کے بچوں پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے نائنٹوں سے تازہ خون ٹپک رہا ہو۔

(باقی آئندہ)

اک خاکِ بحرِ نوبھوان کا قصہ..... جو خدا کو اپنی شہرِ رنگ سے کچھ دور تھلائے رہا تھا



.....ہمارے دوست

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”خندے سیکورین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمبہز“ بھی چھپنے کے بعد، نئی الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک سال پہلے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے اداکار کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر جگہ دن، حلقہ قلبی کی فنی فنی حواریں سر کرنے کا مرحلہ درجیش ہے۔ ناول کا خاکہ سب سے پہلے اُنہی اسرار و رموز کے گرد غامبیا ہے، جن سے عام زندگی میں نظر بچا ہوا انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ وہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سرایتی مجاہدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سبب ناخصل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے پرہیز راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ میں حوالات میں بیٹھا چھوٹے سے روشن دان کی تلک سلاخوں کی درز سے اپنے منہ کے چاند کو مستطیل ٹکڑوں میں ڈاٹھا دیکھ رہا تھا۔ کاش ان قید خانوں میں ایسے روشن دان ہٹائے جاتے، جہاں سے تم از کم مجھ جیسے سیاہ مقدر قیدی اپنے دوست، چاند تاروں سے تو ملاقات کر لیتے۔ کیا یہ قید پر سے نسیم کے ساتھ ساتھ ہماری نظر موج اور نظریہ کو بھی قید کرنے کا ایک مکمل انتظام ہوتی ہے۔ میں نے حوالات میں آتے ہی اپنے ہم در سنتری سے ملنگ کے بارے میں پوچھا۔ سنتری اسامیل فیس کر پولا۔ ”وہ پاگل مجنوں.....“ اسے تو شام ہی کو ایس بی صاحب نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ آئی شام جب ایس بی صاحب تھا نے آنے تو وہ بڑے ادب سے اُن سے بولا، ”جناب میرا کام یہاں ختم ہو گیا ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں کوچ کر جاؤں۔“ صاحب بہت حقے اور انہوں نے اسے آزاد کر دیا۔ ”میں مایوس ہو گیا۔ میں نے اسامیل سے درخواست کی کہ اسامیل..... تم میرا ایک کام کرو گے؟“ اسامیل جلدی سے بولا ”ہاں جی..... ضرور..... کیوں نہیں.....؟“ ”کیا تم کل صبح کنیس سے اس ملنگ کو یہاں بلوا سکتے ہو۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا، لیکن تب میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ کیا تم اسے مجھ سے ملوا سکتے ہو؟“ حافظ جی ایس کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو مدعا کا دیوانہ ہے۔ اس کی باتوں میں لگا آتا۔ میں نے سنتری کی منت کی کہ وہ یاد تو شاید میں بھی ہوں، تو کیا وہ ایک دیوانے کی ملاقات دوسرے دیوانے سے نہیں کروائے گا۔ جانے اس وقت میرا دل اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اسامیل ایک دم گھبرا سا گیا ”اے اے اے..... یہ کیا.....؟“ عبداللہ..... اے..... ایسے نہیں روتے..... تم تو بہت بہادر لڑکے ہو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ میں کل صبح اسے ضرور کنیس سے بھی تمہارے لیے ڈھونڈ کر نکال آؤں گا، چلو اب آنکھیں پونچھو۔“ وہ مجھے کسی بزرگ کی طرح دیر تک سمجھاتا رہا۔ چنانچہ کبھی کبھی ہم جی کھول کر رونا چاہتے ہیں، گو وہ ہی نسیم سے اتنی زیادہ دور کیوں ہوتا ہے، حقے بھگونے کے لیے ہمارے یہ آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ اس رات مجھے زہرہ کی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ میں نے دلی میں مہر کر لیا کہ کل صبح سلطان بابا سے کہہ کر زہرہ کو پیغام ضرور سمجھوں گا کہ وہ کسی بھی طرح یہاں آ کر مجھ سے ایک بار مل جائے۔ میں ایک بار اپنے مکمل ہوش و حواس میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ جانے پھر کبھی مکمل فرزندگی نصیب ہوگی یا نہیں۔ ڈاکٹر کی باتوں سے آج مجھے احساس ہو پلا تھا کہ میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں بار بار اس مہذب کی یہ ڈھن گونج گونج رہی تھی کہ ”نہ تو تجھے دنیا کا عشق نصیب ہوگا، اور نہ تو مالک کی محبت کا حق دار ٹھہرے گا۔“ چنانچہ میں نے اسے مہذب میرے اندر سے جیسے زندگی کی آخری رمق، امید کا آخری قطرہ بھی مچو ڈمر لے گیا تھا۔ کیا میرا یہ سفر یونہی لا حاصل ہی چلا جائے گا؟ کیا واقعی میرے حقے میں نہ تو عشق عبادی کی چنگاری آئے گی اور نہ ہی عشق مقبلی کی مکمل بھڑکتی آگ..... کیا میں یونہی خود بخود ادھر ادھر سر پٹک رہا تھا؟ انہی سوچوں میں نہ جانے کب صبح ہوگی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ایک بار پھر میرا پورا جسم جلنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو اپنا سر سلاخوں سے نکرانے سے روک رکھا، اور نہ میرے سر میں شدید درد کے جو دھماکے ہو رہے تھے، ان کا فوری حل مجھے بس یہی نظر آ رہا تھا کہ اپنا سر اس زور سے دیاں یا سلاخوں پر دے ماروں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس میں جو بھی مادہ، یا درد کا باعث ہے، وہ بہ جائے۔ جالے منتی دیر میں اپنے ہاتھ پاؤں یونہی تھکڑے بیخار ہاتھ کی کہ میری ہاتھ ہر کی انگلیاں ٹوٹ کر تقریباً چٹکی بن گئیں۔ اسی اثنا میں اسامیل جانے کے لیے حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ ٹھہرا گیا اور جلدی سے میری جانب دوڑا۔ ”عبداللہ..... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں.....“ میں نے پٹھن اپنے لب کھولے ”کچھ نہیں..... تم بس جا کر ناؤ سے ڈھونڈ لاؤ۔ اس سے پہلے کہ میرا ہوش جو اب دے جائے، تم اسے لے آؤ.....“ اسامیل اُلٹے پاؤں باہر بھاگا۔ میں نے تھپہ کر رکھا تھا کہ آج اس جنوں کو خود پر تب تک حاوی نہیں ہونے دوں گا، جب تک مجھے اپنے کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود اپنے ہی پاس اپنے دانت گاڑ دوں۔ جہڑے کی اسٹیشن نے مجھے اس قدر مجبور کیا کہ میں نے زمین پر ریٹ میں پڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا لیا اور اسے اپنے دانتوں کے درمیان اس زور سے جکڑ لیا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ کڑک سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کچھ ہی دیر میں اسامیل دوڑتا ہوا واپس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ بازار میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر تھک گیا، لیکن وہ مالک دوبارہ اسے کنیس نظر نہیں آیا، حالاں کہ وہ عام طور پر اسی بازار میں کسی مذہبی مکان یا ہوٹل کے باہر تھڑے یا چھوڑے پڑا نظر آتا تھا۔ آج تو لوگوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ میری حالت تب تک قدرے سنبھل گئی تھی، لیکن

میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا اور میں ہولے ہولے کاہن رہا تھا۔ شاید مجھے پھر سے بخار ہو رہا تھا۔ اسماعیل جلدی سے تھانے دار کے کمرے سے ایک موٹی سی کھیس نما چادر اٹھا لیا، جسے میں نے اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اسماعیل دکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ”یہ روگ کہاں سے لگا لیا، اپنی جوانی کو باہر..... ابھی تو تمہارے کھینے کھانے کے دن ہیں۔“ پھر اچانک ہی جیسے اُسے کوئی ضروری بات یاد آئی ”ارے ہاں، رات کو یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک بات یاد آئی، سوچا تھا صبح آکر تمہیں بتاؤں گا، پر یہاں پہنچے ہی تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔ وہ دیوانہ جب حوالات میں تمہاری طبیعت خراب ہونے کے بعد تمہارہ کیا تھا، تب بار بار تمہیں خیالوں میں غائب کر کے بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ ”اس سے کوئی مشرق کو دیکھے..... مشرق کو دیکھے۔“ جانے مشرق میں کیا ہے۔؟“ میں نے چونک کر اسماعیل کو دیکھا۔ حوالات کی سلاخیں اور دروازہ مغرب کی جانب کھلتے تھے۔ میں جہاں قید تھا، وہاں مشرق کی جانب صرف ایک سیٹ دیوار تھی اور اس میں پھونکا سا ہارون دان تھا اور بس۔ پھر بھی میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے دیوار کی جانب اس امید سے دیکھتا رہا کہ شاید مجھے وہاں کچھ نظر آجائے، لیکن سب بے سود ہی رہا۔

کچھ ہی دیر میں سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آگئے۔ سلطان بابا دو دن ہی میں برسوں کے بیمار اور مڑھال سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ابھی کال کڑھ والے حادثے سے ٹھیک طرح سنبھل نہیں پائے تھے کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ کاش ہم شیخ صاحب کے ہاں کچھ روز اور ٹھہر جاتے تو ان کی حالت بہتر ہو جاتی، لیکن یہ سب اگر ہمارے ہی بس میں ہوتا تو پھر یہ ”کاش“ لفظ ہماری لغت میں کہاں سے آتا؟ مرتضیٰ صاحب مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، لیکن سلطان بابا چپ چاپ بس میری جانب دیکھتے رہے۔ آخر کار وہ مجھے ہی ان سے پوچھنا پڑا ”آپ کچھ کہتے کیوں نہیں..... اس طرح چپ رہیں گے تو میں اور بھی پریشان ہو جاؤں گا۔ کچھ بات کیجیے۔“ ”کیا کہوں میاں..... سوچتا ہوں تمہارا یہ امتحان کب ختم ہوگا۔ اتنی کڑی آزمائش تو شاید ہی کسی نے جھیلی ہو۔ لگتا ہے اس بار خود مجھ سے بھی کوئی سراچہ مٹ رہا ہے۔ کچھ مجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے مختصر لفظوں میں انہیں ملک کی ساری بات بتا دی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکا کر بیٹھے رہے اور پھر گہری سانس لے کر بولے ”وہ اب شاید کسی کو دوبارہ نظر نہ آئے، اگر اس کا متعدد اشارہ دینا تھا، تو وہ دے کر چلا گیا۔ اس کا کام واقعی ختم ہوا۔“ میں چاہ کر بھی ان سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ اگر اس کی تنبیہ صحیح ثابت ہوئی، تو پھر انجام کیا ہوگا۔ میں نے دے لفظوں میں انہیں زہرہ کو پیغام بھیجے گا کہا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئے۔ اسے میں باہر لپٹ لپیٹی۔ پتا چلا کہ ایس بی صاحب شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور اب چند لمحوں میں ان کی آمد متوقع ہے۔ اس پھوٹے سے تھانے کے لیے بھی یہ ایک ان موٹی تھی۔ عام حالات میں ایس بی جیسا بڑا افسر شاید سال میں ایک آدھ بار ہی کسی معاہدے کے لیے یہاں آیا ہوگا، لیکن ریجان صاحب کے حکومت میں اثر و رسوخ کی وجہ سے اس تھانے کے درو دیوار کڑھتے تین دنوں سے یہ تمام گہما گہمی دیکھ رہے تھے۔ اہل کاروں کی مہینوں پرانی وزیوں کو روز کھف لگا کر چپکایا جا رہا تھا۔ تھانے کے درو دیوار اور احاطے کی صبح و شام دو بار صفائی ہو رہی تھی اور کچھ زیادہ صحت مند سنتری اپنی توند کو چھپانے کے لیے پلٹ کو اس کے آخری حلقے سے آگے کچھ نئے سوراخ کر کے اور پلٹ کافیتہ سانس کھنے کی حد تک کس کر تھانے آنے لگے تھے۔ مکمل قلمی سے جگہ رہے تھے اور ہوتے پالش سے چمکنے لگے تھے۔ ہفتوں کی بڑی حجامت روزانہ بننے لگی تھی اور سارے رنگروٹ صبح سویرے اپنی گردن پر موٹی ٹھین پھروا کر اور سارے بال اڑا کر آنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایس بی صاحب پھیری سے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے دار نے سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب کو پہلے ہی برآمدے میں بٹھا دیا تھا۔ آج ایس بی کا رخ خلاف معمول سیدھا حوالات کی جانب تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آکر بڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولے ”آئی۔ جی نصیر صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا ”کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن بہت مہربان ہیں وہ میرے۔“ ”رہمن صاحب پشیمانی سے بولے“ عجیب لڑکے تو تم بھی، تم نے اتنے دن سے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم..... میرا مطلب ہے تم کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیتے۔“ میرے منہ سے اچانک بے اختیار ایک صحیح بات نکل گئی ”کیا ایسا کوئی اشارہ دینے سے میرے بزم کی نوعیت بدل جاتی.....؟“ وہ جو کئے ”نہیں..... لیکن شاید میں اتنا شرمندہ نہ ہو تاں جتنا آج صبح اُن کے فون کے بعد ہوا۔“ ”لیکن میں نے تو ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا یہ بات تو آپ خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“ ”ہاں، جانتا ہوں، لیکن شاید تمہارے بزرگ نے ان سے رابطہ کیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئے۔“ تھانے دار نے جلدی سے ایس بی صاحب کو بتایا کہ اس نے ایس بی کے معاہدے کی وجہ سے میرے دونوں ملاقاتیوں کو پھیلے برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔ ”رہمن صاحب نے جلدی سے انہیں اندر لائے کو کہا۔ تھانے دار خود بھاگا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں تھانے دار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رہمن صاحب بہت الجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے ”یقین جانیے، یہ میری زندگی کا پہلا کھس ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں ایک ہی دن میں کئی کئی بار حیرت کے اتنے شدید جھٹکوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ لوگ پہلے ہی نصیر صاحب سے اپنا نام بتا دیتے۔ وہ میرے نہایت قابل احترام استاد ہیں۔ میں نے آکیزی لے ان بی کی سرپرستی میں ٹریلنگ لی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کی وجہ سے ہوں اور آج صبح سویرے جب ان کی کال آئی، تو یقین جانیے، میں دل ہی دل میں بہت نادام ہوا۔ اس تمام عرصے میں مہرے کسی بھی برتاؤ سے آپ کو جو بھی کوفت ہوئی ہو، میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“ سلطان بابا بولے ”آپ نے کچھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا، ہوا آپ کے فرض کے دائرے سے باہر ہوا اور پھر صحیح تو یہ ہے کہ اگر مبد اللہ میاں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی، تو شاید نصیر صاحب تک میری عرضداشت بھی نہ جاتی۔ اس بیٹے نہ جانے کتنے الزام، کتنے کٹک لگائے ہوئے ہیں۔ کہاں ہر بار نصیر صاحب کو زحمت دیتے پھر میں گئے ہم..... لیکن اس بار معاملہ کچھ اور تھا، لہذا انہیں درمیان میں لانا ہی پڑا۔ امید ہے آپ اس غبار خیز کانڈ انہیں مانیں گے۔“ ”رہمن صاحب گڑبڑا کر بولے ”نہیں..... ہرگز نہیں..... یقین جانیے، یہ سب میرے لیے بہت عجیب ہے۔ اتنا اختیار رکھنے کے باوجود اگر کوئی اتنی تکلیف جیسے تو اسے چٹائی کی دوسری سہکی کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی ذاتی چٹکے بھر کر مبد اللہ کو حمانت پر لے جاسکتا ہے۔ ہاں، بس اتنا خیال رکھنا ہوگا کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، اسے علاقے ہی میں موجود رہنا ہوگا۔ میں ذاتی چٹکے کے تکلف میں بھی نہ پڑتا کہ نصیر صاحب کی ضمانت میرے لیے دنیا کی کسی بھی ضمانت سے بڑھ کر ہے، لیکن آپ جاننے ہیں، ہر کاری قواعد و ضوابط بھی میرے پاؤں کی بہت سی زنجیروں میں سے ایک ہیں۔“

مرضی صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے بستی کے پیش امام کی حیثیت سے ایک چمکے بھر دیا اور اس پر اپنے دستخط اور انگوٹھے کی مہر ثبت کر دی۔ جاتے جاتے رحمن صاحب نے ایک اور خبر سنائی کہ لڑکی کے چہرے اور جسم پر خراشوں اور ناخن کی کھر و نچوں کے جوشانات تھے، وہ میرے خون اور گزشتہ شام لیے گئے میرے ناخنوں کے مواد سے مماثلت نہیں رکھتے۔ گویا فی الحال میں ایک فوری نوعیت کے شک سے پھر باہر نکل چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اشرف نے جو کچا پکا حلیہ اس دوسری عورت کا بتایا تھا، اس کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے، لیکن چوں کہ ایک بچے کی یادداشت اور منظر نگاری بہر حال اتنی پختہ نہیں ہو سکتی تھی، لہذا ابھی کچھ مشکلات کا سامنا تھا، لیکن رحمن صاحب پر امید تھی کہ پولیس جلد درست خطوط پر کیس کی تفتیش شروع کر دے گی۔ وہ ہمیں رخصت کرنے خود تھانے کے صحن تک آئے اور سلطان بابا کے لاکھ انکار کے باوجود اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں بستی چھوڑ آئے۔ شاید اس ہدایت کے پیچھے کہیں نہ کہیں ان کی یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ بستی سے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گرفتار کر کے لاتے وقت بستی والوں کی نظر میں میرے مجموعی تاثر میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا، اس کی کچھ تلافی تو ممکن ہو۔ ہم انسان ہوتے ہی اتنے ظاہر پرست ہیں کہ ہماری عزت اور ذلت کے پیمانے اسی قدر سطحی اور پائیدار بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رحمن صاحب کا یہ کلمہ مولانا نے درست ثابت ہوا اور ہمیں ایسی ہی کی گاڑی سے اترتے دیکھ کر بستی والوں کے دل میں اگر کوئی رہا سہا شک باقی بھی تھا، تو جاتا رہا۔ ویسے بھی یہ سیدھے سادے ٹھیکروں کی بستی تھی اور یہاں کے لوگ رشتوں کے معاملے میں زیادہ بھاؤ تاؤ کے قائل نہیں تھے۔

اشرف کو اسکول سے آتے ہی جب یہ پتا چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں، تو وہ دوڑتا ہوا مسجد آ پہنچا۔ میں مسجد سے ذرا فاصلے پر ٹھہر کے تین چار بجے ہوئے درختوں کے ٹھنڈے تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چہن تھا، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی اور دو چار نمازی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ دیر رُک گئے تھے، لہذا ان کے جانے تک اشرف ریت میں گھر و نہن بنانے کا ٹھیکہ لیتا رہا اور پھر جیسے ہی آخری نمازی مجھ سے رخصت ہوا، وہ جلدی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ ”بتا ہے..... کل وہ چنگ۔ والے صاحب آئے تھے شام کو وہاں۔ میرے لیے بہت سی پتلیاں بھی لائے تھے، پر میں نے چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ رو رہے تھے اُس جگہ بیٹھ کر۔“ میرے دل پر ایک گلوں سا لگا۔ اُس بد نصیب کو تو اب تمام عمر رونا تھا۔ ”اور بتا ہے، وہ زور زور سے کسی کو کہہ رہے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا..... یہ تم نے اچھا نہیں کیا..... پر طالب جی..... وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔“ میں زور سے چونکا۔ اشرف مجھے طالب اور سلطان بابا کو بڑے مولوی جی کہتا تھا، لیکن آخر یہ ریجان کس سے خود کلامی کر رہا تھا۔ کس نے، کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے اشرف کو زیادہ کر پدا تو مجھے اتنا سمجھ میں آیا کہ ریجان عموماً جب کبھی وہاں تنہا آتا تھا، تو خود کلامی ضرور کرتا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے اور کامیاب انسان اندرونی طور پر شدید تنہائی کا شکار ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کے آس پاس عملہ تو میگزینوں اور ہزاروں میں ہوتا ہے، لیکن ایک دوست کی کمی انہیں سدا پریشان کرتی رہتی ہے، ان میں سے بہت سے اس خود کلامی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید ریجان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ شام تک دو چار مرچہ میری طبیعت ڈھڑی اور پھر سنبھل بھی گئی، لیکن اس دھوپ چھانوں کے کھیل نے مجھے بذحال کر ڈالا، لہذا مغرب کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسجد کے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران سلطان بابا لگا تار مجھے سادہ پانی پر کچھ دم کر کے پلاتے رہے اور میرے اندر کی جلن کو اس پانی سے قدرے سکون بھی ملتا رہا۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی کہ کچھ گھاؤ اور کچھ زخم بظاہر بھر جانے کے باوجود اس خاص مدت میں ایک بار پھر ٹیس پکڑ لیتے ہیں، جب وہ تاریخیں اور وہی خاص وقت پلٹتا ہے، جس میں ماضی میں ہم نے وہ زخم یا چوٹ کھائی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ زخم سہ ماہی، ششماہی اور کچھ تو سال بھر کے بعد بھی دوبارہ ہرے نہ بھی ہوں، تب بھی اپنی پوری کسک اور بے چینی کے ساتھ پلٹتے ہیں۔ ان کے اس کھلے کی رو سے مجھے پچھلے ماہ انہی تاریخوں میں یہ زہریلے گھاؤ لگے تھے اور کٹوں کا زہر میرے جسم میں پھیلا تھا۔ بروقت ملی دوا اور ویکسین کے ٹیکوں نے وقتی طور پر میری جان تو بچائی، لیکن ان درندوں کے فوٹو ہر جڑوں کا زہر میرے فون کے فلیشوں ہی میں دوا اور ویکسین سے بچنے کے لیے اپنے ہی بنائے کسی حفاظتی فول میں جا کر ٹھپ گیا تھا اور اب ٹھیک اسی وقت اور تاریخ کو تیس دن کا عرصہ گزرتے ہی وہ پھر سے میرے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا اس زہر نے اپنے دائرے کو کھل کرنے میں مہینے بھر کا عرصہ لیا تھا اور یہ خطے اب ہر ماہ انہی تاریخوں میں اور اسی خاص وقت پر میرے اعصابی نظام کو تباہ کرنے کے لیے ہوتے رہیں گے۔ بظاہر ایلو پتھتی اور جدید طب میں اس کی دوا اور مثال ڈاکٹروں کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، پر بقول حکیم صاحب ان کی مات فطریں حکمت ہی کے پیچھے سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اپنی پرانی حکمت کی کتابوں میں موجود مستند تفصیل پڑھنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انہیں سوچوں میں گم نہ ہانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی ہماری نیند اس قدر بے چین اور کچی ہوتی ہے کہ ہم سوتے وقت بھی خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بند آنکھوں کے پردے تلے بھی ہمیں اپنے آس پاس ہوتی حرکات کا ادراک ہوتا رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ جانے وہ خواب تھا یا سراب..... لیکن میں نے اپنی بند آنکھوں کے پوٹوں تلے ایک عورت کی شبیہ فنی محسوس کی۔ میں بے چینی سے کسمسایا، لیکن اس عورت کی تصویر فنی چلی گئی۔ عجیب سی سفاکی تھی اس کے چہرے پر۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے..... پر کہاں.....؟ وہ بہ یک وقت میرے لیے بے حد اجنبی اور بہت شاسا چہرہ تھا۔ اور وہ عجیب سی سفاکی لیے میری جانب گھور رہی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور خوف کے مارے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک تو مجھ سے حرکت بھی نہ ہو سکی۔ وہی عجیب سی نگہ میرے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں نے سنا تھا، ہم جس بات کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے ہاتھ پر جاتے ہیں، وہی واقعہ ٹھیک اسی طرح ہمارے خواب میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایسی ہی صاحب کی زبانی جب سے ایک دوسری عورت کا اس قصے میں ذکر سنا تھا، تب سے شاید وہی عورت میرے حواس پر بھی سوار تھی۔ تجھی میں سوتے میں بھی اُس کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے دور سے کسی چھوٹی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہوا کا رخ بدلا اور آواز غائب ہو گئی۔ میں لپک کر حجرے سے باہر نکلا۔ دور اسی پہاڑی نیلے پر کسی گاؤں کی روشنیاں مجھے نظر آئیں۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھرنی اور میں اس جانب دوڑا۔ دور سے میں نے کسی عورت کی پشت دیکھی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اور وہ سمندر کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ گاڑی کی پارکنگ والی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میرے بھاگتے قدموں کی آواز پر وہ گھبرا کر پٹلی اور چند لٹوں کے لیے تلخ سرخ آجالے میں اُس کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا تھا۔

اک خاک برسٹو جوان کا فسانہ جو خدا کو اپنی شہرہ لگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ ”جنگ“ ”سندے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا نیکو نکل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دو رجحانوں کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی فی منو میں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز نکلنے نہیں۔ اسی متوازی و تنہا کے سرایت میں ہی وہ اپنے اپنے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناکمل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ امی میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabulallah@janggroup.com.pk

کچھ لمحے وہ مجھے اور میں اسے لاجبی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے، نیلے پر بہت اندھیرا تھا اور جس منظر میں ساحل پر پھیلی چاندنی قدرتی روشنی اس چوٹی کو مزید تاریک بنا رہی تھی۔ اگر اس چھوٹی مارک ٹو کار کی پارکنگ والی بنیاں روشن نہ ہوتیں، تو میں انہی دور سے شاید اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔ گاؤں کے دو گروہ روشنی کا ایک سرخ ہالہ مانتا ہوا تھا اور اسی ہالے میں مجھے اس کے چہرے کی دھیمی سی، لیکن بے حد سٹاک ہوٹل نظر آتی تھی، نہ جانے اس چہرے میں ایسا کیا تھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی پر گردن کی پشت سے ہوتی ہوئی سرد پسینے کی ایک لہری دوڑ گئی، میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اسے ہوشیار کر دیا تھا، وہ پہلے مجھ میں ایک جھٹکے سے مڑی اور بجلی کی طرح گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارت کر دی۔ میں زور سے چیخا ”میری بات سنئے..... رگ جائیے.....“ لیکن وہ بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گاڑی نے لمبا سا موڑ کاٹا اور فرار لے بھرتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی اور جب تک میں گاڑی کے مقام تک نہ پہنچا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی، بہت دیر تک تو میں اپنی چھوٹی سانسوں پر قابو ہی نہیں پاسکا۔ گاڑی چائیکی تھی اور اب صرف اس کے چیلوں کے نشانات ہی وہاں باقی رہ گئے تھے یہ ٹھیک وہی جگہ تھی، جہاں سے پولیس کی لفٹیں کے مطابق لمبی نیچے مری تھی یا اسے دھکا دیا گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چٹانوں کے پیچھے پھاڑا، تاکہ میں وہ قاتل گہرائی دیکھ سکوں، جس نے ایک معصوم ہان لی تھی، اچانک مجھے زوردار پتھر آیا اور مجھے لگا کہ میں خود بھی چند لمحوں میں اسی گہرائی کا شکار ہو چکا ہوں گا، لیکن بھلا، جو قریب نقلی پٹان کے ایک چتر کا، جو لہراتے وقت میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں اسی کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے کبھی بھی اونچائی کے خوف (Height Phobia) کا عارضہ لاحق نہیں رہا، لیکن آج میں نہ جانے یہ اونچائی کیوں جھیل نہیں پا رہا تھا۔ میں اکثر خواب میں خود کو کسی اونچی جگہ پر حلق یا پھر اونچائی سے خود کو نیچے کرتے ہوئے دیکھوں کرتا تھا اور ہر بار میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج یوں لگا، جیسے وہ خواب بج ہونے کو تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اسپتال والے سینکڑا کنسر نے، ریڑھ کی ایک علامت ”اونچائی کا خوف“ بھی بتائی تھی۔ میں نے آس پاس نظر ڈالی، تو مشرق کی سمت میں کوئی چیز دیریت میں پڑی چٹکی نظر آئی۔ میں نے اسے اٹھایا تو سرخ رنگ کی ایک چٹکی ٹوک دار بن گئی تھی۔ اوہ، گویا وہ پراسرار عورت اپنی جوتی کی ایڑی تڑا کر ہالہ دی میں میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اگلے روز ٹھیک اسی جگہ میں رتن صاحب اور ان کی ٹیم کے ہم راہ کھڑا تھا اور وہ سرخ جوتی کی ایڑی اب رتن صاحب کے ہاتھ میں تھی، جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے ”خیرت ہے.....“ اگر یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں ہم در بدر بھٹک رہے ہیں، تو پھر اس کی بہت سی واہ و بنا بھی زیادتی ہو گئی اور میں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی روایتی پولیس والوں کی طرح تفتیش میں الجھ کر اور ہر طرف جال بچھا کر بیٹھتا ہوں، جب کہ سب سے اہم، لیکن غیر متوقع جگہ پر ناک ٹکوانا بھول گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اگر کوئی اور عورت بھی اس کیس کا مرکز بن کر رہے، تو وہ وہاں بھی آسکتی ہے۔ ضرور اس جگہ میں کوئی خاص بات ہے، جو بظاہر ہمیں محسوس نہیں ہوتی، لیکن اس کی کیس کے باقی کرداروں کے لیے کوئی نہ کوئی شدید چند باقی اہمیت ہے۔ اب شاید وہ وہاں نہ آئے، کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آگئی ہے۔ لہذا اب ہمیں خود اس کے پیچھے جانا ہوگا۔ ”رتن صاحب نے گاڑی کا علیہ اور عورت کی حیرت انگیز تھیلیات مجھ سے کسی بار پوچھیں۔ پھر میں ٹوٹ نہیں کر پایا تھا، کیوں کہ میرا فاصلہ گاڑی سے بہت زیادہ تھا، البتہ گہرے نیلے یا سیاہ رنگ کی ایسی مارک ٹو گاڑیاں تو شہر میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہر حال، رتن صاحب کے نظریے نظر سے یہ کیس میں بھی پیش رفت تھی اور شام ڈھلنے تک اس مقام پر مختلف پولیس والوں کا آنا جانا برقرار رہا۔

اس وقت بھی سورج ڈھلنے کے قریب میں دور ریت پر بیٹھا تھا، دار کو اپنے محرر کو کچھ تفصیلات لکھواتے ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ وقوع کا نقشہ پھر سے بنا رہے تھے، تھانے دار کی آواز مجھ تک آ رہی تھی۔ محرر نے کچھ غلط لکھ ڈالا۔ تھانے دار چلایا ”میں نے کہا تھا مشرق کی سمت سے نشانی ملی..... مشرق کی سمت سے..... سمجھ نہیں آتا کیا.....؟“ اور ٹھیک اسی لمحے میرے کان میں اسماعیل سنتری کی آواز گونجی، اس نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجھ کو میرے لیے یہی پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں مشرق کی سمت دیکھوں، اور مجھے پہلی نشانی مشرق ہی میں ملی تھی، جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رات جب میں اس عورت کو دیکھنے کے بعد واپس حجرے میں پہنچا، تو سلطان بابا میری تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اپنے خواب اور پھر اس عورت کے بارے میں بتایا کہ جس ہولے کو چند لمحے پہلے میں نے بند آنکھوں کے پردے تلے دیکھا، وہی کچھ دیر بعد میرے سامنے حقیقت بن کر کھڑا تھا۔ سلطان بابا میری بات ختم ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میری جانب دیکھتے رہے۔ ”جانتے ہو..... یہ تمہارا پہلا الہام تھا۔ آج تک تمہیں جو کچھ نظر آتا رہا، وہ ماضی میں ہو چکا تھا اور وہ کیا کہتی ہے سائنس کی ”ڈائی پلر تصویری آف گریوٹی“..... اس کے مطابق وہ سب صرف بنی ہوئی اور گزری ہوئی تصویروں کے فریم ہوتے تھے، لیکن اب جو تم نے دیکھا، وہ ماضی نہیں مستقبل تھا۔ لگتا ہے تمہاری ریاضت قبول ہو رہی ہے عبداللہ میاں..... جیتے رہو۔“ مجھے دعا دیتے وقت ان کی آنکھوں میں نمی اور میرے سر پر رکھا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے دار اور محرر نے اپنا کام ختم کر لیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کروں، تو فوراً ہستی کے پوسٹ آفس سے ماہی تحصیل تھانے کے نمبر پر فون کر کے بتا دوں۔ سورج ڈھلتے ہی سب عملہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

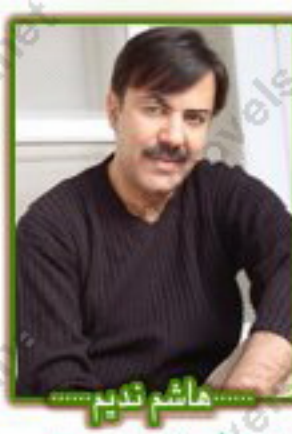
اگلی صبح رحمن صاحب کا پیغام آ گیا کہ میں تھانے آ کر اس عورت کا خاکہ بنا دوں۔ میں ہستی سے چلنے والی واحد قدیم سی بس میں سوار ہو کر تھانے پہنچا، تو زیادہ تر عملہ تھانے دار سمیت کسی چھاپے پر گیا ہوا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے چند ٹکڑے ان شری پتوں کی طرح ادھر ادھر ڈول رہے تھے، جو اسکول سے بھاگ کر کھلیانوں اور میدانوں میں مزل گشت کرتے پھرتے ہیں۔ خاکے بنانے والا فن کار اور محرر تھانے میں موجود تھے۔ محرر نے مجھے اپنے ہی کمرے میں بلا لیا۔ کمرہ کیا تھا، چھوٹا سا کیمین تھا، جہاں ایک طرف میز پر ایک پرانا سا وائز لیس نظام اور ایک قدیم سا میٹا لے رنگ کا ٹیلی فون پڑا ہوا تھا، جس کے ڈائل کے اوپر ایک چھوٹا سا رنگ آلود ٹالا لگا تھا۔ ٹالے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں چابی گھمانے کے مواقع کم ہی آتے ہوں گے۔ محرر نے مجھے فن کار مصور کے ساتھ بیٹھا دیا اور خود چائے کا کہنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس رات اس عورت کے چہرے کا صرف دایاں حصہ ہی دیکھا تھا، وہ بھی سرخ مٹکے اندھیرے میں، چہرے کا بایاں حصہ نقاب اور مکمل اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، لہذا میں احتیاط سے سوچ سوچ کر مصور کو اس عورت کے خدو خال اپنی یادداشت کے مطابق بتا رہا تھا، جسے وہ تیزی سے کاغذ پر پینسل کے ذریعے اس کی صورت میں اتار رہا تھا۔ اچانک مصور نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کمرے کی مشرقی سمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہتھے ہی میں نے دیکھا، اس کے پیچھے دیوار پر سینوں کی بدو سے جھولنا ہوا ملک کا ایک پرانا سا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ میں مصور کو تفصیلات بتاتے بتاتے بے خیالی میں نقشے میں اپنا شہر ڈھونڈنے لگا۔ اپنے شہر سے رحیم پور، رحمن آباد پھر جبل پور، کمال آباد اور پھر کال گڑھ اور اب یہ چھوٹی سی تحصیل ماہی، میں نقشے پر خیالی انگلی سے اپنے سفر کی منزلوں کے نقطے جوڑتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ میں نے جلدی میں دو تین بار پھر نقشے پر ان نقطوں کو جوڑا، سلطان بابا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وقت ملے تو میں نقشہ دیکھ لوں۔ مصور اپنے کام میں جتا ہوا تھا، اسے مجھ سے جتنی تفصیل مل سکتی تھی، میں اسے بتا چکا تھا، میں نے زمین پر پڑے اس کے کیونوں کے تھیلے میں سے جھانکتی بہت سی رنگ برنگی پینسلوں میں سے ایک پینسل نکالی اور اس کی مدد سے اب تک کے اپنے سفر کے نقطوں کو جوڑا اور میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ان نقطوں کو جوڑنے سے جو شبیہ اس میاں لے نقشے پر میری رنگین پینسل نے بنائی تھی، وہ پہلے الف اور پھر لٹہ تک آ کر رک گئی تھی، یعنی اگر مکمل لفظ جوڑا جاتا تو اللہ کا اللہ بنتا تھا، یعنی حرف ہ کی کمی تھی، جسے جوڑنے سے پورا ”اللہ“ کا نام بن جاتا۔ میرے دل و دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ سلطان بابا نے کہا تھا کہ انہیں ہمارے سفر کے راستوں اور منزلوں کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ کیا قدرت میرے راستوں اور پڑاؤ کے مقامات کے ذریعے اپنا پورا نام لکھوانا چاہتی ہے۔ تو کیا اب تک کا میرا یہ سارا سفر پہلے ہی سے طے شدہ تھا؟ کیا یہ سفر اسی وقت طے ہو چکا تھا، جب عبداللہ نام کا یہ اعزاز ساحر کے نام کی جگہ میرے حصے میں لکھ دیا گیا تھا، مصور جانے کب سے خاکہ مکمل کر چکا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ میں دیوار کے نقشے سے ہٹ کر اس کی تصویر کو دیکھ کر اپنا حتمی فیصلہ سناؤں، لیکن اس وقت میرے حواس میرے قابو ہی میں کب تھے۔ محرر کب کا چائے رکھ کر جا چکا تھا، جواب پانی ہو چکی تھی۔ میں نے خاکے پر نظر ڈالی، مصور اصل چہرے سے بہت قریب تھا، میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ایسا ہی ایک خاکہ میرے لیے بھی بنا دے۔ مصور نے بنا کسی پس و پیش کے ہو ہو ویسا ہی دوسرا خاکہ بنا کر میرے حوالے کر دیا اور ایک بار پھر اس آدمے چہرے کے خاکے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میری اس عورت سے پہلے بھی کہیں نہ کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کاش میں اسے بروقت پہچان پاتا۔

میرے ہستی پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت بس نکلنے کو تھا۔ نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے باہر آیا، تو دور آسمان پر میں نے دھانی رنگ کی ایک پتنگ اڑتے ہوئے دیکھی۔ نیچے ساحل پر اشرف اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی میں سرشار پتنگ کو ڈھیل دیے جا رہا تھا اور اس کی دھانی پتنگ، دور آسمان میں اتنی بلند ہو چکی تھی، جہاں سے سمندر کے اوپر کا ہلکا نیلا آسمان بھی دھانی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا، میں نے چونک کر دور ٹیلے کی جانب دیکھا تو ریحان کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ مجھے تھانے دار نے بتایا تھا کہ ٹھیک اسی رنگ اور ماڈل کی دوسری گاڑی ریحان نے لیلی کو بھی کمپنی کی طرف سے دے رکھی تھی۔ ریحان حسب معمول سمندر کی طرف چہرہ کیے، گم صم سا کھڑا تھا۔ آج اس کے ساتھ اس کا پرانا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اس ڈرائیور کو میں پہلے بھی ریحان کے ساتھ تھانے والی ملاقات کے روز دیکھ چکا تھا، جو بیٹھنے سے ستر برس کے پینے کا ایک سنجیدہ اور کم گو شخص تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ میں اپنی زندگی میں اب تک جتنے بھی ڈرائیوروں سے ملا تھا، وہ گفتگو کے معاملے میں دو انتہاؤں پر تھے، یا تو بے انتہا باتونی یا پھر انتہائی خاموش..... ریحان میرے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹا ”اوہ..... تم ہو..... مجھے رحمن صاحب نے بتایا تھا کہ تمہیں عثمان پر رہا کر دیا گیا ہے۔ چلو اچھا ہوا..... پولیس کی غلط فہمی دور ہو گئی.....“ میں نے غور سے ریحان کی طرف دیکھا ”مجھے پولیس کی کبھی اتنی پروا ہی بھی نہیں، لیکن کیا آپ کا دل بھی میری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔“ ریحان اسی طرح خلا میں

گھورتا رہا۔ ”جو خود اپنی ذات ہی سے بدگمان ہو، اسے بھلا اوروں سے بدگمانی کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ ریحان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اسے اپنی تنہائی میں مداخلت بھی شاید پسند نہیں آتی تھی۔ اتنے میں اس کا ڈرائیور گاڑی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا اور ریحان سے بولا ”چھوٹے صاحب..... سورج ڈھلنے والا ہے، ہماری واپسی کا وقت ہو گیا ہے.....“ ریحان کی آواز درشت تھی۔ ”کچھ دیر میں چلتے ہیں.....“ لیکن میری حیرت بڑھ گئی، جب ڈرائیور نے دوبارہ اصرار کیا۔ ”نہیں چھوٹے صاحب..... سورج ڈھل جائے گا..... ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے.....“ ریحان نے کڑی نظروں سے ڈرائیور کو دیکھا، لیکن بادل خواستہ اس نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ایک ڈرائیور کی ہدایت پر ریحان کا یوں ہنا چوں چراں کیے چل دینا مجھے عجیب سا لگا اور پھر سورج ڈھل جانے میں ایسی کیا بات تھی، ایسی ہدایات تو عام طور پر چھوٹے بچوں کے لیے ہوتی ہیں کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آنا، جب کہ ریحان کے بارے میں مجھے جتنا کچھ پتا چلتا تھا، اس اعتبار سے تو وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے اور وہ اکلوتا تھا، لہذا اس کا گھر میں انتظار کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک سبلی تھی، جو اس کی زندگی میں بہار بن کر آنے سے پہلے ہی پتہ جھڑکی نذر ہو چکی تھی۔ پھر گھر واپس لوٹنے کی یہ جلدی کیوں؟ میں خود اپنے آپ ہی سے سوال کر کے خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا رہا۔ سورج ڈھلنے کا تعلق اندھیرے سے بنتا ہے، تو کیا ریحان تاریکی سے خوف کے کسی اسرار میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ریحان کے پیچھے جا کر دیکھوں کہ وہ اس وقت اپنے گھر ہی گیا ہے یا اس کی کوئی اور مصروفیت ہے؟ عشاء کے بعد مر قاضی صاحب میرے اور سلطان بابا کے لیے گھر کا بنا ہوا کچھ بیٹھالے کر آئے، تو اشرف بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں نے اشرف کو اشارہ کیا اور ہم دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے اور میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اس سے پوچھا کہ کیا اس کے پتنگ والے صاحب کبھی شام ڈھلنے کے بعد بھی ساحل کی طرف آئے ہیں۔ اشرف نے کچھ دیر سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں ناں..... وہ تو میم صاحبہ کو بھی کبھی دیر تک وہاں نہیں رہنے دیتے تھے، حالاں کہ میرے سامنے کئی مرتبہ میم صاحبہ نے انہیں بولا بھی تھا کہ ہم رات کو پتنگ اڑائیں گے اور اپنی پتنگ ستاروں تک لے کر جائیں گے، لیکن صاحبہ کبھی رات تک رکتے ہی نہیں تھے۔“ میں نے مصور کا بنا ہوا خاکہ اشرف کو دکھایا ”کیا اس رات تم نے اسی عورت کو پہاڑی پہ آتے دیکھا تھا۔“ اشرف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا ”ہاں ہاں..... یہی تو تھی۔ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔“ کچھ گتھیاں ایک جانب سے الجھ رہی ہوتی ہیں، تو دوسرے سرے سے ان کی گرہیں کھل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اگلی صبح میں نے پوسٹ آفس سے تھانے فون کر کے رحمن صاحب کے دفتر کا نمبر لیا اور انہیں فون کر کے گزارش کی کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی دو گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سینئر ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق میرے دوروں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے درمیانی وقفے میں روز بہ روز کمی ہو رہی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مکمل جنوں سے پہلے لیلیٰ کے قتل کی کتنی سنجیدگی سے اور اس کے لیے مجھ ان کی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔ رحمن صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا ”لیکن تمہارا علاج بھی تو ساتھ ساتھ چل رہا ہے..... پھر تمہیں اتنا پختہ یقین کیوں ہے کہ تم مکمل جنوں کی منزل کو پہنچ کر ہی رہو گے.....؟ بہر حال، میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں..... اور یہی میرا فرض بھی ہے.....“ ”نہیں میرے لیے فرض سے بڑھ کر آپ کا ایک اور احسان ہوگا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ میری اور ریحان کی ایک ملاقات کا بندوبست کروادیں، لیکن ہماری ملاقات شامل ڈھلنے کے بعد ہونی چاہیے۔“ رحمان صاحب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”لیکن شام ڈھلنے کے بعد ہی کیوں، شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ ریحان شام کے بعد کسی سے بھی ملاقات نہیں کرتا۔ پولیس کو بھی اس نے ہمارے بڑوں کے ذریعے خاص ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مغرب کے بعد کسی شخص سے بھی نہیں ملتا، چاہے طوفان ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ بڑا آدمی ہے اور اس کی پہنچ بھی دور تک ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا ”لیکن کیا یہ بہت عجیب بات نہیں ہے..... ایک شخص مغرب ہوتے ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے میں کوئی ایمر جنسی ہو جائے تو اس سے کیسے رابطہ ہو سکے گا۔“ ”ایمر جنسی کے لیے اس کے ایک پرانے ڈرائیور کا فون نمبر موجود ہے، جو مغرب کے بعد ریحان کی تمام فون کالز اور پیغام وصول کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرائیور ریحان کے باپ سیٹھ غیاث کے دور کا ہے اور یہی دنیا کا وہ واحد فرد ہے، جسے ریحان کا اعتماد حاصل ہے۔“ ”لیکن یہ معما کیسا ہے؟“ ”کچھ نہیں..... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، ویسے عام لوگوں میں یہی بات مشہور ہے کہ ریحان کو بچپن ہی سے اندھیرے کا کوئی خوف (Darkness Phobia) ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں میں تنہائی کی وجہ سے ایسی نفسیاتی بیماریاں کچھ زیادہ اچھنبھے کی بات نہیں ہوتیں اور پھر آخر یہ اس کی اپنی زندگی ہے۔ اس کی مرضی کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد کسی سے ملے یا انکار کر دے۔ ہم اس پر زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے۔“ میں نے گہری سانس لی ”مطلب یہ کہ میرا ریحان سے مغرب کے بعد ملنا ممکن نہیں ہوگا۔“ ”میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا، لیکن ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ بہت مشکل لگتا ہے۔“ اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے شام ڈھلنے اس کے گھر تک پہنچا دیں۔ یا مجھے اس کا پتہ دے دیں۔ میں اپنے طور پر اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔“ رحمن صاحب اب بھی کچھ مخمخے میں تھے۔ ”ہاں..... یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے..... میرا عملہ تمہیں ریحان کی کوٹھی کے باہر پہنچا دے گا، لیکن میں اب بھی سمجھ نہیں پایا کہ تم اس سے مغرب کے بعد کیوں ملنا چاہتے ہو۔ میں نے سنا ہے، ریحان اپنی اس اندھیرے سے ڈرنے والی بیماری کے علاج کے لیے بیرون ملک کے بھی بہت سے چکر لگا چکا ہے اور وہاں کے اعلیٰ پائے کے معالجین سے بھی مشورہ کر چکا ہے، لیکن اس کا مرض ”مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی“ کے مصداق پھیلتا ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری اس مداخلت پر وہ ناراض ہو کر تمہارے لیے مزید مسائل نہ کھڑے کر دے۔ یاد رکھو، تم ابھی تک ضمانت پر ہو۔ تمہیں مکمل رہائی نہیں ملی۔“ ”جی میں جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ خطرہ مول لینا چاہوں گا۔ میں آپ کی سرکاری مجبوریاں اور ریحان کا اثر و رسوخ جانتا ہوں۔ اسی لیے خود اپنے طور پر ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رحمن صاحب نے ہنکارا بھرا اور ٹھیک تین گھنٹے بعد مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک عظیم الشان کوٹھی کے بہت بڑے سے گیٹ کے قریب اتار کر پولیس کی جیب خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مغرب کی اذان ختم ہوتے ہی گیٹ پر لگی تھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے انٹرکام پر کسی کی آواز ابھری ”کون ہے؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔ مجھے ریحان صاحب سے ملنا ہے۔“ فوراً جواب ملا۔ ”وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ آپ صبح آئیں۔“ انٹرکام پر کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر کوئی تھنٹی تھنٹی سی آواز میں بولا ”ہاں بولو..... کیا بات کرنی ہے تمہیں؟“ یہ آواز میرے لیے اجنبی تھی، مجھے یوں لگا، جیسے کوئی عورت ریحان کی آواز میں بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔



.....ہاشم ندیم.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، حشر حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گروہ بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک یلیدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

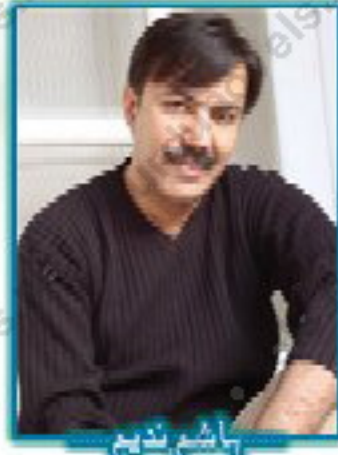
میں کچھ دیر تو اس آواز کے استار چڑھا ہی میں الجھا رہا۔ انٹرکام پر دوبارہ ذرا درشتی سے پوچھا گیا ”تم کچھ لپٹی کے بارے میں بتانے والے تھے؟“، ”جی..... لیکن آپ کون بول رہے ہیں؟ کیا میں ریحان صاحب سے بات کر سکتا ہوں.....“ دوسری جانب سے جھنجھلائی ہوئی تیز آواز ابھری ”میں ریحان بول رہا ہوں، جلدی بولو تمہیں کیا کہنا ہے۔“ اس بار آواز واقعی ریحان ہی کی تھی۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی۔ ”کیا میں آپ سے مل کر بات نہیں کر سکتا، آپ اپنے مہمانوں کو اس طرح دروازے ہی سے بات کر کے لوٹا دیتے ہیں؟“ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ شاید انٹرکام رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کے قریب قدموں کی چاپ ابھری اور دربان نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے اندر جاتی پٹی سڑک کے دونوں طرف دور تک خوب صورت بجلی کے کمان نما کیمبیوں کی قطاری چلی گئی تھی، جن پر لٹکے پھونے پھونے فانوس یوں جل رہے تھے کہ انہوں نے دودھیاروشنی کا ایک سیلاب سا بہار دکھا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ کوٹھی میں چاروں طرف روشنی کا ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ ہر سو چراغاں جیسی کیفیت تھی۔ میں نے جس شخص کے قدموں کی چاپ سنی تھی، وہ ریحان کا وفادار ڈرائیور تھا، جس کے چہرے پر ہر بھی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا، لیکن پھر اپنے تاثرات گھسپا کر بولا ”معذرت چاہتا ہوں، لیکن اس وقت چھوٹے صاحب کسی سے بھی نہیں ملتے، چاہے کچھ بھی ہو جائے“، ”چاہے کچھ بھی ہو جائے، چاہے معاملہ کسی کی زندگی یا موت ہی کیوں نہ ہو۔“ ڈرائیور نے میری بات کے جواب میں دوبارہ سختی سے کہا۔ ”ہاں، چاہے کچھ بھی ہو جائے، لیکن ایسے موقعوں کے لیے میں ہمیشہ موجود رہتا ہوں۔ تم تو اسی ساحلی مسجد کے طالب ہونا۔ تو تمہارا نام عبداللہ ہے۔ تمہیں جو بھی اطلاع دینی ہے، تم مجھے دے سکتے ہو۔“ ڈرائیور نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ شاید وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ریحان کی حیثیت دیکھ کر کچھ پیسے بٹورنے کے لیے اتنی دور آیا ہوں اور خاص اسی مقصد کے لیے ریحان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے نوٹ دوبارہ ڈرائیور کے ہاتھ میں پکڑائے ”تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے جو بات کرنی ہے، اس کا براہ راست تعلق ریحان صاحب ہی سے ہے، لیکن اگر وہ واقعی اس قدر مجبور ہیں کہ مجھ سے ملنے کے لیے دروازے تک بھی نہیں آ سکتے، تو مجھے واپس پلٹ جانا چاہیے، ہاں البتہ ایک پیغام ضرور دے دینا کہ میں اس عورت کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، جو پہلی کی موت کی رات پہاڑی ٹیلے پر آئی تھی۔“ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا، لیکن میں نے مڑتے مڑتے بھی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے دیکھ لیا، حالاں کہ میں نے صرف اشرف ہی سے اب تک اس عورت کی قتل والی رات ٹیلے پر آمد کا سنا تھا، لیکن پھر بھی یہ صرف ایک انداز پرے میں چلا یا ہوا تیر نہیں تھا، میرا وجدان نہ جانے کیوں مجھے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اس پر اسرار عورت کا اس قتل سے ضرور کوئی ایسا تعلق تھا، جس کے دھاگے لپٹی اور ریحان کے ماضی سے جوئے ہوئے تھے۔ میں شہر سے ساحل کی طرف جائے والی آخری بس لے کر جب ساحل پر اترتا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے میں سلطان بابا کو بتا گیا تھا، پھر بھی وہ مسجد کے باہر مجھے اپنا انتظار کرتے ملے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ہلاکت سی آ گئی۔ ”جانتے ہو مہاشا..... کسی استاد کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے.....؟“ میں ان کا منہ غما سمجھ کر مسکرایا۔ ”جب وہ اپنے کسی نالائق شاگرد کو اپنے راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔“ میری ”نالائق شاگرد“ والی اصطلاح پر وہ بھی مسکرا دیے۔ کال گڑھ سے نکلنے کے بعد میری زیادہ تر کوشش یہی رہی تھی کہ میں سلطان بابا کی طبیعت کے پیش نظر انہیں کم سے کم زحمت دوں۔ ڈاکٹروں نے بھی انہیں سختی سے آرام کی تلقین کی تھی، اس لیے میں حتی الامکان ان کے ذہن پر کبھی بھی طرح کا بوجھ ڈالنے سے احتراز کرتا، لیکن آج ان کی بات سن کر نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ سلطان بابا خود بھی دانستہ مجھے اس معاملے میں اپنا وجدان آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ شاید میری تربیت کا عملی دور شروع ہو چکا تھا اور اب زندگی کی گرہیں مجھے خود کھولنی تھیں۔

اگلی صبح فجر کے بعد میں ساحل پر چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ صبح کی اوس سے بھیگئی ٹھنڈی ریت، پاؤں کے تلوؤں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مجھے حکیم صاحب نے کل ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بھول ان کے، یہ میرے کم زور اعصاب کے لیے بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے دھوپ اور گرمی سے بھی خود کو قحطی الامکان بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شاید جنون اور تشش کا آپس میں کچھ گہرا تعلق تھا۔ پھر سورج کا تابناک زمین پر بننے کے چند لمحے بعد ہی، جب ابتدائی کرنیں شریں پنچوں کی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی زمین کو سب سے پہلے پھونکنے کے لیے لپک رہی تھیں اور میں اپنی چہل قدمی ختم کر کے حجرے میں جانے کے لیے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، تو میں نے اچانک اپنے شام والے تیر کو ٹھیک نشانے پر لگتے دیکھا۔ دور نیچے آتی کوتار کی سڑک پر سفید مرشدیز دوڑتی ہوئی اوپر پہاڑی کی جانب آ رہی تھی۔ یہ مرشدیز میں کل شام ہی ریحان کے پورچ میں کھڑی دیکھ چکا تھا۔ شاید شہر کے اندرونی راستوں کے لیے وہ یہی کار استعمال کرتا ہوگا۔ گاڑی چند لمحوں میں مسجد کے باہر ریت کے بڑے میدان میں پہنچ کر رک گئی اور اس میں سے ریحان کا درایور برآمد ہوا۔ وہ تنہا آیا تھا۔ ”چھوٹے صاحب تم سے کل شام نہ ملنے پر معذرت خواہ ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم چاہو تو ناشتا وہیں چل کر کر لینا۔“ سلطان بابا گاڑی کی آواز سن کر صحن ہی میں نکل آئے تھے۔ میں نے ان کی جانب دیکھا۔ انہوں نے رضامندی کے اظہار میں دھیرے سے سر ہلایا۔ ڈرائیور کا نام یعقوب تھا اور وہ راستہ بھر بالکل خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے، تو دربان نے بتایا کہ ریحان صاحب کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے گالف کورس میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہاں بیٹروں پر پھیلی ہوئی جدید وضع کی کوٹھی تھی، جس کے اندر ہی گھاس کے اتنے وسیع لان تھے کہ ایک بہت بڑے گھاس کے قطعے کو گالف کے کھیل کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا نے بھی فارم ہاؤس کے پیچھے ایک چھوٹا سا گالف کورس بنوا رکھا تھا، لیکن مجھے کبھی بھی اس دھیمے سے کھیل کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یعقوب کے ساتھ گاڑی سے اتر کر پھیلی جانب جاتے ہوئے میں نے ٹینس کورٹ اور باسکٹ بال کے پختہ میدان بھی بنے دیکھے۔ شاید ریحان اپنے تمام کھیلوں کے شوق گھر ہی میں پورے کر لیتا تھا۔ گھر کے اندر ہی ایک مصنوعی ندی بھی بنائی گئی تھی، جس پر بتائیل پار کرتے ہی دور بڑی بڑی منبر جھڑیوں کے نیچے ریحان اور دو افراد کا عملہ مجھے نظر آیا، جو ریحان کے گالف والی چھڑیوں کا بیگ اور گیند وغیرہ کھڑے تھے۔ ریحان نے ریت کے ایک چھوٹے سے مصنوعی ڈھیر کے پیچھے پڑی گیند کو بہت احتیاط سے تاک کر چھڑی کی ضرب لگا کر اچھالا اور گیند کچھ دور ایک چھوٹی سی ڈھلوان پر بنے ایک سفید گول سوراخ میں غائب ہو گئی۔ عملے نے سناٹے جملوں سے اپنے صاحب کی پزیرائی کی۔ مجھے دیکھ کر ریحان نے چھڑی عملے کے حوالے کی اور اپنے ہاتھوں پر پہنے چھوٹے سفید دستا نے بھی یکے بعد دیگرے اُتار دیے۔ عملہ ادھر ادھر ہو گیا اور ڈرائیور یعقوب بھی ایک خاص مقام پر آ کر رُک گیا۔ میں دھیرے دھیرے ہلتا ہوا ریحان کے قریب پہنچا۔ اس کے سفید کرتے گھاس پر گیس کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اس نے ہنر پر پنا سے جوس کے گلاس کے اوپر سے پلاسٹک کا کور اُتارا ”ناشتا کرو گے؟“ ”نہیں..... میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے لیتا ہوں، ساتھ میں رات کی باسی روٹی کا ایک بچا ہوا ٹکڑا۔“ ریحان نے جوس کا ایک لمبا سا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اُتارا اور قریب پڑی رس بھری کی پلیٹ سے ایک تازہ رس بھری اٹھا کر اپنے منہ میں رکھی۔ وہ حسب معمول کھو یا کھو یا سا تھا۔ جیسے مجھ سے نہیں، مجھ سے پرے کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہو۔ ”کیا مذہب کے لیے یہ جوگ لازمی ہوتا ہے؟ میں یعقوب کی کل کی پیسوں والی حرکت پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے رحمن صاحب نے بتایا تھا کہ تم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ تمہیں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ کل تم کچھ اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ تم چاہو تو ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔“ ریحان نے اپنے اندر کی بے چینی کو اپنے سر دروئے سے بخوبی ڈھانپ رکھا تھا، لیکن اس کے لہجے کی لرزش کو میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید لیلیٰ اس کی ایسی کمزوری تھی، جس کا ذکر آتے ہی وہ خود اپنے بنائے پہرے پھلانگ کر اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن عمر بھر کی پروٹی خاں دار تاروں کو کاٹنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے غور سے اس کے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو دیکھا۔ ”آپ نے یہی بات گزشتہ شام کیوں نہیں سنی.....؟ میں لیلیٰ کے آخری لمحات کا واحد معنی شاہد ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام باریکیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع رکھ سکوں۔ اس لیے میں شام ڈھلے آپ کے دروازے تک آیا تھا۔“ ریحان نے اپنے لہجے کی تخی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ ”تمہیں ایک چھوٹی سی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ میں شام ڈھلنے کے بعد کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ میرے کاروباری حلقے میں بھی سب ہی کو یہ بات پتا ہے اور میں اپنے معمول کے خلاف کبھی نہیں جاتا۔“ ”کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ ریحان کی آواز بلند ہو گئی ”نہیں..... میں اپنے ذاتی معاملات پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا تم بھی اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرو۔“ میں نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے، ”بہتر ہے..... اگر ہم دونوں کے درمیان اعتماد کا اسی قدر فقدان ہے، تو پھر میری یہاں موجودگی بھی بے معنی ہے۔“ ریحان نے مجھے آواز دی ”سنو..... تم..... تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا تعلق میرے بچپن کے ایک خوف سے ہے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کسی طرح اپنے اس ہسٹریا پر قابو پاسکوں..... لیکن فی الحال میرے لیے اس موضوع پر بات کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ امید ہے اب تم مزید اصرار نہیں کرو گے۔“ میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس وقت روئے زمین پر اس سے زیادہ مجبور انسان شاید اور کوئی نہ ہوگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یقیناً جانو، کل جب سے مجھے تمہارا پیغام ملا کہ تم لیلیٰ کی آخری سانسوں کے شاہد ہو اور مجھے اُس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہو، تو میں رات بھر سو نہیں پایا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ محبت کس قدر ظالم اور جابر جذبہ ہوتا ہے۔ چاہے اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی، لیکن اس سے متعلق ہر ذکر، ہر یاد میرے لیے پہلے سے کہیں قیمتی ہو گئی ہے۔ میں اپنی تمام دولت دے کر بھی اس سے تجوی چھوٹی سے چھوٹی بات، ہر یاد اپنے دل کی پٹاری میں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، تمہیں روپے پیسے یا کسی صلے کی حرص نہیں ہے، لیکن میں تمہیں دل سے نکلی دعا کا خزانہ تو دے سکتا ہوں۔ کاش تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی، تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔“ ریحان اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے نہ جانے کتنی دور سے دوڑ کر آیا ہو۔ تو اب نوبت یہ آ گئی تھی کہ لوگ میرے ٹیلیے کو دیکھ کر مجھے محبت کی دہائی دینے لگے تھے۔ بہر حال، ریحان نے لیلیٰ کے لیے اپنے جذبات کھول کر بیان کر دیے تھے۔ مجھے اس کے لہجے میں کوئی کھوٹ محسوس نہیں

ہوا۔ ویسے بھی محبت کرنے والے اپنے اندر کوئی کھوٹ لکھنے پال سکتے ہیں۔ محبت ہمارے اندر اتنی جگہ ہی کہاں رہے دیتی ہے کہ کوئی اور جذبہ پہنچ سکے؟ محبت ہمیں اندر سے بھر دیتی ہے، مکمل کر دیتی ہے۔ ریمان بھی اندر سے مکمل تھا۔ لیلیٰ کی محبت نے اس کے اندر کسی نچل کپٹ کا ناندہ نکالی ہی نہیں چھوڑا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں یہ خوف کیسا تھا۔ یہ اذیت کیسی تھی، جو اسے اپنا درد اندر دبائے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا اور ریمان کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا۔ ”لیلیٰ نے مجھ سے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی سانسیں ہار گئی۔“ ریمان نے تڑپ کر میرے دونوں کانڈھے اتنی زور سے پکڑ لیے کہ اس کی انگلیاں میرے شانوں میں بیوست ہوئے نکلیں۔ ”کیا..... لیلیٰ نے تم سے کیا کہا تھا..... مجھے بتاؤ..... خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ.....“ اور ٹھیک یہی وہ لکھ تھا، جب میرے ذہن میں یہ یک وقت بہت سے جھماکے ہوئے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ تھا، لیکن ریمان کی آنکھوں نے میرے اندر نہ جانے ایک ہی بل میں کتنی بھارتیں بھر دیں۔ شاید قدرت یہ یک وقت مجھ سے میری فرزانگی چھین بھی رہی تھی اور میرے اندر دیوانگی کے ساتھ ساتھ ایک ان جانی روشنی بھی کسی درز سے مشتعل چمکن کر آ رہی تھی۔ میں دھیرے سے بولا ”لیلیٰ نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔ ریمان کے سر پر بیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے سے حملہ کر دیا ہو۔ وہ اپنا سر تھام کر وہیں کرسی پر گر گیا۔ دور کھڑے یعقوب کے سہمت وجود میں بے چینی سے حرکت پیدا ہوئی، لیکن شاید اس کی حدود وہیں تک تھی۔ بادل ٹھوسا وہ پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ریمان کے چہرے پر مٹی رنگ آ کر گزر گئے اور اس کے ماتھے پر پسینے کی ہوندیں اتنی جلدی نمودار ہوئیں، جیسے کوئی کسی گھیلے اٹھنے کو دبا دے۔ پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز لرز رہی تھی ”لیکن..... وہ کس کو معاف کرنے کی بات کر رہی تھی.....“ ”یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید اُسی ان جان عورت کو، جسے اس رات پہاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔“ ریمان بالکل ہی پُپ ہو گیا۔ میرے مزید وہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ریمان کو لیلیٰ کی یادوں کی بارات کو ڈولی چڑھانے میں گھنٹوں لگ جائیں گے۔ میں نے یعقوب سے کہا کہ وہ اپنے صاحب کا خیال رکھے، میں بس لے کر ہستی چلا جاؤں گا۔ واپسی پر آتے ہوئے میں تھانہ ماہی کے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ اسماعیل سنتری کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر میں واپس ہمتی آ گیا۔ جانے اُس دن گرمی ہی کچھ زیادہ تھی یا پھر خود میرا ہی دم، جہیں سے گھٹا جا رہا تھا۔ وہی ایک عجیب سی بے چینی چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی تھی، جو مجھے بیٹھ۔ یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ کچھ اُن ہوتی ہوئے کو ہے۔ شام تک میں بالکل ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ مجھے سلطان بابا نے بتایا تھا کہ پیش کوئی، الہام اور وجدان کا خود بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ منوں اور منوں جیسا وزنی اور ہمارے کوئل انسانی وجود پر ایسے لحات بے حد کراں اور بھاری کزرتے ہیں، تو کیا میرے شانوں کو بھی اس وجدان کا بھاری وزن توڑ رہا تھا۔ آج ہفتے کی رات تھی، لہذا مسائل پر اور پہاڑی نیلے پر غیر معمولی چہل قدمی تھی۔ کافی خاندان چھوٹے بچوں سمیت ساحل کی سیر کو آئے ہوئے تھے۔ مغرب سہر آگئی تھی، لیکن ابھی تک کافی لوگ ساحل کی اس ویران پٹی کے ارد گرد بکھرے تھے۔ نماز کے بعد میرے اندر کی بے چینی نے مجھے زیادہ ستایا تو میں نیلے کی چوٹی کی جانب چلا گیا۔

گنگا اندھیرا چھانچکا تھا۔ لوگ ادھر ادھر فاصلے پر ٹولیوں میں بیٹھے بس بول رہے تھے، مشروبات پی رہے تھے، اپنے بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے تھے۔ میں ان سب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا اور دور پہاڑی سے نیچے بھاگ اُڑاتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ وہی سمندر، جس کے دوسرے کنارے پر زہرہ رہتی تھی۔ جانے سلطان بابا نے اسے سیرا پیغام بھیجا ہوگا یا نہیں۔ میرے اندر زہرہ کو براہ راست مخاطب کرنے کی جھجک آج بھی روزِ اوّل کی طرح موجود تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی نے میری پشت پر موجود نیلے کے پیچھے سے دھیرے سے آواز دی ”عبداللہ“ میں چونک کر پلٹا، لیکن اندھیرے کی وجہ سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اپنا دھمک بکھ کر پھر سے سمندر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔ ”عبداللہ“ عجیب سی کرخت۔ لیکن نروانی آواز کے تعاقب میں، میں نے ایک بار پھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے میرے تمام جسم کا خون ایک ہی پل میں میری نگوںوں میں جم گیا۔ اپنا آدھا چہرہ سرخ پلوں میں پھپھائے اور اپنے وجود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھکے، وہ چٹان کی آڑ میں کھڑی تھی۔ ہاں..... یہ وہی تھی، جسے اس رات میں نے اس جگہ اپنی سرخ سینڈل کی ایڑی ٹوٹی جھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں پولیس اور بد بھگ رہی تھی اور جسے لیلیٰ کے قتل کی رات چوٹی کی جانب آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ اس طرح مٹھپ کر کھڑی تھی کہ کچھ دور سو جو ایک خاندان کو اس بات کی بھجک بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہاں کوئی اور موجود ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اندھیرا اکہرا ہو چکا تھا اور ہماری باتوں کی آواز بھی بہ مشکل ہی وہاں تک پہنچتی۔ میرے حواس ابھی تک جاگ رہے تھے۔ ”تم اس روز بھاگ کیوں گئی تھیں.....؟“ وہ غزائی ”میرے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ریمان سے دور رہو۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو، ورنہ جہاں ایک جان گئی ہے، وہاں دوسری بھی جا سکتی ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیا ”تو میرا شک کچھ ہے۔ لیلیٰ کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے۔“ وہ دبی آواز میں چلائی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا، جیسے وہ آواز کا ذکر بول رہی ہے ”تم اپنے کام سے کام رکھو مولوی..... اور تم نے ریمان سے جھوٹ کیاں ہوا کہ اس رات لیلیٰ نے تم سے کوئی بات کی تھی۔ میں اسی نیلے پر سو جوتھی، جب وہ نیچے گری تھی۔ اس وقت نیچے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اسے نہیں مارا، لیکن اگر وہ میرے اور ریمان کے درمیان آئے سے باز نہ آتی، تو میں واقعی اسے قتل کر دیتی۔ اس کی آواز میں اس قدر نفاس تھی کہ میں اندر تک لرز کر رہ گیا۔ اس نے آج بھی اپنا آدھا چہرہ پوری طرح ڈھک رکھا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی شخصیت میں کبھی ہوشی کی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر غزائی ”میں تمہیں آج آخری بار منہ بہ منہ کہنے آئی ہوں کہ اگر تم نے وہ بارہ ریمان کے دل میں اس منہوں لیلیٰ کی محبت پکانے کی کوشش کی، تو اگلا نمبر تمہارا ہی ہوگا۔“ اچانک تین چار بچے اپنی لینڈ کے پیچھے پیچھے چوٹی کی جانب دوڑے اور ان کی مائیں انہیں روکنے کے لیے ان کی طرف نکلیں، جو ٹہنی پندرہ لوگ ہمارے درمیان حائل ہوئے اور ایک لمبے لمبے لمبے میری توجہ دیتی، تو میں نے نظراٹھا کر دیکھا، تو وہ کسی چھٹاویں کی طرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر چٹان کے پیچھے پہنچا۔ مجھے دور اندھیرے میں ایک بوجھ لگا تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس جانب بڑھتا نظر آیا، جہاں کچھ ٹوٹوں کی گاڑیاں پارک تھیں۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جلدی میں اُس کی جانب دوڑا۔ آج وہ کسی دوسری گاڑی میں آئی تھی۔ شاید اسے پولیس کے سپاہیوں نے پکڑ لیا تھا، لیکن وہ شاعرانہ تھی۔ اس نے ساحل پر آنے کے لیے ہفتے کی شام کا انتخاب کیا تھا، جب دیکھ ایڈمنسٹرانے کے لیے شہر کے بہت سے گھرانے اس پوائنٹ کا رخ کر چکے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارت کر چکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کی گاڑی فرار لے بھرنے لگی۔ دھنکے اندھیرے میں ٹھوکر لگی اور میں سڑک کے بل رہنے پر مجبور کیا۔ اٹھتے وقت میری نظریات میں دھنسی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی اور میری آنکھیں پھری ہو گئیں۔ میں وہیں ڈھکے گیا۔ میں جان پکا تھا کہ وہ عورت کون تھی۔

ایک خاک اسر تو جوانی کا فضاں..... جو خدا کو اپنی ہب رگ سے کچھ دور ملاں رہا تھا



ہاشم ندیم

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”منڈے ہنگرین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم نے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”چھین کا بمبر“ بھی چھپنے کے بعد بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سمرے کے مطابق ”عبداللہ“ وہ حاضر کا بہترین مہر و معروف سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ چل رہا ہے کہ جہاں اسے ہر لمحے دلی، عشق، حقیقی کی غی غی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ سب سب سبائی آگئی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، لیکن اسے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک کے لیے راز کھلتے نہیں۔ اسی متنازع دنیا کے سب سے بے بہدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑا ہے۔ ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، پاکہ مختلف انداز، نئے سب ناسل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک طبعی ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مطالبہ کر سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

اس رات میں ایک بل کے لیے بھی پلک نہیں جھپکا پایا۔ زندگی کے تکتے زاویے اور محبت نامی اس طہریت کے تکتے رخ ہو سکتے ہیں، شاید یہ فانا نام میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ کم از کم میں نے تو جب بھی سوچا کرا آخری صدمہ چلا کہ شاید یہ باپ بند ہوا، ٹھیک اسی لمحے خود کو پھر سے پہلے صدمے پر پایا۔ اگلی صبح میں نے ڈاکے خانہ کھلتے ہی سب سے پہلا فون رومن صاحب کو کیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں قہانہ مای میں ان کے حاشے پہلا تھا۔ میری باسٹن کمران کی آنکھیں پھٹتی چلی گئیں۔ حسب معمول ان کا چہرہ سگریٹ کے نیلے دھوئیں کے پار و حید میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ ”تم جانتے ہو تم جس جگہ گھسے رات کو چھاپ مارنے کا کہہ رہے ہو وہاں دن میں باقاعدہ اجازت لے کر جانے کے لیے بھی نہ جانے کتنے ایوانوں کی گھنٹیاں بلانا پڑتی ہیں۔ مجھے اچھے سے اجازت ملنا تو ضرور اس بات کا ذکر کرتے ہی ختم ہو جاتا۔“ لیکن آپ کی اسے غصے کی لہری میں چند افسرانہ بالا تو ایسے ہوں گے، جن پر آپ کا بھرم اور اعتماد قائم ہو گا۔ کیا آپ انہیں بھی مدد کے لیے نہیں پکار سکتے۔ آپ بہر حال اپنا فرض ہی تو پورا کریں گے یا پھر ملک آپ کو صرف وہاں کارروائی کی اجازت دیتا ہے، جہاں کارروائی کرنے سے کسی ایوان کی گھنٹی نہ بیتی ہو۔“ رومن صاحب نے ایک لمبا سانس لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں مٹل دیا۔ ”بات سچ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ہماری ان دیکسی حدیں ہمیشہ ہی سے مقرر ہیں۔“ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے ”ٹھیک ہے..... آج یہ جو ابھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے وجدان پر بھروسہ کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ سمجھائی بھی نہیں دے رہا، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہاتھ دوسرا بھی تو چھاپنا تو حکام کو مجھے فارغ کرنے میں پوچھیں گھنٹوں سے بھی کم وقت لگے گا اور ایسی صورت میں، میں بھی تمہاری ہی مہر کے حجرے میں اپنا ستر ڈالوں گا۔“ انہوں نے چند فون نمبر کھائے اور پھر شام ڈھلتے ہی ہم کچھ ضروری نفی کے ساتھ اپنی منزل کے دروازے پر موجود تھے۔ ممکنہ مزاحمت کے بعد دروازہ کھلوایا گیا۔ رومن صاحب نے اپنے حملے کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک وہ خود کسی سے بات کر دے گا نہ کہیں، تب تک کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا پیغام یا فون انہیں منتقل نہ کیا جائے۔ گھر میں جب سنا گا طاعاری تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تو مرکزی عمارت کے دروازے کو منتظر پایا۔ رومن صاحب کے اشارے پر دو مضبوط قدم کے پامیوں نے کافی مشقت کے بعد تالا توڑ ڈالا۔ اندرونی جانب سے دو تین سے ہوئے نوکر اور خدام کھڑے جو باورچی خانے کے دروازے سے باہر نکلنے کی جگہ دوہیں تھے۔ انہیں اطمینان دلایا گیا کہ کوئی کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ اوپر کی منزل کے کمرے کھلے پڑے تھے۔ مجھے ایک پردے کے پیچھے سے دو کھٹکھروؤں کی جھڑپاں بھی چھلک نظر آئیں۔ اگلا کمرہ جیونا سا ہال تھا، جہاں طبقہ اور ہارسوئم سلپے سے پڑے تھے۔ شاید یہاں رقص کی مشق کی جاتی ہو۔ ہمارے اس گھر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک لگا تار رومن صاحب کے ڈرامیور، گادری، قہانے دار اور دیگر حملے کے دستی وائرلیس سینٹ (واکی ٹاک) پر درجنوں پیغام وصول ہو چکے تھے۔ جس میں رومن صاحب کو اعلیٰ حکام اور شہر کے مشہور اور آئی جی وغیرہ کی طرف سے مسلسل ہدایت کی جارہی تھی کہ وہ جہاں بھی ہوں، اپنا مشن ختم کر کے فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔ رفتہ رفتہ یہ پیغام وحمکیوں کی صورت اختیار کر گئے، لیکن ایس پی صاحب شاید اپنی آخری مشق بھی جلا کر کھاتے تھے۔ پولیس کے جوان مختلف دروازوں کو دھکیلتے جا رہے تھے اور ہر کمرے پر حد سے زیادہ پولیس سائز و سائبان سے آراستہ اور بہترین آرائش کا شاہ کار تھا۔ کمروں کی کلر اسکیم پر بھی بہت دھیان دیا گیا تھا، لیکن سبھی کمرے خالی تھے اور کچھ آٹری کمرہ بند تھا۔ رومن صاحب نے اندر دو دفتر کو دیکھ کر دھکا دیا جائے درودہ آسے توڑ دیں گے۔ اندر سے آواز ابھری ”توڑنا انتظار کریں.....“ کچھ دیر بعد کسی کے تھکے قدم گھٹنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ زمانہ کھڑے اور کامیٹکس اور اداکار کھڑے پڑے تھے۔ کمرے کی ڈریسنگ ٹیبل پر دنیا کی بہترین کمینوں کا میک اپ کا سامان بچا ہوا تھا۔ ایک پردے کے پیچھے سے مجھے دو سرخ سینڈل بھی چھانکے ہوئے نظر آ گئے، لیکن ان کی ایک ایسی اس وقت پولیس کی قویل میں تھی۔ ایک عورت دروازہ کھولنے کے بعد کمرے میں اندر بھاگ کر کے دوبارے سماج و یک کر بیٹھ گئی تھی۔ رومن صاحب کے اشارے پر حملے کے کسی فرد نے کمرے کی قی جلائی تو پہلے ہماری نظر کمرے کے سامان اور پھر اس کھنکڑے سے ہو کر پڑی۔ رومن صاحب نے کڑک کر آواز کھڑا ہونے کو کہا، تو گھنٹوں میں پچھلایک چہرہ دھیرے دھیرے اٹھا اور پولیس کا سامان رومن صاحب سمیت چلا بکا رہ گیا۔ عورت کے گھٹس میں ہمارے سامنے ریمان کھڑا تھا اور اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

آگے کی کہانی زیادہ پے پیچہ نہیں تھی۔ رومن صاحب نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ انہما اور مینڈ یا تک اس چھاپے کی خبر نہ پہنچے، لیکن پھر بھی صبح کے تمام اخبارات کی شہر سرفی ملک کے بڑے صنعت کار ریمان کی اپنی منگیتر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتاری ہی کی تھی۔ ایک رات پہلے جب میں اس

عورت کا بچھا کرتے ہوئے کر پڑا تھا، جب نیچے ریت میں جیسے سفید کرکچ کے جوتوں کا ایک سول نظر آیا تھا۔ یہ اُن ہی جوتوں میں سے ایک کا سول تھا، جو میں اسی صبح ریحان کو کال فک کورس میں پہنچے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ریحان گرفتار ہوا تو رات بھر نہایت بے چینی رہا اور اپنا وجود چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا برتاؤ بھی بہت عجیب تھا۔ کبھی وہ لڑائی آواز میں پولیس کے حملے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا، تو کبھی ان کی منت کرتا کہ اسے واپس جانے دیا جائے، کیوں کہ گھر میں ”ریحان“ اکلیا گھبرا رہا ہوگا۔

میں نے رُمن صاحب سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس کی یہ حالت عام نہ ہونے پائے اور ہمیں ہر حال میں ریحان کا پردہ رکھنا ہوگا۔ اگلی صبح تک ریحان بالکل لائق ہو چکا تھا اور ہر سوال کے جواب میں صرف ظاہری میں گھورتا رہتا۔ اس نے صبح ہی اقرار کر لیا کہ ”وہ لیلیٰ کو مارنا نہیں چاہتی تھی، لیکن ہاتھ پائی کے دوران لیلیٰ کا پاؤں پھسلا اور وہ اونچائی سے گر گئی۔“ ریحان کے بیان سے لگتا تھا، جیسے وہ کسی تیسری ہستی کے بارے میں بیان دے رہا ہو، لیکن ”وہ“ کون تھی، جو ریحان کے اندر برسوں سے دبائے بیٹھی تھی۔ یہ وہ سمجھتا تھا، جس کا سراغ ماہر نفسیات دانوں کی سات رُکنی ٹیم پورے پانچ دن بعد لگا پائی۔

تفتیش کا آغاز ریحان کے بچپن سے ہوا۔ منہ میں سونے کا بیج لے کر پیدا ہونے والا ریحان، ماں باپ کی آنکھوں کا تار تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کبھی اسے بیٹے کا پیار دیتی اور کبھی بیٹی کا سنگھار کر کے اس کے ساتھ کھیلتی، لیکن منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے بیٹے کو گھر سے باہر کرم ہی لگا لیا جاتا۔ پھر نہ جانے کب ریحان کے باپ غیاث الدین کی زندگی میں ایک کنول نامی لڑکی، جو اس کی پرانی سنگھریڑی کی جگہ صرف چند دن کے لیے آئی تھی، داخل ہو گئی اور دھیرے دھیرے اس کے دل و دماغ ہی پر نہیں، پورے کار و بار پر قابض ہوتی چلی گئی۔ غیاث کا اپنی بیوی سے آئے دن جھگڑا رہنے لگا اور چار سالہ ریحان پردوں کے پیچھے بٹھپا اپنے ماں باپ کو جیج جیج کر لڑتے ہوئے دیکھ کر روتا رہتا۔ بات اتنی بڑھی کہ غیاث اپنی بیوی پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا اور ایک دن تو ریحان نے اپنے باپ کو اپنی ماں کا گلا دہانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بات کورٹ پکھری تک چلی گئی اور ریحان کی ماں کو اس کے والدین آکر اپنے ساتھ لے گئے۔ ریحان کو اس کے باپ نے جانے نہیں دیا اور معصوم ریحان اپنے گھر کے پورچ میں کھڑا رہتے ہوئے اپنی ماں کو ٹانگی کا ریش بچھلی سیٹ پر ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی ماں کی آنکھوں سے ٹپکے آغری دواؤں ہمیشہ کے لیے ریحان کی روح کو جھگو گئے۔ شاید پہلی مرتبہ اسی دن اس کے اندر کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، جس میں سے ایک حصہ ریحان کے پاس رہ گیا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لیے اس کی ماں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

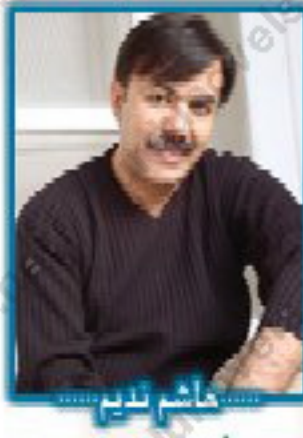
باپ نے مجھے ریحان کو، رشتوں اور پردوں کے پیچھے چھپ کر اپنی ماں کے لیے روتے ہوئے دیکھا، تو اپنے وقار دار رُتنیہ یعقوب کو ہدایت کی کہ اس کے دفتر سے واپس آنے تک وہی ریحان کے بچنے کا کچھ سامان کیا کرے۔ ڈرائیور کو اور تو کچھ نہ سوجھی، دو دنوں میں ریحان کو لیے بٹلے کے پیچھے اپنے سرزنٹ کو انڈر میں لے آتا، جہاں اس کی بیوی اور چھ بیٹیاں ہر ممکن کوشش کرتیں کہ ان کے صاحب کے لاڈلے کا دل ہللا رہے، لڑکیوں کے کھیل زیادہ تر وہی ہوتے، گڑیا اور کڈے کی شادی، کوکھلا چھپا کی، ہنڈکلیا بنانا یا پھر ایک دوسرے کو سستی ٹیل پالش اور سرنی سے غوارنا۔ سوہرہ ریحان بھی انہی مشغلوں میں گم ہوتا گیا۔ تیسرے ماہ ریحان کی سگی ماں کو طلاق بھیجنے کے ساتھ ہی اُس کا باپ غیاث، کنول کو ریحان کی سوتیلی ماں کے روپ میں گھر لے آیا۔ کنول نے دو چار دن تو غیاث الدین کو دکھانے کے لیے ریحان سے جھوٹا پار بنایا، لیکن پھر جلد ہی وہ اس ٹانگ سے اُوب گئی اور ریحان اُسے کاسنے کی طرح کھٹکے لگا۔ بات صرف سوتیلی بہن کی حد تک ہوتی، تو بھی کنول شاید ریحان کی موجودگی کا کڑوا ٹھونٹ پی ہی لیتی، لیکن کچھ عرصے کے بعد غیاث الدین کی فیکٹری کا نو جوان شاہر غیاث کی غیر موجودگی میں کسی شہ کی بھانے کوٹھی کے پتھر لگانے لگا، تو ایسے میں کنول کو ریحان کی گھر میں موجودگی نہ ہر گز تھی۔ ایسے میں یا تو ریحان کو اپنے اس کے کمرے میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بند کر دیا جاتا یا پھر کوٹھی کے پتھر لگانے سے بچ دیا جاتا کہ وہ جا کر یعقوب کی بیٹیوں سے کھیلے۔ اس تمام احتیاط کے باوجود ریحان کی سوتیلی ماں اسے مختلف طریقوں سے ڈرائی برائی اور اسے میڑھیوں سے جوئے کمرے کے پیچھے والے قہ خانے میں بند کرنے کی دھمکی دیتی، تاکہ وہ اپنے باپ کی رات گئے والی پر فہر کی آمد کا ذکر نہ کرے۔ ایسے مواقع پر اگر یعقوب کی گھر والی اور بیٹیاں کہیں گئی ہوتیں تو ریحان اپنے کمرے میں بند خود ہی گڑیا اور کڈے کا کھیل کھیلتا رہتا۔ پھر اس کے ہاتھ کہیں سے لپ اسٹک لگ گئی، تو وہ اپنی ہاتھوں کی طرح ہونٹوں پر سرخنی لگانے میں لگن رہتا۔ رفتہ رفتہ اس نے آنکھوں میں کاہل بھرا اور نل پالش لگانا بھی سیکھ لیا، پھر ایک دن اسے سوتیلی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کے سامان کی پوری کٹ ہی نظر آگئی، تو وہ چپکے سے وہ بھی اپنے کمرے میں اٹھالایا اور کئی دن تک مختلف ٹیبلز سے اپنا چہرہ نکھین کرتا رہا۔ بد قسمتی سے اس کی یہ چوری جلد ہی پکڑ لی گئی اور اس کی ماں لے، جو نوکرانی پر اس کٹ کی گم شدگی پر کئی دن سے برس رہی تھی، ریحان کو میک اپ استعمال کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ سوتیلی ماں کا قبر اس دن عروج پر تھا اور اس نے سزا کے طور پر مجھے ریحان کو اس کی ٹیبلز کا سب سے بڑا خوف اسی تہہ خانے میں قید کر کے بخش دیا۔ جس تہہ خانے کے ذکر ہی سے ریحان بھاگ کر اپنے کمرے کی الہاری کے پیچھے بٹھپ جاتا تھا۔ وہ دو گھنٹے اس تاریک قہ خانے میں ریحان نے کس طرح روتے، سن سکتے اور ڈرے کا بچتے گزارے، اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں، جن کی اپنی کوئی اولاد ہو۔ اس قہ خانے کی دیواروں پر اس روز اندھیرے میں ریحان نے اتنے عجیب و غریب رُوح لے بٹے اور مٹے دیکھے کہ اس دن، اس کی اپنی شخصیت ہی ایک نیا عالم بن کر رہ گئی۔ شام کو باپ کے آنے سے پہلے سوتیلی ماں ریحان کے جسم کو تہہ خانے سے باہر کھینچ لائی، لیکن اس کی روح دیں اندھیرے میں بھٹکتی رہ گئی۔ اس رات کے بعد سے اندھیرا ریحان کو ڈرنے لگا اور وہ سوچے وقت بھی کمرے کی تمام بیتیاں جلائے رکھنے کا عادی ہو گیا۔ ایسے میں کمرے میں بڑا آئینہ ریحان کا سب سے قریبی دوست بن گیا۔ ریحان کو میک اپ کا شوق تو اپنی ہاتھوں سے پہلے ہی مل چکا تھا، اب اس تہائی کو دور کرنے کے لیے اور اپنے راتوں کے خوف کو مٹانے کے لیے اس نے اپنے ہی کمرے میں ایک دوسری دنیا آباد کر لی تھی، کیوں کہ اس کے باپ کو اتنی فرصت تھی کہ وہ اپنے خوف زدہ بیٹے کے پاس دو کھڑی بیٹھ کر دیکھتی باتیں ہی کر لیتا یا اسے لوری سنا کر سلا دیتا۔ ایسے میں ریحان نے اپنے خوف کو لوری دینے والی خود ایجاد کر لی۔ رات گئے جب سارے گھر کی بیتیاں گھب جاتیں، تو وہ پہلے

سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھ جاتا اور ادھر ادھر سے چرائی کرتی اور غارہ اپنے چہرے پر منظر کر رہے آدھے چہرے کا میک اپ کرتا۔ پھر یہی آدھا چہرہ اس کی ماں، بہن، دوست، سب ہی کچھ بن جاتا۔ دانتی سے والی عورت، ریحان سے باتیں کرتی، اُسے کہانیاں اور لطیفے سناتی اور چہرے کے پائیس جسے والا ریحان خوش ہوتا، ہنستا اور اپنے چہرے کے داغے جسے سے وہ سب کہتا، جو وہ اپنی سگی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ ریحان کو جب عورت سے بات کرنی ہوتی، تو وہ اپنے چہرے کا بایاں حصہ بونٹا میک اپ سادہ رہتا، اُسے آئینے کے رخ پر رکھتا اور سوال کرتا، خدا کرتا، کہانیاں اور لوری سننے کی فرمائش کرتا اور پھر جواب کے لیے، چہرے کا دایاں حصہ ایسے رخ پر آئینے کو دکھاتا کہ صرف وہ مہربان عورت ہی اسے شیشے میں جھانکتی نظر آتی، جو ریحان کی سب ضدیں، ہر فرمائش پوری کرتی اور پھر جب رات نصف سے بھی زیادہ بیت جاتی، تو ریحان کی دوست، ماں، بہن اور ہم درد اُسے ایک اچھی سی لوری سناتی۔ وہ لوری، جو ریحان اپنی سگی ماں سے سنا کرتا تھا اور پھر آخر کار ریحان کو نیند آ جاتی۔ اس تمام عمر سے میں ریحان کے نکمرے کا دروازہ اندر سے منظر رکھتا رہتا اور صبح تب ہی نکلتا، جب وہ عورت ریحان کا ہاتھ چوم کر اگلی شام تک کے لیے رخصت ہو جاتی۔ اب ریحان کو باقی دنیا سے شہید بے زاریت اور نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ بس ایک یعقوب اور اس کا کھرا بھائی تھا۔ جہاں کچھ دیر کے لیے ریحان کا دل لگ جاتا تھا، لیکن اب وہاں سے بھی ریحان ہر شام ہی بھاگنے کی کرتا، کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی اس کی پیادہ اور مہربان دوست نے جو آنا ہوتا تھا۔

وہاں ریحان کی سوتیلی ماں کنول نے بھی ایک ہی بار بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک صبح جب گھر کے کچن اٹھے، تو تمام کھوپڑیوں اور زیورات سمیت بینک بینکس کو صاف پایا۔ اس دن کے بعد کنول اور فیکٹری کے ٹیبلر کی کبھی کبھی خیر خیر نہیں ملی۔ ریحان کا باپ اس صدمے سے شعلیں نہیں پایا۔ بات صرف پیسے کی ہوتی، تو وہ ایک سال ہی میں کھوئے ہوئے مال سے تین گنا زیادہ کمائے کی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اسے بستر پر ڈال دینے والا صدمہ بے وفا کی تھا۔ رفتہ رفتہ جب باتیں کھلنے لگیں، تو پتا چلا کہ کنول نے یہ سارا منصوبہ ہی اپنے چاہنے والے فیکٹری ٹیبلر کی وساطت سے بنایا تھا اور اس کی شادی سے لے کر اب تک ہر بات پہلے سے ایک منصوبے کے تحت طے شدہ تھی۔ ریحان کا باپ دوبارہ بستر سے نہیں اٹھ سکا اور پندرہ سالہ ریحان کو اپنے وفادار ذرا تیرہ کی سپردگی میں دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گیا۔ اس دوران ریحان کی سگی ماں کو تلاش کرنے کی بھی بہت کوشش کی گئی، مگر سب بے سود۔ یعقوب نے نمک کا حق ادا تو کیا، لیکن اب ریحان جوان ہو رہا تھا اور اس نے اپنے گرو اتنا مضبوط غول بنا رکھا تھا کہ اس کے دل کی بات کسی تک پہنچنا محال تھا۔ آخر کار، یعقوب کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی اپنے گھر سدھار گئی اور یعقوب کی بیوی کی موت کے بعد ریحان کی زندگی کا آخری روشن دان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، لیکن یعقوب کی بیوی مرتے مرتے اپنے شوہر کو اس کے چھوٹے صاحب کے اندر رملتی دو الگ شخصیات کا حال دے گئی، کیوں کہ اس نے بھی ایک ماں کی طرح ہی، ریحان کو پالا تھا، وہ گزشتہ کئی مہینوں سے، ریحان کی ہر شام شروع ہو جانے والی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یعقوب زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا، لیکن زمانہ شناس ضرور تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ریحان اپنے اندر اپنی اس عورت کے ساتھ اتنی دور آؤنگا ہے کہ اب اس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ ریحان نے شام کے بعد خود کو دھو کر غسل کاٹے دیا اور دھو کر اب صرف یعقوب ہی وہ واحد فرد تھا، جسے پتا تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد ریحان اور ریحان نہیں رہتا، اس کے اندر کی عورت باہر نکل آتی ہے۔ دل دھپ بات یہ تھی کہ ریحان کے اندر کی عورت کی عمر، ریحان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گھٹتی گئی۔ بچپن میں وہ اس کی ماں تھی، لڑکھپن میں دوست اور ہم درد اور جوانی میں وہ باقاعدہ ایک محبوبہ کے حقوق حاصل کر چکی تھی۔ دن میں اگر کھلے کی کسی لڑکی سے ریحان دو گھڑی تک نہ کہ بات کر لیتا یا کوئی ریحان کی شان دار شخصیت کو نظر بھر کر دیکھ لیتی، تو شام کو کمرے میں آنے کے بعد جب ریحان آئینے کے سامنے بیٹھتا، تو اس کی روح کی قابض باقاعدہ اس سے لڑتی جھگڑتی اور روٹھ جاتی۔ دونوں کے درمیان مکالمے کی صورت کچھ یوں بنتی کہ ریحان بائیں جانب چہرے کی اوٹ سے اس سے پوچھتا ”آج کچھ سی ہو، کوئی ناراضی ہے کیا؟“ داہنا میک اپ زدہ حصہ موند بنا کر کہتا ”تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو اس مصل بڑی شائستہ کے نگرے اٹھانے سے ہی فرصت نہیں۔“ ریحان اُسے سناتا ”اوہو..... اب جانے بھی دو، وہ نئی اکاؤنٹنٹ ہے۔ کچھ رہنمائی کی ضرورت تھی اُسے۔ سو، میں نے بتا دیا، اور نہ تم تو جانتی ہو کہ.....“ فوراً وہ پلٹ کر آئینے پر قابض ہو جاتی اور غصے سے کہتی ”ہاں ہاں..... تین چار ہزار کے غصے میں سے اسے اور کوئی نہیں ملا تھا، اپنی الجھن دور کرنے کے لیے۔ میں سب جانتی ہوں، ان عورتوں کے چلن..... ٹھیک ہے اگر تمہیں اس کی اتنی ہی فکر ہے تو پھر جاؤ۔ اس کی رہنمائی کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟“ ریحان بے بس ہو جاتا ”اوہو..... تم پھر روٹھ گئیں۔ اچھا بابا..... پکا وعدہ..... آئندہ کسی سے، کوئی کام کی بات بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب ناراضی ختم کر دو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ جو باقیہم رضا مندی کا اظہار بھی مصنوعی غصے سے کیا جاتا۔ ”خوب جانتی ہو میں یہ سب بہانے، تمہیں پتا ہے تاکہ میں تمہیں بھوکا سوتا نہیں دیکھ سکتی۔ تب ہی مجھے اتنا سنا تے ہو۔ اچھا چلو اب مذہب سو دو۔ اٹھ کر کھالو۔“ ریحان خوش ہو کر مسکرا دیتا اور وقتی طور پر جھگڑا ختم ہو جاتا، لیکن پھر چند دن بعد ایسی کوئی بات ہو جاتی اور پھر رات کے تھک سہی سکر چلتی روتی۔ عام دنیا کے لیے ریحان اندھیرے کے خوف کا ایک عام مریض تھا اور اس کے کاروباری حلقے میں سب ہی اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ ریحان صرف دن بھر کا کام کرنے والی ہے۔ ریحان نے کبھی دو تپاں پارٹنر پالے ہی نہیں تھے، جو اس کی پندرہ سالہ زندگی میں کسی قسم کی پہل چاہتے۔ وہ ہمیشہ سے تنہا ہی پندھتا اور تنہائی ہی اس کی سب سے بڑی رفیق تھی، لیکن پھر لیلی نام کی ایک مصدوم سی لڑکی اس کے مسئلے میں مداخلتی طور پر شامل ہوئی اور ریحان کی زندگی قتل قتل سی ہونے لگی۔ لیلی ریحان کی فرم کے سینئر ڈرافٹس مین کی بیٹی تھی، جو اپنے باپ کی ملازمت کی وجہ سے پندرہویں کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کا کام سنبھالنے کے لیے صرف دو ماہ کے عارضی سحابے پر کمپنی میں رکھی گئی تھی، لیکن شاید یہی دو ماہ ریحان کے اندر وہ اچھوٹا احساس جگانے کے لیے کافی تھے، جس سے وہ عمر بھر ان جان رہا تھا۔ پہلے پہل تو خود ریحان کو بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں اس کو ل ہی لڑکی کے اپنے آفس میں آنے پر ایک ان جانی سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی رات کی راز داں اور اپنے اندر کی عورت سے بھی کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔ ریحان ویسے بھی اپنے اسٹاف سے بہت کم بات کرتا تھا اور غواہین تو اس کے دفتر سے سات ڈر پر ہی گزارا کرتی تھیں، لیکن لیلی میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی، جو ریحان کو اس کی جانب کھینچنے لے جا رہی تھی۔ شاید اس کا عام لڑکیوں کی طرح ریحان کے ارد گرد چکر نہ کاٹنا ہی ریحان کو بھاگیا تھا، لیکن اس کے اندر والی سے یہ راز بھلا کہاں چھپ جاتا۔ اس رات پہلی بار ریحان کا آئینے میں بیٹھی اپنی اس ہم زاد سے جھگڑا ہوا۔ وہ اتنا گڑبی کہ اس نے کمرے کا سارا کالج توڑ ڈالا۔ کونھی میں اپنے سرورنٹ کو آرڈرز میں پڑے نوکر حیرت اور خوف سے اپنے صاحب کے کمرے میں اس عجیب و غریب شور مچا رہے کی دور سے آتی آوازیں سننے رہے، کیوں کہ انہیں شام کے بعد صاحب کے کمرے کی طرف جانے کی ضرورت تھی اور وہی وہ کونھی کے اندر دنی جیسے میں پاؤں دھر سکتے تھے۔ صرف یعقوب ہی تھا، جو ایسے مواقع پر اندر جا کر کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ عموماً نصف شب کے بعد کونھی سے گھٹکھروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی، لیکن اس رات کچھ عجیب سا ساٹا طاری رہا۔ ریحان اپنی ہم زاد کے اپنے اندر جھم لینے کے بعد زندگی میں پہلی بار اسی رات سو گیا تھا۔ اگلی صبح دفتر کھلتے ہی شدیدہ غصے سے عالم میں اس نے انٹرکام پر لیلی کو اپنے دفتر میں آنے کا کہا۔ لیلی دفتر میں داخل ہوئی، تو اس کی چیٹ ٹکلتے ٹکلتے رہ گئی۔

(باقی آئندہ)

اُک خاکِ اسرارِ جہان کا احسان..... جو خود کو اپنی جہد رنگ ہے، کچھ دور تلاش رہا تھا



.....حاشم ندیم.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منظرہ دار مارائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سندھے نیگن“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا نیکو نکل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسمز“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پڑائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک عالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دورِ حاضر کا بے حد مطلوب و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے کڑی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر لمحے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں منور کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق انجی اسرار و رموز کے گرد بچا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سر پہ یہ عہدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑا ہے۔ ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سبب ناکمل کے ساتھ... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک طبعہ ای میل آئی وی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے ”عبداللہ“ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

دنِ بھان شد یہ المیہ کے عالم میں جیسے خود اپنے آپ ہی سے لڑتے ہوئے نہ حال ہو کر اس طرح کڑی پڑھا سکا ہو ا تھا کہ اس کا سر ہیز کے کونے پر ایک گہا تھا۔ فوراً کہنی کے باہر ڈاکٹروں کی ٹیم کو طلب کیا گیا اور معالجِ خاص لے اسے شدید ذہنی تناؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اگلے ایک ہفتے تک کسی دفتری کام یا فائل کو ہاتھ نہ لگائے گا، لیکن ریحان بھلا کب مائے والا تھا۔ اسے اپنے کام سے خون کی حد تک لگاؤ تھا اور درحقیقت یہ کام ہی تو تھا، جنور ریحان کے دن کے آٹھ دس گھنٹے گزارنے میں اس کی مدد کرتا تھا۔ مجبوراً ہیڈ آفس کے جنرل شیگر کو ریحان کا کام سنبھالنے پر مجبورانے کا انتظام کرنا پڑا۔ جنرل شیگر ریحان کے باپ کے وفاداروں میں سے ایک تھا اور ریحان کو اس کی باقی ہی پڑی۔ یہی وہ سات دن تھے، جب لعلی ریحان کے حواس پر پوری طرح چھاتی گئی۔ ریحان کے اندر کا مصوم، ہا سا سچا، جس نے اپنی ماں کو دتے ہوئے خود سے دور جاتے دیکھ کر ہمیشہ گئے لیے کوئی اوٹ ڈھونڈ لی تھی۔ لعلی کو دیکھتے ہی جسم سے باہر نکل آتا۔ زندگی میں پہلی بار ریحان کے ہونٹوں پر وہی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اس کا دل بھی چاہنے لگا کہ وہ اپنے اندر کی مصوم ی خواتین اور باتیں کی سے ہانپے، لیکن یہ ساری خوشی اور سرشاری صرف سورج ڈھلنے سے پہلے تک ہی رہتی اور جب شام ڈھلے ریحان خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا، تو پھر وہی طوفان آجاتا۔ وہی اس کی ہم زاد کے شکوے، طعنے اور ٹھکڑے۔ اب تو وہ ریحان کے منانے سے بھی نہیں مانتی تھی۔ اس کا بس ایک ہی تھا نہا ہوتا کہ ریحان کسی بھی طرح لعلی کو کمپنی سے باہر نکال چھینے۔ ریحان اس کے سامنے عذر تراش تراش کر چھک جاتا، لیکن وہ رنجی اور ریحان سے لڑتی رہتی کہ ریحان اب اس سے احتیاج نہیں کرتا، جتنا لعلی کے آنے سے پہلے کرتا تھا۔ اس کی ہم زاد کو لعلی سے شدید نفرت ہوئے لگی تھی اور پھر جب ریحان کو ڈاکٹروں نے گھر پر مکمل آرام کا مشورہ دیا اور لعلی دفتر کے کچھ اہل کاروں کے ساتھ ضروری فائلوں پر مختل کردانے کو بھی بھیجے گئے تھے، وہ لعلی اور پھر جو نچال ہی آگیا۔ ہم زاد نے ریحان سے بات ڈیت، نگر کردی اور پورے تین دن تک ریحان کی پھر پور منت سماجت کے باوجود بھی پچھ سادھے بیٹھی آئینے سے ریحان کو نکلتی رہی۔ ریحان کی حالت ان تین دنوں میں مزید بگڑ گئی، کیوں کہ وہ ساری ساری رات اُسے منانے کے لیے رہتا رہتا۔ پھر جب ریحان نے اُس سے آخر کار یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی لعلی کو ملو دے دور کر دے گا، جب وہ ڈرامائی، لیکن جب تک لعلی ملو دے ریحان کی الجھی الجھی، خاموش اور کسی حد تک شرمیلی ہی شخصیت کے آگے دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ تمننوں اپنے شے کے نہیں کے بالکل سامنے راہ داری میں، دوسری جانب موجود ریحان کے آفس کے کانچ کی دیوار سے پرے اُسے مختلف کاموں میں الجھا ہوا دیکھتی رہتی۔ اُسے یہ نیکو یا نیکو یا، اپنے آپ سے باتیں کرتا اور لہجائے شائستہ اور نیکس عادات و اطوار والا نوجوان کسی اور ہی دنیا کا فرد دکھائی دیتا۔ اسی قرارت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ریحان اپنے اندر چلتے اس شدید انقباضی تمنا کا سامنا کرتے کرتے ٹوٹ کر بکھرے گئے بالکل قریب تھا، ٹھیک اُسی وقت لعلی نے آخر کار سے تمام لیا اور وہ ریحان، جو لعلی کو فوری سے فارغ کرنے کا لہر تیار کر دے بیٹھا تھا، اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بننے کا پیام دے بیٹھا۔ لعلی کی تو جیسے کا نکات ہی مکمل ہو گئی، لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، لعلی کی اُبھرتی بڑھتی گئیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی ٹیٹھے ٹھٹھائے ریحان کا رویہ بالکل ہی تبدیل ہو جاتا۔ کبھی کبھار جب وہ صبح اپنی سرخ انگارہ آنکلیں لیے در سے دفتر نکلتا، تو بالکل ہی سچے سے اکڑا ہوتا۔ ایسے میں اس کا رہتا، لعلی سے بالکل اجنبی والا ہو جاتا۔ اُس بے چاری کو کیا پتا کہ رات بھر اس کا ہم نفس کس عذاب سے گزر کر صبح کی پیر سی پھاٹک کر اس تک پہنچا ہے۔ لعلی شروع میں تو اُسے کام کے باوجود ریحان کی ازلی تمنا کی پندی کا کچھ احساس ہی سمجھتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ بات بننے کے بجائے گاڑتی چلی گئی۔ ان دونوں کی بجھت، خاص طور پر اس وقت طول پکڑ لیتی، جب لعلی ریحان کو شام ڈھلنے کے

بعد کہیں آؤ جنگ کے لیے لے جانے کی ضد کر بیٹھتی۔ اس کا اصرار کچھ بے جا بھی تو نہ ہوتا، کیوں کہ سارا دن تو ریحان دفتر کے کاموں اور میٹنگز ہی میں الجھا رہتا۔ بس، گھڑی دو گھڑی کے لیے دوپہر کے کھانے یا شام کی چائے پر ان دونوں کی ملاقات ہو پاتی۔ وہ بھی تمام دفتر کے عملے کے سامنے۔ اب بھلا ایسے موقع پر کوئی دل کی بات کیسے کی جاسکتی تھی، حالاں کہ تمام عملے کو بھی ریحان اور لیلیٰ کے مستقبل میں ہونے والے رشتے کے بارے میں خبر تھی اور درحقیقت سب ہی اس بات سے خوش بھی تھے، کیوں کہ ریحان نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے تمام عملے کی ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا، لیکن پھر بھی لیلیٰ کو ریحان سے کچھ ایسے لمحوں کی ہمیشہ ہی تمنا رہی، جب صرف وہ اور ریحان ہوں اور وہ دل کی ہر بات بتا کسی جھجک کے کہہ سکے، لیکن شام ہوتے ہی ریحان کے اندر جیسے تمام جہان کی بے چینیوں ہی بھر جاتی تھیں۔ عصر کے بعد تو وہ اپنے کئی کام ادھورے چھوڑ کر ہی گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں یعقوب بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اور آج تک کبھی کسی نے اسے لیٹ ہوتے یا ناغہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ انٹرکام پر یا میٹنگ کے دوران مختلف کاغذوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتی، مگر ریحان کا دل کبھی نہ پیبتا۔ لیلیٰ کو بھی ریحان کے بچپن کے خوف کی کچھ خبر پہنچ چکی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی اس خوف کے جال سے نکلنے میں مدد کرے، مگر شام کا ریحان اس کے لیے بالکل اجنبی ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے جب ریحان کو زبردستی روکنے کی کوشش کی بھی، تو ریحان نے اُسے بری طرح جھڑک دیا۔ پھر بھی لیلیٰ کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ امید ضرور دیا جلائے رکھتی تھی کہ وہ شادی کے بعد ریحان کے دل میں مچھپا ہر خوف اپنی جہت سے مٹا دے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریحان شام کے بعد بہت ضروری فون بھی اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار لیلیٰ اندھیرا ہونے کے بعد ریحان کی کوٹھی کے گیٹ تک بھی جا پہنچی، مگر اس کے لاکھ سر ہٹنے پر بھی دربان نے اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ اٹا اگلی صبح ریحان لیلیٰ پر بری طرح برس پڑا کہ وہ اس کے انتہائی منع کرنے کے باوجود شام ڈھلنے کے بعد اس کی چوکھٹ پر کیوں آئی۔ لیلیٰ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور بھاتی ہوئی اپنے کیمین میں واپس چلی گئی۔

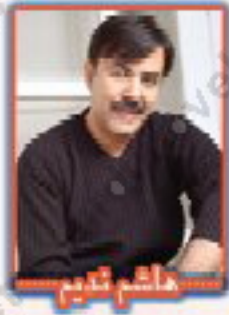
دو تین روز تک دونوں میں بات چیت بند رہی اور ان تین راتوں میں ریحان کی ہم زاد نے جی بھر کے ریحان کے لاڈ اٹھائے۔ اسے اس کی پسندیدہ شاعری سنائی۔ رقص کر کے اس کا دل بہلایا اور اس سے بہت سے گلے شکوے بھی کیے کہ وہ بچپن سے ریحان کی ہم زاد اور ہم نفس رہی ہے اور ہر مشکل اور کرب میں اس نے ریحان کا ساتھ دیا، لیکن جب اُسے ریحان کی ضرورت پڑی، تو ریحان اس سے منہ موڑ کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اس نے ریحان سے وعدہ لیا کہ وہ پہلی فرصت میں لیلیٰ کے رشتے سے چھٹکارا پا کر دوبارہ اپنی ساتھی کے پاس آجائے گا، لیکن ریحان تین دن تک ہی یہ وعدہ نبھایا اور چوتھے دن جب خود لیلیٰ نے اس کے سامنے آکر ہاتھ جوڑ دیے، تو دونوں ہی مسکرا دیے۔ اس رات پہلی مرتبہ ریحان کی ہم زاد نے اس سے ضد کی کہ وہ بھی ریحان کی پسند سے ملنا چاہتی ہے، لہذا ریحان اسے رات کو کہیں مدعو کرے۔ ریحان نے سختی سے انکار کر دیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے، یہ راز راز ہی رہنا چاہیے، لیکن ہم زاد کی ٹھمرائی بھی طول پکڑتی گئی۔ ہم زاد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کا راج صرف سورج نکلنے تک ہی قائم رہتا تھا اور اجالا ہوتے ہی اسے ریحان کی روح کو آزاد کرنا پڑتا تھا۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈھلنے تک ریحان کے دل و دماغ پر صرف لیلیٰ ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لیے ہم زاد دن میں بھی ریحان کے اعصاب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ پھر لیلیٰ خود بھی ریحان کی نفسیاتی پیچیدگیاں دور کرنے کی آس میں گاہے بگاہے اُسے شام ڈھلنے کے بعد ملنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ رات کو ہم زاد اسے بڑھاوا دیتی ”اگر وہ تم سے رات کو ملنا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے بھی اس سے جلد از جلد ملو دو۔ آخر شادی کی پہلی رات بھی تو مجھے ہی اس کا استقبال کرنا ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ میں پہلے ہی اس سے دوستی کر لوں۔ کہیں پہلی رات وہ مجھے تمہارے کمرے میں دیکھ کر بالکل ہی نہ گھبرا جائے اور تمہارا راز سب کے سامنے فاش نہ کر دے۔“ کبھی کبھی تو ریحان ان دونوں کی ضد اور ٹکرار کے سامنے بالکل ہی لاجواب ہو جاتا اور اسے لگتا کہ اس کے اندر پلٹی وہ عورت، اس کی ہم زاد ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیلیٰ کو اس راز سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے کہ یہ اس کا حق بھی تو تھا۔ آخر دل اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح جیت دل نادان ہی کی ہوتی اور ریحان نے پہلی اور آخری مرتبہ لیلیٰ سے شام کے بعد ملنے کی ہامی بھری۔ اس روز لیلیٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ آسمان کے خیمے کی، زمین سے بندھی گریں کھول کر پورا آسمان اوڑھنی کی جگہ اپنے سر پر اوڑھ لے۔ سارا دن وہ ہواؤں میں اڑتی رہی۔ بات بے بات خود ہی مسکاتی رہی۔ شام کو اس نے ریحان کی پسندیدہ سفید ساڑی پہنی، بالوں میں گجرا لگایا اور اپنی کالی آنکھوں میں محبوب کی دید کی آس لیے، ساحل کی اس بجٹی کی طرف اُسی گاڑی میں خود ہی ڈرائیو کرتی ہوئی چل دی، جس کی پہاڑی کے ٹیلے پر آج مغرب کے بعد ریحان نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ریحان کے ساتھ دن میں پہلے بھی کئی مرتبہ ڈرائیو پر اس جگہ آچکی تھی۔ اسے وہاں چینگ اڑانا بہت پسند تھا اور آج بھی وہ اپنے ساتھ بہت سی چنگلیں لے کر جا رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ آج وہ رات دیر تک ریحان کے ساتھ مل کر چنگلیں اڑائے گی اور اسے اتنا اونچا کر دے گی کہ اس کی چینگ اس کے اور ریحان کے ملنے کے ستارے چھو کر لوٹے گی۔ جب تک لیلیٰ پہاڑی ٹیلے پر پہنچی، تب تک شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے وقت کا جھٹ پنا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریحان ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیلیٰ اپنی گاڑی سے نکل کر پہاڑی کے سرے تک چلی گئی اور وہاں کھڑے کھڑے اس نے دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں، وہ خوش ہو گئی کہ ریحان آ رہا ہے، لیکن جب گاڑی کچھ قریب پہنچی، تو وہ مایوس ہو گئی۔ یہ تو کوئی چھوٹی گاڑی تھی، لیکن وہ گاڑی تو اسی طرف آ رہی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر گاڑی کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھتی رہی، پھر اس کی توجہ دوبارہ سمندر کی طرف ہو گئی، جو آج نہ جانے اتنا پھرا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ گاڑی نہ جانے کب لیلیٰ کی گاڑی کے پیچھے آکر پارک ہو گئی اور لیلیٰ تب چوکی، جب دھیرے سے کسی نے اس کا نام لیا۔ وہ آواز کتنی اپنی اور کتنی اجنبی بھی تھی۔ لیلیٰ نے اندھیرے میں کسی لمبی عورت کو پلو ٹکا لے کچھ دور کھڑے دیکھا۔ چہرہ واضح نہیں تھا۔ لیلیٰ کچھ ڈری گئی۔ ”جی..... آپ کون.....؟“ اور پھر وہ عورت قریب آگئی۔ لیلیٰ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اس کے سامنے ریحان اپنے آدھے چہرے پر میک اپ کیے، آدھی عورت کے روپ میں کھڑا تھا۔ لیلیٰ سہم کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے لڑتے ہوئے لہجے میں ریحان سے پوچھا کہ یہ کیسا ہے ہو وہ مذاق ہے اور ریحان نے اتنا بھیا تک حلیہ کیوں بھار کھا ہے۔ بائیں جانب والے آدھے سادے چہرے والا ریحان رخ موڑ کر بولا کہ لیلیٰ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی سے ملوانا

چاہتا ہے۔ اس کے اندر بستی آدمی عورت اور ادھامرد۔ یہی اس کی تقسیم شدہ شخصیت کی حقیقت ہے اور اگر وہ ریحان کو اس کے اندر کی عورت سمیت اپنانے کا حوصلہ رکھتی ہے، تب ہی اس نازک بندھن کی گرہ باندھنے کی سوچے، کیوں کہ ریحان کی ڈیپری شخصیت اس اندھیرے میں پلنے والے وجود کے بنا دھوری ہے۔ لیلیٰ تب تک پہلے صدمے سے کچھ سنسبل چکی تھی اور اسے کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس نے چلا کر ریحان سے کہا، یہ سب اس کا وہم ہے اور خود اس کی اپنی خود ساختہ پرچھائیں ہیں۔ ایسی کسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے اور ریحان نے اپنی ساری زندگی ایک سائے کے ساتھ برباد کر دی ہے، لیکن اب بھی وقت ہے، اگر وہ لیلیٰ کا ساتھ دے تو وہ دونوں مل کر اس غمِ بہت کی پرچھائیں پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی چہرے کے دائیں جانب والی بگڑ گئی اور غرُا کر بولی کہ ”وہ بہت دیر سے لیلیٰ کی یہ بکواس برداشت کر رہی ہے، لیکن اب اگر اس نے، اُس کے ریحان کو چھیننے کی کوشش کی تو انجام بہت برا ہوگا، کیوں کہ اُسے پہلے دن ہی سے لیلیٰ سے شدید نفرت ہے، لہذا لیلیٰ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلی جائے اور وہ بارہ کبھی پلٹ کر اس طرف کا رخ نہ کرے۔“ لیلیٰ ریحان کو ایک بدلی ہوئی آواز میں چلائے دیکھ کر ایک بار پھر لرز گئی۔ اس نے ریحان کے آگے ہاتھ بڑھے کہ سارا کھیل صرف اور صرف قوتِ ارادی کا ہے اور اگر آج ریحان نے اپنے اندر کی طاقت سے اس عورت کو اپنے وجود سے باہر نہ نکال پھینکا تو شاید پھر ساری زندگی وہ اس کے پھٹکل سے چھٹکارا نہ پاسکے۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ریحان، لیلیٰ کی مٹت ساجت کر کے اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا، جب کہ اس کے اندر کی ہم زاد لیلیٰ کو دھتکار رہی تھی، اس پر چلا رہی تھی اور اُسے ریحان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔ لیلیٰ ابھی ریحان کے آگے روتی اور کبھی اس کی ہم زاد سے لڑتی۔ اسی کش مکش میں نہ جانے کب اور کیسے لیلیٰ جیسے ہتے ہتے پہاڑی کی ٹوک تک جا پہنچی۔ اس کی سوت نے اسے تھپڑ مارا اور دھکا دیا۔ ریحان والی بائیں طرف نے لپک کر لیلیٰ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، لیکن اب تک لیلیٰ کا توازن بگڑ چکا تھا۔ فضا میں ایک زوردار جھج گونجی اور چند لمحوں کے لیے لیلیٰ کی سفید ساڑی کا پلو گہرائی کے خلا میں لہرایا اور پھر ایک زوردار ”دھپ“ کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ نیچے ساحل پر موجود ایک آدھ آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے وہ گرنے والے کی طرف لپکا ہو۔ ریحان تڑپ کر لیلیٰ کے پیچھے جانے کے لیے گہرائی کی طرف دوڑا، لیکن ہم زاد نے اُسے زبردستی روکا اور جھاڑا کہ نیچے کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا ہے، شاید کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں ہڈیاں کے عالم میں حجرے سے نکل کر ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ مجھے اس طرف آتے دیکھ کر وہ زبردستی ریحان کو وہاں سے لے گئی۔

اگلی صبح ریحان کو پتا چلا کہ لیلیٰ کے قتل کے الزام میں عبداللہ نامی ایک نوجوان گرفتار ہو چکا ہے۔ ریحان کا دماغ اس وقت لیلیٰ کی موت کی وجہ سے تن ہو چکا تھا اور اس کی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ اس وقت اس کی تمام ذوریں اسی ہم زاد کے ہاتھ میں تھیں، جو اسے یہ کہہ کر ڈراتی رہی کہ اگر ریحان نے پولیس کو حقیقت بتا دی، تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آدمی شخصیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیلیٰ تو پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ پھر ایک شام وہی عبداللہ نامی نوجوان اس کے دروازے پر یہ پیغام لے کر آیا کہ اس نے لیلیٰ کی آخری سرگوشی سنی ہے۔ ریحان اس وقت اس سے ملاقات تو نہیں کر پایا، لیکن اس رات اپنی ہم زاد سے اس کی شدید تنگدستی ہوئی اور ریحان نے اس پر لیلیٰ کی قاتل ہونے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ لیلیٰ اوچائی سے گرنے کے بعد بھی زندہ تھی، تب ہی اس نے مسجد کے اس طالب کو پیغام دیا۔ اگر ریحان موقع پر پہنچے تو جیت جاتا تو شاید وہ لیلیٰ کی جان بچا لیتا۔ پھر ہم زاد کے منع کرنے کے باوجود ریحان نے صبح سویرے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر عبداللہ کو اپنی کوٹھی بلوایا اور عبداللہ نے جب اسے یہ بتایا کہ لیلیٰ نے اپنی سانسیں رُکنے سے پہلے اس عورت کو معاف کرنے کا پیغام دیا تھا، تو خود ریحان کو اپنی سانسیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس روز شام سے پہلے وہ یہ جہیز کر چکا تھا کہ وہ اگلے روز پولیس کو جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروادے گا، لیکن شام ہوتے ہی اس کی روح کی قابض نے حکم دیا کہ چل کر اس بیٹی گواہ کو دھمکا دیا جائے۔ ریحان کی ہم زاد کو عبداللہ نامی نوجوان کا گھٹھی آنا اور یوں ریحان کے دل میں دبی چنگاری کو ہوادے کر لیلیٰ کی یادیں ابھارنا بھی بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ اس رات ساحلی چوٹی پر اس کے پیچھے آئی تھی۔ ریحان ابھی تک صبح سے گالف کے لباس ہی میں تھا اور اس کا اپنا من بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ساحل پر جائے، کیوں کہ وہاں اسے لیلیٰ کی یاد ستاتی تھی۔ اسی کش مکش میں وہ چلا تو آیا، لیکن اپنے سفید کرچ کے جوتے تبدیل کرنا بھول گیا یا شاید یہ اُس کے آدھے مردانہ حصے کا انوکھا احتجاج تھا۔ بہر حال، یہی جوڑے اس کی گرفتاری کا سبب بن گئے، لیکن پولیس ابھی تک محضے میں تھی کہ وہ ریحان ہی کو پکڑ لائے ہیں یا کسی انجینی کو۔۔۔۔۔

ماہر نفسیات نے ریحان کی کہانی ختم کر کے چند لمبے کی خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سب اس وقت رُمن صاحب کے کمرے میں موجود تھے، جہاں گزشتہ پانچ گھنٹوں سے یہ بریفنگ چل رہی تھی۔ کمرے میں گیمبرٹا کا طاری تھا۔ پولیس کی تاریخ میں یہ ایک ایسا انوکھا کیس تھا، جس نے اُن سب کے دماغوں کی چولیس ہلا دی تھیں۔ ریحان کو اس وقت پولیس کے پہرے میں اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا، جہاں اس کی حالت شام کے بعد انتہائی ابتر بنائی جاتی تھی۔ ملک کے بڑے اور مشہور نفسیات دان اور معالج اس بحث میں پڑے ہوئے تھے کہ کیا یہ تقسیم شدہ شخصیت (split personality) کا کیس ہے یا پھر ڈیپری شخصیت کا تضاد (multiple personality disorder) ہے۔ سچ ہے کہ انسانی نفسیات ایک ایسا گھٹا جھگڑا ہے، جس میں اگر ریحان جیسے کسی شخص کا محسوس ہونے کو چاہے، تو پھر وہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ انسان بھی کس قدر پیچیدہ مخلوق ہے۔ انسانی ذہن کی بھول بھلتیوں کا پہلا اور اک گھٹا وہیں پہلی بار ہوا اور مجھے خود اپنے آپ سے بھی شدید خوف محسوس ہونے لگا، کیوں کہ میں بھی تو جانے انجانے میں اسی نفسیاتی اور اعصابی نظام کے خاتمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری رگوں میں پھیلتے زہر کا انہماں بھی تو آخر کار ایک مکمل دیوانگی ہی بیان کیا جا رہا تھا۔

بریفنگ ختم ہونے کے بعد جب معالجین رُمن صاحب کے کمرے سے نکل گئے، تو میں نے بھی ان سے رخصت چاہی، تو انہوں نے مجھے کچھ دیر کئے کا کہا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بولے، ”تم کون ہو۔۔۔۔۔؟“ میں ان کا سوال سُن کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ”میں عبداللہ ہوں۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔۔۔۔۔“ ”نہیں۔۔۔۔۔ میں وہ جانا چاہتا ہوں، جواب تک نہیں جانتا۔ بہت سے سوال ہیں میرے ذہن میں، مگر میں انہیں ترتیب نہیں دے پا رہا۔۔۔۔۔ لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ تم کچھ اور ہو۔۔۔۔۔ اوروں سے کچھ ہوا۔۔۔۔۔ کچھ الگ۔“ میں نے بات مالی ”آپ کا واہمہ ہے۔ میں باقی سب ہی کی طرح ہوں، بلکہ شاید ان سے بہت تم۔۔۔۔۔ بہت عام۔۔۔۔۔“ لیکن انہوں نے جیسے میری بات سُنی ہی نہیں ”ساری تفلیشی نیم اس پر کمر عورت کی نحوج میں تو تھی، لیکن ہم میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ریحان ہی کی دوسری ہیویہ ہوگی۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہ صرف تمہارے وجدان کی کاری گری تھی کہ تم نے ریحان سے شام کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر دھاگے سے دھاگا جڑا گیا اور سبھی تڑیاں آپس میں یوں ملتی گئیں کہ آج لیلیٰ کا پورا تیس ایک گھنٹی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ اب تم ہی کہو، میں اسے کیا کہوں۔۔۔۔۔؟“ میں کچھ دیر پُچ رہا ”آپ اسے وجدان کہہ لیں یا الہام۔۔۔۔۔ سچ یہی ہے کہ میں صرف ریحان کے اندھیرے سے خوف کی کہانی سُن کر ہی اس کے گھر گیا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے پہلے دن ہی سے اس عورت کی حسیہ میں کچھ ایسا سرا ر بھلتا نظر آیا کہ مجھے اس کا تعلق لیلیٰ کی موت سے جو تا محسوس ہوا۔ میں خود بھی یہ بات تب ہی جان پایا کہ ریحان ہی وہ عورت ہے، جب میں نے اس کے جوتے کا سول ساحل پر پایا۔ شاید قدرت کچھ راستے خاص میرے لیے ہی کھولتی تھی اور آپ کا کیس حل ہوتا گیا۔“ اسنے میں میز پر پڑے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ رُمن صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا۔ رُمن صاحب نے جلدی سے کہا ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔“ انہوں نے فون رکھ کر میری جانب دیکھا، ”ریحان اپنے حواس میں آ چکا ہے اور وہ تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے۔“



حاشم عظیم

ایک خاک اسر نو جوان کا قصہ..... جو خدا کو اپنی مہر رنگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، حاشم عظیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”نڈے سنگھ“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا نیکو نسل ہے۔ اس سے قبل حاشم عظیم کے دو ناول ”لدا اور صہبہ“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نو جوان کی سرگزشت ہے جو اپنے ہماری عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر نکل نکلتا ہے کہ جہاں سے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاک اسر سب ساہلی انہی اسرار و رموز کے گرد گھومتا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا ہے لیکن ہر ایک کا یہ دائرہ مختلف نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سرایتی ماحولوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑا ہے۔ ”عبداللہ“ ایک نئے آواز، نئے سلسلے، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناکمل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک طبعی و ادبی میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہم شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سامنے کچھ بھیڑ مچی اور راستہ بند تھا۔ پتا چلا کہ کوئی مریض دم توڑ گیا ہے اور اس کی میت لے جانی جا رہی ہے۔ قریبی عزیزین، چند رفقاء اور آس پاس کے چند راہ گزر کا نمحوا دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے۔ مجھے یوں لگا جیسے انسان اپنی پوری زندگی میں بس اتنا ہی کھاتا ہے، جتنے لوگ اس کے جنازے کو کا نمحوا دیتے اور اس کے آخری سفر میں چار قدم ساتھ چلنے کے لیے موجود ہوتے ہیں، باقی سب ضائع جاتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا نفع خود ”انسان“ ہی ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جس سے وہ اپنی زندگی کے دوران مختلف ادوار میں نقصان کی صورت میں نکھو جاتا ہے۔ کیسے کیسے بیش قیمت لوگ ہمارے ہاتھوں سے چھل جاتے ہیں۔ یہ بے رحم ”وقت“ کیسے ڈاکہ مار جاتا ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور کوئی ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے اٹھ کر جا چلا دیتا ہے اور اس کے بعد صرف یادیں، بچھتاوے اور افسوس باقی رہ جاتا ہے۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ رحن صاحب کی جیب نے ایک لمبا سا سوڑ کا نا اور ہم اسپتال کی مرکزی راہ داری کے بالکل سامنے والے پورچ میں پہنچ گئے۔ رحن صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”جاؤ..... جا کر اس سے مل لو.....“ ”آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ.....؟“ ”نہیں..... اس وقت وہ صرف تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میری موجودگی میں وہ مکمل کڑواہٹ نہیں کر پائے گا۔“ میں سامنے کھڑے مستعد اور چاق و چوبند سپاہی کے ساتھ مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا اندر لگتی اور انحصاری مریضوں کے لیے مخصوص کمروں تک جا پہنچا۔ سپاہی نے 13 نمبر کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے باہر پہلے ہی دو پولیس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرہ بالکل خالی تھا۔ یہ ہو رہا تھا۔ شاید کمرے کے مرکزی صحنہ اکرنے کے نظام کو اس کے آخری درجے پر رکھا گیا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف پلاسٹک کی دو کرسیاں پڑی تھیں اور اسے کمرے سے زیادہ ہرک کہنا مناسب ہوتا، کیوں کہ چوکور کے بجائے مستطیل ساخت کی دیواریں دور تک بڑھ چکی تھیں۔ فرش پر بے داغ سفید ٹائلز لگے ہوئے تھے اور ریحان سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ آنکھوں کو مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا تھا۔ آج سُن کر ریحان نے مراٹھا یا، لیکن یہ..... یہ تو وہ ریحان نہیں تھا، جسے میں جانتا تھا، وہ ریحان تو بے حد سجا سورا، نہایت نفس اور نازک سا تھا، جبکہ میرے سامنے بیٹھا شخص آنکھوں کے گرد گہرے کالے حلقے لیے، چہرے پر برسوں کی جھکن، بال الجھے ہوئے اور کئی دن کی بڑھی شیو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی پہلے والے ریحان کے چہرے یا لباس پر جھکن نہیں دیکھی تھی، لیکن اس ریحان کے لباس اور چہرے پر اتنی زیادہ ٹھنڈی تھیں کہ یوں لگتا تھا، جیسے زندگی نے میری ”بے گھٹی“ کا حساب لے لیا ہو۔ کچھ دین کے لیے میں اس کی یہ حالت دیکھ کر دروازے ہی پر ہمارہ گیا۔ پھر ریحان ہی نے ابتداء کی ”تم آگے عبداللہ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا“ ”میں اس کی جانب بڑھا“ ”یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔“ وہ جھپٹ کر اس طرح دیکھتی تھیں تو اسے لگتا دکھ ہوتا..... ”ریحان نے ایک گہری سی سانس لی ”جب سارے شہر کے آکھنے ہی ٹوٹ جائیں، تو پھر بنے سٹوڈنٹ سے کیا فائدہ.....؟ میں نے تم سے حافی مانگنے کے لیے آج تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دانش منگی کسی کو ذرا برابر بھی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن میری وجہ سے تمہیں بے حد اذیت اٹھانی پڑی۔ تمہیں ہتھکڑیاں لگانی گئیں، شدید بیماری کے عالم میں تمہیں اس تند و نرغہ حوالات میں راقمیں کاٹنی پڑی۔ جو کچھ تو مجھے معاف کر دو۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا، لیکن یقین چانو میں بے اختیار رہا تھا۔“ میں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”معذرت فیروں کے درمیان ہوتی ہے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ میرا فیصلہ تھا، لیکن اگر حافی ہی کسی اذیت کا ہوا ہے، تو تم مجھے معاف کر دو، کیوں کہ تمہاری گرفتاری میرے وعدہ ان کا شام بھاٹ ہے اور میں خود کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو بھی مجرم گردانتا ہوں۔“ ”ریحان تڑپ سا گیا۔“ ”نہیں..... بالکل نہیں..... جسے تم گرفتاری کہتے ہو، اصل میں یہ میری پہلی رہائی ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اور اندر سے کئی حصوں میں تقسیم شخصیت کے اتنے ریزے ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کڑیاں چننا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری روح کی قابض نے میرا سب کچھ لوٹ لیا اور اس کا واحد علاج اسے پابند سلاسل کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی تک میرے وجود پر اپنے نچے گاڑے ہوئے

ہے اور میری راتوں کا اندھیرا اب بھی اتنا خوف ناک ہے۔ کاش تم میری زندگی میں لمبی ۹ کی موت سے قبل آئے ہوتے تو شاید میری ساری جمع پونجی نہ لٹی۔ کاش.....“ بولتے بولتے ریحان کی آواز بھڑکنی اور شدید تپ کے باوجود اس کی معصوم آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو کیا تھے، تھیرا ب کی دو ہونٹیں تھیں، جو میرے دل کی پوری کائنات کو مل بھر میں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ ہم انسان کتنے بے بس، کتنے محدود ہوتے ہیں کہ صرف زبانی ہم دردی کے علاوہ کبھی اپنے کاظم تک اپنے اندر اتار کر اس کا پوچھ بھی پا کر نہیں کر سکتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے بیٹھ کر رونے والا ریحان نہیں، کوئی سات آٹھ سالہ بچہ ہے جس کا سب سے پیارا مھلوٹا، کوئی اسی کے سامنے توڑ کر چلا گیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ میں نے ریحان کی آنکھوں میں چھانکا۔ ”میری ایک بات مانو گے ریحان.....؟“ معصوم سے بھولے لہجے نے سرائی کر کر دن ہلائی۔ میں نے اس کے ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیے۔ ”جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تمہاری میں خوب زور زور سے چیخ مچا کر رونا۔ اتنا رونا کہ یہ قلب پھٹ جائے اور اس آسمان سے بے کی گلابی دھند میں تمہیں تمہاری لیلیٰ کا چہرہ دکھائی دینے لگے۔ مجھے یقین ہے، تمہارے آنسو اس دھند کو پیر کر اس تک ضرور پہنچیں گے۔ پھر اس سے جی بھر کر باتیں کرنا۔ مجھے یقین ہے، وہ اب بھی مستحکم سے بات کرے گی۔“ ریحان نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے بہتا پانی مسلسل میری ہتھیلیوں کی پشت کو بھگور رہا تھا۔ رمانے کے لیے وہ ایک قائل تھا، لیکن کیا کبھی کسی نے اتنا معصوم قائل بھی دیکھا ہوگا۔ مجھے کچھ یاد آیا۔ ”اور ہاں.....“ مجھے تم سے اپنے ایک اور موصوت کی معافی بھی مانگنی ہے۔ میں نے تمہیں لیلیٰ کے آخری جملے کے بارے میں جو بات کہی تھی۔ وہ صرف اسی پر سر اور صورت کا کھوج لگانے کے لیے میری ذہنی اختراع تھی، پتا نہیں کیوں اور کب میرے ذہن میں وہ بات آئی اور میں نے کہہ دی۔ مجھے اپنے اس جھوٹ پر بے حد شرمندگی ہے۔“ ریحان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”لیکن تم نے تو کوئی موصوت نہیں ہوا۔ میں نے خود اس رات سوچے جھانک کر دیکھا تھا، تم لیلیٰ کے گرتے ہی چند لمحوں بعد اس کے قریب پہنچ گئے تھے اور ٹھیک اس کے سر ہانے بیٹھے ہوئے تھے، ضرور لیلیٰ نے تم سے کچھ بات کی ہوگی، مگر تم اپنی دگرگوں ذہنی حالت کی وجہ سے یاد نہیں رکھ پاؤ۔“ اب حیران ہونے کی باری میری تھی، میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ تو گو یا میری زبان سے جو لفظ ادا ہوئے تھے، وہ میرے ذہن میں ٹھیک اسی وقت نہیں آئے تھے، جب میں ریحان سے اس کے گھر کا لف کورس میں ملا تھا۔ لیلیٰ کی زبان سے ادا ہوئے وہ لفظ میرے مومنے ہوئے ذہن کی کسی دروازہ میں بند ہو گئے تھے اور صبح جب مجھے پولیس نے حاصل سے گرفتار کیا، تو میرے ہاتھ کا وہ دور سب معمول میری یاد سے محو ہو گیا، لیکن جب ریحان میرے سامنے آیا، تو یاد کی گھڑکی سے لیلیٰ کا وہ جملہ ہوا کہ ایک جھوٹے کی طرح آیا اور میری زبان سے ادا ہو گیا۔ مجھے انسانی ذہن کی بھول بھلیوں اور اس کے کرشموں سے ایک بار پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ ہانے کتنے شہید ہے، ہانے کتنے عفریت اس چھنا تک بھر کے ذہن میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس ذہن کی موجودگی میں شاید ہر انسان ایک پختا پختا آتش لٹاں ہی تو ہوتا ہے، جو کبھی بھی وقت دھماکے سے پھٹ سکتا ہے۔ ریحان کی اس حالت کا ذمے دار بھی تو صرف اور صرف یہ ذہن ہی تھا۔

میں بہت دیر تک ریحان کے آنسو پونچھتا رہا۔ کاش اس کے اندر قیمتی وہ قابض قاتلہ میری رسائی میں ہوتی، تو میں اسے نصرف کے لیے اپنا نا کارہ وجود پیش کر دیتا کہ یہ جسم پسیدہ تو اب خود یو آگنی کی راہ پر گام زن تھا۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ کئی احوال انسیات دانوں اور ڈاکٹروں نے اس کی ہم زاد سے اس کی جان چھڑانے کے لیے نیند کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سر شام ہی اندھیرا ہونے سے قبل ریحان کے جسم میں ایک خاص مقدار میں نیند کی دوا تحلیل کر دی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر صبح دیر گئے تک ریحان سویا رہتا ہے، لیکن بقول ریحان، اسے ڈر تھا کہ یہ ترکیب زیادہ عرصہ چل نہیں پائے گی، کیوں کہ وہ بہت پہلے خود بھی لیلیٰ کی آواز پا چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اسے نیند آ جاتی تھی، لیکن پھر رونا رونا بے غلطی شروع ہونے لگی اور چند دن بعد تو وہ اس کے خوابوں پر بھی قابض ہوتی گئی، نتیجتاً ریحان کو دورے پڑنے لگے اور اسے نیند کی دوا ترک کر دینی پڑی اور پھر میں اس وقت اپنا ضبط کھوی بیٹھا، جب ریحان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ ”کیا میں بھی اسے ایک قاتل سمجھتا ہوں اور کیا میں سمجھی، ریحان کے لیے جا کر ہوں گا.....؟“ میں جواب دیتے ہوئے رو پڑا کہ میری اور میری دعاؤں کی کیا اوقات ہے۔ ہاں البتہ اگر اوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور گڑ گڑا کر مانگنے ہی کو دعا کہا جاتا ہے، تو میں یہ مشق ریحان کی گرفتاری سے بھی پہلے سے کر رہا ہوں۔ کہ ”یا مالک..... اس انسان کو صبر دے، سکون دے اور اسے عطا کر.....“ میں بہت دیر سے ریحان کے ساتھ بیٹھا تھا اور مجھے باہر کے گزرتے وقت کی اطلاع صرف روشن دان سے چھنی دھوپ کے مختلف زاویوں ہی سے مل رہی تھی۔ دیر سے دیر سے شام قریب آ رہی تھی۔ میں نے نماز بھی ریحان کے کمرے ہی میں ایک صاف چادر بچھا کر ادا کی اور ریحان سے بھی کہا کہ وہ نماز کی پابندی کی کوشش کیا کرے۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ بچپن میں یعقوب ڈرامہ گور کے ساتھ وہ ہمیشہ جتنے اور عید کی نماز کے لیے ضرور جاتا تھا۔ یعقوب کی بیوی، جو ریحان کی روحانی ماں کے برابر تھی، اس نے اسے نماز اور سورتیں یاد کروائی تھیں، لیکن پھر دیر سے دیر سے وہ سب بھول گیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ چاہے وہ مذہب کو بھلا بیٹھا ہو، لیکن مذہب اسے کبھی نہیں بھولے گا اور جس دن ریحان با وضو ہو کر جائے نماز پر کھڑا ہوگا، اسے خود بخود سب یاد آ جائے گا۔ خود میرے ساتھ بھی تو یہی ہو چکا تھا۔ مذہب ہمارے اندر آتی جاتی سانس کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب ہم سانس لینا نہیں بھولتے اور کوئی ہمیں سانس لینا سکھاتا بھی نہیں، تو پھر مذہب ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔ بس، کچھ طریقہ کار دیکھنے کے لیے کبھی کسی رہبر اور کبھی ماحول کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

مصر کے فوراً بعد ریحان کی دوا کا وقت ہونے لگا اور میرے جانے کی خبر سن کر نہ جانے وہ کیوں ایک دم ہی بہت بے چین سا ہو گیا۔ شاید میں اس کی عمر بھر میں اس کا واحد دوست تھا، جس کے ساتھ اس نے صبح سے شام تک کا وقت گزارا اور اپنے دل کی اتنی جہت سی اموں باتیں بانی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر عیب سے درد بھرے لہجے میں التجائی ”پھر آؤ گے نا عبد اللہ.....؟“ ”ہاں..... ضرور..... کیوں نہیں..... اور اس دن ہم صرف تمہاری اور لیلیٰ کی بات کریں گے۔“ ٹٹنگوں کی باتیں، دھانی آسمان اور نیلی ڈور کی باتیں..... جھاگ اڑاتے سمندر اور وہ دھیا دھیا بولوں کی باتیں..... ٹھیک ہے نا.....؟“ وہ بہت

خوش ہو کر بولا "ہاں..... بالکل ٹھیک ہے..... لیکن بچہ..... تم آؤ گے ماں....." "ہاں بالکل بچہ....." میں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چھو دیا اور ہیلڈ نرس نے ریحان کے بازو میں نیند کی دوا انجیکٹ کر دی۔ میں ریحان کی پٹلیں بوجھل ہونے تک وہیں اس کے سر ہانے بیٹھا رہا۔ نیند کی سرمئی پری نے دیر سے میرے اپنے کچھ اس کے بوجھل پوٹوں پر پھیرنا شروع کر دیے۔ ریحان کی پٹلیں بھاری ہونے لگیں، لیکن سوتے سوتے بھی آج اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور چمکی سی مسکان موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اس کی زندگی کی سب سے پرسکون نیند کی رات ہوگی۔ نیند کا یہ مکمل خزانہ آج کل ہم سب میں سے کسی کا بھی نصیب نہیں ہے۔ ہم سوتو جاتے ہیں، مگر ہانپنے کے..... میں ریحان کے سوجانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں کم صم سا بیٹھا رہا۔ میری ہتھکی پٹلیں مجھ سے بہت سے سوال کرتی رہیں، مگر آج بھی پیرا دامن جوابوں سے خالی تھا۔

رات بہت دیر سے میں ساحلی مسجد کے قریب بس سے اتر آیا ایک غنی پریشانی میرے انتظار میں مسجد کے باہر ہی ٹہل رہی تھی۔ سرقتی صاحب مجھے آتا دیکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھے اور انہوں نے بتایا کہ مغرب کی نماز کے بعد ایا تک سلطان بابا کی طبیعت کڑکئی تھی۔ فوری طور پر ہستی کے حکیم کو بلا دیا گیا۔ مگر معاملہ اس کی فافش سے دور کا تھا۔ الہذا ہستی والوں نے شہر کے ڈاکٹر کا انتظام کیا۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر واپس جا چکا تھا۔ میں لپک کر حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا نیند میں تھے۔ پتا چا کہ ڈاکٹر نے عارضی طور پر کوئی دوا اور نیند کا ٹیکا لگا دیا ہے، لیکن اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ پہلی فرصت میں صبح سلطان بابا کو شہر کے بڑے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

میں ساری رات وہیں بابا کے سر ہانے ہی بیٹھا رہا اور اس ہمدرد اور بزرگ مخلص کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند مہینوں ہی میں میری زندگی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی کو کا پاپاٹ کہتے ہیں، لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ اس پوری راہ میں، میں نے زہرہ کے علاوہ کوئی اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ساحری زندگی جتنی ہم وار تھی، عبداللہ کی زندگی اسی قدر دشت اور بیکوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس جذبے کو ہم نے خوشی کا نام دے رکھا ہے۔ وہ کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی غم کا وہ ہونا ہی اصل میں خوشی ہے، ورنہ سب طرف غم ہی غم ہوتا ہے۔ حسب معمول فجر کے وقت سلطان بابا کی آنکھیں میکانیکی انداز میں کھل گئیں۔ ہمارے ذہن میں گھبراہٹ کا ایک کی سوئیاں سواتے میں بھی بالکل ٹھیک کام کرتی ہیں۔ میں نے انہیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر ان سے پوچھا "آپ مجھے کیوں اتنا مٹاتے ہیں.....؟" سلطان بابا کے نصف چہرے پر ہلکی سی مسکان آگئی۔ "ستایا تو ابناں ہی کو جاتا ہے میاں، اور پھر جسے عبداللہ جیسا حمار وار پیسہ ہو، وہ بار بار بیمار نہ پڑے، تو اور کیا کرے؟" میں نے منت سماجت کر کے انہیں کم سے کم حرکت کرنے پر آمادہ کیا تو انہوں نے وضو کے بعد بیچہ کراٹھروں سے نماز ادا کی۔ سورج نکلنے ہی میں نے رجن صاحب کو شہر فون کر کے کسی سواری کا بندوبست کرنے کی درخواست کی اور ٹھیک پونے گھنٹے بعد ایک بڑی سی آرام دہ کار سمیت وہ خود مسجد کے باہر موجود تھے۔ ہم نے سفر کے دوران بھی اس بات کی حق الامکان کوشش کی کہ سلطان بابا کے جسم کو راستے کے بیکوٹوں سے بچایا جائے، کیوں کہ رات والے ڈاکٹر کی بھی یہی ہدایت تھی۔

شہر کے بڑے اسپتال کے ڈاکٹر نے سلطان بابا کو معائنے کے دوران ہی اسپتال میں داخل کرنے کی ہدایت کر دی۔ میں اور رجن صاحب راہ داری ہی میں موجود تھے، جب ڈاکٹر صاحب مریض کے معائنے والے کمرے سے باہر نکلے۔ ہم دونوں ان کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ "ان بزرگ کو ماضی قریب میں کوئی سری شدہ چوٹ لگی ہے شاید....." "جی..... کچھ حادثہ ہو گیا تھا؟" ڈاکٹر نے سر ہلایا "تو میرا اندازہ درست تھا۔ کچھ وجوہات ہو گئی ہے، لیکن میں حتیٰ راستے آپ ہی دوں گا، جب ان کے تمام معائنوں کی رپورٹ میرے پاس آ پائے گی..... اللہ بخیر کرے گا؟" ڈاکٹر میرا کاغذ ہاتھ میں کراٹھ کے بڑھ گیا۔ سلطان بابا کو فوری نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور پھر سے وہی شیشے کی نلکیاں اور بوتلیں ان کے جسم سے چپکادی گئیں، جن سے انہیں شدید جھنجھکی۔ رجن صاحب بھی بہت دیر تک میرے ساتھ ہی شیشے کی دیوار سے پرے کمرے میں لیٹے سلطان بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں کوئی ضروری فون آیا تو وہ مجھ سے معذرت کر کے اپنے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وقت جب اڑنے پر آئے تو پھر لگا کر اڑتا ہے اور جب سر کٹے پر آئے، تو یوں ایک ایک صدی کر کے سر کٹا ہے کہ ہم ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کئی ختم گزار دیتے ہیں۔ میں نے بھی نہ جانے اس نگرانی کی فافش پر بیٹھے کتنے ختم پھر سے جی کرنا کر دیے۔ ڈاکٹروں کی نہ جانے کتنی ٹولیاں اٹھرا آتی جاتی رہیں اور سلطان بابا کا معائنہ جاری رہا۔ نہ جانے کب پھر سے رات ہوئی اور پھر سویرا بھی ہو گیا۔ درمیان میں دوسرے رجن صاحب کا فون بھی آیا۔ میں دو رات پہلے ریحان سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تھا، لیکن آج دوسرا دن چڑھ آنے کے باوجود یہاں سے مل بھی نہیں سکا تھا۔ جانے ہم انسان کس بل بوتے پر ایسے وعدے اور اسنے بڑے بڑے دعوے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک بل کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔

پھر صبح پہر ڈھلنے کے بعد نکلے نکلے سے رجن صاحب بھی آ گئے۔ میں نے ان سے ریحان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا، تو وہ ہول ہاں کر کے ٹال گئے۔ میں بے چین ہو گیا اور ان کی منہ کی کہ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ آخر رجن صاحب نے ہتھیار ڈال کر مجھ وہاں ہوئی بھی سنا دی، جس کا خدشہ شاید میرے اندر بہت پہلے سے کہیں بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ رجن صاحب نے بتایا کہ ریحان اس رابطہ پہلے سے نہ سکون میں ہو گیا تھا اور اگلے کے بعد بھی وہ بہت کم سکون رہا، لیکن صبح پھر کے بعد اس کے اندر عجیب سی بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ فوراً کمرے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں تاکہ اسے دن ہونے کا احساس ہوتا رہے، مگر وہ بے چینی سے ادھر ادھر مڑتا رہا۔ شاید اس کا وجود اندر سے نکل رہا تھا اور ہر سونے سے اس کے اندر ملتی دہری غصہ پت کو سب لگا تار کئی راتوں تک اپنے اظہار کا موقع نہیں مل پایا تو اس نے ریحان کے اعصاب اکھیرنا شروع کر دیے تھے۔ باہر افسانے کے کہنے پر شام سے پہلے ہی کھڑکیوں کے پردے کو ریحان کے کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل اور ٹیبل اپ کا کچھ سامان بیچا دیا گیا اور کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں ریحان نے ستھار میز کے آئینے کو ایک ہی ضرب سے کرچی کرچی کر دیا اور ستھار کا سارا سامان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسپتال کے عملے نے فوراً ریحان کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا جنوں بڑھتا ہی گیا اور نصف شب تک وہ خرد کی آخری حد بھی پار کر چکا تھا۔ مجبوراً اسے بجلی کے جھکے دیے گئے، لیکن ریحان جس گلابی دھند کے پار جا چکا تھا، وہاں سے واپس نہ لوٹ پایا۔ اگلی صبح اسپتال کی راہ دار ہاں اس کے دیوانہ وار قہقہوں سے گونج رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں کو کسی مصوم بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ مصوم بچہ، جس کی پیاری ماں کو لوگ اس سے چھین کر لے جا رہے ہوں اور وہ رو رو کر اپنی ماں سے پوچھ رہا ہو کہ اب اسے رات کو کوری کون سنائے گی، کون صبح اس کے ہال سنوارے گی اور کون اسے نرس کر اپنے سینے سے اکائے گی۔ میرا دل پھٹنے لگا اور مجھے یوں لگا کہ ریحان کے ساتھ ساتھ میں بھی اسی گلابی دھند کے پار جا رہا ہوں۔

(باقی آئندہ)



.....ہاشم ندیم.....

"عبداللہ" ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ رنگ "خط بے یگترین" ہی میں چھپنے والا پہلا ناول "عبداللہ" کا نیکو نکل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول "خدا اور صحبت" اور "بچپن کا دبیر" بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پڑھائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ میرا نے کے مطابق "عبداللہ" دو مضامین کا بے حد مطلوب و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نو جوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے ہماری عشق کی سلاش میں ایک انہی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اس سے چھٹے دن، عشق ظنی کی نئی نئی ملائگی سر کرنے کا مرحلہ درخشاں ہے۔ ناول کا خاکہ حسب حائق انہی اسرار و رموز کے گرد بچا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز چھلکتے ہیں۔ اسی ۱۹۴۱ء کا زمانہ ہے کہ سرگت جیہے کے لیے بڑھ چکا، "عبداللہ" ایک نئے آغاز ہے، جسے مسلسل، کچھ مختلف انداز، مختلف فائنل کے ساتھ..... آپ کی سمجھت کے لیے ناول کی ایک طبعیہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست انہی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

رہنما نے ہمیشہ کے لیے اپنا نانا اس ہوش کی دنیا سے توڑ لیا تھا، جہاں اس جیسے نازک احساس والے کے لیے ذی ہوش خود یوانہ تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس کے کام کی نہیں تھی، جہاں کا بچہ کا سن، کھنے والوں کو ہر دم ہاتھوں کا۔ سنا ہوا بتا ہے۔ اس شام جب سلطان بابا نے قین دن کی بے چینی کے بعد ڈرا ویر کے لیے خود کوئی کی چادر اور لٹی، تو میں رخصت صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ریحان کو دیکھنے کے لیے گیا۔ آہنی سلاخوں سے پرے ایک ایسے کمرے میں، جس کی دیواروں کو اندر سے پختے اسٹیل سے ڈھک دیا گیا تھا اور جس کی آہنی چھت کے اندر صرف ایک باب کے چلنے کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی، ریحان کھٹکوں میں سر دے بیٹھا تھا، ہماری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور کسی نچے کی طرح خوف زدہ ہو گیا۔ پھر ہلدی سے ہماری جانب سے بچھڑو کر بیٹھ گیا، لیکن اچانک ہی جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ ہلدی سے بھاگ کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ زمین صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "میری انہی کپ آئیں گی.....؟" زمین صاحب نے جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔ "تمہاری انہی جلد آ جائیں گی، شرط یہ ہے کہ تم رو دو گے نہیں، نہ ہی یہاں کے عملے کو تنگ کر دو گے۔" ریحان خوش ہو گیا۔ "ٹھیک ہے..... پچا.....؟" زمین صاحب نے اس کی پچلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "بالکل پچا....." وہ فوراً جا کر اپنی جگہ پر یوں باادب بیٹھ گیا، جیسے کوئی بہت تیز در پیچ اپنی ماں کے حکم کے مطابق کسی جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ مجھ سے بھر ہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ کتنا نازک ہوتا ہے یہ انسان، کتنا کول، کتنے ملائم احساس والا..... پھر بدل کیسے جاتا ہے۔ مکاریاں، فریب، چال بازی، دشمنیاں، حسد، برائیاں، کین پروری، چوری، چھوٹ، خیانت اور دغا بازی ایسے سیکے لیتا ہے؟ اگر جنوں انسان کو پھر سے ریحان کی طرح معصوم بنانے کے عمل ہی کا نام ہے، تو اسے کاش قدرت سب ہی ہوش مندوں کو مجنوں کر دے اور پھر شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہوش والے بھلا جنوں کی حکایت کو کیا جانیں، بے خودی کی لذت تو صرف دیوانوں ہی کا انعام ہے۔ یہ نادان ہوش والے تو بس سا ہو کر کی طرح لین دین اور نفع نقصان کے پیچھے سے پڑے رہتے ہیں، لیکن ایک دن انہیں بھی سب کچھ نہیں چھوڑ کر دیوانوں کے ساتھ ہی کوچ کرنا پڑتا ہے۔

میں واپس اسپتال تو آ گیا تھا، لیکن اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہیں ریحان کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ خود میری اپنی حالت بھی نہایت اتر ہوئی جاری تھی۔ رگوں میں سگلتی چنگاریاں وقفے وقفے سے ایک بھڑکتا شعلہ بن کر میرے پورے سراپے کو جھلسا رہی تھیں، لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ میں ایسے موقع پر ڈاکٹروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا کر سلطان بابا کے سامنے سے ہٹا نہیں چاہتا تھا، لیکن یہ جرم میں نے رات بھر خود پر اس طرح جھپکا کہ میرا سارا بدن بخار میں پھٹ رہا تھا۔ بالآخر صبح ڈاکٹروں نے سلطان بابا کے معائنے کے حتمی نتائج دیکھنے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جس جدید علاج کی ضرورت ہے، وہ ملک کے صرف دو شہروں میں دست یاب ہے، جس میں ایک میرا اپنا شہر بھی شامل تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے ہمارے شہر کے لیے ہفتے بھر میں صرف ایک جہاز اڑتا تھا اور ہفتہ ہفتی سے آج وہی دن تھا اور اڑان کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ زمینی راستے سے جانے والی سلطان بابا کی حالت نہیں تھی اور ٹرین تک پہنچنے کے لیے کم از کم یہاں سے دو دن کا زمینی سفر درکار تھا۔ پھر نہ جانے زمین صاحب کے ذہن میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے دو چار فون کھمائے اور کھٹے بھر بند ہی آ کر یہ سڑدہ سنایا کہ شہر کی بندرگاہ پر ایک بہت بڑا غیر ملکی بحری جہاز آ کر لگا ہے اور ٹھیک چھ کھٹے بعد اس کی روانگی ہے۔ زمین صاحب نے ہمارے لیے دو فرسٹ کلاس کے کپن مختص کر دے لیے تھے۔ ہمیں یہ بحری جہاز آج سے ٹھیک پانچویں دن شہر کی بندرگاہ پر اتار دیتا۔ بقول زمین صاحب، یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی منزل کی جانب چل پڑے، کیوں کہ سات دن بعد بھی اگر موسم یا کسی دوسری ان ہونی کی وجہ سے ہم سے اگلی فلائٹ بھی رہ جاتی، تو مزید دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہا، تو انہوں نے زور سے میرا کانہ جھپٹا یا اور میرے ساتھ سامان چھیننے میں مشغول ہو گئے۔

جب ہم بندرگاہ پہنچے، تو وہ عظیم الشان ٹیلے رنگ کا بحری جہاز، جس کی سات منزلیں تو دور ہی سے گنی جاسکتی تھیں، کسی فوج کے قاتع سپہ سالار کی طرح سینہ تانے لنگر انداز تھا۔ جہاز پر شہری اور سفید حروف میں بڑا بڑا کاسا لٹکا لٹکا ہوا تھا اور اطالوی نژاد عملہ عرشے پر اور نیچے سیڑھیوں پر کھڑا آنے والے

اللہ کے نام پر، جس نے تمہیں پیدا کیا اور اتنی اچھی صورت دی اور آرام دہ زندگی عطا کی۔ تم تم سے تمہارے دس منٹ مانگنے کے لیے سات سمندر پار سے آئے ہیں، اور یہاں سب سے ہمارا بس اتنا ہی مطالبہ ہے، لیکن اب تک زیادہ تر دھڑکار ہی ملی ہے۔“ حبیب نے کچھ دیر سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اس کا دل ہلچ گیا۔ ”ٹھیک ہے..... لیکن صرف دس منٹ..... ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں، کیوں کہ مجھے اپنے کلب پہنچنا ہے اور ایک بہت ضروری شو کا اہتمام کرنا ہے۔“ سنگل گھل چکا تھا۔ بارش ٹولی حبیب کو سامنے ہی شیشوں کے بڑے بڑے دروازوں والے ایک کینے میں لے گئی۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں کے نشان برف پر بننا شروع ہو چکے تھے۔ حبیب نے کینے میں داخل ہو کر سر کے بالوں میں جمی برف کو جھاڑا۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے والی میز سنہال لی۔ ایک بزرگ نے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تلاوت کی۔ ساتھ بیٹھے دوسرے بزرگ نے ترجمہ سنایا ”تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے.....“ تلاوت جاری رہی اور ترجمہ ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو منٹ بعد بزرگ نے تلاوت بند کر دی۔ ”دس منٹ پورے ہوئے کو ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اپنے وقت میں سے دس منٹ اللہ کے نام کر دیے۔ جزاک اللہ.....“ لیکن حبیب ابھی سیر نہیں ہوا تھا ”کیا آپ میرے لیے پانچ منٹ مزید یہ کتاب پڑھ سکتے ہیں..... میں اپنا وقت کور کرنے کے لیے زیر زمین ٹرین پکڑ لوں گا۔“ بزرگ نے ہٹا کچھ کہے، پھر سے کتاب کھولی اور مزید پانچ منٹ تلاوت کی۔ حبیب نے گھڑی دیکھی ”اگر میں اپنے عملے کو موبائل کے ذریعے ایک پیغام بھیج دوں، تو وہ میرے پہنچنے تک کچھ انتظامات شروع کر سکیں گے۔ اس صورت میں میرے پاس مزید پندرہ منٹ بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میں مزید سننا چاہوں گا۔“ پندرہ منٹ مزید تلاوت ہوتی رہی، لیکن حبیب اب بھی کچھ بے چین سا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنا شو ختم کر کے رات دس بجے دوبارہ اس کینے میں آئے گا اور پوری سورۃ دوبارہ سنے گا۔ وہ رات بھی آگئی اور نصف شب تک تلاوت بھی ہوتی رہی، لیکن معاملہ اب بھی وہی تھا۔ حبیب کی تھکن..... پھر طے یہ ہوا کہ حبیب اتوار کے روز جماعت کے ساتھ مین ہٹن کے علاقے میں پورا ایک دن گزارے گا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ حبیب نے ہلچکپاتے ہوئے بزرگ سے پوچھا کہ یہ پوری کتاب اور یہ پورا پیغام سننے کے لیے اسے اُن لوگوں کے ساتھ کتنا وقت پٹانا ہوگا؟ کیوں کہ تین دن تو وہ کسی نہ کسی طرح نکال ہی لے گا۔ بزرگ نے کہا ”جزاک اللہ“ اور تین دن کے لیے حبیب البشران کے ساتھ ہولیا، پھر تین سے دس اور دس سے بات چالیس دنوں تک جا پہنچی اور جب چالیس دن کے بعد حبیب گھر پہنچا تو وہ حبیب نہ تھا، جسے اس کی گلی نمبر 128 والے جانتے تھے۔ ڈانس کلب دھیرے دھیرے کافی کے کینے میں تبدیل ہو گیا، جس کے باہر لگا بڑا سا بورڈ دور سے لوگوں کو نظر آ جاتا تھا۔ جس پر لکھا تھا ”یہاں شراب فروخت نہیں کی جاتی۔“ زندگی کا یہیہ گھومتا رہا اور اپنے وقت میں سے دیے گئے دس منٹوں نے حبیب کو کچھ ایسا خراج ادا کیا کہ وہ خود اُن لوگوں کا سر براہ بن گیا، جو لوگوں سے اللہ کے لیے چند منٹ طلب کرنے، دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک دن حبیب چند لوگوں کے ساتھ مشرقی ساحل والے اپنے آبائی شہر میں اترا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔“ حبیب صاحب اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئے، بیس برس کا جمع پانی ان کی آنکھوں سے نکل کر سمندر کے نمک کو مزید نمکین کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا، بقول ان کے، بیس برس بعد آخر کار اُن کا وہاں سے بلاوا آئی گیا تھا، جہاں جا کر وہ اٹھائیک کر تباہ نہ اٹھتے، جب تک انہیں اپنے بچھلے ہر گناہ کی معافی کا یقین نہیں ہو جاتا۔ وہ یہ شکوہ بھی کرنے جا رہے تھے کہ وہ ہڈ اسرار بندے جو عمر کے چوبیسویں سال میں نیویارک کے ایک چوراہے پر ان سے ملے تھے، وہ انہیں پہلے کیوں نہیں ملے.....؟ وہ اس کے پیارے حبیب کے رونے کی جالی سے اپنی جبین نکا کر تباہ کرنا چاہتے تھے، جب تک اُن کی آنکھوں کا پانی بھی آب زم زم کی طرح میٹھا نہ ہو جائے..... میں عقیدت سے اس انسان کی طلب کو محسوس کرتا رہا۔ سمندر کی لہریں اب بھرتی جاری تھیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ ٹھلی منزل پر اوّل درجے کے مہمانوں کے ریستوران کی گھنٹی بج چکی تھی اور اندر سے پیانو کی ہلکی سی موسیقی کی تانیں باہر عرشے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ حبیب صاحب تیسری منزل کے مہمان تھے، لہذا انہیں اسی ریستوران میں کھانا کھانے جانا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ جس صاحب نے بناء مجھ سے پوچھے ہی جہاز کے سب سے اعلیٰ حصے کے ٹکٹ کروا لیے تھے۔ مجھے جہاز کا اطالوی عملہ دو مرتبہ آکر یاد دہانی کروا چکا تھا کہ کھانا نیچے ریستوران میں پہنچ دیا گیا ہے۔ حبیب صاحب بھی نیچے جانے کے لیے پلٹے، اچانک میں ان سے پوچھ بیٹھا ”کیا وہاں پہنچنے تک میں آپ کو یاد رہا پاؤں گا؟ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ میرے لیے اس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگ سکتے ہیں اور اس جالی کے سامنے بھی، اگر آپ کو یاد رہے تو.....؟“ حبیب صاحب تڑپ کر پلٹے ”ہاں ضرور..... کیوں نہیں..... یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کوئی خاص دعا کروانی ہے تو وہ بھی بتا دو.....“ میں کچھ دیر خاموش رہا ”ہاں..... بہت خاص..... دعا بھی کیا ہے، بس ایک پیغام ہے کہ آپ نے اُسے صرف چالیس دن میں پالیا، میں چالیس صدیاں بھی ریاضت کرنے کو تیار ہوں، بس مجھے مکمل دیوانہ کرنے سے پہلے ایک بار چند لمحوں کے لیے فرزا لگی عطا کر دے۔ وہ فرزا لگی، جو میری آنکھوں پر پڑے سب پردے اٹھا دے۔“ جانے حبیب صاحب کو میری بات سمجھ میں بھی آئی کہ نہیں۔ وہ کچھ دیر غم آنکھوں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر دھیرے سے بولے ”انشاء اللہ۔“

میں اُن سے رخصت ہو کر نیچے ریستوران میں پہنچا، تو کھانا لگایا جا چکا تھا۔ خوب صورت سفید اور نیلی وردیوں میں چاق و چوبند ہیرے اور دیگر عملہ مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھا۔ ایک جانب پیانو پر ایک خوش گلو دو شیرہ بیٹھی کسی اطالوی اوپیرا کا کوئی مشہور گیت بجانے کے ساتھ دھیمے سُرور میں گنگنا بھی رہی تھی۔ سارے ہال میں غیر ملکی مسافر ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاڈ اور انناس کی چند قاشیں رکھیں اور ایک اندھیرے گوشے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ایک غیر ملکی خاتون سے، جو اپنی چار پانچ سالہ بچی کو پکڑنے کے لیے لپک رہی تھی، زور سے ٹکرا گیا۔ میری پلیٹ سے سلاڈ ان کے لباس اور پھر زمین پر بکھر گیا۔ ان کا پارہ ایک دم ہی آسمان کو چھو گیا اور انہوں نے ہٹا میری معذرت سنے، انگریزی میں مجھے بے نقط سنانا شروع کر دیں، حالاں کہ غلطی بھی انہی کی تھی۔ میرے سادہ سے شلوار کرتے کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی نچلے عملے کا کوئی رُکن سمجھتی تھیں اور پھر پورا ہال ہماری جانب متوجہ ہو چکا تھا ”جانے کہاں کہاں سے آ جاتے ہی احمق لوگ۔ جنہیں ریستوران کے آداب کی بھی تمیز نہیں۔ میرے سارے لباس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس آدمی کو کس نے ہال میں آنے دیا ہے۔ میری کپتان سے بات کرواؤ ابھی۔“ وہ بناء وقفے کے چلائے جاری تھیں۔ میں چپ چاپ کھڑا اپنی وضاحت پیش کرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک جہاز کی ایک اینیڈنٹ بدحواسی میری جانب دوڑتی ہوئی آئی ”وہ جو بزرگ آپ کے ساتھ تھے..... ان کی حالت بگڑ رہی ہے.....“ (جاری ہے)

ہے، لہذا بہتر یہی تھا کہ میں انہیں اپنے معاملات سلجھانے کا موقع دوں۔ صبح تک سلطان بابا نے دوسرے آگےئیں کھینیں اور دونوں مرتبہ مجھے جا کر سونے کا اشارہ کیا، لیکن وہ میرے جواب سے بھی خوب واقف تھے۔ صبح کے بعد ان کی فیند کچھ پڑ سکون ہوئی، تو میں باہر نکل آیا۔ ٹھیک اسی وقت راجیل صاحب بھی ناشتے کے لیے ڈانکنگ ہال کی طرف نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ”رات میں ٹھیک طرح سے تمہارا شکر یہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ مٹا شانے مجھے آدھی رات کو ڈھونڈ لیا تھا۔ دراصل ہمارے درمیان تمہارے سناٹے ہی پر کچھ اُن بن ہوئی تھی، اس لیے میں اپنا کبوتر چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ پہلے تو وہ میرے کبوتر سے یوں چلے آئے پر بہت ناراض ہوئی اور پھر جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں اس وقت اسی نو جوان کے کبوتر میں ہوں، جسے اس نے بھرے ہال میں سخت سب سناٹی تھی، تو وہ بہت دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اتنا شرمندہ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں رات ہی اپنے کبوتر واپس لوٹ گیا تھا۔ بہر حال تمہارا بہت شکریہ۔“ انہوں نے کبوتر کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی اور مجھے اپنے ساتھ ناشتے کے لیے چلنے کی دعوت دی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اب اس تبدیلی کر کے نیچے ہال میں ان سے ملوں گا۔ کبھی کبھی غم کرم پانی کا ایک طویل شادو جاری رکوں سے تنگ یوں پھڑپھڑاتا ہے، جیسے گیلی ریت پر لکھے کسی نام کو سمندر کی ایک بڑی لہر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ میں ڈانکنگ ہال پہنچا، تو کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جا چکے تھے اور باہر آسمان پر ہلکے پادلوں سے چھن کر آتی دھوپ نے ہال کے چاروں طرف لکڑی کے پھلے فرش پر دھوپ کی درجنوں کھڑکیاں ہی باریک تھیں۔ میں ابھی بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا کہ راجیل صاحب نے آواز دی۔ ”بہنیں آ جاؤ تو جوان..... ہماری میز پر ایک کرسی خالی ہے۔“ لیکن میں نے دور ہی سے ہاتھ ہلا کر ان کا شکر یہ ادا کیا اور عرشے کی جانب کھینچی ایک کھڑکی کے قریب پڑی میز پر اپنے دلچسپ کاپیالہ رکھ دیا۔ تب ہی میں نے مٹا شادو کو میز سے اٹھ کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیس تیس سال کی ایک دلکش خاتون تھیں۔ سلیقے سے کٹے ہوئے سنہرے بال، جو فلپس سے میچنگ ایکارڈ سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور دونوں ہی مرتبہ چانے کیوں مجھے ان کے چہرے کے ایک زاویے سے کبھی کے ساتھ کی پسندیدہ ہالی وڈ آرٹسٹ کی تھریں زینا جوز کی بھلک بھٹ واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹی چھوٹی اردو میں اجازت لے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کل رات راجیل صاحب بھی مجھ سے اردو میں ہی بات کر رہے تھے، لیکن مٹا شادو کو اردو میں اپنے لفظ جوڑنے کے لیے کافی مشقت گزار رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر انہیں یہ ”نا کام کوشش“ کرنے دی اور پھر دھیرے سے ان سے انگریزی میں کہا کہ وہ چاہیں، تو اب یہ کوشش ترک کر کے مجھ سے انگلش میں بات کر سکتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھونچکا سی رہ گئیں اور پھر انتہائی ندامت سے بولیں۔ ”اوہ..... تو تم انگلش بول لیتے ہو، لیکن مجھے راجیل نے تو بتایا تھا کہ..... پھر تو میں مزید نادم ہوں، کیوں کہ تم نے میری گزشتہ رات کی ساری گفتگو سمجھ لی ہوگی۔ بتائیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کبھی کسی پر اس طرح نہیں سیٹائی۔“ میں مسکرایا۔ ”چلیں یہ اعزاز میری قسمت میں لکھا تھا، ورنہ عام طور پر بے چارے شوہر کا نصیب ہوتا ہے۔“ میری بات سن کر وہ فحش پڑیں اور ان کے چہرے پر چھایا ہوا تلخد رکھ ہو گیا۔ ”دیے تم عجیب لڑکے ہو، جس عورت نے تمہیں یوں سر بازار سو گھمایا، اسی کے شوہر کو تم نے رات گزارنے کے لیے اپنا کبوتر فحش کر دیا۔ کیوں؟.....“ میں نے ان سے بھی وہی کہا، جو رات کو راجیل صاحب سے کہہ چکا تھا کہ وہ سب فراموش کر دیں۔ ہماری میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک نوجوان بھائی انگریز جوڑا ناشتا کر رہا تھا۔ بتائیں کس بات پر لڑکے نے لڑکی سے، بہت پیار سے پوچھا۔ ”بچا، تم میرے ساتھ خوش تو ہو نا۔“ لڑکی نے ہنستے ہوئے زور سے ”ہاں“ کہا اور وہ دونوں فحش پڑے۔ قریب ہونے کی وجہ سے ان کی ساری گفتگو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ مٹا شادو مسکرائی۔ ”کتنی عجیب بات ہے، ہر سونے سے یہ سوال عورت سے تب ہی کیا جاتا ہے، جب اس کے پاس ”ہاں“ کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔“ ظاہر ہے، ”کون بے وقوف شوہر ہوگا، جو اپنی بیوی کو ہنستے ہوئے یہ سوال کرے گا؟“ میری بات سن کر وہ پھر زور سے فحش پڑیں، لیکن ان کی اداس آنکھیں کچھ اور ہی فضا بن رہی تھیں۔ میں نے ان سے معذرت کی کہ کل رات میری وجہ سے راجیل صاحب کا ان سے بھگڑا ہوا۔ وہ جلدی سے بولیں ”نہیں نہیں..... ایک کوئی بات نہیں..... تم صرف ایک بہانہ بنے، ورنہ ہمارے درمیان بہت دن پہلے ہی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگلی ہندو گاہ پر اتر کر ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔“ میرے اندر جیسے ایک جھٹکا کا مہا ہوا۔ یہ بات میرے لیے کچھ اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ شاید میری حالت بہانہ نہ تھی۔ ”شاید میں نے تمہیں دھچکا پہنچایا۔ مجھے افسوس ہے، مگر کچھ یہی ہے۔ ہمارے درمیان جو دو طاری ہو رہا تھا اور شاید جو دمہمت کی موت ہے، لیکن اللہ یہ ہے کہ محبت کو ہمد سے پہچانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح جیسے محبت کا ہو جانا ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ مشرق کی عورت جس بات کو چھپانے کے لیے زندگی بھر چپ رہتی ہے، مغرب کی عورت نے وہی حقیقت کتنی آسانی سے بیان کر دی تھی۔ میں چپ رہنا چاہتا تھا، لیکن پھر وہی آداب گفتگو کی زنجیر آڑے تھی۔ ”ہمارے مشرق میں ہزاروں لاکھوں محبتیں ایسے جو دو کا شکار ہونے کے باوجود صرف ایک ہمد کی سرمت کی خاطر اپنی طبیعت کی موت کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ہاتھ یہ ان کی خوش قسمتی ہے یا سرماں ٹھنکی، لیکن شاید یہ رشتہ کبھی نہ کبھی ایسی قربانی ضرور مانگتا ہے۔“ وہ اپنی پلینٹ میں رکھے آئینہ کو کانٹے سے ادھر ادھر دھکیلتی رہیں، لیکن اُن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ ”جانتی ہوں، ساری بات شاید اختیار کی ہے۔ کاش میں بھی تمہارے مشرق کی عورت کی طرح بہت سی باتوں پر اختیار رکھنے کے باوجود بے اختیار ہوتی۔“ میں نے تردید مناسب نہیں تھی۔ ناشتے کے بعد میں بہت دیر تک سلطان بابا کے کبوتر میں ان کے سر ہانے بیٹھا رہا۔ انہیں اب بھی خود سے زیادہ میری فکر کھائے جا رہی تھی اور وہ مختلف بہانوں سے مجھ سے وعدہ لیتے رہے کہ میں شہر پہنچے ہی خود کو تم ازم ایک ہفتے کے لیے ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں گا۔ شہر کا ذکر آنے پر ایک دم ہی میرے ذہن میں اس پری کا تصور ابھر آیا، جو اس جنازے فسانے کی بنیاد تھی۔ جاے میں اس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ میری سانسیں تو اس کے تصور ہی سے جھینپ گئیں تھیں۔ اگلے صبح بعد اسے اپنے سامنے دیکھ کر جانے میرا کیا حال ہوگا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل ہی زمین صاحب کے ذریعے اپنے گھر اپنی واپسی کی اطلاع کروا چکا تھا اور یقیناً مٹا پٹا نے زہرہ کو بھی میری آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔ جہاز کے ہندو گاہ پر ننگرا انداز ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن مجھے ان لمحوں میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کبھی کبھی انتظار خود ایک وصل کی لذت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، لیکن اس کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو خود کسی طویل ریاضت سے گزر کر اپنی منزل کو بالکل سامنے پا کر بھی خود کو سویرا ہونے تک روکے رکھتے ہیں۔ میں بھی عصر کے بعد عرشے پر کچھ نیلی بان سے بنی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا دوڑا سی افق کو دیکھ رہا تھا، جس سے پرے، وہ زہرہ جیڑی رہتی تھی، اور انتظار کی اسی لذت کو محسوس کر رہا تھا، جو کسی کی کا مقرر ہوتی ہے۔ اگلے میں مجھے اپنے عقب سے مٹا شادو کی آواز سنائی دی۔ ”کیا میں غل ہو سکتی ہوں؟“ میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ راجیل صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ مٹا شادو نے بات شروع کی۔ ”تم نے کبھی محسوس کیا، ہماری زندگی

کی ننانوے فی صد ضروریات کسی نہ کسی تخلیق کار کے ذہن کی مرہون منت ہیں۔ سوئی سے لے کر بحری جہاز تک۔ کوئی بھی ایجاد اٹھا لو، انسان نے انسان کی سہولت کے لیے، کیا کچھ نہیں کیا۔ بس ایک زیادتی ہوگئی کہ ان سب آسانوں کے حصول کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے منسلک کر دیا، جسے ہم آج کل پیسا کہتے ہیں۔“ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... اور شاید جہاں سے پیسے کا عمل دخل شروع ہوتا ہے، وہیں سے تخلیق کے عمل کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تخلیق یا Creativity خود کو غلطیاں کرنے کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے، جب کہ ”آرٹ“ اپنی غلطیوں میں سے کسی ایک کو جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔“ مناشا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”ایک بات کہوں اگر برانہ مانو تو..... تمہارا یہ حلیہ اور تمہاری باتیں آپس میں بالکل میچ نہیں کرتیں۔ یہ کیا معنی ہے؟“ میں مسکرایا۔ ”اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ باتیں مجھے یہ حلیہ اختیار کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئی ہیں تو آپ مزید الجھ نہ جائیں..... آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے اور راجیل صاحب کے درمیان صلح کی کوئی گنجائش نہیں؟ میں نے انہیں ایک بے حد نفیس انسان پایا ہے اور بھینا وہ آپ سے شدید محبت بھی کرتے ہیں۔“ مناشا نے گہرا سانس لیا۔ ”صلح وہاں ہوتی ہے، جہاں جھگڑے کی کوئی بنیادی وجہ بھی ہو، اور یہ بھی سچ ہے کہ راجیل جیسا عمدہ اور نفیس انسان بڑی مشکل سے میسر ہوتا ہے، مجھے اس کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں جدا ہو رہے ہیں۔ ہماری بیٹی یعنی ابھی بہت چھوٹی ہے، لہذا ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ وہ شروع میں کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے گی اور پھر جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی، تو آخری چناؤ اس کے ہاتھ ہی میں ہوگا۔“ مناشا نے جتنی بار اپنا گھر ٹوٹنے کا ذکر کیا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں ایک خاص دکھ کی لہر محسوس کی تھی۔ مشرق ہو یا مغرب، رشتے ٹوٹنے کی چھین شاید یکساں ہوتی ہے۔ ”میں جانتا ہوں کہ شاید یہ بہت ذاتی سوال ہوگا، لیکن کیا میں اس جدائی کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ مناشا نے کچھ دیر توقف کیا، پھر ان کی آواز یوں سنائی دی، جیسے وہ ساحلوں سے پرے بیٹھی ہوں۔ ”وفا..... ہماری جدائی کا سبب وفا ہے۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ لیکن چپ رہ کر انہیں خود کو مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ”جو بات میں تمہیں اب بتانے جارہی ہوں، جانے اس کے بعد تمہارے دل میں میرے لیے رشتی برابر بھی عزت باقی رہے گی یا نہیں۔ ہمارے مغرب میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونے پر گھروں کا ٹوٹ جانا ایسی کوئی معیوب بات نہیں رہی، بلکہ اب تو کسی بندھن کے تکلف ہی کو ترک کر دیا گیا ہے، لیکن میں نے ایک مشرقی مرد سے محبت کے بعد شادی کی تھی اور اس کی ہر روایت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ پھر نہ جانے یہ تیسری ”درانداز محبت“ کہاں سے ہمارے درمیان کی دیوار بنتی گئی۔ مجھے امید ہے، تم مجھے دیگر لوگوں کی طرح ایک بے راہ و مغربی عورت نہیں سمجھو گے۔ سچ یہ ہے کہ میری وفا مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں راجیل کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی سوچوں کے دروازے کسی اور کے تصور پر وا کروں۔ میں نے اسی لمحے راجیل کو بتا دیا تھا کہ شاید میں کسی اور کی کشش کا شکار ہو رہی ہوں اور یہ راجیل ہی کا اعلیٰ ظرف ہے کہ اس نے آٹھ سالہ رفاقت اور شدید محبت کے باوجود فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیا۔ ہم دونوں ہی محبت میں تجدید وفا کے قائل نہیں ہیں..... اور پھر وہ وفا ہی کیا، جیسے ”تجدید“ کی ضرورت پڑ جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب محبت فرسودہ ہو کر دامن چھڑانا چاہتی ہے، تب وفا اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے اور محبت کو اس کا راستہ بدلنے نہیں دیتی۔ ننانوے فی صد کیسز میں جیت وفا ہی کی ہوتی ہے، لیکن افسوس میرا مقدمہ 100 سوال تھا۔“ میں چپ کر کے مناشا کی بات سنتا رہا۔ انہیں اپنا دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے کسی اچھے سامع کی ضرورت شاید بہت عرصے سے تھی۔ ان کی کہانی بھی ہر محبت کی کہانی کی طرح ان کی پہلی ملاقات سے شروع ہوتی تھی۔ راجیل اور مناشا کی ملاقات پیرس کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ جہاں راجیل پاکستان سے اپنے ادارے کے ملبوسات کی تشہیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ راجیل کی شان دار شخصیت، متانت اور سمجھ داری کے امتزاج نے جلد ہی مشکل پسند اور سچی مناشا کے دل میں گھر کر لیا۔ خود مناشا اٹلی سے فیشن ڈیزائننگ کے کورس کے لیے پیرس آئی ہوئی تھی۔ دو چار ملاقاتوں ہی میں سارے بیان بندھ چکے، تو راجیل نے اپنے گھر والوں سے فون پر مناشا کی بات کروائی، کیوں کہ وہ اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ ماں نے بیٹی کی آواز میں جھلکتی خوشی کو مستقل کرنے کا عندیہ دے ڈالا اور مناشا راجیل کی ہوگئی۔ دونوں کا شعبہ ایسا تھا کہ انہیں فرانس اور پیرس ہی سب سے زیادہ چہتا تھا، لہذا رہائش وہیں رکھی گئی۔ ان کی اکلوتی بیٹی یعنی کی پیدائش بھی پیرس ہی میں ہوئی۔ سات سال یوں پر لگا کر اڑ گئے کہ دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ ہاں بس، دونوں میں کبھی ہنستے کھیلتے اختلاف ہوا بھی تو صرف اس بات پر کہ راجیل محبت کے حصول ہی کو محبت کی معراج سمجھتا تھا، جب کہ مناشا اس حاصل پن کو صرف ایک ابتدا۔ وہ محبت میں جنوں کے سرد ہونے کو منافقت کے طور پر لیتی تھی اور ہمیں شاید راجیل سے کچھ چوک ہوگئی اور فرہاد ان کی زندگیوں میں داخل ہو گیا۔ فرہاد ایک ایرانی مصور، جس کی تصویروں کی نمائش پیرس کی ایک بہت بڑی آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تھی اور مناشا کے لاکھ اصرار کے باوجود راجیل نے گھر پر یعنی کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دی، جب کہ اس سے قبل راجیل اور مناشا ایک ساتھ ایسی ہر تقریب میں نہ صرف شرکت کرتے، بلکہ واپس آ کر ہفتوں ان فن پاروں پر بحث کر کے اپنے خیالات بھی بانٹا کرتے تھے، لیکن اس بار مناشا کو مجبوراً تنہا ہی نمائش دیکھنے جانا پڑا۔ شاید کچھ ”ان ہونیاں“ سدا ہی سے ہماری تاک میں ہوتی ہیں۔ وہ تصویریں بھی کچھ یوں ہی تھیں۔ ایک حادثے کا طرح اچانک اور فن کا ایک عظیم شاہ کار، مناشا پینٹنگز میں کچھ ایسی کھوئی کہ خود اپنا آپ ہی بھولتی چلی گئی۔ کتنا درد، کتنی پیاس، کیسی گہری تکلیف ہر تصویر میں، روح میں سے روح نچوڑ لینے والی تاثیر لیے ان رنگوں نے گیلری میں سب ہی لوگوں کو مبہوت کر رکھا تھا۔ اور پھر مناشا کی نظر فرہاد پر پڑی، وہ کسی شخص کو اپنی کسی تصویر کا عنوان بتا رہا تھا۔ ”کھوج..... اس تصویر کا عنوان کھوج ہے..... لا حاصل کی کھوج..... یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی اپنے کسی نہایت عزیز اور اس پیارے کے لیے چھلنی میں بھر کر پانی لے جانے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہو، جو اسی کے سامنے شدید پیاس سے دم توڑ رہا ہو یا میدان جنگ میں پیاس سے تڑپتے، جان دیتے سپہ سالار کے لیے اس کے کسی وفادار سپاہی کا اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں دو گھونٹ پانی لے کر بھاگنا..... بس کچھ ایسا ہی بیان کرنے کی کوشش کی ہے میں نے اس تصویر میں.....“ مناشا خاموشی سے فرہاد کی بات سنتی رہی۔ اور یہی وہ ابتدا تھی، جس کی انتہا، آج میرے سامنے کا سا بلا ٹکا کے عرشے پر موجود تھی، شروع کے چند ہفتے تو مناشا کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کشش فرہاد کے فن کی ہے یا شخصیت کی۔ وہ راجیل کو بھی اگلے ہفتے وہ نمائش دکھانے لے گئی اور راجیل نے بھی فرہاد کے فن کو خوب سراہا۔ خود فرہاد اس بات سے ہمیشہ بے خبر رہا کہ ان جانے میں وہ کسی کے اندر ہونے والی کتنی بڑی ٹوٹ پھوٹ کا ذیہ دار ہے، کیوں کہ مناشا نے کبھی اسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ مناشا اس لیے بھی شدید الجھن میں تھی، کیوں کہ اس کے پاس بظاہر ایک اور محبت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی، لیکن کیا کبھی محبت کو کسی وجہ کی ضرورت رہی ہے؟ کیا محبت کسی عمر کی مرہون منت ہوتی ہے؟ نہیں..... دل کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے..... کہ

دل کب کسی کا دوست ہوا ہے۔..... (جاری ہے)



ہاشم ندیم

اک خاک بسرنو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رکھے کچھ دور تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ بنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا نیکو نسل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دوسرا“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف و محبوب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی غنی غنی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بننا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز نکلنے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے مرتبہ سیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑا ہے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سبب فاضل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی خطاب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggrouop.com.pk

سراپا عشق ہوں میں، اب بکھر جاؤں تو بہتر ہے
جدھر جاتے ہیں یہ بادل، ادھر جاؤں تو بہتر ہے
یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں
حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے.....
یہاں ہے کون میرا جو مجھے اپنا بھی سمجھے گا
میں کوشش کر کے اب خود ہی سنو جاؤں تو بہتر ہے.....

مناشا کے حالات سنو نے کے بجائے بگڑتے ہی چلے گئے، حالاں کہ وہ صرف دوسرے ہی فرہادی آرٹ گیلری گئی تھی۔ پہلی مرتبہ تنہا اور دوسری بار راحیل کے ساتھ اور اس کے بعد اس نے کئی نئے دو بارہ اس جانب کا رخ بھی نہیں کیا۔ اُسے راحیل، اپنی بیٹی اور اپنی پُرسکون زندگی ہاتھوں سے بچھلتی نظر آنے لگی۔ یہ محبت ہمارے دلوں پر تب ہی شب خون کیوں مارتی ہے، جب ہم اس کے وار سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہی جرم ہمارے مشرق میں کسی عورت سے سرزد ہوا ہوتا، تو طوفان آ جاتا۔ پھر چاہے وہ مناشا کی طرح یک طرفہ اور بنا اظہار و اجازت ہی کیوں نہ ہوتا، لیکن ایک مکمل بربادی عورت کا مقدر ہوتی، لیکن یہ پیرس تھا اور مناشا ایک اعلیٰ نژاد فرانسیسی شہری۔ پھر بھی راحیل کے اندر اپنی پرانی افتداز گہری جڑوں تک موجود تھیں اور پھر اسے اب بھی مناشا سے شدید محبت تھی۔ وہ چاہتا تو چیخا، چلا تا، اُسے بے وفائی کے طعنے دیتا، ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے باہر بھی کھینکتا تھا، لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو دوسرے کے پلٹ جانے پر اپنی حرمت ہی کھو دے۔ اپنا وقار، اپنا گریس ختم کر دے۔ راحیل نے ٹھیک اس ڈوبتے جہاز کے کپتان جیسا بھرم قائم رکھا، جس کے سامنے اس کی متاع حیات قطرہ قطرہ کر کے ڈوب رہی ہو، لیکن وہ آخری مسافر کو بھی بچالے کی خاطر عرشے پر آخری وقت تک سیدنا تے ٹھہرا رہے اور جہاز سے بندھی آخری کشتی کے سمندر میں اترنے کے بعد جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو جائے۔ مناشا نے بھی مغربی معاشرے کی ایک آزاد عورت ہونے کے باوجود اپنی کم گشتہ محبت کی حرمت قائم رکھی اور آخری وقت تک فرہاد کو اپنے دل و دماغ میں چلتی چنگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، تا وقت یہ کہ اس نے راحیل سے ہر بات بانٹ نہ لی۔ راحیل کو مناشا کے اس آخری کڑوے سچ پر بھی مان تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے زیادہ دیر نہیں دیکھ پائے گا۔ اس نے مناشا سے آخری فیصلہ کرنے کا کہا۔ مناشا خود بھی راحیل کو یوں لہو بہ لہو ٹٹے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سو، اس نے ٹوڈ ہی اپنی فرد جرم پڑھ کر سنائی اور ٹوڈ ہی اپنی سزا بھی طے کر دی۔ مگر بھری جدائی کی سزا۔ جب کوئی جج کسی کو عمر قید کی سزا سناتا ہے، تو وہ اصل میں ملزم کو اس کے پیاروں سے مبرا بھری جدائی کی سزا ہی تو دے رہا ہوتا ہے۔ سو، مناشا نے بھی اپنے لیے اک نئے طرز کی ”عمر قید“ ٹٹائی تھی۔ راحیل نے مناشا سے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیڑ پڑ کے دار کا فکار اگر مناشا کا دل ہوا تھا اور جرم کی سزا دہی جی بھی اس کے دل کے سر ہے، تو پھر سزا راحیل کو بھی کیوں مل رہی ہے۔ شاید دلوں کے جرم ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کرنا کوئی اور ہے اور بھرنے کوئی اور..... دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کے تیسرے مرکزی کردار فرہاد کو ابھی تک اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کتنی زندگیاں میں طوفان کا باعث بن رہا تھا۔ حالاں کہ اب اس کی مناشا سے اچھی خاصی پہچان ہو چکی تھی اور وہ اس کے تمام خاندان سے بھی مل چکا تھا، لیکن مناشا نے راحیل کے کہنے پر بھی اپنے دل کا حال فرہاد پر ظاہر نہیں کیا۔ اُس نے اپنے دل کو سزا دینے کے لیے ایک عجیب ٹھوٹھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا ظرف اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ راحیل کے ہوٹے ہوئے فرہاد کے سامنے دل کے لٹ جانے کی دہائی دے اور پھر اگر کسی وجہ سے فرہاد ہی اُسے ٹھکرا دے، تو پھر سے روتی دھوتی راحیل کی زندگی میں واپس آ جائے، لہذا اس نے آخری کشتی جلا کر تخت پا تختے کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے راحیل کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ جب تک وہ علیحدہ نہ ہو جائیں، تب تک فرہاد کو اس بات کی بھٹک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ ان کی علیحدگی کی وجہ خود اسی ”مرد مظلوم“ کے ہاتھ سے کیوں ہو پھینکے گئے چند رنگ کے چھینٹے ہیں۔ بظاہر ناممکن نظر آنے والی ایسی داستانیں صرف مغرب ہی میں جنم لے سکتی ہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں کسی مرد کا ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری محبت میں ”جتلا“ ہو جانا تو عام ہی بات سمجھی جاتی ہے، مگر عورت بے چاری اپنے خواب میں ساتویں کس سے پرے بھی اگر کسی غیر کی شبیہ دیکھ لے تو گمبھرا کر خود ہی اٹھ ٹٹھمتی ہے۔ مشرق میں وفا کے پلڑے کا سارا بوجھ عورت ہی کو پورا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ یہاں کا مرد اُس تر از و میں ٹٹھکتا ہی نہیں، لیکن مناشا نے مغربی ہوتے ہوئے بھی اپنی وفا کا ایک معیار قائم

رکھنے کی یہ انہی کو بخش ضروری۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راجیل سے علیحدہ ہونے کے بعد فرہاد اسے اپنائے گا یا اُس کی ساری داستان کو ایک قہقہے میں ختم کر دے گا، کیوں کہ یہ جو تو صرف شاہی نے اپنی زندگی کے ساتھ کھینچا۔ فرہاد کی وفا اور محبت تو کبھی اس ٹھیل سے مشروط ہی نہیں تھی۔ راجیل شاہ کے اس پائل پن سے کبھی کبھار اتنا بکھر جاتا کہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اسے فرہاد کی آرٹ کیلری چھوڑ آئے، تاکہ شاہیہ اندھی جال چلنے سے پہلے صرف ایک بار اپنے پتے ضرور دیکھ لے کہ کہیں مات ہی تو اس بازی کا سقڑ نہیں؟ لیکن بالآخر راجیل ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں اُس کی ماں کی طبیعت پاکستان میں مسلسل کڑی جا رہی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ ایک بار اپنی بہو اور پوتی سے مل لے۔ کیوں کہ شاہی شادی کے بعد سے اب تک راجیل کے وطن نہیں جایا تھی، لہذا راجیل نے اُس سے اس آخری ”ہم سنی“ کی درخواست کی اور طے یہ پایا کہ راجیل کی ماں سے ملاقات کے بعد خاموشی سے وہ دونوں جدا ہو جائیں گے اور اس کی خبر راجیل کی بوڑھی ماں کو کبھی نہیں ہو پائے گی۔ کیوں کہ وہ یہی سمجھتی رہے گی کہ اس کا بیٹا اور بہو خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئے ہیں۔

شاہی کی عجیب داستان کا اختتام ابھی باقی تھا، لیکن میں اس رات لھر بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں چپک۔ کا۔ کیا محبت دوبارہ بھی ہماری زندگیوں میں چلتی ہے، وفا کیا ہے اور اس کی حدیں کہاں تک مقرر ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں جس محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتے ہیں، اپنے دل کے کواڑ دوسروں پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتے ہیں، کیا وہی ہماری ”آخری محبت“ ہوتی ہے۔ کیا ”محبت“ اور ”وفا“ کے معیار بھی ہماری معاشرتی اقدار کے تابع ہوتے ہیں اور ہم صرف انہی کی پیروی ہی کو ان جذبوں کے پرکھنے کا اصل پیمانہ تو نہیں سمجھ بیٹھے۔ جانے اس ”محبت“ کا ہی سننے کی کتنی پرہیز، گھٹے پہلو اور گھٹے زاویے مزید ایسے تھے، جن سے میرا پا پا پڑنا ابھی باقی تھا۔ رات بھر سلطان بابا بے حد بے چین رہے اور بار بار اُن کی آنکھ کھلتی رہی۔ مجھے ان کی طرف سے بے حد تشویش تھی اور میں اس پریشانی میں کئی مرتبہ خود اپنی دوائیں لینا بھی بھول جاتا تھا، حالانکہ مجھے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے شہر پہنچنے تک مجھے ہر حال میں ان دواؤں کا استعمال جاری رکھنا ہوگا، ورنہ سمندر کے سفر میں میری طبیعت مزید بگڑنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ میرے دوروں کا دورانیہ ویسے بھی اب طویل تر ہونے لگا تھا۔ اس رات بھی کئی مرتبہ میری رگوں میں جیسے مکمل اندھیرا سا بھانے لگا اور کئی مرتبہ مجھے اپنا سر بھٹک کر اٹھ کے ٹھلنا پڑا، نتیجتاً صبح میری طبیعت نہایت بوجھل تھی اور سردرد سے بھٹ رہا تھا، لہذا میں اپنے کپڑے میں ہی پڑا رہا۔ سلطان بابا کے کمرے میں نرس ان کی دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے کپڑے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے راجیل صاحب کھڑے تھے ”میں ٹھل تو نہیں ہوا، دراصل تمہیں ناشتے پر ڈائننگ ہال میں نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی۔“ ”جی..... میری طبیعت کچھ بوجھل تھی، اس وجہ سے بچے نہیں آسکا۔“ انہوں نے فوراً میری نبض دیکھی اور تیز بخار کا بخار ظاہر کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دوا لے چکا ہوں۔ انہوں نے تجویز دی کہ مجھے اس حال میں بند کمرے کے بجائے مرثے پر گھٹی فضا میں رہنا چاہیے، تاکہ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں میرے تپتے جسم کو کچھ راحت مل سکے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں بہانے کے ذریعے جسے میں لکڑی کے پتے تختوں سے ایک اونچے پیٹ فارم نما مرثے پر کھڑے تھے۔ آس پاس شدید دردی پر نیلی لکیر والی مخصوص ٹوپی پہنے جہاز کا عملہ صفائی کر رہا تھا اور سٹرین اطالوی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ راجیل صاحب نے دور مٹی لہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”جانتے ہو یہ سراج اس اطالوی گیت میں کیا گنگنا رہے ہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ کہہ رہے ہیں کہ بادبان اونچے کرلو۔ چور اور تیز چلاؤ، کیوں کہ ایک بڑا طوفان ہماری تاک میں ہے..... ہمارا معاملہ دور ہے اور کپتان کی بھوپہ پھول لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔“ ”آپ کو اطالوی آتی ہے؟“ ”ہاں..... کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں..... شاہ کے گھر والوں کے سامنے بہت پاپڑ چلنے پڑے تھے مجھے۔ وہاں کی بہت سی رسمیں اب بھی ہم سے ملتی چلتی ہیں۔“ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ”کیا بادبان اونچے کرنے اور چور اور تیز چلانے سے طوفانوں سے بچا جاسکتا ہے۔؟“ انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے ”نہیں..... طوفان تو آکر ہی رہتے ہیں، لیکن طوفانوں کے ڈر سے سمندروں کو بچان بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا اور پھر جن کی ناکہ بندی میں جھپٹا ہو جائے، انہیں طوفانوں سے کیا لگا کر ڈوبنا ہی مقدر ہے تو، پھر مکوں سے پناہ کی آواز گئے کیوں ڈوبنا چاہئے۔ شور مچا گئے اور دوا دیا کر کے سمندر کا تقدس پاٹال کرنے سے کیا فائدہ؟“ میں ان کے چہرے ہی سے ان کے اندر اچھے طوفانوں کی ایک بھٹک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں پھر ٹوٹا ”آپ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان سکتے ہیں، جو ڈوبنے کا حوصلہ دیتے ہیں، وہ طوفانوں کا رخ بھی تو موڑ سکتے ہیں۔“ وہ مسکرائے۔ کنگلی کھائے مسکراہٹ تھی۔ ”وہ جس معاشرے میں پٹی بڑھی ہے، وہاں محبت کا ہو جانا عادی تو ہو سکتا ہے، نرم نہیں اور محبت نرم تب بنتی ہے، جب وہ اپنے ساتھ احساسِ ہرم لے کر آئے..... اور پھر یہ دلوں کے سودے ہیں۔ یہاں ڈوبنے والے ہی فاتح قرار پاتے ہیں۔ اس کے دل میں بال آ جانے سے میری محبت پر کوئی فرق پڑے، تو پھر یہ محبت نہیں ”سوداگری“ ہوتی۔ میں صرف اپنے احساس کے ساتھ بھی تو ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ جانتے ہو، محبت بخشنی پرانی ہوتی ہے، اتنی ہی خون میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت، کبھی محبت کا خون میں ہمایہ نہ ہرچیز نہیں نکلتی۔“ ”تو پھر آپ خون میں سرایت کی ہوئی اس محبت کو نکالو اور کھینچنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔؟“ آپ پاکستان میں رہ جائیں گے اور جانے وہاں فرانس میں فرہاد انہیں قبول کرے گا بھی یا ان کے اتنے بڑے قدم اٹھانے پر صرف اسٹوپس کا اظہار کر کے اپنی زندگی میں پھر سے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے، اسے پہلے سے کسی اور سے محبت ہو۔ محبت بھلا کب کسی کا انتظار کرتی ہے؟“ ”میرا لہجہ شاید جلد بائیں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا تھا، تب ہی ہمارے پاس سے گزرتی ایک بوڑھی خاتون مسافر نے اپنے کالے بالی دار ہیٹ انکے نیچے سے ہم پر ٹپکھیں سی لگا ڈالی۔ راجیل صاحب کچھ دیر پُپ رہے۔ جہاں شاہ نے کھینچا ہے، لیکن ہاڑی نہیں نے بچھائی ہے۔ میں اپنی ہم سفر کو اس کی زندگی کے لیے سب سے مشکل سفر میں تمہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں، دو دن بعد ہم جس بندرگاہ پر اتر رہے ہیں، وہاں فرہاد پہلے سے موجود ہوگا۔“ میرے پاؤں تلے سے جیسے کسی نے عرشے کا تختہ بھینچ لیا اور مجھے یوں لگا، جیسے میں دھڑام سے سمندر میں جا گر ا ہوں۔ راجیل صاحب میری کیفیت سے بے خبر مجھے تفصیل بتاتے رہے کہ کس طرح پیرس میں جب وہ شاہی کی ضد گئے آگے ہار مان گئے اور انہوں نے اُسے آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تب انہوں نے شاہی کی سب سے قریبی دوست سونیا سے رابطہ کیا۔ سونیا، شاہی کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، لہذا راجیل اور شاہی کی علیحدگی کا سن کر وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ شاہی سے لڑنا چاہتی تھی، مگر راجیل نے بڑی مشکل سے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بے خبر کسی طریقے سے فرہاد تک پہنچا دے کہ راجیل اور شاہی آپس کی ان بن اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ راجیل نے سونیا کو سختی سے تاکید کی کہ شاہی کا بھرم کبھی نہ ٹوٹے پائے اور فرہاد کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ شاہی راجیل سے کیوں جدا ہو رہی ہے۔ سونیا کو فرہاد کے سامنے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنی عزیز از جان کھلی کے

لیے بہت پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اگر فرہاد پر پہلے سے کسی وعدے یا رشتے کا بوجھ نہیں ہے، تو وہ متا شا کو اپنا لے۔ راجیل نے سونیا کو یہ پیغام دے کر فرہاد کے پاس تو بھیج دیا، لیکن خود انگاروں پر لوٹا رہا۔ دنیا میں بھلا کون ہوگا، جو کسی لیرے کو خود بدعو کرے کہ ”آؤ اور میری متاع حیات لوٹ کر چلتے بنو.....“

دوسرے دن جب سونیا نے راجیل کو آکر یہ بتایا کہ پہلے پہل تو فرہاد ان کی جدائی کے صدمے سے سنبھل ہی نہیں پایا، کیوں کہ وہ متا شا کے پورے خاندان سے واقف تھا اور اسے ایک فرد کی حیثیت دی جاتی تھی، پھر اس نے سونیا سے التجائی کہ کیا وہ متا شا کی ذاتی زندگی میں دخل دے کر اسے سمجھا سکتا ہے، لیکن جب سونیا نے اُسے متا شا کے بھرم کی قسم دی، تو اس نے سونیا کو بتایا کہ وہ ہمیشہ راجیل کی قسمت پر رشک کرتا آیا ہے، کیوں کہ متا شا جیسی ہم سفر قسمت والوں ہی کو ملتی ہے اور اس نے سونیا سے کہا کہ وہ متا شا کو اپنا اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ سب سن کر راجیل کا دل آخری بار دھڑک کر پیسے بند ہو گیا، شاید کہیں دور اس کے دل میں اب بھی یہ امید تھی کہ فرہاد متا شا کو کسی وجہ سے اپنا نہ پائے، مگر اب تو کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔ متا شا کو اس اردات کی خبر نہیں تھی کہ فرہاد کو سونیا نے پہلے ہی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر بھیج دیا ہے اور راجیل اسے بندرگاہ ہی پر الوداع کہہ دے گا، البتہ ماں سے کیا بہانہ کرنا ہے، وہ بعد کی بات تھی۔ دنیا کا سب سے مشکل کام شاید اپنی محبت کو خود اپنے دل میں پل پل مرتے دیکھنا ہے اور اس سے بھی مشکل خود اسی محبت کی لاش کو اپنے دل میں دفن کرنا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسا ہی شخص کھڑا تھا، جو اپنی محبت کے لیے اپنے دل میں گڑھا کھود چکا تھا اور اب صرف اُسے دفنانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے حبیب البشر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ جانے والے سبھی حاجیوں سے انہوں نے میرے لیے دعا کرنے کا وعدہ لیا ہے۔ انہیں شاید جہاز کے طبی مشن سے میری نام سازی طبیعت کا بھی پتا چل گیا تھا۔ وہ بہت دیر میرے ساتھ عرشے پر بیٹھ رہے۔

عشاء کے بعد جب ان کے جانے کا وقت ہوا، تو مجھے اوپر والے چوٹی ڈیک پر جہاز کی آخری ریٹنگ کے پاس متا شا نظر آئی۔ عام طور پر جہاز کا عملہ کسی مسافر کو مغرب کے بعد اتنی اونچائی پر کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا، کیوں کہ کوئی بھی بڑی لبر انسان کا توازن بگاڑ کر اسے بیچ سمندر میں پھینک سکتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو خود متا شا کے ارادے بھی مجھے کچھ بدلے سے نظر آئے۔ میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ان کے قریب پہنچا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹیں۔ ”کیں آپ نے کسی شامک مچھلی کے ساتھ ڈنکا وعدہ تو نہیں کر رکھا؟“ وہ مسکرائیں۔ ”نہیں! میری شامک مچھلیوں سے کبھی اچھی سلام دعا نہیں رہی.....“ ہم دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے لہروں کو گھنٹے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے عبداللہ؟“ ”نہیں..... میں ابھی محبت کے ”م“ اور عشق کے ”عین“ تک بھی نہیں پہنچ پایا اور پھر ج یہ ہے کہ آپ سے ملنے کے بعد تو مجھے اپنے جذبے کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”کیوں؟“ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ سے ملنے کے بعد میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہماری محبتوں کا کوئی اختتام نہیں ہوتا، شاید محبت کی بقا صرف اس کے لا حاصل رہنے ہی میں ہے۔ جسے پالیا جائے، شاید وہ محبت نہیں رہتی، ورنہ انسان کا دل اس معراج کو پالینے سے پھر سے خاک میں کیوں لوٹتا؟ رشتوں کے ٹیلے بھنور بھی جب محبت کی سنہری گندہ کو نئی فیلیوں پر اٹکنے سے نہیں روک پاتے، تو پھر ہم ایک نیا گلہ کیوں نہ ایجاد کر لیں؟“ متا شا کی آواز کوئی کھوئی سی تھی۔ ”کیسا گلہ؟“ میں نے غور کر دیکھا۔ ”یہی کہ ہم اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور شدید محبت کو اس شرط سے متصل نہیں رکھ سکتے کہ خود ہم بھی اس کے لیے آخری محبت ہی ثابت ہوں گے، بلکہ ہمیں یہ گنجائش بھی رکھنی ہوگی کہ خود ہمارا دل بھی چلت سکتا ہے، تو پھر اسکی چلت جانے والی چیز کے لیے مرد و عورت کی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے ایک نئی راہ دکھادی۔“ متا شا کی آواز میں بے چینی تھی ”لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو واردات میرے دل کے ساتھ ہوئی ہے، وہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ تم اپنا نظریہ کیوں بدل رہے ہو۔ یہ صرف میری بدبختی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ میں نے آخری وار کر دیا ”تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سیاہ نصیبی پھر سے اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی؟“ ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں، وہ تو سدا کا بے نشان و منزل ہے۔ کل تک راجیل آپ کی پہلی محبت تھے۔ آپ کا ہر خواب اُن سے وابستہ تھا، لیکن آج آپ کو اپنا من فرہاد کی جانب کھینچا محسوس ہوتا ہے۔ ایک اجنبی آپ کے تمام خوابوں پر قابض ہو بیٹھا، تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل یہ من اپنے دھاکے کہیں اور نہیں الجھتا بیٹھے گا؟“ متا شا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”لیکن تم.....؟“ میں صرف اتنا کچھ پایا ہوں کہ بات اگر دل کے اختیار پر چلنے کی ہے، تو پھر ہمارا ایک شاعر صدیوں پہلے کہہ گیا تھا کہ ”دل پر زور نہیں“ آپ جس ماحول میں پلی بڑھی ہیں، اُس معاشرے میں انسان کی آخری سانس تک، ایسے دل کش ہیو لے اس کا دل کھینچنے کے لیے اس کے آس پاس بھٹکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی فلم اسٹار، کبھی کوئی کھلاڑی، کبھی کوئی سنگر..... تو پھر آپ کے گلے کے حساب سے ایک پل کا سکون ملتا بھی محال ہوگا۔ انسان کی ذات اندر سے جن سیکڑوں، ہزاروں خانوں میں بٹی ہوئی ہے، وہ سب کوئی بھی ایک انسان ان سب خانوں کے خلا کو بھرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ یہ کسی فرد واحد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم خود بھی کسی دوسرے کے بنائے ہوئے ہیو لے کا صرف چندہ یا نینس فی صد ہی پورا کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان مشہور لوگوں (سیلبرٹیز) میں اپنے من کے بنائے خاکے کی خوبیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے راجیل کے من کے ہیو لے کو ٹوٹا ہے۔ ہو سکتا ہے، خود آپ بھی اس کے اندر کی شبیہ کا صرف پانچ فی صد ہی پورا کرتی ہوں۔“ متا شا نے چونک کر میری جانب دیکھا ”لیکن راجیل نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ یقین کرو، میں اس کے من کے اندر موجود ہر تصویر کو اس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں اُس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ ”کتنی تصویریں جمع کر پائیں آپ؟ اور کیا انسان ساری زندگی انہی سراپوں کے پیچھے بھاگتے ہی گزار دے اور آخر میں خود ایک ہیو لہ بن کر رہ جائے۔ کیا یہی مقدر ہے ہم مجبور اور بے کس انسانوں کا، جنہیں زندگی تو صرف ایک ملتی ہے، مگر خواہشیں ہزار صدیوں کے وزن جتنی۔“ متا شا کی طرف سے بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو آواز سمندر کے اندر سے آئی محسوس ہوئی۔ ”پھر ان ہزار صدی کی خواہشوں کا کیا ہو، دل پر قفل کیسے لگایا جائے؟“ میں نے ان کی جانب دیکھا ”اگر اس دل نے ہمارے ساتھ ہر حاصل کو خاص سے عام کرنے کا کھیل رچایا ہوا ہے، تو پھر ہمیں بھی اس کے لیے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے ”لا حاصل“ نہ رکھ چھوڑنا چاہیے، تاکہ وہی ”لا حاصل“ اس کی آخری چاہت ثابت ہو۔ ہم اگر کسی صدی کے بچے کی طرح اس دل کی ہر بات ماننے لگے اور اس کی پسند کا ہر کھلو نا اس کی بھولی میں ڈالتے رہے، تو پھر پچھ بھی اُس بچے کی طرح چند دن تکمیل کر اس کھلونے کو پرانا کر دے گا یا دل اوپ گیا، تو تو زور دے گا اور پھر سے کسی نئے کھلونے کے لیے مچھلنے لگے گا، تو کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے ایک کھلونے کی آس ہی میں منتظر چھوڑ دیا جائے..... تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے لیے ”خاص“ رہے.....“

میں متا شا کو سوچوں کے بھنور میں چھوڑ کر نیچے کہیں میں چلا آیا۔ اگلی شام جہاز بندرگاہ پر ٹنگر انداز ہونے کے لیے اپنی رفتار دھبی کر چکا تھا۔ میرے سامنے وہی ساحل باغیں کھولے کھڑا تھا، جس کی ایک درگاہ پر نظر آئی ایک جھٹک اور جلوے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ دور سے میں نے منا اور پتا کو میزبانوں والے حصے کی جالی کے پرے دیکھا۔ ان کی نظرا بھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ مجھ پر زیادہ تھی، لیکن مجھے زہرہ کا دھانی آنچل تو ہمیشہ پہلی نظر میں نہا رہا تھا، مگر کیوں آج ابھی تک میری نظرا سے ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ جہاز بندرگاہ پر لگ گیا۔ ہم سب ایک ایک کر کے سیڑھیاں اتر کر زمین پر قدم رکھنے لگے۔ راجیل کے بعد اس کی بچی یعنی اور پھر متا شانے آخری سیڑھی کو الوداع کہا۔ دفعتاً متا شا کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک بچے سنورے شخص پر پڑی اور اُس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میرے دل نے دھڑک کر مجھ سے کہا ”فرہاد.....“ (جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

اک خاک بسرو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد دہرایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سرستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

میں نے بھی مناشا کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ ڈالی۔ وہ بھینا فرما رہا تھا۔ اس کے انداز میں جو ایک خاص لا پرواہی تھی اور اس کے سفید لباس پر چھٹی نیلی پی کپ اسے دور ہی سے کوئی مصور بتا رہی تھی۔ یہ تخلیقی کاموں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ وہ عمر میں مناشا سے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ مناشا ابھی تک شاک کی کیفیت سے نہیں نکل پائی تھی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی ”فرہاد..... تم..... یہاں.....؟“ فرہاد مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھا ”ہاں مجھے مونیات پتا چلا کہ تم پاکستان آرہی ہو۔ اتفاق سے میری بھی ایک تعویذی نمائش ہے، اسی شہر کی آرٹ گیلری میں۔ سوچا تمہیں سر پر اندر دے کر حیران کر دوں۔“ مناشا ابھی تک کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ راحیل کی آنکھیں نم ہونے کو تھیں، مگر وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر مناشا سے کہا ”چلیں..... آپ کا کام آسان ہو گیا، لوگوں کو خواب دیکھنے کے لیے رات بھر آنکھیں بند کر کے غیند کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جب کہ آپ کا خواب خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اب اپنے پٹنے کے ساتھ ہی لوٹ جائیں۔ خوابوں کو جینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ سہانے خوابوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔“ اتنے میں راحیل نے بھی تائید کی ”عبداللہ ٹھیک کہہ رہا ہے مناشا! میں اپنی ماں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یہاں تک میرے ساتھ آئیں۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اب یہاں سے آگے ہمارے راستے جدا ہیں۔ مناشا شاید سمجھ گئی تھی کہ فرہاد کی یہاں آمد کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے۔ اس کے بدن پر جیسے ایک لرزہ سا طاری تھا، وہ کسی پتے کی طرح کا پتہ رہی تھی اور اپنی لرزہ اہٹ چھپانے کی کوشش میں اس کا وجود مزید ریت ہوا جا رہا تھا۔ راحیل نے یعنی کا ہاتھ پکڑا اور مخالف سمت میں قدم اٹھائے۔ یعنی نے حیرت سے اپنی ماں کو وہیں جے دیکھا اور پھر اسے جاتے جاتے آواز دی ”منا“ مناشا کو جیسے ایک جھک سا لگا اور وہ جلدی سے پلٹ کر چلائی ”رک جاؤ راحیل“ راحیل کے قدم جم گئے، لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ مناشا تیزی سے میری جانب بڑھی ”کل رات تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دل جیسے ضدی بچے کی بات سنی جائے، تو ہماری سمجھوتوں کا کبھی اختتام نہ ہو، تو پھر کیوں نہ کسی ایک کو اپنی ”آخری محبت“ بنا لیا جائے۔ میرے رشتوں کے نیلے بھنور نے آج ہمیشہ کے لیے وہ سنہری کند توڑ ڈالی ہے، جو آس پاس بکھرے ہزاروں دل کش ہیولوں کی فسیل پر ہر بار اپنی کندھی اٹکا بیٹھتی ہے۔ میں پیرس واپس جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی عبداللہ، اس ”تجدید وفا“ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، لیکن تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ اپنا نظریہ کبھی نہیں بدلو گے، کیوں کہ آج سے میرا بھی یہی نظریہ ہے اور میں یہ پیغام ہر محبت کرنے والے تک ضرور پہنچاؤں گی۔“ میں نے مسکرا کر اس نئی مناشا کو دیکھا۔ ”ہر محبت آخری محبت ہوتی ہے اور آخری محبت بن کر ہی نازل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا، تو شاید ہم کبھی محبت میں جتنا ہی نہ ہو پاتے۔ محبت سورج کی کرنوں کی طرح درزوں سے چھن کر ہمارا آس پاس منور کر سکتی ہے، مگر محبت کو کسی بھی شرط سے متصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بندھن اور رشتے خود محبت کے آخری ہونے کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں سورج ہیں، مگر ہمیں بس اپنے حصے کے ایک آفتاب ہی کی روشنی سنبھلنی ہوتی ہے، لیکن سورج کی طرح چمکنے کے لیے پہلے اس کی طرح جھلنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ آج آپ بھی تب کر کندن بن چکی ہیں۔ جائیے..... آپ کی محبت کا سورج آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ مناشا نے میرے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دور کھڑے راحیل کی جانب دیکھا۔ فرہاد کو سنانے کے لیے اس بار میں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ مناشا پلٹنے سے پہلے فرہاد کی طرف بڑھی۔ ”تمہارا بہت شکریہ فرہاد کہ تم میرا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے، لیکن انہی مجھے جانا ہے، راحیل کے ساتھ۔ ہاں البتہ اپنی نمائش کا دعوت نامہ ضرور بھیجنا۔ میں، راحیل اور یعنی نمائش دیکھنے ضرور آئیں گے اور تم سے اچھی سی ٹریٹ بھی لیں گے، یہ وعدہ رہا.....“ مناشا نے اپنی نیکی آنکھیں پونچھیں اور فرہاد کو یوں ہی ہلکا ہلکا چھوڑ کر راحیل کے سگ آگے بڑھ گئی۔ کافی دور جا کر اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھ کر ہاتھ بلایا۔ راحیل صاحب نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ ان کی ایک نگاہ ہی سارا خراج ادا کرنے کے لیے کافی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ تینوں بندرگاہ کی بھیر میں غائب ہو چکے تھے۔ فرہاد بھی تھکے تھکے قدموں سے پلٹ گیا۔ اسے اپنی محبت کے سورج کے لیے ابھی کچھ اور آسمان چھاننا باقی تھے۔ میں سلطان بابا کے لیے آئے کرین اسٹریچر کے ذریعے انہیں لے کر نیچے اترا ہی تھا کہ پپا کی ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ ”ساحر..... ہم یہاں ہیں.....“ پپا کے ساتھ ماما بھی کھڑی تھیں، لیکن ان کی آواز ان کے بہتے آنسو پہلے ہی گھونٹ چکے تھے۔ میں لپک کر ان کے قریب پہنچا اور پھر ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو چپ کراتے کراتے رو رہے تھے۔ میں تقریباً چھ ماہ

کے بعد ان سے مل رہا تھا اور متا بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے یوں ٹول ٹول کر دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں اب تک یقین نہ آ رہا ہو کہ میں واقعی ان کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ سائیکس جدا سے اولاد کے معاملے میں اتنی بے یقین کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی دیر میں ایمبولینس بھی بندرگاہ کے مرکزی واسطے سے ہوتی ہوئی مقررہ جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ اب مزید کوئی دیر کیے بنا سلطان بابا کو بڑے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری آنکھیں بار بار میرا ہاتھوں کی تھلری کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جتنی دیر میں سلطان بابا کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، تب تک میں شاید ٹیکڑوں بار اس جانب دیکھ چکا تھا، جہاں سے اس ناز آفریں کو آنا تھا، لیکن وہ راستہ اتنے زیادہ جھوم کے باوجود میرے لیے ششمان ہی رہا۔ منہ پتا دونوں میری بے یقینی بہت اچھی طرح بھانپ چکے تھے، لیکن نہ جانے کیوں دونوں ہی چپ سے تھے۔ بالآخر میں نے ماما سے پوچھا ہی لیا کہ زہرہ کیوں نہیں آئی؟ ماما نے بتایا کہ انہوں نے میرے آنے کی خبر اسی دن زہرہ کے گھر والوں تک پہنچا دی تھی، جس دن انہیں پتا چلا تھا۔ پھر بھی زہرہ میرے استقبال کو نہیں آئی۔ کیوں؟

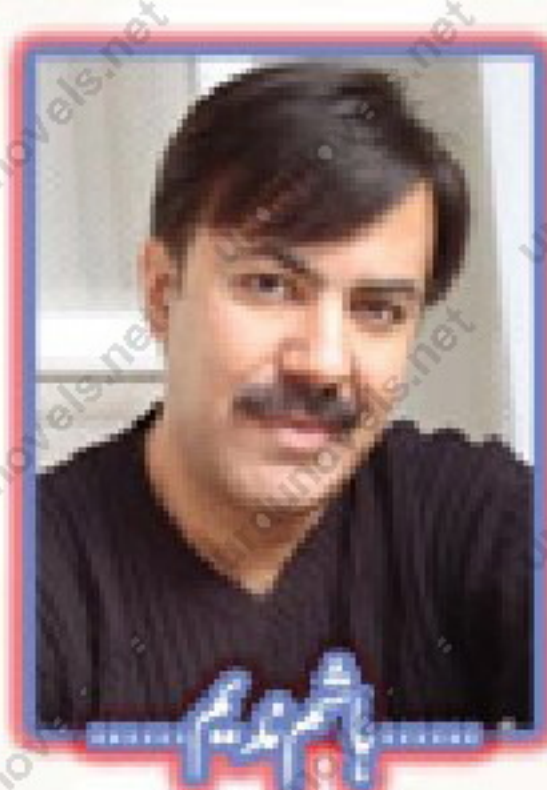
سلطان بابا کو اسپتال لے جاتے ہوئے بھی میرے اندر خودی سوال اٹھتے رہے اور میرا نادان دل خود ہی ان وسوسوں کے جواب اور جواز تراشتا رہا۔ ہو سکتا ہے، اسے ٹھیک خبر ہی مل چکی ہو۔ یا ہو سکتا ہے، وہ کہیں بھیڑی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ یہ بڑے شہروں کا ٹریفک بھی تو کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے بندرگاہ سے نکلتے ہی وہاں پہنچ گئی ہو۔ ہم بھی تو سلطان بابا کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے تھے۔ وہ آئی ہو اور مجھے وہاں نہ پا کر کتنی پریشان ہوئی ہوگی۔ میرا ذہن کسی ایک خدشے کا سر اٹھاتا تو میرا سوداگی دل اس کے خوفزدہ تراش کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ محبت میں کتنے بھانے بنانا سکھا دیتی ہے۔ بندرگاہ سے نکلنے سے پہلے میں خاص طور پر عمرے پر کھڑے حبیب البشر صاحب سے ملنے کے لیے ادر گیا۔ وہ مجھے بہت دیر تک گلے لگاتے تھکے رہے اور میرے شانے ان کی چٹکوں سے نم ہوتے رہے۔ آتے وقت انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دیر سے بولے "ہم اگر اس کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہیں، تو وہ ہماری جانب ستر قدم آتا ہے۔ یقین جانو، تم اس کے بہت قریب ہو، میں جتنی بار بھی اس کے گھر پر نگاہ ڈالوں گا، میرے دل سے تمہارے لیے دعا ضرور نکلتی کی اور مجھے یقین ہے، ایک دن تمہاری کھوج ضرور اپنے انجام کو پہنچے گی۔" میں اپنے خیالات سے تپ ہونکا، جب ایمبولینس اسپتال کے "انتہائی گہداشت" کے شعبے کی پارکنگ میں جا کر رک گئی۔ مساپا بھی اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی پہنچ چکے تھے اور اگلے چند لمحوں میں ہم سلطان بابا کو علیحدہ کمرے میں منتقل کر چکے تھے، جہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم ہماری منتظر تھی۔ سلطان بابا نے نیم غنود کی کے عالم میں ایک دوبارہ نگاہ پر نگاہ ڈالی اور پھر دواؤں کے اثرات ان کی ٹانگیں جھپکی چلی گئیں۔ ہمیں بڑے معالج کی ہدایت پر باہر انتظار کرنے کا کہا گیا۔ پتا چاہتے تھے کہ میں کچھ دیر کے لیے کمرے سے تازہ دم ہواؤں، تب تک وہ اسپتال میں ٹھہرتے، لیکن میں نے منع کر دیا اور ہم دونوں نے تقریباً زبردستی ماما کو کھڑا پس بٹھا، کیوں کہ انہیں اسپتال کے ماحول اور ارد گرد ہوتی ان مونیوں سے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ سلطان بابا کی طبیعت سنہلے ہی میں کچھ دیر کے لیے کمر ضرور آؤں گا اور پھر ہم سب رات کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ وہ بادل بخور استہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائیں وہاں سے چلی تو گئیں، لیکن تقریباً ہر قدم ہی پر مڑ کر انہوں نے مجھ سے میرے عہد کی تجدید ضرور چاہی۔ دنیا کا کوئی بھی فرد اپنے ماں باپ کا قرض نہیں چکا سکتا۔ یہ وہ سودا ہے، ہوسودا سودا ہر جہاں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور شاید اس جہاں کا یہ واحد احسا ہے جس کی ادائیگی کیے بنیادی ہم سب کے بعد دیکھ کرے اللہ وار کہتے جاتے ہیں۔

ماما کے جانے کے بعد میں نے کافی وقت سے صاحب الفلاط میں چپا کو اپنی بیماری کے بارے میں بھی بتا دیا اور میری توقع کے مطابق وہ میرے لاکھ کھل انداز اور قلمی کے باوجود ایک دم ہی گھبرا اے گئے۔ اگر سلطان بابا کی طبیعت کا خیال نہ ہوتا، تو وہ اسی وقت مجھے بھی اسی اسپتال میں داخل کروا دیتے۔ گھر بھی جب تک میں نے ان سے وعدہ نہیں کر لیا کہ اگلی صبح سب سے پہلے میں اپنے تمام معائنے خود ان کی نگرانی میں کرواؤں گا، تب تک وہ جینے سے نہیں بیٹھے اور راہ داری ہی میں بیٹھتے رہے۔ مجھے ان بات پر حیرت تھی کہ جب تک میں اپنے گھر میں تھا اور ماما پاپا کے لاڈلے کے طور پر ان کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، تب تک مجھے کبھی پاپا کے اندر سلطان بابا جتنی بزرگ نہ جھٹک نظر نہیں آئی تھی، لیکن آج میرے سامنے ماما پر تل ڈالے، بوڑھے اور مجھے ڈانٹتے ہوئے بیٹھے والا یہ شخص مجھے اپنے پاپا سے زیادہ اپنا بزرگ دوست لگ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ بزرگی کا تعلق صرف انسان کی عمر بڑھنے سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی صرف عقل و دانش اس کی وجہ ہوتی ہے۔ "بزرگ" کچھ اس سے بڑھ کر، کچھ ہوا ہوتا ہے۔ پاپا نے مجھے میرے بھری دوست کا شرف کے بارے میں بتایا کہ وہ ان دنوں کسی کاروبار کے سلسلے میں لندن گیا ہوا ہے۔ وہ میرے اندر کی بے یقینی سے خوب واقف تھے، لہذا مختلف بہانوں سے میرا وہ بیان جاننے کی کوشش کرتے رہے، لیکن میرے ذہن کی جو کنڈی اس زہرہ جیس کی پلک کے خم میں اٹک چکی تھی، اسے شام ڈھلے تک اس کی مسلسل غیر موجودگی کے تمام جواز بھر بھرے ہوتے نظر آئے۔ اگر کسی وجہ سے وہ بندرگاہ پر میرے استقبال کے لیے نہیں پہنچ سکی تو پھر بھی اب تک اسے مجھ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے شہر میں اترے سات گھنٹے ہو چکے تھے، لیکن اس کی طرف سے کوئی پیام، کوئی رقم، کوئی سندیر تک موصول نہیں ہوا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں تحصیل مانی کے مہذب گئی آواز گونجی "جا..... تجھے خدا ملے گا، نہ ہی وہ سال منم....." میں نے بے یقینی سے پہلو بدلا، ٹھیک اسی لمحے سلطان بابا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سب ہی ڈاکٹر ایک ایک کمرے کے باہر نکل آئے۔ میں لپک کر ان کے سربراہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ فکر مند سے تھے "آپ ان سے مل سکتے ہیں..... لیکن دھیان رہے کہ انہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ سر پر کبری پوٹ لگنے کے بعد مسلسل آرام نہ کرنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ چھپے کھیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہیں۔ بہر حال مایوسی نافر ہے..... ہمیں ایک آدھ دن ہی میں بڑا آپریشن کرنا ہوگا۔" میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں اور پاپا کمرے میں داخل ہوئے تو آہٹ سن کر بابا نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے، لیکن ان کی آواز میں ٹھنڈا بہت نمایاں تھی "تم نے پھر ایک بار اپنی ضد پوری کر لی نہ میاں..... اب یہ ڈاکٹر دن رات تمہیں ڈراتے رہیں گے، حالانکہ ان کے ہاتھ میں شفا تو ہو سکتی ہے، لیکن "بڑا" نہیں۔ تمہارا اور جزا کا اختیار صرف اس کے پاس ہے۔ جتنی سانسیں کھوا کر لائے ہیں۔ وہ تو بہر حال کافی ہی ہیں۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا "بات اگر سانسوں کی کتنی کی ہے، تو پھر مجھے وہ کلیہ بھی آج بتا دیں، جس کے ذریعے میں اپنی باقی ماندہ سانس بھی آپ کے حساب میں منتقل کروا سکوں۔" انہوں نے میری جھگی ٹانگیں پوچھیں "زندگی صرف سانسوں ہی میں نہیں ہانی جاتی، تم نہیں جانتے، ہم مجھے نئی زندگی دے چکے ہو اور ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی ہمیشہ سانسوں ہی سے ملے نہیں ہوتی۔ ایک سفر ختم ہوگا تو دوسرا

شروع ہو جائے گا۔“ پپانے دھیرے سے میرے کاندھے کو دبا کر مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے سلطان بابا کو آرام کا موقع دینا چاہیے۔ میری آنکھیں بھی نہیں رہیں۔ جانے ہم اپنے سب سے زیادہ عزیز رشتوں سے ہمیشہ یہ توقع کیوں لگا بیٹھتے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ میرا دل اور ذہن کسی طور پر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ ”بزرگ دانش“ بھی باقی سب کی طرح ایک دن اپنی پلکیں موند کر گہری نیند کی چادر اوڑھ کر چلتے بنیں گے۔

عشاء کے بعد رات کی ڈیوٹی والی نرس نے ہمیں یاد دلایا کہ اسپتال کے قوانین کے مطابق کوئی ایک تیار داری وہاں رات گزار سکتا ہے اور وہ بھی سلطان بابا کے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں۔ مجھے متا سے کیا گیا وعدہ یاد تھا، سو، میں سلطان بابا کو آرام کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے پپا کے ساتھ گھر چلا آیا۔ وہی مانوس دیواریں، وہی جانی پہچانی سی خوش بو..... وہی منا کی اپنی اپنی نوکروں کو ڈانٹنے کی آوازیں، وہی دیواروں سے لٹٹی بلیں، شاید اگلی زندگی میں جسے جنت سے بھی بڑھ کر کسی کو کچھ عطا کرنے کا فیصلہ ہوا، تو اسے واپس اپنے ہی گھر بھیج دیا جائے گا۔ میرا کمرہ بھی بالکل اسی طرح ”بکھرا“ ہوا تھا، جیسے میں اپنی عادت کے مطابق اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید ممانے میرے جانے کے بعد کسی کو میرے کمرے میں داخلے کی اجازت ہی نہیں دی ہوگی۔ میرے پرفیومز، ہی ڈیز، سن گلاسز، سوئس، میوزک سسٹم اور ذاتی تھینر..... سبھی کچھ ویسا ہی تو تھا، حتیٰ کہ میرے کف لٹکس اور نائی پنز بھی اسی طرح اپنی جگہ پر پڑی تھیں۔ ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنا کمرہ چھوڑ کر کسی دوست کے پاس گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے فون سے زہرہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بھتی ہر گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن اتھل پھٹل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا، جیسے وہ گھنٹی دوسری جانب کے فون کے بجائے میرے اپنے من مندر میں بج رہی ہو، لیکن بہت دیر بجنے کے باوجود دوسری جانب سے فون نہیں اٹھایا گیا۔ زہرہ موبائل استعمال نہیں کرتی تھی اور اس ایک رابطہ نمبر کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی اور نمبر بھی نہیں تھا۔

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اسی جانب انگار ہا۔ ممانے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کسر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مجبوراً مجھے ان کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پپانے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرہ کی طرف بھی آتے ہیں، لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر دیے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ پپا مزید اصرار کرتے، واپس ایک فون کی گھنٹی بج اٹھی، میں اندر تک جھنجھٹا اٹھا، لیکن دوسری جانب کی بات سنتے ہی ممانے کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”کیا..... ادو..... اچھا..... جی جی..... لیکن کس اسپتال میں..... اچھا ٹھیک ہے.....“ ممانے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی، ”زہرہ کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے۔“ میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ ممانے جلدی میں بتایا کہ زہرہ کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا، تو اس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر سے خود ہی گاڑی لے کر نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور بھی پہنچ گیا، تو اسے بھی زہرہ کے پیچھے دوسری گاڑی دے کر بھیج دیا گیا اور پھر بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ ہجوم دیکھ کر ڈرائیور نے بریک لگائی اور پھر اپنی مالکن کی گاڑی کے گرد خون کھرا دیکھ کر اس کے تو ہوش ہی گم ہو گئے۔ پتا چلا کہ کوئی موٹر سائیکل سوار زہرہ کی گاڑی تلے آ گیا ہے۔ نو جوان کی بنفیس ابھی چل رہی تھیں، لہذا لوگوں کے چیخنے چلانے کے باوجود ڈرائیور نے اسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور زہرہ سمیت اسے لے کر قریبی اسپتال کی طرف گاڑی بھاگادی۔ یہ فون وہیں سے زہرہ کے والد نے کیا تھا۔ جب زہرہ گھر سے نکلی تھی، تب تک وہ اپنے دفتر سے واپس نہیں لوٹے تھے اور پھر جب گھر پہنچے، تو اس اتفاق کا سنتے ہی وہ زہرہ کی اماں کو لے کر فوراً اسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیوی بانیک پر سوار نو جوان کسی اونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور دوسری جانب کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زہرہ کے ابا نے پپا اور مجھ سے بھی وہاں آنے کی درخواست کی تھی، کیوں کہ معاملہ پولیس کا تھا۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی، لیکن ممانے کے بقول زہرہ کے ابا کی آواز سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ ”یا میرے مولا..... اس گھائل کو اپنی اماں میں رکھنا۔“ ابھی ہم نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اس مرتبہ میں نے لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سلطان بابا کے وہ سینئر معالج تھے، جنہیں میں خاص طور پر اپنے گھر کا فون نمبر دے کر آیا تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون پر اطلاع دے سکیں۔ میں صرف اتنا ہی سن سکا کہ سلطان بابا کی سانسیں اٹھنے لگی تھیں، لہذا انہیں پھر سے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ غنودگی میں کئی بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ میں ریسیور رکھ کر باہر کی جانب لپکا، جہاں ممانے پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ دونوں طرف ہی کچھ ایسی صورت حال تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کس طرف کو نکلا جائے۔ میں نے پپا کو زہرہ لوگوں کی جانب جانے کا کہا اور خود دوسری گاڑی میں سلطان بابا کی جانب روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ ڈرائیور جلدی میں گیراج سے گاڑی نکال کر ابھی پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ میری رگوں میں پھر سے وہی اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن میری بصارت سے رنگ غائب ہوتے گئے اور پھر میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ذہن میں جیل کی قید کے دوران کیے گئے معائنے والے بڑے ڈاکٹر کے الفاظ پھر سے گونجنے لگے۔ ”کوئی بھی شدید پریشانی یا اچانک خوشی کی خبر ان کے اعصاب کو جھجھوڑ کر اس نظام کو متحرک کر سکتی ہے، جو آگے چل کر کسی بھی بڑے اعصابی حملے کی بنیاد بن سکتا ہے۔“ افسوس وہ نظام متحرک ہوا بھی تو کس گھڑی، جب چاروں طرف سے مصائب میرا گھیراؤ کر چکے تھے۔ میں زور سے لہرایا اور گاڑی کے بونٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ میری حالت دیکھ کر پپا تیزی سے میری جانب بڑھے۔ ”ساحر..... خود کو سنبھالو بیٹا.....“ لیکن میں شاید بہت پہلے سنبھلنے کے مقام سے آگے گزرا آیا تھا۔ میری ذہنی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں نے ممانے کو چیتے ہوئے میری جانب بڑھتے دیکھا، لیکن میری سماعتیں آس پاس کے شور سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے پپا کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں ہوش میں تھا یا کوئی سہنا تھا۔ ایسبولینس کی گھومتی سرخ بقی، شور مچاتی سڑک، کسی غیر ملکی اسپتال کی ہمارے شہر میں موجود کڑی کاسائن بورڈ، سفید گاؤں پہنے اور میرے اسٹرپچ کے ساتھ بھاگتے ڈاکٹر، بدحواس سی نرسیں، آپریشن تھینر کی ایک جھلک سے جلنے والی گول فانوس نما روشنیاں، کچھ چمکتے اوزار، خون کے چھینٹے، درد، کک، بو، جھل پین، میری کنپٹی کی بائیں جانب کسی انتہائی تیز نشتر کی نوک کی چھن اور پھر جلد سے گزر کر ماس کے اندر تک کاٹ کا احساس..... اور پھر وہی سرخ اندھیرا..... کئی صدیوں کے بعد میری سماعت میں کچھ ملکی سی سرگوشیاں گونجیں..... ”ہمیں افسوس ہے..... لیکن آپ کے بیٹے کے بچنے کی امید بہت کم ہے، البتہ آپ اگر چانس لینا چاہیں، تو اسے فوراً لندن کے روز ویل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہاں ڈاکٹر البرٹ ہی واجد ماہر اعصابی امراض ہیں، جو شاید اب کچھ کر سکتے ہیں۔“ پھر ممانے رونے کی آواز، ایئر پورٹ ٹرمینل کے مخصوصعلانات، ہوائی جہاز کے پیہوں کی رن وے پر رگڑ سے اڑتی چنگاریاں۔ اور پھر ایک طالم آواز ”ہم لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔“..... (جاری ہے)



”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سر بستہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ زاہد راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں کہ سورج کدھر سے نکلا تھا
یہ کون پھر سے مجھے راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا
یہ تیر دل میں گھر بے سبب نہیں اتر
کوئی تو حرف لب چارہ گھر سے نکلا تھا
میں رات ٹوٹ کے رويا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا
وہ قیس اب جسے مجھوں پکارتے ہیں فراز
تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا.....

سچ تو یہی ہے کہ میں خود ہی اپنی راہ کی سب سے بڑی دیوار تھا۔ میرے ہوش و حواس تب میرا ساتھ چھوڑ گئے، جب دو چار ہاتھ ہی اُس بام کی منڈیر چھوئے کورہ گئے تھے، جس پر میری قسمت کا واحد چاند چمک رہا تھا، لیکن چکور کی قسمت میں بھلا چاند کو پانا کب ممکن ہوا ہے۔؟ اس کا مقدر تو صرف اسے چھونے کی خواہش میں اڑتے جانا ہے۔ اونچا اور اونچا تر، حتیٰ کہ اس کی سانسیں رکنے لگیں، دم گھٹنے لگے اور پھر بے دم ہو کر فلک سے زمین پر نیست و نابود ہونے کے لیے ایک آخری قلابازی اور پھر سب ختم..... شاید میرا خاتمہ بھی قریب تھا۔ جھپکتی گھڑیوں کے چند لمحوں مجھے ایک بہت بڑی سی ششے کی گھڑی دکھاتے، جس کے کانچ پر پھسلتی بوندوں سے پرے، مجھے ایک دریا رواں دکھائی دیتا۔ میں اس دریا کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا، بلکہ کئی کئی گھنٹے میں نے اس کے کنارے بھی بیٹھیں پر اُس سے باتیں کرتے گزارے تھے۔ ہاں..... شاید یہ دریائے یمن ہی تھا۔ میں اس کی دھیمی لہروں کی خاموش سرگوشیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر کچھ وقفوں سے دھیرے دھیرے میرے پوٹھوں میں حرکت ہونے لگی۔ شاید نصف صدی بعد میں اپنی بوجھل پلکیں اٹھانے میں کام یاب ہوا اور سب سے پہلے جوشبیہ میری بصارت کے سامنے دھیرے دھیرے متعارف ہوئی، وہ اپنے پورے جسم اور سر کو ایک چادر سے اچھی طرح ڈھانپے جائے نماز پر سجدے میں پڑی ہوئی میری ماں کی تھی۔ ہاں..... وہ منہ ہی تھیں، جن کی جبین نے ماتھا ٹیکنا سیکھ ہی لیا تھا۔ اولاد کی محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اس کا ایک دوسرا مظاہرہ گھڑی کے قریب بیٹھے تسبیح کے دانے گراتے اپنے والد کی صورت مجھے نظر آیا۔ محبت چاہے کیسی بھی ہو، سجدہ کرنا سکھای دیتی ہے۔ میری پلکیں اشقی دیکھ کر پتا کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور وہ باہر کی جانب لپکے۔ منہ بھی وہیں جائے نماز پر جمی رہ گئیں اور آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو چند معاونوں کے ساتھ ٹیڑی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

دوسری بار جب میرے حواس جاگے، تو میں نے گلیسنڈر پر مزید تین ہند سے بڑھے ہوئے دیکھے اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں پورے چندرہ دن تک اس موتی جاتی حالت میں بننا جیسے گزار چکا ہوں۔ ہم لندن کے روز ویل اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے اعصابی حصے میں موجود تھے اور میرے گرد ڈاکٹروں کا ایک جھوم جمع تھا، جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور پھر ایک معمر ڈاکٹر کی آمد پر سب چپ ہو گئے۔ اُس نے اپنا تعارف کروایا ”ہیلو لڑکے..... میرا نام البرٹ ہے، ڈاکٹر البرٹ۔ تمہیں نئی زندگی کی جانب پہلا قدم مبارک ہو“ مجھ سے جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ میں پتا سے سلطان بابا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا، لیکن میری زبان تالو سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ شدید پیاس کا احساس میرے حلق میں کانٹے چھو گیا۔ ڈاکٹر البرٹ کو شاید میری کیفیت کی کچھ خبر تھی۔ ”تمہیں کچھ عرصہ احتیاط کرنی ہوگی۔ اس وقت پانی کی ایک بوند بھی تمہارے لیے نہ ہر ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بے بیزار کا ایسا کیس آج تک کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا موت کے منہ سے واپس لوٹ آنا میرے لیے ایک معجزے سے کم نہیں۔“ وہ میرے گال چھتپا کر پلٹ گئے۔ چند گھنٹے بعد جب میں لگت کے ساتھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے پہلا سوال بابا کے متعلق ہی کیا۔ بتانے مجھے بتایا کہ ہمارے ملک سے روانہ ہوتے وقت وہ تقریباً کوئے میں تھے اور ڈاکٹر اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں، نہ جانے کیوں، مگر مجھے پتا کی بات ادھوری سی لگی، لیکن میں خود اس وقت کچھ ایسی معذوری کے عالم میں بستر پر پڑا تھا کہ خود اٹھ کر اور دو قدم چل کر پاکستان فون بھی نہیں ملا سکتا تھا، کتنی عجیب بات تھی کہ جن لمحوں میں، میں ہوش کی سرحد سے پار تھا، تب سلطان بابا بھی دنیا والوں کے نزدیک بے ہوش پڑے تھے، لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس تمام بے ہوشی کے دوران بھی

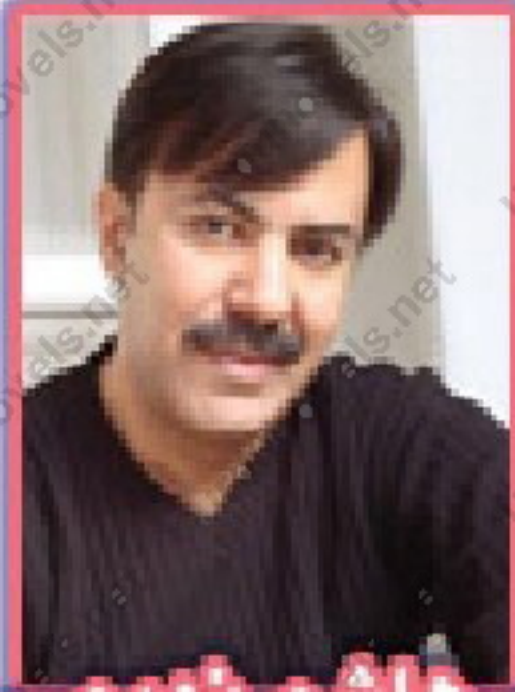
میرا ان سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹا کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا۔ میں صدم ہو کر رہتا ہوں، بوندوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ پانی اپنے اندر پانی کو کتنی آسانی سے جذب کر لیتا ہے۔ شاید ساری بات میڈیم عنصر کی ہوتی ہے۔ ہر عنصر اپنے ہم جنس کو اتنی ہی آسانی سے قبول کرتا ہے۔ گویا ہم انسانوں کا میڈیم بھی اس دنیا سے کچھ بڑا ہی ہوتا ہوگا، کیوں کہ ہم اپنی پوری زندگی اس جہاں میں کاٹ کر بھی اس سے کتنے انجمنی رہتے ہیں، کتنے جدا اور کتنے الگ سے۔ کہیں ہمارا میڈیم وہی تو نہیں، جہاں سے ہمیں نکالا گیا تھا؟ اچانک میری نظر کمرے کی دیوار پر لگے پتلے سے اسکرین نمائی وی پر پڑی، جو بند آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ یہاں وقت گزاری کے لیے مختلف محسوس بدل رہے تھے اور پھر ایک لمحے کے لیے ٹی وی کے پردے پر وہ منظر گزرا، جس نے میرے وجود کے اندر جیسے ایک کرنٹ سا دوڑا دیا۔ یہاں تک تین چار مزید چینل گزار چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں آواز دے کر پھر سے چینل چلنے کو کہا۔ وہ میری حالت دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے اور انہوں نے جلدی سے چینل پلٹے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کو کہا۔ ہاں..... یہی وہ چینل تھا۔ حجاج آخری مناسک حج ادا کرنے کے بعد میدان میں جمع ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا، جیسے ان میں سے ہر ایک ہاتھ حبیب البشر صاحب ہی کا ہو۔ میں نے جلدی سے اپنے چارٹ پر نظر ڈالی۔ میرے ہوش میں آنے کا وقت ٹھیک ہی تھا، جب حبیب صاحب کی پہلی نظر اس کے گھر پر پڑی تھی۔ ٹھیک چار دن پہلے..... جب حجاج پہلی مرتبہ حرم میں داخل ہوئے اور جب دل زندگی میں پہلی مرتبہ کسی خشک پنے کی طرح لرز کر چند گھڑیوں کے لیے رُک گیا ہوگا، جب پوری کائنات میں اپنے ایک مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ساموں سے پسینے کی صورت بہا ہوگا اور جب رُواں رُواں سجدے میں جھک کر رو پڑا ہوگا، تب وہ لمحہ تھا، جب میں نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مغرب میں ڈاکٹر اب تمام عمر سر کھپاتے رہیں گے کہ یہ ان ہونی کیسے ممکن ہوئی۔ جس بیماری کو وہ لاعلاج قرار دے کر میرے لیے تمام عمر مدد ہوشی یا جنون کے عالم میں جلا رہے تھے ان کا اعلان بہت پہلے کر چکے تھے، ایک پل میں اس کے آثار کیسے مٹنے لگے۔ یہاں مغرب میں ایسے واقعات پر فوراً ایک لیبیل لگا دیا جاتا ہے۔ miracle (معجزہ) اور لوگ چند دن بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اب ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ ”سائنس کی آمدورفت“ سے بڑا بھی کیا کوئی ”معجزہ“ ہوگا اس دور کا؟ اُس کے گھر سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی جب اس کے حضور مانگی گئی دعا پک جھکنے سے پہلے اس کی بارگاہ میں پہنچ جاتی ہے، تو پھر اس کی چونکھٹ کو چومنے ہوئے ماتھے کی سرسراہٹیں وہاں تک پہنچنے میں بھلا کیا وقت لیتی ہوں گی؟ ڈاکٹر البرٹ کی ٹیم کو یہ بات سمجھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کی تشخیص کے مطابق رے ہیز کے کچھ جڑوے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو صحیح وقت پر دیکھیں دیے جانے کے باوجود دین میں موقع پر اپنے آپ کو کسی سیپ نہما چادر میں چھپا کر خود پر کوئی ”جھوٹا خول“ چڑھ لیتے ہیں، لہذا دیکھیں کے غلبے اسے پہچان نہیں پاتے اور اُس کا اثر ختم ہونے کے بعد یہ زہریلے جراثیم اپنی قلعہ نما پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں اور دوا کے نیچے کچے اور دم توڑتے خلیوں پر ایک تازہ دم فوج کی طرح حملہ کر کے اعصاب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ البرٹ کی تشخیص کے مطابق جب مجھے لندن کے روزویل اسپتال لایا گیا تھا، تب میرے تقریباً 90 نوے فیصد اعصاب پر وہ زہریلی فوج اپنا قبضہ کر چکی تھی اور ایسے سرایضوں کا زندگی کی طرف ٹوٹنا یا پھر اپنے اعصاب ہی کو داپس پالینا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، لیکن ان کے سامنے ایک ایسا سرایض موجود تھا، جس کے ٹھکے ہوئے اور قریب المرگ اعصاب کے چند آخری سپاہی اُس پوری فوج کا مقابلہ کر کے یہ آخری جنگ جیت چکے تھے۔ میرے کم زور اعصاب کی فسیل پر نگا میرے ذہن کا قلعہ مفتوح ہونے سے بچا لیا گیا، لیکن جدید ایلوپیتھی اور سائنس اس معنی کو کبھی نہیں سمجھ پائے گی۔ سچ ہے، انسان خدا سے خسارے میں ہے۔ خدا کا کوتاہ نظر ہے۔ اپنے سامنے روزانہ سورج نکلنے اور چاند تارے ڈوبنے دیکھ کر بھی اُسے یقین نہیں آتا۔ یہ پانی سے بھرے بادل، یہ ہوائیں، یہ روشنی، یہ پہاڑ، یہ آسمان..... بھلا اور کیا نشانی باقی رہ جاتی ہے اپنے اندر بیٹھے ”دلیل کے سوداگر“ کو مطمئن کرنے کے لیے.....؟ لیکن میرے اندر کچھ لپکتی ہے چینی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ چند روز دن سے زہرہ سے ماما، پاپا کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایک بار اُس کا فون آیا بھی تو بس چند لمحوں کے لیے۔ پاپا ایسی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے، لیکن ماما کچھ کھنکی ہوئی سی لگتی تھیں، جیسے زہرہ کا ایسی حالت میں مجھ سے لا تعلق ہونا انہیں پسند نہ آیا ہو..... تب ہی شام کو میرے حلق میں سوپ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اندھیلے ہوئے ان کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا ”کون بے وقوف ہوگی، جو موت کے منہ میں جانے والے کو الوداع کہنے ایئر پورٹ پر آئے گی یا اس کا انتظار کرے گی.....؟“ پاپا نے نظروں نظروں میں ماما کو ڈانٹا۔ وہ بڑبڑا کر پُچ ہو گئیں، لیکن میرے ذہن میں کئی سوال گنگنانے لگے۔ وہ میری حالت جاننے کے باوجود ایئر پورٹ تک کیوں نہیں آئی؟ اور اگر کوئی مجبوری بھی تھی، تب بھی وہ ایک بار فون کر کے میری خیریت تو پوچھ سکتی تھی، کہتے ہیں، محبت وسوسوں کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس زاویے سے بھی اس کا عکس دیکھیں، کوئی نیا وسوسہ کچھ الگ ہی خدشہ سراٹھاتا ہے۔ ایک پل پہلے مل کر جانے والا محبوب بھی موڑ مڑتے ہوئے آخری بار پلٹ کر نہ دیکھے، تو دیوانوں کی دنیا اُتھل پھٹل ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا ہو گیا؟ کہیں وہ روٹھ تو نہیں گیا۔ کوئی بات بری تو نہیں لگ گئی اُسے.....؟ اور پھر اگلی ملاقات تک سارا بچپن و سکون غارت ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا، لیکن میں کتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس انسانی جسم کی لاچاری پر بے حد غصہ آتا تھا۔ ہمارے جسم کو ہماری سوچ جیسی پرداز کیوں نہیں عطا کی گئی؟ ایسا ہوتا تو میں اڑ کر اُس بے پروا کے در پر جا پہنچتا کہ اس خفا کی وجہ تو بتا دے؟ مجھے سلطان بابا کی فکر بھی گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟ عجیب بات یہ تھی کہ جب تک میں بے ہوش تھا، خود کو اُن کے بے حد قریب محسوس کرتا تھا، لیکن جب سے میں دنیا والوں کے لیے ہوش میں آیا تھا، اس فرد نے انہیں مجھ سے جیسے چھین لیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم اپنے عزیز ترین رشتوں سے جسمانی طور پر دور ہوں، تو ہمارے اندر موجود کوئی غیر مرئی نظام ہمیں روحانی طور پر اُن کے قریب تر کر دیتا ہو؟

میں ابھی تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، لیکن تین دن بعد ڈاکٹر البرٹ کی ہدایت پر مجھے ایک نرس جیسا کھی اور وکیل جیسی مدد سے اسپتال کی اندرونی حدود میں واقع، بانچوں یا نہر کے کنارے مختصر سیر کے لیے لے جانے لگی۔ یہ اسپتال دریا کے ٹیڑھے کے بالکل کنارے اور ایک چوڑی سی سڑک سے ملحق تھا۔ میں جانے کتنی بار اس سڑک سے گزرا ہوں گا، کیوں کہ لندن کی زرد شام کے سب رنگ اس سڑک پر بکھرے پتوں کی صورت، ہر خزاں مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے تھے، لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی دن اس خشک بدن کے ساتھ اس سڑک کی دیوار سے پرے اسپتال میں یوں بے بس اور لاچار بھی پڑا ہوں گا؟ ہماری زندگی میں کون سا مقام ہم پر کس وقت، کس صورت میں ٹھکے گا، یہ ہم اگر پہلے جان جائیں، تو شاید بہت سے مقامات سے کبھی ہماری دوستی بھی نہ ہو پائے۔ اُس روز بھی میں وکیل جیسیز پر بیٹھا، اسپتال کے وسیع گھاس کے میدان میں بکھرے سرخ اور زرد پتوں کی چادر پر سفید برف کے ننھے ستاروں کو اپنے موتی ٹانگتے ہوئے دیکھ کر کچھ ایسی ہی سوچوں میں گم تھا۔ موسم کی پہلی برف باری لندن کے درود یوار کو سفیدے کی شکل سے ڈھک رہی تھی۔ جہاں برف گرتی ہے، وہاں کے لوگ جانتے ہوں گے کہ پہلی برف کی کوری چادر زمین کو یوں ڈھانپتی ہے، جیسے کوئی ماں اپنی بیٹی کے داغوں پر سفید مرہم لگاتی ہے۔ اس کی بد صورتی چھپانے کے لیے اُسے سفید نور کی اوڑھنی اڑھا دیتی ہے۔ جب برف کے سفید گالوں نے میرے بالوں میں جمع ہو کر میرے ماتھے پر پھرے سیاہ مقدور کی لکیروں کی تلاش شروع کی، تو نرس نے میرے منہ سے گھٹنے کے باوجود وکیل جیسیز کو جلدی سے آگے دھکیلا اور ٹھیک اُسی لمحے مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظریں اٹھائی۔ گہرے رنگ کا چولا پہنے، ہاتھوں میں آہنی کڑے ڈالے اور سر پر جام گول ٹوپی کی گولائی سے نصف ایک چھوٹی سی سفید ٹوپی پہنے ایک بچی عمر کا شخص بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی میں ایک عجیب سی چکا چوند

تھی۔ جیسے گرم تپتی دو پہر کا سوانیزے پر کھڑا سورج، جس پر کبھی نگاہ تک نہیں پاتی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں، کس قدر چھین تھی اس کی نظر میں، میں ایک پل ہی میں ابولہان سا ہو گیا۔ ”مجھے یہاں سب گرو کے نام سے جانتے ہیں۔ ویسے میرا نام پارکر گولڈمین ہے اور میں آسٹریلیین نژاد یہودی ہوں۔ مجھے لگا تمہیں ابدی سکون کی تلاش ہے لڑکے.....“ نرس، گرو نامی اس پڑاسرا شخص کو دیکھ کر متوہب سی ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص اسپتال کے عملے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ گرو نے میرے ماتھے پر اپنی دو انگلیاں رکھیں اور منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا بڑبڑانے لگا۔ مجھے یوں لگا، جیسے گرم دھکتے الاؤ میں کسی نے برف کی دو سلاخیں گاڑ دی ہوں۔ اسٹے میں منانے دوسری منزل پر موجود میرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور زور سے بولیں ”ساحر برف باری شروع ہو چکی ہے..... فوراً اندر آ جاؤ۔“ وہ جانتی تھیں کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر آسمان سے اس فوری برسات کو دیکھتا ہوں، جب بھی میرا دل نہیں بھرے گا۔ گرو نے مسکرا کر ہمارا راستہ چھوڑ دیا، لیکن وہ دو آنکھیں ساری رات نیند میں بھی مجھے اپنی پلکوں کے پیچھے چمکتی رہیں۔

صبح ہوئی تو دو دو دھیا برف، لندن کے سب گناہوں پر پردہ ڈال چکی تھی۔ باہر بہتا اور یائے ٹیز اور دور نظر آتا ویسٹ منسٹر کا پل بھی برف سے بنا سا نچا لگ رہا ہے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی دوسرا نظارہ کسی برفیلی صبح سے زیادہ محرزہ اور بہوت کر دینے والا ہو سکتا ہے، جانے کیوں مجھے ایسی ہر برفیلی صبح کے بعد اپنی روح پھر سے ایک نیا جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب پڑی آرام کرسی پر ادھ لیٹا ہوا ہر بنے نور کے محسوس کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور گرو اپنے مخصوص حلیے میں دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ منا تو اسے دیکھ کر ڈر ہی گئیں۔ اس نے سسٹہ انگریزی میں سب سے معذرت کی کہ وہ صرف میری خیریت دریافت کرنے آیا ہے۔ پاپا اس کا مدعا سمجھ کر اپنی جگہ سے اٹھے اور منا کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ منا مجھے اس شخص کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں، لیکن پپا نے اپنی آدمی زندگی اسی ماحول میں گزاری تھی اور وہ یہاں کے آداب سے واقف تھے، لہذا بادل خواستہ بنا کو بھی ان کے ساتھ ہی اٹھنا پڑا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا ”مسلمان ہو.....؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”الحمد للہ.....“ گرو چونک سا گیا، خود مجھے اپنی اس بے ساختگی پر حیرت ہوئی۔ مجھے یہ اندازہ افتخار پہلے تو کبھی نہیں سوجھا تھا۔ شاید اس کے سوال ہی میں کچھ ایسا پوشیدہ تھا کہ میرے اندر سے خود بہ خود یہ آواز باہر نکل آئی ”کیا نام ہے تمہارا؟“ ”عبداللہ“ کچھ دیر تک میں کھڑکی سے باہر اور وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ ”پورے روز وہی اسپتال میں تمہارے عجیب تر مرض اور پھر عجیب ترین شفا کا چرچا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر اسے حسب معمول کسی معجزے سے تعبیر کر رہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آج کل معجزے اتنی آسانی سے رونما نہیں ہوتے، ان کے پیچھے ضرور کچھ راز پوشیدہ ہوتے ہیں، کیا تم مجھے وہ راز بتاؤ گے.....؟“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ لگی لپٹی رکھے بغیر اس نے اپنے دل کی بات پہلی باقاعدہ ملاقات ہی میں میرے سامنے رکھ دی تھی، جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ شخص بہت خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا ”معجزے ناقابل بیان ہوتے ہیں اور بات اگر راز کی ہے، تو پھر وہ راز ہی کیا جو افشاء ہو جائے.....“ گرو نے بے چینی سے پہلو بدلا ”ٹھیک کہا تم نے..... راز کا واسطہ افشاء سے ہے، لیکن یہ معاملہ انسان کی بھلائی کا ہے، ہو سکتا ہے تمہارے افشاء سے کسی دوسرے مریض کی حالت سدھرنے کی ترکیب بھی ہو جائے.....“ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو، لیکن مجھے یوں لگا کہ اس کی آنکھیں ہر لمحہ مجھے تسخیر کی کوشش میں مصروف ہیں ”بات اگر کسی کی بھلائی کی ہے، تو پھر جان لو کہ میری روح پر صرف دُعا کا معجزہ رونما ہوا ہے۔ ہزاروں میل دور بیٹھے کسی شخص کے اٹھے ہاتھوں کے پیالے میں میری مسیحا کی کاضمک ڈال دیا گیا۔ دعائیں تو میرے لیے، میرے اپنوں نے بھی بہت مانگی ہوں گی، لیکن کچھ اعجاز اجنبیوں کے حصے آتے ہیں۔ بس، اتنا سا افسانہ ہے میرا.....“ گرو غور سے میری جانب دیکھتا رہا، جیسے اُسے میری بات کا یقین تو ہو، لیکن نصف۔ لیکن اس نے مجھ سے مزید بحث نہیں کی اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا چل چکا تھا۔ مغرب میں آج کل لوگوں کا روحانی علاج کی طرف بہت بڑھ چکا ہے۔ باقاعدہ روحانی علاج کے کلینک کھل چکے ہیں، جہاں لوگ اپنے بے چین من اور روح کی کک دور کرنے کی نیت سے آتے تھے۔ گرو بھی یہاں کا ایک ویسا ہی روحانی مسیحا تھا، جسے اسپتال کے بعض مریضوں کی خصوصی درخواست پر مختلف اوقات میں روحانی سیشن کرنے کے لیے خاص دعوت دی جاتی تھی۔ پارکر نام کا یہ یہودی اپنی شفا کے لیے یہاں بہت مقبول بھی تھا اور بھنگی روجوں کے ستائے جسم اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس کا یہ حلیہ اور ”گرو“ نام کا لقب اس کے ہندوستان کے ایک دورے کے بعد کے عطا کردہ تھے، جب اس نے وہاں بہت سے لوگوں کا کھڑے کھڑے علاج کر کے ان کی روجوں کو سکون بخشا تھا۔ لیکن نہ جانے میرے ساتھ یہ الٹ معاملہ کیوں تھا کہ وہ جتنی بار بھی میرے سامنے آیا تھا، میری روح میں بہ یک وقت کئی کانٹے چھو گیا تھا، لیکن کیوں؟ کیا لگا ہوں کی طرح روجیں بھی آپس میں کچھ بھید بھاؤ رکھتی ہیں؟ ہاں..... بظاہر یہ روح کی ناپسندیدگی کا معاملہ ہی لگتا تھا، کیوں کہ اُس کی ظاہری شخصیت عام لوگوں کے لیے بے حد کشش تھی۔ میں منانہ پتا کے ذریعے سلطان بابا کی خیریت تو کسی نہ کسی طور دریافت کروا ہی لیتا تھا، لیکن زہرہ کی خبر ملنا محال ہوتا جا رہا تھا۔ منانے ایک ادھ بار میرے کمرے ہی سے زہرہ کے گھر بھی فون ملا کر دیکھا، لیکن زیادہ تر اس کے گھر کے نوکروں ہی سے بات ہو سکی۔ ایک بار زہرہ کی انتاں نے فون اٹھایا بھی، تو چاچا کہ زہرہ گھر پر نہیں ہے۔ منانے بد دل ہو کر فون کرنا ہی چھوڑ دیا، لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا۔ جودن کسی نہ کسی طور گزار ہی لیتا تھا، مگر شام ہوتے ہی جانے کہاں سے پورے جہاں کی بے چینیاں اس کے منہ میں بھر وجود کے چار خانوں میں درآتی تھیں۔ کاش ہمارا دل بھی ان ٹیلی فونوں کی طرح یادوں کے لیے کسی خاص نمبر اور ڈائل کا محتاج ہوتا اور جب تک وہ خاص نمبر نہ گھمایا جاتا، تب تک یاد کی گھنٹی بھی نہ بجتی۔ یہ قدرت بھی ہمارے ساتھ کیسے عجیب کھیل کھیلتی ہے، جن رابطوں کو آزاد چھوڑنا چاہیے تھا، انہیں ٹیلی فون جیسی ایجادوں میں قید کر دیا اور جن بے لگام جذبوں کو تالے میں بند کر کے رکھنا لازم تھا، انہیں دلی جیسی بے پروا سلطنت کے حوالے کر ڈالا، مگر تقدیر کو لگہ پھر بھی ہم کم زور انسانوں ہی سے رہتا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی اور میں گھنٹوں کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند سے کوسوں دور تھا۔ تنگ آ کر ڈنک چیر کے ذریعے کھڑکی کے پاس آ بیٹھا اور باہر گرنتی برف اور درختوں کی آپس میں ہوتی سرگوشیاں سننے لگا۔ برف کے پھول سوکھی ٹہنیوں سے گلہ کر رہے تھے کہ ابھی تو وہ انہیں خود سے لپٹائے بیٹھی ہیں، لیکن بہار آتے ہی جب نئے شکوفے کھلیں گے تو وہ ان سے نانا توڑ لیں گی اور ٹہنیاں بے وفا محبوب کی طرح ان سے کبھی پورے نہ ہونے والے عہد و پیمان کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر برف میں جسے ایک وجود پر پڑی، جو یوگا کے کسی آسن کو اپنائے، برستی برف میں کھڑا تھا۔ وہ گرو تھا۔ گرو کی آنکھیں کھلیں اور تیر کی طرح میری نظروں میں گڑ گئیں۔ جانے کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں شدید غصے کی جھلک نظر آئی۔ گرو نے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کسی معمول کی طرح پلٹا۔ مجھے لگا، میں خود پر اختیار کھو بیٹھا ہوں۔



.....**ہاشم ندیم**.....

اک خاک بسر نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شبہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سندے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نو جوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اصرار و رموز کے گرد بنایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے مربوطہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیں ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@jangggroup.com.pk

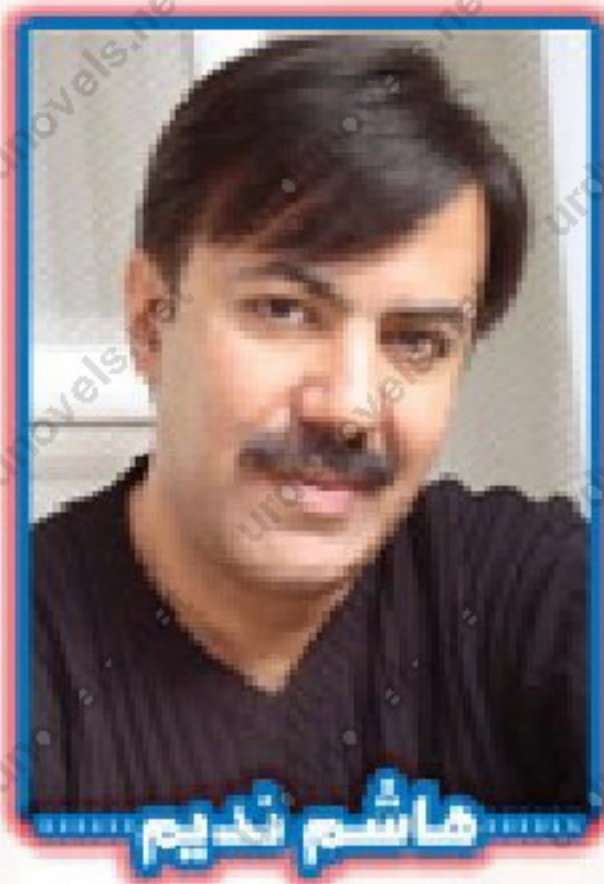
میں نے پینا نرم کے بارے میں آج تک جتنا کچھ سنا تھا، اس کے تمام آثار میں اپنے وجود پر اس وقت محسوس کر سکتا تھا، لیکن پھر بھی میرے ذہن کا کوئی ایک حصہ ایسا ضرور تھا، جو ابھی تک جاگ رہا تھا۔ تب ہی میں جب برف کی چادر پر اپنی موٹر سائیکل چیر کے پہیوں کے نشان ثبت کرتا ہوا نیچے گھاں کے برف سے اٹنے میدان میں گڑو کے قریب پہنچا، تب بھی سوچ سکتا تھا اور یہ سب محسوس کر سکتا تھا۔ گڑو کچھ دیر تک فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ ”دیکھا..... کیسے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے.....“ لیکن اگلے لمحے ہی میری زبان سے نکلے سوال نے اس کی نظر کا سارا غرور چکنا چور کر دیا۔ ”کیا تم پینا نرم بھی جانتے ہو.....؟“ گڑو کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ ”کیا مطلب، یعنی کہ تم..... تم یہ سب کچھ محسوس کر سکتے ہو.....؟“ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ہاں، میرا وجود تمہاری نظر کے اثر میں یہاں نیچے تک خود کو وحیل تو لایا ہے، لیکن میں اب بھی جاگ رہا ہوں۔“ آسمان سے برقی برف ہمارے وجود و خانپ رہی تھی۔ رات کے وقت جب آسمان سے برف گرتی ہے، تو برف کی اپنی ایک خاص روشنی ہوتی ہے، جیسے صفر سے بھی کہیں کم طاقت والے بہت سے دودھیا بلب آس پاس جل رہے ہوں۔ میں اور گڑو بھی ایسی ہی مدہم روشنی میں رات کے بسر کرتے پہیوں کو اپنی جھولی میں جمع کر رہے تھے۔ گڑو مزید بے چین ہو گیا۔ ”میں پہلے دن ہی سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہاری رُوح میرا تسلط قبول کرنے میں شدید مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی ہے، جو تمہارے اندر بیٹھ کر تمہاری حفاظت کرتا ہے، وہی تمہاری طاقت ہے، لیکن میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وقت آ گیا ہے کہ تم خود مجھے بتا دو کہ کس ہستی کا سایا ہے تم پر.....؟“ میں اپنے آپ کو اندر سے انتہائی مضطرب محسوس کر رہا تھا۔ ”تم میرے وجود پر تو شاید کبھی اپنا تسلط قائم کر بھی لو، لیکن میری رُوح کے کواڑ صرف چند مخصوص دشکوں ہی پر کھلتے ہیں۔“ گڑو کچھ دیر نظروں ہی نظروں میں مجھے توتا رہا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر سودا ہوگا، تم مجھے اپنا راز دو گے اور بدلے میں، میں تمہیں کچھ ایسا بتا جاؤں گا کہ تمہاری عاقبت سنور جائے گی۔ بولو منظور ہے؟“ اس حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ایک نا مکمل اور زخمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اگر میری عاقبت کا سنورنا اور بگڑنا تقدیر نے تمہارے ذمے ہی لگا چھوڑا ہے، تو ٹھیک ہے، ایک سودا اور کی.....“ اتنے میں ہم پر رات والی ڈیوٹی شفٹ کے خاتمے کے بعد واپس جاتی کسی نرس کی نظر پڑ گئی اور وہ جلدی سے شور مچاتے ہوئے میری طرف دوڑی اور جلدی سے میرے برف سے بھرے وجود کو وکیل چیر سمیت وحشیانہ ہوئی اندر راہ داری کی جانب لے گئی۔ گڑو ہیں برف میں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا، بعد میں مجھے اس کی عمر کی ہیڈ نرس کا نام سٹاف ایسی معلوم ہوا۔ صبح جب وہ میرا معمول کا چیک اپ کرنے آئی، تو کافی خفا معلوم ہو رہی تھی۔ مٹا، پتار رات کو میرے کمرے سے ملحق کمرے میں ہوتے تھے، لہذا انہیں گزشتہ رات کی واردات کی خبر نہیں ہو سکی۔ میں نے نظروں نظروں میں ایسی کو منع کیا کہ وہ میرے رات بھر برف اوڑھنے کا ذکر نہ کرے۔ وہ ناراض سی، تھرما میٹر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں بخار ہو گیا ہے، اب تمہیں ڈانٹ پڑنی چاہیے۔“ مٹا پنا ڈور بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ فریضہ مٹا چر دو گھنٹے بعد ادا کرتی رہتی ہیں، کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معمولات میں تھوڑی بہت تبدیلی ضروری ہے۔“ وہ بھی ہنس پڑی۔ ”باتیں خوب بنالیتے ہو، تم رات کو اس عجیب شخص کے ساتھ کون سی بحث کر رہے تھے؟“ ”کون.....؟ وہ گڑو.....؟ وہ میرے ساتھ کوئی سودا کرنا چاہتا تھا۔“ ایسی کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ ”دیکھو، میری مانو تو اس شخص سے ڈوڑھی رہو۔ پتا نہیں، اسپتال والوں نے اُسے اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے، میرا بس چلے تو اس کا یہاں داخلہ ہی بند کر دوں۔“ ایسی، گڑو سے کافی بدل دکھائی دیتی تھی۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ نرس ہر ڈی رُوح کے لیے ایک نرم دل رکھنے والی ہستی کا نام ہوتا ہے، لیکن آپ تو گڑو کے لیے کافی تلخ جذبات رکھتی ہیں، ایسا کیوں؟“ ایسی نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”دیکھو گڑو! میں تمہیں پوری بات نہیں بتا سکتی، بس اتنا جان لو کہ وہ ایک ”صیہونی“ ہے۔ دراصل.....“ ابھی ایسی نے بات شروع ہی کی تھی کہ ڈاکٹر البرٹ اپنے دو معاونین کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا اور ایسی جلدی سے سامان کی ٹرے اٹھا کر چل پڑی۔ میں اخبارات اور ٹی وی پر روزانہ کی بار صیہونیت اور صیہونی کی اصطلاح سُننا اور پڑھتا رہتا تھا، لیکن مجھے ابھی تک اس لفظ کے اصل معنی نہیں آتے تھے، شام تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ ایسی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی۔ شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل آسمان پر بھجے بادلوں میں سے کسی ایک شریر جوڑے نے کچھ دیر کے لیے اپنے ایک دوسرے سے بندھے ہاتھ کھول دیے، تو چند لمحوں کے لیے فلک پر گسا اورے بادلوں کا خیمہ ایک جانب گھل گیا اور مٹی بھر آسمان جھلکنے لگا۔ ٹھیک اُسی لمحے سورج کے

تصف پیا لے نے مُسکرا کر زمین سے چھیڑ خانی کی اور اس کی الوداعی کرنیں نیچے بھی ہدف پر کچھ اس طرح پڑیں، جیسے بچپن میں ہمارے محلے میں گولے گنڈے والا سفید دودھیا برف کے گولے پر نارنجی رنگ کا شربت اُٹھاتا تھا۔ میرا اس وقت شدت سے جی چاہا کہ میں کسی اونچی عمارت سے سارے لندن کا نظارہ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت پورا لندن سورج منکھی کے کسی بھول کی طرح دمک رہا ہوگا۔ زرد لندن کی نارنجی بہتی زمین اور جما ہوا دودھیاے ٹیگز، وہی شام اور وہی زہرہ کی یاد کا پسندا، جو ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ یوں گسا جاتا تھا، جیسے گیلی بان کی رشتی خشک ہونے پر سکھاتی جاتی ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے جھلک دکھلا کر پھر سے گہرے بادلوں کے پیچھے جا کر بھپ گیا۔

برف باری کے بعد ہونے والی شام عام شاموں سے کہیں زیادہ اُداس، بوجھل اور تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ ایسے میں جن کے دل دار ان کے قریب بستے ہیں، وہ گرم جسموں کے سامنے بھاپ اڑاتی کافی سگ لیے، کشادہ کھڑکیوں کے کانچ سے پرے درختوں کی برف سے بوجھل شاخوں کو سجدے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن میں تنہا اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر ٹیگز کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ تب ہی ٹرودروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ منا اور پتا کو میں نے آج زبردستی لندن کے مشہور ویبلے تھیٹر میں بہت عرصے سے لگاتار چلنے والا شیکسپیر کا ڈراما میکبیتھ (MECBITH) دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک زمانے میں پتا لندن کا تھیٹر دیکھنے کے لیے خصوصی طور پر یہاں آیا کرتے تھے، لیکن میری پریشانی کی وجہ سے وہ آج لندن میں موجود ہوتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل پارہے تھے۔ ٹرودروازے میرا حال چال پوچھنے کے بعد پھر سے وہی سوال دہرایا، لیکن آج میرے پاس بھی اسی کے لیے ایک سوال موجود تھا۔ ”مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے ہوش میں لوٹ آنے کا واقعہ تمہارے لیے اتنا اہم کیوں ہے، ایسے درجنوں واقعات تمہارے آس پاس روزانہ ہوتے ہوں گے، پھر یہی ایک شفا تمہارے لیے مجزہ کیوں بن کر رہ گئی ہے؟“ اس لیے کہ میرا علم کہتا تھا کہ تم کبھی اپنے حواس میں واپس نہیں آؤ گے۔ تمہارے علم میں شاید یہ بات نہ ہو، مگر کچ یہ ہے کہ جب تم کو س میں تھے، تب مجھے ڈاکٹر البرٹ نے تمہارے رُوحانی علاج کے لیے خصوصی طور پر تین مرتبہ آئی سی یو میں بلایا تھا۔ تمہاری بے ہوشی میں بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی اور میں نے گھنٹوں تمہارے سر ہانے تنہا کھڑے ہو کر تمہاری رُوح میں جھانکنے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ تمہاری والہی کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ یہی بات میں نے تمام عملے کو بھی منتقل کر دی تھی، لیکن انہوں نے باعثِ مصلحت تمہارے والدین سے یہ بات چھپائے رکھی، حالاں کہ مجھے بلانے سے پہلے خود ان کی تمام تر جدید طب تمہاری عجیب و غریب بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی، لیکن ایک ہی رات میں یہ ساری کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ میں ابھی تک شدید حیرت کا شکار ہوں۔“ میں غور سے گڑو کو دیکھتا رہا۔ بظاہر سیدھا سادا نظر آنے والا یہ شخص اندر سے کتنا گہرا تھا، اس کا اندازہ لگانا میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن ایک بات تو طے تھی کہ خود اس کے پاس بھی کوئی ایسا علم ضرور تھا، جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے اس بار اُسے تفصیلی سے پانی کے جہاز، کا سا بلانکا میں حبیب البشر صاحب سے ہونے والی ملاقات سے لے کر دس ڈی ایچ کے دن پہلی بار کچھ دیر کے لیے اپنے حواس میں آنے تک کے تمام واقعات سُنا دیے۔ گڑو کی آنکھوں میں کبھی حیرت، کبھی بے چینی اور کبھی بے یقینی کی لہریں وقفے وقفے سے جنم لیتی رہیں، شاید کہیں بہت گہرائی میں اپنے اندر خود کو یقین دلانے میں اُسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر خاموش بیٹھا رہا۔ ”تمہاری کہانی میں اب بھی بہت سی باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں، لیکن میرے پاس یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں، کیوں کہ ایک بات تو طے ہے کہ تم کچھ ”خاص“ ہو۔“ میں مسکرایا۔ ”میں تمہاری بے چینی کی وجہ سمجھ سکتا ہوں، اگر یہی دُعا کوئی میرے لیے برہم میں مانگتا تو شاید تم اتنے بے یقین نہ ہوتے۔“ ”حالاں کہ میں نے یہ بات کسی خاص نقطہ نظر یا طریہ لے لے لی نہیں کہی تھی۔ میرا مقصد صرف دو مقدس مقامات کے لیے اپنے اپنے جذبات کا زاویہ بیان کرنا تھا، لیکن گڑو یوں اچھلا، جیسے اُسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ شدید غصے میں بولا۔ ”تو گویا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو آج زمانے بھر میں تم لوگوں کی ناکامی اور رسوائی کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ یہی کہ تم لوگ بولتے زیادہ اور عمل کم کرتے ہو، لیکن آج میں تمہیں عملی طور پر ایک مظاہرہ دکھانا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تمہیں کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن اور حواس پر میرا تسلط قبول کرنا ہوگا۔“ میں نے حیرت سے گڑو کی طرف دیکھا۔ ”لیکن یہ کیسے ہوگا؟“ ”کوئی بے چیدہ بات نہیں ہے۔ رات کو سونے سے قبل اپنے دماغ کو سُست چھوڑ دینا اور میرا تصور اپنے ذہن میں تواتر سے دہراتے رہنا۔ جیسے تم مجھے اپنے اعصاب کے ذریعے مدعو کر رہے ہو، لیکن یاد رہے کہ تمہیں ٹھیک رات بارہ بجے سو جانا ہوگا۔“ میں نے گڑو کو ٹولا۔ ”کیا تم پھر سے مجھ جتنا ناز کرنا چاہتے ہو، یا پھر ٹیلی ویژن کا سہارا لو گے۔“ ”گڑو کچھ جھنجھلا سا گیا۔ ”جنہیں اپنے چاہنے والوں کی دعاؤں اور کُھد پر اتنا کامل یقین ہو۔۔۔۔۔ انہیں ان پٹا نرزم یا نیلی پتھی جیسے معمولی شعبہوں سے نہیں ڈرنا چاہیے۔“ ”گڑو میرے اندر کے ساحر کو جگا چکا تھا۔ اب مزید کسی دلیل یا وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ منا، پتا کے واپس لوٹنے سے قبل میں اپنے کمرے کی ساری بٹیاں بجھا کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔ منانے دھیرے سے کمرے میں جھانکا اور پھر میرا کمبل درست کر کے آہستگی سے پلٹ گئیں۔ میری نظریں گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بارہ کے ہند سے تک پہنچ گئیں۔ میں نے گڑو کی ہدایت کے مطابق اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا اور میری بار بار بند ہوتی پلکوں تلے گڑو کی شبیہ وقفے وقفے سے اُبھرتی رہی اور پھر ٹھیک بارہ بجے میری مکمل غنودگی سے پہلے میرے ذہن میں گڑو کی وہ دو جھمکتی آنکھیں بڑی طرح کھٹکنے لگیں اور پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے میں گڑو کی آنکھوں ہی سے سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک بہت بڑا سا ہال تھا، جس کی اونچی دیواروں پر درجنوں وسیع روشن دانوں سے برف میں چٹکی چاندنی کی نیلگوں روشنی اس طرح اندر آ رہی تھی کہ کھڑکی کے پتلے تختوں سے بنے فرش پر چمکوری روشنی کے مستطیل ٹکڑوں سے ایک دائرہ سا بن گیا تھا۔ دائرے کے درمیان میں یہودیوں کے مقدس نشان، داؤد کا ستارہ (David star) بنا ہوا تھا، جس کے گرد دائرے میں گڑو سمیت حیرہ لوگ اپنے سر، چہرے اور جسم کو بڑے بڑے کالے پٹھوں سے ڈھکے ہوئے مؤدب کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چاندنی کا پتالہ تھا، جس میں کسی بھی کڑواؤن بھرا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر بنے ہوئے ستارے کو میں نے غور سے دیکھا، تو وہ باقاعدہ دھات کی پتلی نالیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ گڑو نے دھیرے سے زیر لب عبرانی زبان میں کوئی آیت پڑھی، یوں لگتا تھا، جیسے وہ سب جس تقریب کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس کا وقت پورا ہونے کو ہے۔ گڑو نے عبرانی زبان میں زور زور سے قوم یہود پر مہوٹ ہونے والے پیغمبروں کے عبرانی نام دہرانا شروع کر دیے۔ ”میکاہ، عاموس، یرمیاہ، یونان، یوحنا۔۔۔۔۔“ پھر سب سے پہلے گڑو اور پھر اس کی تقلید میں باقی سب پختہ پوشوں نے اپنے اپنے پیالے کاٹھون زمین میں کھدے آہنی داؤدی ستارے کے بالائی کونے میں اٹھل دیا۔ ٹھون تھڑی سے چھ کٹھون

کی جانب یوں دوڑا کہ ترتیب وار پہلے کونے سے دوسرا کونا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زمین میں ستارہ کھود کر اس میں چکنا چولہا داس طرح بھرا گیا ہے کہ کسی بھی سیال مادے کو بننے میں کوئی وقت نہ ہو۔ اور ستارے کو خاص طور پر اس طرح ڈھلان کی ایک سمت دی گئی ہے کہ اس کی ہم دار فولا دی نالیوں میں اٹھایا جانے والا مائع پہلے کونے سے ہوتا ہوا ترتیب وار اور یکے بعد دیگر باقی پانچ کونوں تک یوں بہتا ہے کہ چھٹا کونا چھوٹے ہی واؤ دی ستارہ مکمل ہو جائے، لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ نالیوں میں بہایا جانے والا خون رک رک کر آگے بڑھ رہا تھا، جیسے کوئی ان دیکھی رکاوٹ اس کی راہ میں مڑا ہوا ہو۔ سب ہی پختہ پوشوں نے بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے گڑو کو اس مزاحمت کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اس نے زیرِ لب کچھ پڑھ کر ایک جھٹکے سے آنکھیں بند کر لیں اور ٹھیک اسی لمحے میرے ذہن کے پردے پر چلتی وہ فلم بھی یک دم یوں غائب ہوگئی، جیسے کسی سنیما کی اسکرین پر ریل کا فیتہ ٹوٹ جانے سے سب کچھ پل بھر میں مٹ جاتا ہے۔ یا کسی ٹی وی کا پردہ بجلی جانے سے ایک چمک کے بعد سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گڑو کی آنکھیں بند ہوتے ہی کھٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہوائی برف باری اور شدید ٹھنڈ کے باوجود میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں پہلے عالم خواب میں تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ باہر گرتی برف کے گالوں کا حجم اور ان کی رفتار، دونوں ہی زیادتی کی جانب مائل تھے۔ بارش کے موسم اور برف باری میں یہی ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بارش بے صبری ہوتی ہے، چٹختی چلاتی، شور مچاتی، سارے آنگن کو سر پر اٹھا لینے والی، جب کہ برف صابر ہوتی ہے، خاموشی اور سکون سے برسنے والی۔ ایک سکوت سا طاری کر کے مہوت کر دینے والی..... مجھے اس لمحے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ بارش اگر ”عاشق“ ہے، تو برف ”معتوق“ کہ دونوں کا مزاج خود ان کی درجہ بندی کا آئینہ ہے۔ رنرہ رفتہ صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے میرے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں پر کوئی تازہ سفید قلعی پھیر گیا ہو۔ مٹا، پٹا سے پہلے ابھی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ ”لندن کی خوب صورت بریلی صبح بخیر.....“ میں مسکرایا۔

”ڈاکٹر البرٹ جانتے ہیں کہ سیجا گری کی ابتدا خوب صورت لفظوں اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے ہوتی ہے اور اس کے لیے انہوں نے ٹیم بھی خوب چنی ہے۔“ ایسی بھی نہیں دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے مٹا پھر پٹا اور پھر ڈاکٹر البرٹ کی آمد نے اس کا مقصد پورا نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر البرٹ نے میرے معائنے کے بعد اطمینان سے سر ہلایا۔ ”بہترین..... لگتا ہے تم نے بہت جلد ہمیں الوداع کہنے کی تیاری کر رکھی ہے نوجوان..... اسے جاری رکھو۔“ ایسی وہاں کچھ دیر مزید رکنا چاہتی تھی، لیکن البرٹ نے کمرے سے نکلنے وقت کچھ کام بتائے، مجبوراً اسے بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی وہاں سے جانا پڑا۔ انہیں نکلے ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ گڑو اپنے مخصوص طے میں کمرے میں داخل ہوا۔ مٹا کی تیوریاں چڑھنے سے پہلے ہی میں نے پٹا کو نظروں نظروں میں انہیں دوسرے کمرے میں لے جانے کی درخواست کی۔ پٹا نے مسکرا کر پائپ کا ایک بھرپور کش لیا اور کسی بہانے سے مٹا کو وہاں سے لے کر اٹھ گئے۔ گڑو نے بات جوڑنے میں دیر نہیں کی۔ ”کیا مجھے گزشتہ رات کی کہانی دہرانے کی ضرورت ہے، یا ہم اگلی بات کریں؟“ تو گویا رات میں نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ خواب نہیں تھا۔ گڑو کا کوئی شعبہ تھا۔ اس لمحے مجھے ہڈت سے سلطان بابا کی یاد آئی۔ اگر وہ مہینوں میری اتنی سخت تربیت نہ کرتے، تو آج میں گڑو کے اس پہلے حملے ہی میں چاروں خانے چت ہو چکا ہوتا، لیکن میں یا قوت سے لے کر جبروت تک جانے ایسی کتنی ان ہویاں جھیل چکا تھا، لہذا اطمینان سے نیکے سے ٹیک لگا کر گڑو کو دیکھتا رہا۔ ”نہیں..... میں نے رات کو وہ سب کچھ دیکھا، جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے، لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم نے اچانک چلتی ہوئی فلم کی ریل کیوں کاٹ دی؟“ اب چوکنے کی باری گڑو کی تھی۔ ”گویا تم سمجھ گئے تھے کہ میں نے جان بوجھ کر تم سے اپنا ذہنی رابطہ ختم کر دیا تھا، دراصل تمہاری وہاں موجودگی سے ہماری عبادت میں خلل پڑ رہا تھا۔“ لیکن میں تو یہیں تھا..... اپنے کمرے میں.....“ گڑو مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ”اس کمرے میں صرف تمہارا جسم موجود تھا، لیکن تم اتنے خطرناک ہو کہ تمہاری صرف میرے ذہن میں موجودگی بھی ہماری عبادت میں رکاوٹ کا باعث بن رہی تھی۔ اسی لیے مجھے تم سے رابطہ توڑنا پڑا۔“ گڑو نے مجھے بتایا کہ رات جو رسم میں نے اپنے ذہن کے پردے پر چلتے ہوئے دیکھی، اُسے قدیم عبرانی زبان میں ”مقدس بہاؤ“ اور انگریزی میں ”پوراؤور“ Pourover کہتے ہیں۔ صدیوں پہلے قوم یہود کے تیرہ معزز خاندانوں کے سربراہ۔ بیٹھڑکی مقدس قربانی کے بعد تہرک کے طور پر بھیڑ کا خون سات دن تک اپنے گھر کے دروازے پر لگا کر رکھتے تھے اور پھر ساتویں ہی دن ایک بہت بڑے جشن کی صورت میں اس دھم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بقول گڑو، قدامت پسند یہودیوں میں پیدم اب بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھی اور کل رات میں نے جو منظر دیکھا، وہ دراصل ساتویں دن کے خاتمے پر اُسی پوراؤور کی رسم کی اختتامی تقریب تھی۔ جس وقت گڑو سرگوشیوں میں مجھے یہ ساری تفصیلات بتا رہا تھا، تب ایسی نے دوبارہ وقفوں سے میرے کمرے میں جھانکا اور نظروں نظروں میں کسی ناراضی بزرگ کی طرح ڈانٹا کہ میں اس کے منع کرنے کے باوجود، کیوں اس شخص کے ساتھ دوبارہ بات کر رہا ہوں؟ وہ مٹا سے بہت چھوٹی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے اُس میں مٹائی کی جھلک دکھائی دی۔ شاید ”اُدائے بُد رگیت“ سب ہی جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اب میں ابھی کو کیا بتانا کہ اسکول اور کالج میں بھی مجھے ہمیشہ سب سے زیادہ تجسس اور بات کرنے کی خواہش اُسی سے ہوتی، جس سے بات کرنے یا کھیلنے سے مجھے مٹا منع کیا کرتی تھیں، لیکن ابھی کو مجھے باقاعدہ ڈانٹنے کا موقع سہ پہر کی چائے کے بعد ہی مل سکا۔ جب مٹا اور پٹا کھیلنے کے لیے نیچے جا چکے تھے۔ ”لڑکے..... میں نے تمہیں منع کیا تھا نا، اس گڑو کے ساتھ بات کرنے سے؟“ مجھے اُس کے انداز پر ہنسی آگئی۔ ”آخر آپ اس شخص سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ بظاہر تو مجھے وہ کافی پڑھا لکھا اور شائستہ اطوار کا دکھتا ہے۔“ ایسی کو غصہ آگیا۔ ”اس کا یہی علم نہ جانے کتنے گھروں کے بچوں کی زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں ڈرتی ہوں، کہیں وہ اپنا محترم پر بھی نہ آزما بیٹھے.....“ گویا ابھی کو بھی گڑو کے کمالات کی کچھ خبر تھی۔ اس نے جلدی میں مجھے بتایا کہ آج کل لندن کے اعلیٰ طبقے میں گڑو کا کافی اثر و رسوخ ہے اور اس نے ایک بہت مہنگے علاقے میں اپنا زوانا ہاؤس (Nirvana House) بھی بنا رکھا ہے، جہاں وہ ہر شام اپنے درجنوں بیروکاروں کو سکون حاصل کرنے کے گڑ بتاتا ہے۔ ان ہی نوجوان شیدا یوں میں ابھی کا اپنا بھائی پیٹر بھی شامل تھا، جو بقول ابھی، گڑو سے ملنے کے بعد باقاعدہ اس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا اور اپنا گھربار چھوڑ کر اب سارا دن گڑو کی خدمت ہی میں لگا رہتا تھا۔ ابھی مجھے ابھی اتنا ہی بتا پائی تھی کہ باہر کی راہ داری کے اسپیکر پر کسی ایمر جنسی کے لیے ابھی کا نام پکا راجا لے لگا۔ ابھی کو جلدی میں جانا پڑا۔ باہر سہ پہر تک تھی برف باری پھر سے ہلکے گالوں کی صورت، آغاز کی تیاری کر رہی تھی۔ گڑو جاتے وقت مجھے شام 5 بجے نیچے نہر کی جانب آنے کا کہہ کر گیا تھا، لیکن مجھے اپنی مددگار نرس کو منانے میں بہت دیر لگی کہ وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کھلی ہوا میں لے جائے۔ میں نیچے پہنچا، تو مجھے دُور سے گڑو اپنے لیے جوتوں سمیت برف کے میدان میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی جانب آتے نظر آیا۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے برف میں کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ نرس کچھ فاصلے پر رک گئی۔ گڑو نے میرے قریب پہنچ کر میری ذہیل چیخ پر اپنی چھتری تان لی۔ ”اچھا ہوا تم آگئے۔ میرا تم سے وعدہ تھا کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا، جسے پانے کے لیے دنیا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے۔“ میں نے اپنی پلک پر برف کے ایک سونے گالے کی نمی محسوس کی۔ ”میں سننے کے لیے تیار ہوں.....“ گڑو نے عجیب سے لمبے میں سرگوشی کی۔ ”تو پھر سنو..... میں جانتا ہوں کہ وہ دن، جسے تم مسلمان روزِ حساب کہتے ہو..... اور جس ”قیامت“ کا انتظار یہ زمانہ ازل سے کر رہا ہے..... مجھے خبر ہے کہ وہ ”قیامت کب آئے گی“



.....ہاشم ندیم.....

اک خاک بسر نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی تہبہ رگ سے کچھ دیر تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نو جوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

میں گرد سے باقی کسی بھی بات کی توقع کر سکتا تھا، لیکن اس نے قیامت کا ذکر چھیڑ کر مجھے چونکا ہی دیا۔ ”کیا مطلب.....؟“، ”مطلب یہ کہ میں تمہیں قیامت کی صحیح تاریخ بتا سکتا ہوں، کیونکہ میرے حساب سے قیامت آنے کی تمام نشانیاں ظہور پزیر ہو چکی ہیں۔“ برف ہمارے چاروں طرف بے بسے قلعے کی فصیلیں گھڑی کر رہی تھی۔ سرد ہوانے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ”تم کن نشانیوں کی بات کر رہے ہو؟“، ”لا تعداد نشانیاں ہیں، جن میں سے بیش تر کا ذکر ایک ذہین نبوی ”ناسر اڈیمس“ صدیوں قبل کر چکا ہے، مثلاً چار فولادی پرندوں کا عظمت کے دو میناروں سے ٹکرانا (نائن الیون) یہودیوں کو اپنی بادملت (اسٹرائٹل) کا واپس ملنا، ساری دنیا پر یہود کا قبضہ ہونا (ڈالر اور بینک سودی نظام) وغیرہ۔ اب بس ایک آخری نشانی باقی ہے۔ عظیم دجال کی آمد اور یہودی آخری فتح اور میرے عمل کے مطابق یہ گھڑی بھی زیادہ دور نہیں، کیونکہ دجال عظیم کی آمد سمندروں میں بہت پہلے ہو چکی ہے۔ اب صرف بعد گشت کے مقام پر ان کا ظہور باقی ہے اور پھر قیامت اٹل ہے.....“ میں کلم ضم سا گرد کی یہ ساری بحث سن رہا تھا۔ اب مجھے ایسی کسے ہوئے لفظ ”صیہونی“ کی اصل تشریح سمجھ میں آرہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار جمل پور میں سلطان بابا نے بھی قیامت کے آثار اور اس کی واضح نشانیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا تھا، لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق ابھی حضرت عیسیٰ کا ظہور باقی تھا اور گرد و جس فتح کو یہودی آخری فتح بتا رہا تھا، وہ دراصل ہمارے ایمان کی فتح کا وقت تھا۔ مجھے اس لمحے اس آخری لڑائی کا نام بھی یاد آ گیا، جسے یہود ”آرما گیڈون“ ”Amagadon“ کے نام سے یاد کرتے تھے اور جس میں ایک فوج کے اسی علم (جھنڈے) بتائے جاتے تھے۔ برف باری تیز ہو چکی تھی اور گرد و کا پورا جسم برف سے ڈھک چکا تھا۔ اس نے مجھ پر تانی ہوئی چھتری کو زور سے جھکا، جو برف کے بوجھ کی وجہ سے تقریباً جھٹنے ہی والی تھی۔ چھتری ہٹنے ہی برف کے موٹے گالوں نے میرے بالوں میں چاندی بھر دی۔ میں نے غور سے گرد کی چھتی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا ہے وہ تاریخ.....؟“ گرد و پائے ٹمڑے بھی پرے خلا میں برقی برف کے ستاروں کے پار کسی ان دیکھی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بولا ”21 دسمبر 2012“، ”کیا..... اتنی جلدی.....؟“ یعنی صرف تین سال بعد“، ”ہاں! میرا علم یہی کہتا ہے اور یہی وہ پیغام ہے، جو میں اپنے سب ہی چاہنے والوں میں عام کر رہا ہوں کہ آنے والے وقت کی تیاری کر لو، وقت بہت کم ہے۔“ گرد واپس پلٹا اور ٹخنوں سے ذرا اونچی پڑی برف میں اپنے قدموں کے نشان بنانا برف کی دھند میں کہیں غائب ہو گیا، لیکن میرے وجود کے اندر جو دھند چھوڑ گیا تھا، وہ اس باہر کے گہرے سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

مجھے اس لمحے سلطان بابا کی شدت سے یاد آئی۔ ساری رات یہی سوچتے ہوئے گزر گئی کہ یہ نئی جنگ ان کے بنا میں کیسے لڑ پاؤں گا۔ پھر نہ جانے کس پہر کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی، تو نیند میں بھی میرے خوابوں کو اس گہری سفید دھند نے ڈھانپ رکھا تھا اور پھر اچانک اسی دھند میں سے دو دھیا سفید لباس پہنے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے لیوں پر وہی اپنی اڑلی اور مخصوص ہسکراہٹ سجانے سلطان بابا نمودار ہوتے چلے گئے ”کیوں نمایاں! پھر الجھا بیٹھے اپنے دھاگے کہیں.....؟“ مجھے شدید حیرانی کے ساتھ بے پایاں خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا ”آپ کہاں رہ گئے تھے، مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر۔ آپ جانتے ہیں، ایک قدم بھی آپ کے بنا الجھنا دو بھر ہو جاتا ہے میرا.....“ وہ میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے ”موجودگی صرف جسمانی ہی تو نہیں ہوتی، اور پھر اب تمہاری تربیت مکمل ہونے کو ہے۔ اب تمہیں تنہا فیصلے کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی ساحر میاں.....“ میں شدید پریشان ہو کر بولا ”آپ آج یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ کہیں جارہے ہیں.....؟“ ”سب ہی کو جانا ہے، کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ سب ہی اسی رستے کے مسافر ہیں، لیکن یاد رہے کہ جانے والوں کے ساتھ کاروبار زندگی رک نہیں جاتا اور پھر جب جسم دور ہو جائیں، تو روحیں مزید قریب ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ کو خود کو سلطان کا جانشین کاہت کرنا ہوگا۔ جیتے رہو.....“ سلطان بابا نے جانے اچانک ہی اس دھند میں کہاں کھو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسا خواب تھا، میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیوں کا گم زور ہنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میری یادداشت میں دریاے ٹیمز یا ویسٹ منسٹر ہل کے علاقے میں کوئی بہت بڑی مسجد نہیں آرہی تھی، لیکن میرے کانوں میں اذان کی واضح آواز پہنچ رہی تھی۔ بے خیالی میں وہیل چیئر کے بجائے بستر کے قریب رکھی اسٹیل کی بیساکھیاں تھام کر میں کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کا خیال سایا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد مجھے خیال آیا کہ میرے بے جان قدم اور مفلوج ٹانگیں آج میرا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو چکی ہیں۔ چاہے جیسا بھی اس کا سہارا اب بھی درکار تھا، مگر یہ بیساکھیاں ڈاکٹر البرٹ نے دور و ز قبل صرف ناپ لینے کے لیے منگوائی تھیں اور ان کی تشخیص کے لیے مجھے ابھی اپنے قدموں پر بوجھ ڈالنے کے لیے مزید

کئی نئے درکار تھے۔ بقول ایچی، جب اس نے البرٹ کو صبح معائنے سے قبل ان کے دفتر میں یہ خبر سنا تو ان کے ہاتھ میں پکڑا اٹھیجھ کر گیا اور وہ بھاگے ہوئے میرے کمرے میں پہنچ گئے۔ ”کیا تم نے ہمیں مستقل حیرت زدہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے نو جوان.....؟“ ڈاکٹر البرٹ بہت دیر تک اپنی ٹیم کے ساتھ میرے مختلف ٹیسٹ اور معائنے کرتے رہے۔ ”نا قابل یقین.....“ اگر یہ صرف قوت ارادی کا کمال ہے، تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ تم آہن سے بھی کہیں بڑھ کر مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔“ منہ پتا بھی بے حد خوش تھے، لیکن میرا دھیان ابھی تک رات والے خواب میں الجھا ہوا تھا۔ دل بار بار ڈوبا جاتا تھا، لہذا ڈاکٹروں کے جاتے ہی میں نے اپنے صبا نے پاپا کو اپنے شہر کے اسپتال کا نمبر ملانے کا کہا، جہاں سلطان بابا داخل تھے، وہاں کے بڑے ڈاکٹر کی بات سن کر میرا دم مزید اٹک گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات سلطان بابا کی طبیعت بہت خراب ہوئے گی، تو انہیں مصنوعی سانس کے لیے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی طرح اڑ کر واپس اپنے شہر پہنچ جاؤں۔ مجھے سلطان بابا نے ہمیشہ ہی سبق دیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ فانی یہ انسانی جسم ہی ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ ہی اصل زندگی کی ابتدا ہے، لیکن ہم انسانوں کو ازل سے اب تک اسی فانی جسم کی محبت ہی میں تو جتا رکھا گیا ہے۔ ہم اس کی جدائی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے، پھر چاہے وہ جسم ہمارا اپنا ہو یا پھر ہمارے کسی اپنے کا..... سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کو کھودینے کا احساس ہی ہماری سانسیں گھونٹنا شروع کر دیتا ہے۔ انہاں زندگی بھر جی کر بھی جینے کا ظرف تو خود میں پیدا کر نہیں پاتا، تو پھر ایک ”اجنبی موت“ کو گلے لگانے کا حوصلہ کہاں سے لائے گا۔ مجھے جب ڈاکٹر البرٹ نے یہ بتایا کہ فی الحال میں ہوائی سفر کے قابل نہیں، تو مجھے اپنی بے بسی پر شدید غصہ آیا اور چند لمحوں کے لیے جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دراصل ہمارا یہ جسم خود ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں اسی خیال میں بیٹا کھیاں ٹیکتا ششے کی صحت اور شفاف دیواروں والی اس راہ داری میں نکل آیا، جو ایک لمبی سی سرنگ یا ٹیوب کی مانند بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی دیواروں کے ایک جانب بہت سے زرد رنگ کے پلاسٹک کے بیج نمتختہ درجنوں کی تعداد میں جڑے ہوئے تھے۔ یہاں اسپتال کے مریض باہر موسم کی دست برد سے محفوظ رہتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر باہر ہوتی بارش، برف یا اچھے دنوں کی دھوپ کا مزہ لے سکتے تھے، لیکن اس وقت ششے کی صحت اور کالج کی دیواروں کے پرے کا ہر منظر دودھیا تھا۔

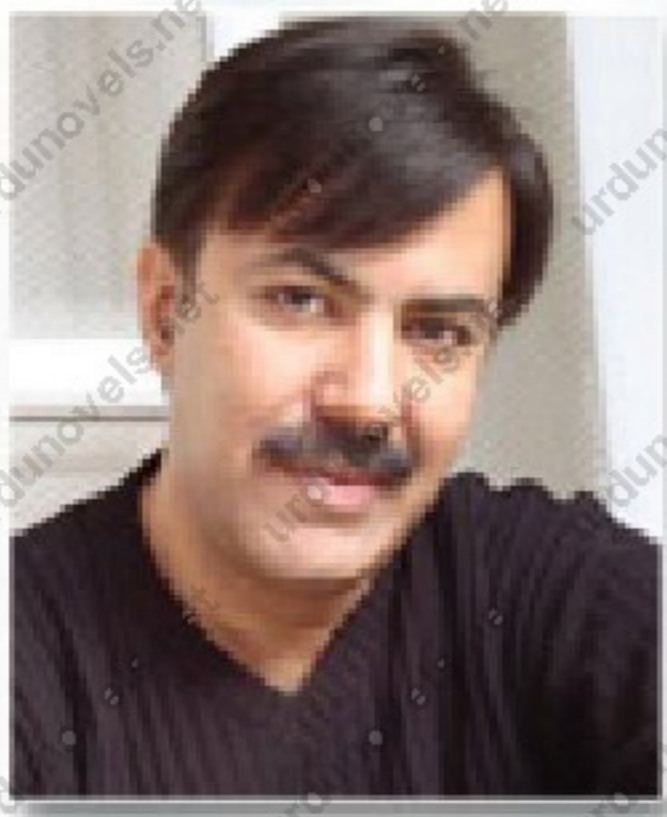
تب ہی میری نظر سامنے سے آتے گرد پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی ”میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تو تم نے ایک بار پھر یہاں سب کو چونکا دیا۔ تمہارے اندر جو بھی چھپا ہے، اُسے ایک ساتھ ہی سب پر ظاہر کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ کھیل کیوں کھیل رہے ہو؟“ گرد کا ٹیغے میں لگ رہا تھا، نہ جانے اس نے اپنے اندر یہ رقابت کیوں پال رکھی تھی، لیکن آج میں پہلے ہی سلطان بابا کی وجہ سے شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا، لہذا بہتر یہی سمجھا کہ اُسے کوئی جواب دیے بنا ہی آگے بڑھ جاؤں، لیکن دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے گرو کی آواز نے پھر میرے قدم جکڑ لیے۔ ”کیوں خود پر سے بھروسہ اٹھ گیا ہے یا پھر اپنے روحانی استاد کی ناکامی کا ڈر ہے.....؟“ مجھے یوں لگا، جیسے عبداللہ کے وجود کا ہر بند کو اڑ توڑتے ہوئے ساحر باہر نکل کر گرد کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی بلند ہوتی آواز کو دھیمار کھنے کی کوشش کی۔ ”تم میں اور مجھ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ تم جسے شعبدہ سمجھتے ہو، وہ میرے لیے ایک معجزہ ہے، تم جس ہنر کو پانے کے لیے جانے کتنی صدیوں سے سرگرداں ہو، میرے نزدیک وہ دعا کی صورت بل بھر میں قبول ہو سکتا ہے، بات صرف یقین کی ہے، اہل یقین..... لیکن افسوس تم نے سب کچھ سیکھ کر بھی یقین کرنا نہیں سیکھا اور شاید اسی لیے تم اس قدر خوف زدہ ہو.....“ گرد میری بات سن کر دھیرے سے مسکرایا۔ ”نہیں..... میں کسی سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں نے ابدیت کا راز پالیا ہے۔ پھر مجھے بھلا کیسا خوف.....؟ ڈرنے کی ضرورت تو تم جیسوں کو ہے، جنہیں آنے والے خطرے کا ادراک ہوتے ہوئے بھی کبوتر کی طرح آنکھیں موند لینے کی عادت ہے۔“ میں نے غور سے گرد کی طرف دیکھا۔ ”صاف صاف کو، تم چاہتے کیا ہو.....؟“ گرد کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی شخصیت کے گرد لپٹے یہ سارے نقاب اتار دو۔ پہلے پہل تو میں واقعی تمہیں کوئی چھوٹا مونا شعبدے باز ہی سمجھا تھا، لیکن اس رات عبادت کے دوران جب تم نے ہم سب کا ارتکا ز توڑنے کی کوشش کی، تب مجھے تنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچنا پڑا۔ تم اگر واقعی ”اسی“ ابدی راہ کے مسافر ہو، تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔ میں تمہیں منزل تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔“ گرد کی باتیں سب معمول اس کی شخصیت کی طرح الجھی ہوئی تھیں، لیکن آج میں نے اسے ٹٹولنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ ”اور اس ابدی منزل کو پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے تم یہ سب کسی صلے کی امید ہی میں کر رہے ہو۔“ گرد مجھے راستے پر آنا دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔ ”تمہاری ذہانت پر مجھے پہلے بھی کوئی شبہ نہیں تھا، لیکن بے فکر رہو، مجھے تم سے کوئی دنیاوی صلہ نہیں چاہیے، میرا مقصد مقدس ترین ہے۔ دراصل ہمارا مشن ہی دنیا کے اعلیٰ دماغوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے اور پھر تم تو یوں بھی میرے لیے بہت قیمتی ہو، کیوں کہ تمہارے پاس دوسروں سے کچھ ہوا ہے۔ تم اگر میرے دائرے میں شامل ہو جاؤ، تو میں تم سے ”ابدی سکون“ کا وعدہ کرتا ہوں۔ وہی ابدی سکون، جس کی تلاش میں دنیا کا ہر ذی روح ازل سے بھٹک رہا ہے اور اب تک سرگرداں ہی رہے گا۔ بولو منظور ہے میری پیش کش.....؟“ گرد امید طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں بات کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ گرد چاہتا تھا کہ میں اس کے گردہ میں شامل ہو کر اس کے نظریے کا پرچار کروں۔ میری دن بدن تیزی سے بہتر ہوتی حالت کو وہ اب بھی میرے کسی خاص علم یا شعبدے سے محمول کر رہا تھا۔ ایچی مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ گرد اپنی رہائش گاہ ہی پر باقاعدہ ایسی محافل کا انعقاد کرواتا تھا، جہاں اس کی شخصیت اور تعلیمات سے متاثر طبقہ حاضر ہو کر نہ صرف اسے سنتا اور سراہتا، بلکہ اس کے گردہ کے رکن باقاعدگی سے گرد کی روحانی تعلیمات کا پرچار بھی کرتے اور لوگوں کو اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت بھی دیتے تھے، اسی لیے گرد کے فدائین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، لیکن گرد کا اصل نظریہ آخر کیا تھا؟ یہ بات ابھی تک میرے لیے ایک معما ہی تھی۔ اتنا تو میں جان چکا تھا کہ اسے کامل یقین تھا کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت برپا ہونے والی ہے اور بہ ظاہر وہ اپنی تعلیمات کے ذریعے آس پاس کے لوگوں اور خاص طور پر نو جوان نسل کو آنے والے وقت کے لیے تیاری کا سبق دیتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک زاویے سے بہت آسان اور سادہ دکھائی دینے والی گرد کی یہ مہم، بے حد پیچیدہ اور پُر اسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں مغرب میں لوگوں کو اپنے نظریات کے پرچار کی کھلی آزادی تھی، تاوقتیکہ کسی کا نظریہ ریاست کے قوانین سے نہ ٹکرائے، اس لیے لندن کے ہائیڈ پارک میں تقریباً روزانہ ہی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں، کوئی دنیا سے مشینوں کے خاتمے کی مہم چلا رہا ہے، تو کسی کو چاند پر بکنے والے پلانوں سے اختلاف تھا، کوئی ہم جنس پرستوں کا پیش واثہ، تو کوئی ساری دنیا سے ویزا پابندی کے خاتمے کے لیے بھوک ہڑتال کیے بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں گرد اگر کھلے عام اپنے نظریے کا پرچار کر رہا تھا، تو یہ کوئی ان ہونی نہ تھی۔ میں نے تو لندن میں ایسے گردہ بھی دیکھے تھے، جو حکومت سے ”اعلاویہ اجتماعی خودکشی“ کو جائز قرار دینے کے لیے قانونی جنگ شروع کرنے کی تیاری میں تھے، اس لحاظ سے لندن کے معاشرے میں گرد کی ”تعلیمات“ کو خاصی عزت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ایک نو جوان طبقہ ایسا بھی تھا، جس نے گرد کو باقاعدہ ”روحانی دیوتا“ کا درجہ دے رکھا تھا اور انہی سرپھروں میں ایچی کا چھوٹا بھائی پیٹر بھی شامل تھا۔

باہر گرتی برف کے گالے بڑے ہو گئے تھے اور ایسے میں اگر کوئی دودھ سے مجھے اور گردو کو اس شیشے کی شفاف نیوب میں کھڑا دیکھتا تو اسے یہ جگمگاتی بھڑ نور بنی راہ داری بالکل ایسے ہی دکھائی دیتی، جیسے برف سے ڈھکے دودھیا سمندر میں روشنیوں سے بھرا کوئی شکارہ تیر رہا ہو۔ راہ داری کی اندرونی حدت کی وجہ سے شیشے کی دیواروں اور بیضی چھت پر برف جم نہیں پاری تھی اور مستقل پگھل کر یوں بہ رہی تھی، جیسے ہم کسی شیشے کے خول میں بند گہرے دریا میں ڈوب رہے ہوں۔ اتنے میں اچانک اسپیکر پر ڈاکٹر البرٹ کی آواز گونجی، وہ گردو کو کسی مریض کی درخواست پر زبانی کے لیے خصوصی کمر نمبر 137 میں طلب کر رہے تھے، کیوں کہ یہ گردو کے اسپتال کے دورے کے مخصوص اوقات تھے، سو اس نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ”مجھے تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔ مجھے امید ہے تم اس ”جج کے ستر“ میں میرا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شام تک میرا ذہن گردو کی شخصیت کی بھول بھلیوں میں الجھا رہا۔ جانے اس بار قدرت کو میرا کون سا امتحان مقصود تھا۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں تھی، لیکن میں اس اجنبی دلیس میں اپنے والدین کو مزید کسی نئی الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی وہ دونوں میری وجہ سے انتہائی پریشان تھے، لیکن میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا، جیسے کاہل تقدیر نے میری قسمت کی سیاہی کچھ زیادہ گاڑی بنا ڈالی تھی۔ شام ہوتے ہی زہرہ کی یاد کا پھندا پھر سے میری شہ رگ گھونٹنے کے لیے اپنے منہ کھلے ہوئے بے دم بچھڑے اپنا پورا زور لگا کر تازہ ہوا کی ایک لہر کو اپنے اندر اتارنے کے لیے بے تابی سے پھڑ پھڑاتے ہیں، لیکن عشق کی ڈالی ہوئی خاک ہمارے سانس لینے کے تمام راستے پہلے ہی مسدود کر چکی ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان جتنا بے چین ہو کر ایڑیاں رگڑتا ہے، اتنی ہی زیادہ اسے اذیت ہوتی ہے، جان رک رک کر ٹپکتی ہے، ایسے میں خدا ہونے کا بہترین کلیہ یہی ہے کہ سانس لینے کی اور دم کھینچنے کی ہر کوشش ترک کر دی جائے اور محبت کو اپنی رگوں سے زندگی چھوڑنے کی اجازت دے دی جائے، سو میں نے بھی زہرہ کی یاد کے پھندے کو اپنی شہ رگ کے ساتھ بے حد مضبوطی سے لپٹنے دیا، شاید میرا مقدر یہی یادوں کی امر تھیل تھی، کیوں کہ جس کی ذات سے ان یادوں کی ڈور بندھی تھی، وہ تو نہ جانے کہاں جا چکی تھی۔ سو سے محبت کا آئینہ ہوتے ہیں، میری چاہت بھی انہی دوسووں کے عکس کا شکار ہو رہی تھی، کون کہتا ہے محبت دنیا کا مضبوط ترین جذبہ ہے۔ میں نے تو شروع سے لے کر آخر تک اسے تار عنکبوت ہی پایا تھا۔ بدنامیاں، رسوائیاں، ناکامیاں، درد و غم، کسک اور جلن ہی عاشقوں کا سدا سے مقدر ہے اور لندن کی اس کالی سیاہ رات جیسی نہ جانے کتنی سیاہ راتیں اس مقدر کو رونے کے لیے اپنی زلفیں کھولے ہم جیسوں کا انتظار کرتی ہیں۔ مجھے بھی ایسی ہی ایک اور رات جھیلنا ابھی باقی تھا۔

اگلی صبح ایسی پیری دواؤں کی فہرست مکمل کرنے کے لیے آئی، تو اس کے چہرے پر معمول کی روشنی پہلے سے بہت کم تھی۔ کچھ چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں کہ ہلکا سا دھماپن بھی ان کی پوری شخصیت کو بجا کر دکھ دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ایچی کے ساتھ بھی تھا۔ میرے بے حد اصرار پر وہ رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی بتا پائی کہ اس کے چھوٹے بھائی پیٹر کو گزشتہ رات خون کی دو بوتلیں چڑھائی گئی ہیں، کیوں کہ وہ گزشتہ کئی دنوں سے چوری چھپے کسی ”مقدس عبادت“ کے لیے اپنے جسم سے تھوڑا تھوڑا کر کے خون بہاتا رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ایک لمحے ہی میں گردو کا عبادت خانہ اور چوراہور کی رسم کا منظر کوندے کی طرح لپک کر رہ گیا، لیکن میں نے ایچی کے سامنے اس ذکر سے گریز کیا۔ وہ پہلے ہی بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے روکے ہوئے تھی۔ وہ کام ختم کر کے پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میری کوئی بہن نہیں ہے۔ سنا ہے بڑی بہن ماں کی غیر موجودگی میں ڈانٹنے کے تمام فرائض بخوبی ادا کرتی ہے۔ کیا، آپ وہ جگہ پر کر کے میری ماما کا ہاتھ پٹانے کی زحمت کریں گی۔ ویسے بھی اب ماما مجھے ٹھیک طرح سے ڈانٹ بھی نہیں سکتیں۔ جلد ہی تھک جاتی ہیں۔“ میرا وار کا درگزر رہا اور ایچی کا چہرہ پھر سے جگمگا سا گیا۔ ”بے فکر رہو، میں اس صفت میں خود کفیل ہوں۔ اچھا ہے پیٹر کو بھی تمہاری بدولت کچھ رعایت مل جائے گی، ورنہ بچپن سے اب تک وہی اس انعام کا اکیلا حلق دار تھا۔ آج سے عبد اللہ بھی اس فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔“ ایچی جتنی اداس آئی تھی، اتنی ہی خوش اور مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ جاتے جاتے میں اس سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ وہ پہلی فرصت میں کسی بھی طرح میری پیڑ سے ایک ملاقات ضرور کروائے گی۔ سلطان بابا سے ملاقات کے بعد میری زندگی میں جتنے بھی واقعات رونما ہو چکے تھے، ان سب کا کوئی ایک خاص مقصد ضرور رہا تھا۔ آج ایچی سے ملاقات کے بعد مجھے گردو سے ملنے کا مقصد بھی کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ گردو، ماما کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی کے جذبات محسوس کر چکا تھا، لہذا اب اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ان کی غیر موجودگی ہی میں مجھ سے ملاقات کرے، لیکن اس شام پہلی مرتبہ میں خود اسے تلاش کرنے کے لیے چہل قدمی کے بہانے اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ مجھے ان بیساکھیوں کے سہارے چلنا اور لوگوں کی ہم درد بھری نظروں کو جھیلنا بہت دشوار لگتا تھا، لیکن شاید یہ بھی قدرت کا میرے لیے ایک سبق ہی تو تھا۔ لاچارگی، بے بسی اور انسان نامی اس کم ظرف مخلوق کو اپنی اوقات سکھانے کا سبق۔ میرے بس میں ہوتا تو میں دنیا کے تمام انسانوں کو ایک مرتبہ کچھ روڑ کے لیے بیساکھیوں کے سہارے چلنا لازمی قرار دے دیتا، تاکہ یہ کم زور حافظے والی مخلوق جب کبھی اکڑ کر اس زمین پر چلنے کی کوشش کرتی، تو اسے اس کی حیثیت یاد دلائی جاسکتی۔

آج لندن میں بہت دنوں بعد کچھ دیر کے لیے شام کا سورج جھلکا تھا۔ زمین پر جب سورج کی شریر کریمیں جھم سے گرئیں، تو کچھ دیر کے لیے برف بھی گدگد اسی جاتی اور روشنی کی ایک خیرہ کن چمک سے آنکھیں چندھیسی جاتی تھیں۔ اسپتال کے مرکزی احاطے میں کسی نے برف سے مدد میری کا جھنڈا تراشا ہوا تھا، پاس ہی برف میں راستہ بنانے والی مشین پکی اینٹوں والی روش سے برف بنارہی تھی۔ تب ہی مجھے ایچی ایک سترہ، اٹھارہ سالہ لڑکے کے ساتھ اپنی جانب بڑھتی نظر آئی۔ لڑکے کی حالت کافی ابتر دکھائی دے رہی تھی اور وہ سارے راستے ایچی سے کسی بات پر الجھتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا، ایچی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور قریب پہنچ کر تعارفی کلمات کہے۔ ”پیٹر..... یہ ہے عبد اللہ..... تمہارا بڑا بھائی۔“ پیٹر نے بے دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہیلو بڑے بھائی! مجھے تمہارا نام پسند آیا۔“ میں مسکرایا۔ ”تمہیں پسند ہے تو تم بھی رکھ لو، پیٹر عبد اللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ پیٹر ہنس دیا۔ ”میں نے سنا تھا کہ مشرقی بڑا بخشنے والا ہے، آج دیکھ بھی لیا۔“ میں نے بات جوڑی ”ہاں..... اگر سخاوت صرف نام بانٹنے ہی سے پوری ہو جاتی ہو، تو مجھ جیسے بخیل بھی بخشنے ہو جاتے ہیں۔“ اس بار پیٹر اپنے قہقہے کو روک نہیں پایا۔ ایچی نے شاید بڑے عرصے بعد اپنے ماں جائے کے ہونٹوں پر یہ جادو دیکھا تھا۔ وہ رو پڑی۔ پیٹر نے شکوہ کیا۔ ”دیکھو نا! میں روؤں تو یہ روتی ہے اور میں ہنسوں تو مزید رو پڑتی ہے۔ اس کا کیا علاج کیا جائے۔“ میں خاموشی سے کھڑا بہن بھائی کی یہ انمول تکرار سناتا رہا۔ پھر پیٹر مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے پلٹ گیا، جاتے جاتے اس نے ایچی سے کہا کہ وہ رات دیر سے گھر لوٹے گا، کیوں کہ اسے کسی خاص تقریب میں جانا ہے۔ ایچی کی بڑ بڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ خاص تقریب ضرور گردو سے متعلق تھی۔ ایچی کو رخصت کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ مجھے گردو اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ ”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟“ ”میں نے تمہاری پیش کش پر کافی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل مجھے تمہارا پورا پیغام سن لینا چاہیے۔ تو کیا تم آج رات مجھے اپنی عبادت کی تقریب میں مدعو کر سکتے ہو؟“ گردو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

اک خاکِ بسرِ نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شبہِ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سندے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق انہی اسرارِ درموز کے گرد بٹھا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سر بستہ بچیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑا ہے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سبب ناسل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janguroup.com.pk

شاید گردِ مجھ سے ایسی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود، اس کے ہاں ہونے والی کسی مذہبی تقریب میں شرکت کی فرمائش کر بیٹھوں گا۔ لیکن اُسے اپنے جذبات اور تاثرات کو چھپانا خوب آتا ہے، لہذا اگلے لمحے خود پر قابو پا چکا تھا۔ ”ہاں ضرور، کیوں نہیں، آج نہیں، توکل تمہیں وہاں آنا ہی تھا، تو پھر آج ہی سہی، لیکن تم اسپتال سے چھٹی کیسے لو گے اور پھر تمہارے والدین، وہ شاید تمہیں کبھی بھی یوں تمہا میرے ساتھ نہ جانے دیں۔“ والدین کی تم پر دانہ کرو۔ میں انہیں منالوں گا، البتہ اسپتال سے باہر لے جانے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ تمہیں ڈاکٹر البرٹ سے میرے لیے خصوصی مختصر چھٹی لینا ہوگی۔ کہہ دینا کہ تم مجھے اپنے روحانی علاج کے کسی سیشن میں لے جانا چاہتے ہو، جو میری بیماری کو دور کرنے میں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔“ گردِ مسکرایا ”ٹھیک ہے، تو طے رہا کہ ہم رات ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ تم تیار رہنا۔“

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر باپ اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ نہ جانے انہوں نے کس طرح مٹا سے مجھے گرد کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دلائی۔ میں گرد کی گاڑی میں اسپتال سے باہر نکلا، تو سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ لوگ ہاں کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں، کاش کوئی باپ بیٹے کے اس انوکھے اور خوب صورت رشتے کو بھی کبھی اسی طرح بیان کرے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ڈھلی تھی، لیکن قدامت پسند لندن کی سڑکیں سونے کی تیاری شروع کر چکی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے پر جمع کیے ہوئے برف کے ڈھیر سرد ہوا کی وجہ سے جم چکے تھے اور سینٹرل لندن کی خاموش گلیوں میں کہیں کہیں بے گھر بچارے لوہے کے بڑے ڈرمز میں آگ لگا کر اس کے گرد کھڑے ہاتھ اور جسم تاپ رہے تھے۔ جدید لندن کی طرف سے آتی گاڑیوں میں زندگی ابھی جاگ کر انگڑائی لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوب صورت چہروں، خوش بوؤں، کلونز اور ملبوسات کے جھوم تیزی سے شہر کے ڈسکوز، اوپرا تھیٹر ز اور کلبوں کی جانب رواں دواں تھے، جہاں فجر کے اُجالے تک سب ہی کو مدہوش رہنا تھا، رقص کرنا تھا اور اپنے جیسے انسانوں کی دنیا کو کھوجنا تھا۔ اس رنگ و خوش بو کے سیلاب میں کون یقین کرتا کہ اسی دنیا میں کال گڑھ اور تفصیل مافی جیسے اندھیرے قلعے بھی موجود ہیں، جہاں چراغوں کا تیل پوری طرح شام ڈھلنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں رات اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ستارے بھی تھک کر نہ جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں تب ہی ایک عجیب سا خیال آیا کہ کیا اگلے جہاں میں ان اندھیری راتوں اور ان روشن اجالوں کی بنیاد پر بھی کوئی فرق، کوئی امتیاز برتا جائے گا؟ کوئی صلہ دیا جائے گا یا نہیں..... کیا وہاں کے اور یہاں کے گناہ گار ایک ہی سزا پائیں گے اور کیا جزا کاروں کو ایک ہی سی جزا ملے گی؟ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ گرد کے ڈرائیور نے ایک طویل احاطے میں گاڑی موڑ لی۔ گرد خود مجھے لینے نہیں آیا تھا۔ اُسے اچانک کوئی مصروفیت درپیش ہو گئی تھی۔ گاڑی رکتے ہی ایک خادم کی معیت میں مجھے ایک بڑے سے ہال کی بالکونی میں پہنچا دیا گیا۔ ہال اور بالکونی پہلے سے کچھ کچھ بھرے ہوئے تھے۔ بتا چلا کہ آج گرد کا ٹیکہ ہے۔ اس کے بعد وہ یہیں اسٹیج پر لوگوں کا روحانی علاج بھی کرے گا۔ مجھے تیسری برو میں بیٹھے ہوئے پیٹری ایک جھلک بھی دکھائی دے گئی۔ کچھ ہی دیر میں گرد اپنے مخصوص پختے میں اسٹیج پر نمودار ہوا، تو ہال میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا، پھر اس نے یونہی آنکھیں موندے پورے ہال سے گزارش کی کہ سب لوگ ابدی سکون کے لیے ایک منٹ تک آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائی سے دعا کریں۔ سب کے ساتھ میری آنکھیں بھی میکا کی انداز میں بند ہو گئیں اور ٹھیک اُسی لمحے میری بند آنکھوں کے پردے کے پیچھے گرد کی شبیہ مسکرائی ”خوش آمدید“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ گرد اسی طرح آنکھیں موندے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں، پر ایک لمحے کے لیے میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس بار میرا مقابل ٹیلی ویژن کے ہتھیار سے لیس تھا اور میں بالکل ٹہی دامن۔ ہال میں زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی تھی، جو گرد کی شہرت سن کر پہلی مرتبہ اس کے اس ہفتہ وار روحانی درس میں شامل ہونے آئے تھے۔ گرد کے چاق و چوبند شاگرد ہال کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ علاج کے لیے آنے والوں کی نشستیں علیحدہ لگائی گئی تھیں۔ کچھ دیر میں باقی تمام ہال کی روشنیاں مدھم کر دی گئیں اور صرف اسٹیج پر کھڑے گرد کے گرد نور کا ایک ہالہ روشنی کے دائرے کی صورت میں باقی رہنے دیا گیا۔ گرد کو لوگوں کو مسح کرنے کا فن بدخوبی آتا تھا۔ سب ہی لوگوں کا مکمل ارتکاز اب اسٹیج کی جانب ہو چکا تھا۔ میں نے اس لمحے محسوس کیا کہ اس جدید دنیا کے سب سے ترقی یافتہ شہروں کی فہرست میں سے ایک شہر، لندن بھی ایسے بانیوں سے خالی نہیں، جنہیں روح کی پیاس ایسی جگہوں پر کھینچ لاتی ہے، جہاں روحانیت اور توہم پرستی کے درمیان بہت معمولی سا فرق رہ جاتا ہے۔ شاید انسان جس قدر زیادہ سائنسی ترقی کرتا جاتا ہے، اس کی روحانی پیاس بھی اُسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں گرد

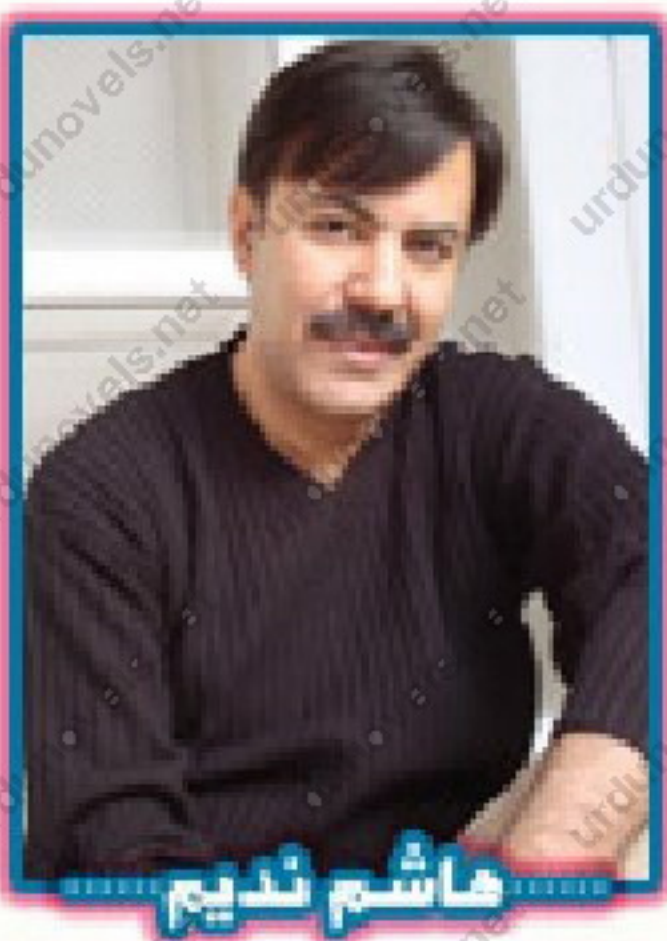
جیسے لوگوں کی کام یابی اور تعظیم سونی صدیقینی ہوتی ہے، کیوں کہ اس جدید معاشرے کے ترقی یافتہ لوگ سب کچھ پالینے کے باوجود بھی کسی روحانی مسیحائی تلاش میں در بدر بھٹک رہے ہوتے ہیں۔

گرو نے اپنے درس کا آغاز عبرانی زبان میں چند دعاؤں کے ساتھ کیا ”قسم ہے مجھے اس خدا کے عظیم و برتر کی، جس نے ہمارے اکابر پر بھی من و سلوی برساتی تھی، جو موسیٰ سے کلام کرتا تھا اور جس نے ہمیں عظیم تربتایا۔ جس نے ہمارے لیے بارہ جتنے تفویض کیے اور فرعون سے مقابلے کو سمندر بھاڑ کر راستہ بنایا۔ اسی رب کی قسم، یہ دنیا بہت عارضی اور جلد مٹ جانے والی ہے۔ سو، میرا یہ پیغام ہے، جہاں تک پہنچے کہ آؤ ہم سب مل کر اس اگلے جہاں کی تیاری کر لیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارے رب نے ہمیں یہاں اس دنیا میں بھی عظیم پیدا کیا ہے اور وہاں بھی وہ اپنے لاڈلے بندوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرے گا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ہم خود کو اس کا محبوب بندہ ثابت کریں اور اس ابدی سکون کی دعوت کو دیکر بے چین لوگوں تک پہنچائیں، جنہیں سچ کی تلاش ہے، مگر وہ ابھی تک سچ کو جان نہیں پائے۔“ گرو کافی دیر تک مختلف حوالے اور ترغیبات دے کر لوگوں کو اپنے حلقے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا رہا اور پھر اس نے اپنے درس کا اختتام بھی چند عبرانی آیات کے ساتھ ہی کیا۔ ہال میں ابھی تک مگجا اندھیرا اور مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر ان بڑے بڑے روشن دانوں پر پڑی، جہاں سے برف باری شروع ہونے سے پہلے کا سرخ انگارہ آسمان جھلک رہا تھا اور پھر چھت پر بنے داؤدی ستارے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھٹکا سا ہوا۔ یہ تو وہی ہال تھا، جہاں ”مقدس بہاؤ“ کی رسم ادا کی گئی تھی۔ میں نے بے چینی سے زمین پر کھدے آہنی ڈیوڈ اسٹار کو ڈھونڈنے کے لیے نظر دوڑائی، لیکن فرش پر اس وقت لکڑی کی نشیمنیں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر بیٹھے لوگ محویت سے گرو کی بات سن رہے تھے۔ درس کے بعد روحانی علاج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک یہودی عورت تریب وار کام پکار کر مریضوں کو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر بلانے لگی۔ مریض بد حال اور نڈھال حالت میں اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے۔ ان میں سے کئی وکیل چیئر اور بعض دوسروں کے سہارے گرو کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے، گرو ان سے نام پوچھ کر مرض کی نوعیت معلوم کرتا اور پھر اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیاں مریض کے ماتھے پر رکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر مریض کے سر پر پھونک مار دیتا۔ نہ جانے اس طلسماتی لمس اور پھونک میں کیا اثر ہوتا کہ مریض ایک لمحے کے لیے بالکل ہی بے سندھ ہو کر وہیں جھول جاتا، جسے سنبھالنے کے لیے اس پاس دو خادم پہلے سے تیار کھڑے تھے اور پھر چند لمحوں کے بعد جب اسے ہوش آتا، تو وہ بالکل ہشاش بشاش اپنے پیروں پر چل کر واپس اپنی نشست پر آ بیٹھتا۔ ہر بار مریض کے ہوش میں آنے اور ٹھیک ہونے پر پورے ہال میں داد و تحسین کا طوفان سالد آتا۔ عورتوں نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور نوجوان طبقہ زور زور سے چلا کر گرو سے مسیحائی کا درخواست گزار تھا۔ میں حیرت سے ٹنگ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک گرو نے ہاتھ اٹھایا اور پورا ہال یک دم یوں خاموش ہو گیا، جیسے وہاں کبھی کوئی ذی روح موجود ہی نہیں تھا۔ گرو کا اشارہ میری طرف تھا ”عبداللہ..... میرے دوست..... تم بھی یہاں نیچے آ جاؤ۔ میں تمہاری بے یقینی کو یقین میں بدلنا چاہتا ہوں۔“ سب ہی کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں اور میرے تمام جسم میں چیونٹیاں سی ریگنے لگیں۔ میرے پاس انکار کا کوئی موقع نہیں تھا۔ گرو کا یہ حملہ میرے لیے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لیے میرا ذہن جیسے سُن ہو کر رہ گیا۔ ہوش تب آیا، جب میں اپنی بیساکھیاں نکلتے ہوئے گرو کے سامنے اسٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا ”اپنے دل سے ہر شک و شبہ کو نکال دو میرے دوست، یاد رہے کہ دائمی علاج صرف میرے رب کی دسترس میں ہے۔ میں صرف روح کو پاک کرنے کی دعا کر سکتا ہوں اور اس دعا کا اثر صرف اُن پر ہوتا ہے، جو آئندہ کے لیے اپنی روح کو کسی گناہ سے پرانگندہ نہ کرنے کا عہد کر کے میرے پاس آئے ہوں، لیکن اگر ان کے دل میں کوئی چور ہو، تو میری یہ دعا بھی چند لمحوں بعد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے، لہذا تم بھی عہد کرو کہ ہمیشہ اپنی روح کو پاک رکھو گے۔“ گرو کی آواز برقی مائیک کے ذریعے پورے ہال میں پھیل رہی تھی اور سب ہی دم سادھے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا دیکھ رہے تھے۔ شاید میرے انداز میں بغاوت کی لہر کو ان سب ہی نے محسوس کر لیا تھا۔ جانے کیوں، مگر جتنی بار بھی میرا گرو سے سامنا ہوا تھا، میں نے اپنے اندر سے کچھ منفی لہریں نکلتی محسوس کی تھیں، حالانکہ اب تک کی ہر ملاقات میں اس نے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کہا یا کیا تھا، جسے دیکھ یا سن کر عام انسان خود کو صرف سحر زدہ ہی محسوس کر پاتا، لیکن میرے اندر کوئی ایسی قوت ضرور تھی، جو مجھے گرو سے دور دھکیلتی رہتی تھی۔ وہی قوت اس وقت اسٹیج پر اس کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود بھی مجھے باہر خبردار کر رہی تھی کہ مجھے اپنا آپ اس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اگلے ہی لمحے اس کی شہادت کی انگلی سمیت دو انگلیاں میرے ماتھے میں جیسے باقاعدہ پوسٹ ہو چکی تھیں۔ گرو کے لب تیزی سے مل رہے تھے اور ایک ہل ہی میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرے ماتھے کے مرکز سے ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ آب حیات نے میری نس نس میں ٹھنڈک، تازگی اور خمار آلود سکون کی ایک لہری دوڑا دی تھی۔ میں نے اس بد ہوشی سے بچنے کے لیے اپنے قدم زور سے زمین پر جھانے کی کوشش کی، لیکن اگلے ہی لمحے میں کبھی مخمور شرابی کی طرح لڑکھڑایا اور میرے ہاتھ سے بیساکھیاں چھوٹ گئیں۔ گرو نے سے پہلے مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمام لیا گیا اور اس کے بعد نشست تک پہنچائے جانے کے مرحلے سے لے کر واپس اسپتال آنے تک میں جیسے ایک خواب کے عالم میں بد ہوش ہی رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم میں سُن کرنے والے بہت سے ٹیکے بہ یک وقت پیوست کر دیے گئے ہوں۔

میری یہ کیفیت اگلی صبح تک برقرار رہی۔ گھنٹوں نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑے ہونے کے بعد کہیں جا کر میرے حواس کچھ بحال ہوئے۔ مٹا نے جب چوتھی بار دروازہ دھڑ دھڑا کر مجھے ناشتا ٹھنڈا ہونے کی دہائی دی، تب میں باہر نکلا اور تب ہی میری نظر دروازے سے باہر کھڑے پیٹر پر پڑی، جو ہاتھوں میں پھولوں کا گل دستہ لیے بے چین سا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مگر ہم دونوں کو کافی کے مگ تھا کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ پیٹر ان کے جاتے ہی جلدی سے بول ”بڑے بھائی تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی گرو کے معتقد ہو۔ میں تو کل رات تمہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ میں نے مسکرا کر پیٹر کو دیکھا ”ٹیلی ویژن اور پیناؤم کے اتنے شدید وار کے اثر سے نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔“ پیٹر کو زور کا جھٹکا لگا۔ ”گو یا تم بھی.....؟ ایسی بھی باتیں کرتی ہے۔ جانے تم لوگوں کو گرو کی روحانی طاقتوں پر یقین کیوں نہیں آتا۔“ میں نے غور سے پیٹر کی جانب دیکھا ”یقین ایک ایسا سودا ہے، جسے دلیل کی تلوار سے زیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہم یا تو یقین کرتے ہیں یا پھر نہیں، تم اپنے یقین کے ساتھ خوش رہو اور مجھے میری بے یقینی کے ساتھ جینے دو..... جانتے ہو، کامل یقین بھی کسی دولت کی طرح ہوتا ہے اور یہ خزانہ کم خوش نصیبوں ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ تمہیں تمہاری دولت مبارک، ہمیں ہماری غریبی۔“ پیٹر میری بات سن کر ہنس پڑا ”مجھے تمہاری یہی بات سب سے اچھی لگتی ہے عبداللہ۔ تم ایسی کی طرح مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی جلد ہی گرو کو اپنا استاد مان لو گے۔ وہ زبردست انسان ہے۔“ ”میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں گرو کی عظمت تسلیم کر

(جاری ہے)

توڑا۔ ”کھاتمہ کبھی بیت المقدس کے لیے ہوا۔“



ہاشم ندیم

اک خاکِ بسرِ نوجوان کا فسانہ..... جو خندہ کو اپنی شبہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سندے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا میکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے تجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سر بستہ مجیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ناسل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی فیک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناولی نگار سے بہ دراز راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janguroup.com.pk

مجھے یوں لگا، جیسے وہ رات بھر میرے اندر کو پڑھتا رہا ہو۔ میں نے گرد کا سوال سن کر جانے کیوں اثبات میں سر ہلا دیا، ”ہاں، میں گزشتہ رات خواب میں بیت المقدس میں تھا“ گرد نے گہری سی سانس لی، وہ کچھ مضطرب سا لگ رہا تھا۔ ”تم..... آخر کون ہو تم؟“ میں پلٹا ”یقین چانو میں خود اسی سوال کی کھوج میں یہاں تک پہنچا ہوں، لیکن کل رات ایک جواب تو مجھے زندگی نے دے ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ تمہارا اور میرا راستہ جدا ہے۔ تم 21 دسمبر 2012ء کو جس قیامت کی آمد کی تیاریاں کر رہے ہو۔ میرے نزدیک وہ سراب ہے، تمہارا آخری سیما کوئی اور..... اور میرا عجبات و ہندہ کوئی اور ہے۔“ گرد نے اطمینان سے میری بات سنی، پھر تاسف سے بولا ”تو آخر تم بھی اس مذہبی تعصب کا شکار ہو ہی گئے، جو ہر مسلمان کا خاصہ ہے، جانے کیوں میں تمہیں دوسروں سے کچھ الگ سمجھ بیٹھا تھا۔ یاد رکھو کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔“ اچانک گرد کی نظر میرے بستر کے ساتھ جڑی چھوٹی سی میز پر پڑی، جہاں ابھی تک ایچی کی لائی کتابیں رکھی تھیں۔ گرد کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”جانتے ہو، تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں نے تمہیں اپنے خدا کی وساطت سے جانا ہے، جب کہ تم مجھے ابھی تک ان کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہو۔ جس دن مجھے جانے کے لیے اپنے خدا کی رتی ہلاؤ گے۔ تمام پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے۔“ گرد اپنی بات ختم کر کے پلٹا اور پھر رک گیا۔ ”اور ہاں، مقدس دجال کا ظہور ہو چکا ہے اور تم دیکھنا کہ قیامت بھی اپنی مقررہ تاریخ ہی پر آئے گی۔ میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ اس وقت تم فائدہ پانے والوں کے ساتھ رہو۔“ گرد پلٹ کر چلا گیا، لیکن میرے لیے ان گنت سوالوں کا بھنڈا ریچھے چھوڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اور میرا عقیدہ ہی سچ ہے، لیکن یہ سچ مجھے پورا اطمینان کیوں نہیں سونپ رہا تھا، کوئی ایک چیز ایسی تھی، جو میرے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھی، لیکن کیا.....؟ میں شام تک ہر پختار ہا، لیکن وہ سادہ سا کلیہ میرے ذہن میں نہ بیٹھ سکا۔ گرد ٹھیک ہی تو کہتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں، تو پھر اس نے اپنے خدا کی وساطت سے میری حقیقت اتنی جلدی کیسے جان لی تھی، جب کہ میں ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھا۔ شام ہوتے ہی میرے اندر کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں منہ پٹا سے ضد کر کے تنہا اپنی بیساکھیاں ٹیکتا باہر برف سے اٹے میدان میں چلا آیا۔ کچھ درختوں پر ابھی تک خزاں کی نشانی کے طور پر زرد پتوں کے سوکھے ہار جھول رہے تھے۔ شاید خزاں کا واسطہ بھی موت کی طرح رگوں سے زندگی نچوڑ لینے سے ہوتا ہے، میں اپنی زندگی سے نچوڑے ہوئے پتوں کے ڈھیر تلے دبے ایک چوٹی بیٹھ کر اس پر بیٹھ گیا، سرد ہوا میرے منہ سے نکلتی سانس کو بھاپ میں تبدیل کر رہی تھی، لیکن میرے دل سے جو دھواں اٹھ رہا تھا، اس کی شاید کسی کو خبر نہیں تھی۔ شاید وہ عصر کی اذان تھی، جس کی آواز کہیں دور مضافات سے ہوا کے دوش پر ایک ہر سراہٹ کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے کان خود بہ خود اپنی تمام تر سماعتوں کو جگا کر فضا میں گم ہوتی اس آواز کے تعاقب میں کھڑے ہو گئے، ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے کہیں پڑھایا تھا کہ اذان دنیا کی وہ واحد آواز ہے، جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں، تمام وقت، دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں گونج رہی ہوتی ہے۔ مؤذن کی آواز میں عجیب سا سوز تھا، جو میں اتنی دور بیٹھ کر بھی اس سرگوشی نما صدا میں محسوس کر سکتا تھا۔ ”الحمد للہ ان محمد رسول اللہ..... الحمد ان محمد رسول اللہ.....“ اور تب ہی میرے ذہن میں پہلا جھماکا ہوا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ذہن میں بارود کے کسی ڈھیر کو فیتہ دکھا دیا گیا ہو۔ ہاں، یہی تو تھا وہ کھلا راز، خیرت ہے، اسنے سامنے کی بات مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آئی؟ جھگڑا خدا کا تو کبھی تھا ہی نہیں کہ خدا تو ازل سے ہم سب کا ایک ہی ہے۔ فرق تو پیارے نبی کی آمد کا ہے، اسلام تو ہمیشہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نازل ہوا تھا۔ آدم سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہر مذہب اسلام ہی کی ایک شکل تھی، ہاں مگر آخری نبی الزماں کی نبوت کا طرہ امتیاز مسلمانوں کے حصے میں آیا اور یہی یہودی ہم سے منافرت کی بنیادی وجہ بھی تھی۔ صدیوں تک یہ تاج یہود کے پاس رہا اور اللہ انہیں ان کی بے تحاشا نافرمانیوں کے باوجود نبیوں کی فرمائش پر معاف کرتا رہا، لیکن پھر یہ امتیاز ان سے آخر کار چھین گیا، چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہود کہیں نہ کہیں مسلمانوں کو ہی اس ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے دھوکے سے اپنے لیے ایک زمین کا ٹکڑا تو حاصل کر لیا، لیکن اپنا قبلہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے اور ہمارے قبلے کو کبھی انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اچانک ہی میرا جسم ناتواں اس احساس سے لرزنے لگا کہ میں آخری نبی کا امتی ہوں، جس کے لیے اس پوری دنیا کا بھیڑا کھڑا کیا گیا ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کہ میں کس قدر بد نصیب ہوں کہ خود اپنی ہی عظمت سے بے بہرہ ہوں، ایک عالم ہماری عظمت و بڑائی سے واقف ہونے کی بنیاد پر بھیڑیوں کی طرح ہماری بوٹیاں نوچنے کے لیے ہمارے درپے ہے اور ہم خود کو تعالیٰ میں سجا کر انہیں پیش کر رہے ہیں۔ گرد ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میرا اور اس کا بھلا کیا مقابلہ، اس نے ہم سے سچی دشمنی نبھائی، وہ ہماری نفرت میں علم کے کتنے سمندر پی گیا اور جو مذہب کی محبت کا دعوے دار تھا، میں نے کیا سیکھا؟ صرف چھ کلمے اور پانچ نمازیں، کیا بس اتنا ہی

تھا میرا دین.....؟ صرف ایک سال پہلے تک میں خود اسی لندن کے کھڑا اور ڈسکوز میں بھٹکتا پھرتا تھا اور آج سال بعد اللہ کے اتنے نیک بندوں کی صحبت کے بعد بھی میں کیا تھا اور در بھٹکتا ہوا ایک بھکاری..... وہ تلاش ہی کیا، جو آپ کو اندر سے مومن نہ کر سکے، انسان کے خمیر کو پاک نہ کر سکے، کیا میں اس نبی آخر الزماں کے امتی ہونے کے اعزاز کا حق دار تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ایک وہ یہودی، جو خدا کی محبت کے بل، اپنی پوری زندگی ایک مقصد کے سپرد کر چکا ہے اور ایک میں، جسے خدا کی محبت پانے کے لیے اس کے نبی کی محبت کا سادہ اور آسان کلیہ بتا کر، خدا نے ساری کائنات اس امتی پر وارد دینے کا وعدہ کیا ہے، جو صرف اس کیلئے ہی کو شرط بنا لے، مگر مجھ جیسے اور نہ جانے کتنے کم نصیب ہوں گے، جو صرف زبانی ہی اس محبت کا دعویٰ کرتے ہوں گے۔ میں جتنا سوچتا جاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہتی جاتی اور پھر کچھ دیر بعد ہی آسمان سے گرتی برف کو میرے آنسوؤں میں پر جمنے سے قبل ہی دھونے لگے۔ کاش انسان کے گناہ بھی اس برف کی طرح اتنی ہی آسانی سے دھل پاتے۔ پھر نہ جانے کب ایسی میری تلاش میں اس طرف آنکلی اور کب وہ مجھے میرے شکستہ وجود سمیت، سمیت کر میرے کمرے تک لے آئی۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا، مگر اگلی صبح ایک اور خبر میرے حواس معطل کرنے کے لیے تیار تھی۔ ایسی دراصل گزشتہ روز ہی خبر سنانے کے لیے مجھے تلاش کرتی ہوئی اسپتال کے احاطے میں آئی تھی، لیکن مجھے بے حال دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی، اس نے مجھے بتایا کہ گرو اس ہفتے کے درس کے بعد یروشلم اور فلسطین کے دورے کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور پیئر نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھی گرو کے وفد کے ساتھ ضرور اس ”مقدس سفر“ پر جائے گا، جب کہ پیئر کی اپنی حالت اس بیماری کی وجہ سے پہلے ہی بے حد خراب تھی، ایسی کوڈر تھا کہ وہ ایک بار گرو کے ساتھ چل پڑنے کے بعد اپنے بھائی کی صورت دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گی۔ برسوں پہلے ٹھیک اسی طرح ایک روز اس کی ماں بھی اپنا سب کچھ تیاگ کر کسی مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے گھر سے نکلی تھی اور پھر کبھی نہیں لوٹی۔ ایسی کوہونی صدیقین تھا کہ گرو بھی اپنے ساتھ جانے والے سب ہی نو جوانوں کو کسی اسرائیلی مشنری کے حوالے کر دے گا، جہاں سے آج تک کسی کی واپسی نہیں ہوئی۔ ایسی اپنی بات ختم کر کے آنکھیں پونچتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خلاف توقع گرو نے دو دن سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنے سفر کی تیاری میں مشغول تھا۔ شام تک میری طبیعت بے حد بے حال ہو گئی، لیکن میں چپ چاپ بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ کبھی کبھی جب انسان کا ٹوٹ کر بکھرنے کو جی چاہے، لیکن اسے اپنوں کی دل جمعی کی خاطر خود کو سمیٹے رکھنا پڑے، تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔

اچانک بند پلکوں کے عقب سے مجھے گرو کی آواز سنائی دی ”کیا تم میرے بارے میں سوچ رہ ہو؟“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے سامنے ہی دروازہ کھولے کھڑا تھا، کمرے میں مغرب سے پہلے کا اداس اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مٹا، پتا شاید مجھے سوتا سمجھ کر باہر چل قدمی کے لیے نکل چکے تھے۔ حسب معمول گرو کی آنکھوں میں وہی بیت لینے والی چمک اور ہونٹوں پر فتح کا غرور لیے، ہلکی سی مسکراہٹ، میں نے پہلی مرتبہ گرو سے درخواست کی ”کیا تم میری ایک بات مان سکتے ہو؟ پیئر بہت بیمار ہے، اسے اپنے ساتھ مت لے جاؤ۔“ گرو زور سے ہنسا ”تمہارے لبوں پر یہ عاجزانہ درخواست کچھ سچتی نہیں، جنہیں قدرت کے عزیز ہونے کا غرور ہو، وہ گناہ رشات نہیں کرتے، حکم دیا کرتے ہیں۔“ میں گرو کا یہ طرز بھی جھیل گیا۔ ”شاید میں کبھی خود کو حکم دینے کا اہل ثابت نہ کر سکوں، تمہیں اپنی اس جنگ کے لیے اور بہت سے جاں نثار مل جائیں گے۔ اس معصوم لڑکے کو بخش دو۔ وہ اپنی کم زور بہن کا آخری سہارا ہے۔“ مگر وہ جیسے میری بے بسی دیکھ کر اطف آ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر ایک سودا کرتے ہیں۔ میں پیئر کو منع کر دوں گا، لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے ساتھ بیت المقدس چلنا ہوگا۔ بولو منظور ہے.....؟“ میرے اندر بہ یک وقت جیسے بہت سی پُرشور ہواؤں کے جھٹکے چلنے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی اور پھر میرے لب بے ”ٹھیک ہے، مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔ پیئر کی جگہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ گرو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، لیکن ٹھیک اسی وقت اس کے عقب سے ایسی کی تیز آواز ابھری ”نہیں، عبد اللہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں اپنے ایک بھائی کو بچانے کے لیے دوسرے کی قربانی نہیں دے سکتی۔ اگر پیئر کی جدائی ہی میرا مقدر ہے تو یوں ہی سہی۔“ گرو ایسی کی بے وقت مداخلت سے کچھ بد مزہ دکھائی دے رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، جیسی تم لوگوں کی مرضی، وہ غصے سے مڑا اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی، ”رکو.....“ مگر بات اختیار کی ہی ہے، تو واقعی تمہیں اس وقت پورا اختیار حاصل ہے۔ اور اس اختیار کا گھمنڈ بھی تمہارے انداز سے ظاہر ہے، تو پھر ایک بیمار اور کم زور لڑکے پر اپنی مرضی چلانے سے کیا حاصل.....؟ اگر تمہیں پیئر کو ساتھ لے جانا ہی ہے، تو اسے ٹھیک کر کے کیوں نہیں لے جاتے۔ تم تو مسیحا ہو، پھر اپنی اس مسیحائی کا اعجاز اپنے ایک چاہنے والے پر کیوں نہیں آزماتے، یا تمہاری ٹیلی پتھی صرف لجاتی اور کچھ دیر کے لیے مسئلہ کرنے کا بھری جانتی ہے۔ پیئر کے جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس حالت میں وہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اپنی سانسیں ہار جائے گا۔ تم اسے تندرست کر دو، تو میں خود تمہارا بے دام غلام بن کر رہوں گا۔ بولو منظور ہے یہ سودا.....؟“ میری بات سن کر وہ سوداگر پلٹا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے ”تو گویا تم مجھے لاکار رہے ہو، تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ سودا کرنے کا حق صرف فاتح کے پاس ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو لڑ کر فتح حاصل کر دو اور پھر اپنی مرضی کے فیصلے صادر کرنا۔“ گرو نے بڑی ہوشیاری سے پتے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت ایک ایسی باری ہوئی فوج کا آخری اور تنہا بچا ہوا سپاہی تھا، جس کے سامنے جیتی ہوئی سپاہ کا سالار اپنے تمام ساتھیوں سمیت کھڑے ہو کر مذاق اڑا رہا تھا، اسے اکسار ہاتھ کہ یا تو وہ گھنے ٹیک کر پوری فاتح فوج کے سامنے ناک رگڑ کر معافی مانگے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ بارے ہوئے سپاہی نے کراہ کر اپنی ٹھکن سے پورے پلکیں اٹھائیں۔ فاتح سپہ سالار جیت کے نشے میں جنگ کا ایک بنیادی اصول بھول گیا تھا کہ بارے ہوئے کو اتنا ہی ہرانا چاہیے، جتنی اس میں ہارنے کی سکت ہو، کیوں کہ ہر شکست کی آخری حد سے پرے ایک نئی چمک چھپی ہوتی ہے، پھر چاہے لڑنے والا وہ ایک آخری بچا ہوا گھائل سپاہی ہی کیوں نہ ہو اور چاہے انجام میں اس سپاہی کو اپنے گھائل جسم میں ہزاروں تیروں کے نئے شکاف ہی کیوں نہ ملیں۔ سپاہی وہ جنگ لڑتا ضرور ہے۔ میں نے بھی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا ”ٹھیک ہے، اگر فتح صرف لڑ کر ہی ملتی ہے، تو یوں ہی سہی۔ میں تیار ہوں۔“ گرو طنز پر ہنسی ہنسا ”اچھا..... تو پھر میدان بھی تم خود ہی منتخب کر لو۔ کل تمہیں یہ گلہ نہ ہو کہ گرو نے اپنے علاقے میں تمہیں ہرا دیا۔“ میں نے غور سے گرو کو دیکھا۔ ”علاقہ بھی تمہارا ہی ہوگا اور مجھ سے ایسے کسی گلے کی کبھی توقع مت رکھنا۔ میں تو سدا ہی ہارنا آیا ہوں اور شکست کے تمام آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہماری یہ جنگ تمہارے اسی آنے والے درس کے دور میں ہوگی۔ تمہارے ہی گھر پر۔“ گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا ”اوہ، تو آخر ملی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ویسے میں تمہاری ہمت کی داد ضرور دوں گا۔ ٹھیک ہے، مجھے اس مناظرے کی دعوت قبول ہے، لیکن شرط اب بھی وہی ہے کہ ہار کی صورت میں تمہیں سدا کے لیے میری غلامی قبول کرنا ہوگی۔“ میں نے حتیٰ فیصلہ دے دیا۔ ”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے.....“ ایسی گنگ سی کھڑی میری اور

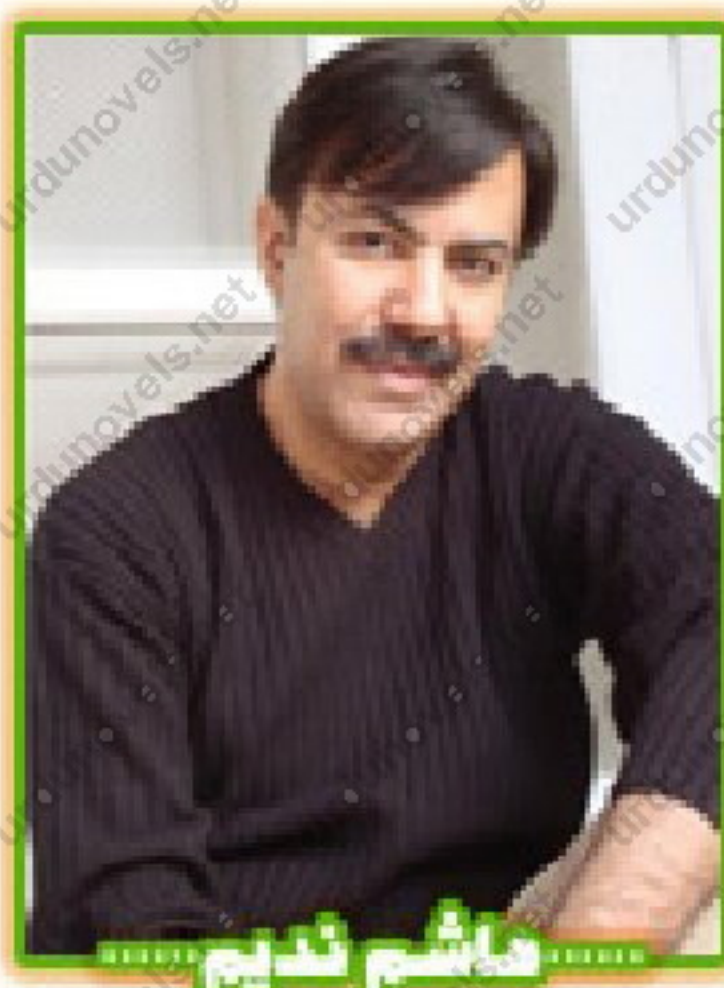
گرو کی یہ بحث سن رہی تھی۔ گرو کے کمرے سے نکلنے ہی چلا پڑی ”یہ تم نے کیا کیا لڑکے اوہ بہت طاقت ور ہے اور تم گھائل۔ یہ کیسا سودا کر لیا تم نے؟“ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ”کچھ سودے تمام تر نقصان جان کر بھی طے کرنا پڑتے ہیں۔ دلوں کے سودوں کی طرح، سودا گھائے والے۔“ ایسی بے بسی سے ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ گرو کے اگلے سیشن میں پیئر کے ساتھ خود بھی درس والے ہال میں آئے، لیکن وہ ابھی تک بے چین تھی ”آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ کیا واقعی تمہارا گرو کے ساتھ باقاعدہ کوئی ”مناظرہ“ کرنے کا ارادہ ہے.....؟“ میرا سرا بھی تک جھکا ہوا تھا۔ ”میں نہیں جانتا کہ مناظرہ کسے کہتے ہیں، بلکہ میں نے اپنی پوری زندگی میں یہ لفظ بھی دو چار مرتبہ ہی سنا ہوگا، لیکن میں لڑے بنا، ہار نہیں مان سکتا، گیوں کہ اب معاملہ صرف میری ذات کا نہیں، بلکہ میرے ایمان، میرے عقیدے اور کامل یقین کا ہے۔ میں نے آج تک جو بھی اس ایمان سے سکایا ہے، وہ تمام جمع پونجی لگا کر بھی مجھے یہ آخری واؤ کھیلنا ہی ہوگا۔“ لیکن شاید قدرت کو میرا یہ آخری جواب بھی قبول نہ تھا۔

اگلے روز مجھے ایسی ہی بتایا کہ پیئر کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اور اسے اسی اسپتال کے انتقال خون والے شعبے کے وارڈ میں داخل کروا دیا گیا ہے۔ گرو کے روحانی درس میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن ایسی ہی رپورٹ کے مطابق پیئر کی حالت سنبھلنے میں کئی ہفتے بھی لگ سکتے تھے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ پیئر اب بھی بھند تھا کہ وہ جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوا، گرو کی ہم راہی اختیار کر لے گا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا، یہ لمحے بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں، جب ہم ان کے ٹلنے کی دعا کرتے ہیں، تو یہ صدیوں میں ڈھل کر جنموں میں گھلتے ہیں اور جب ہم ان کے رکنے کی آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں، تب انہیں ہزاروں پر لگ جاتے ہیں۔ میرے نصیب کے لمحے بھی پرواز کرنے لگے اور آخر کار وہ رات بھی آ پہنچی، جس سے پرے کا صبح میرے اور گرو کے فیصلے کا اعلان لے کر آتا۔ منہ اور پتا میری بے چینی دیکھ دیکھ کر مزید پریشان ہو رہے تھے۔ پاپا نے حسب معمول براہ راست کوئی سوال کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا کہ کیا وہ اور تمنا میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ میری آنکھیں ڈبڈبایں گئیں۔ میں نے ان کا اپنے کاندھے پر رکھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ”میں ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہا ہوں، جس کی ہار یا جیت پر شاید میری پوری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ جنگ ہی اس بات کا تعین کرے گی کہ میں اب تک درست راستے پر تھا یا غلط..... میرے مستقبل کا فیصلہ بھی اسی جنگ سے ہوگا، مگر انہیں مجھے یہ جنگ لڑنے کے لیے کوئی اوزار، کوئی ہتھیار میسر نہیں۔ مجھے خالی ہاتھ صرف اپنے یقین کے سہارے ہی یہ لڑائی لڑنا ہوگی۔ مجھے آپ دونوں کی دعا کی ضرورت ہے..... اور بس“ پس منظر میں کھڑی مہمیری بات سن کر رو پڑیں۔ مائیں تو یوں بھی رونے کا بہانا ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا واسطہ خوشی سے کچھ کم ہی ہوتا ہے، مگر نہ جانے کیوں اس پل میرے مضبوط پاپا بھی اپنے آنسو چھپا نہیں پائے۔ میں نے تڑپ کر انہیں گلے لگا لیا۔ جب کوئی بیٹا اپنے باپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے سینے سے لگاتا ہے، تو رفوگری کا باقی ماندہ کام قدرت خود سنبھال لیتی ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب آتا ہے۔ آہوں، ہچکیوں کے طوفان گزرتے ہیں اور آخر کار دل کے غبار دھل جاتے ہیں۔ پاپا بھی مجھ سے اپنی ہچکی ہوئی آواز میں، صرف اتنا ہی کہہ پائے ”مجھے اپنے ساحرا اور اس کے یقین پر خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس لڑائی میں اس کی جیت ہو یا ہار..... میرا بیٹا یہ جنگ اپنی پوری قوت اور ایمان داری سے لڑے گا۔ میں جانتا ہوں، کبھی کبھی ہار یا جیت سے بھی زیادہ اہم جنگ لڑنا ہوتا ہے۔“ بیٹا مجھے تھکتے رہے۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ جنگیں صرف ہتھیاروں ہی سے نہیں لڑی جاتیں، جنگ کا بنیادی عنصر ”حوصلہ“ ہوتا ہے اور یہ ہمت و حوصلہ ہمیں ہمارے ”اپنے“ دیتے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی، باہر آسمان اور اندر کمرے میں میرا دل بے سنے کو بے تاب تھے۔ آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ انہوں کے سامنے تو میں نے کسی طور بھرم قائم رکھی لیا تھا، مگر وہ اوپر والا تو میرے من کی حالت جانتا تھا۔ سو میں نے کھڑکی کے قریب جائے نماز بچھالی اور ٹیکس زمین پر بچھا کر سجدے میں جس قدر گڑ گڑا سکتا تھا، اس سے بھی کہیں بڑھ کر گڑ گڑایا۔ ”یا خدا.....“ تو جانتا ہے کہ میں تیری کائنات کا سب سے حقیر ذرہ ہوں، لیکن میری کم نظری کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں۔ میری حقیقت سے اور میرے دل میں چھپے، ہر چہرے سے بس تو ہی واقف ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست کتنی بھی طویل تھی، تیری بے کراں رحمت سے کم ہے۔ سو، میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ کرتے وقت بھی میرے دل کا چہرہ مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اکسہا تا رہتا ہے۔ پھر بھی تجھے تیرے پیارے نبی کا واسطہ، میری لاج رکھنا۔ میرے بیبوں چہرے میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا۔ میرے مولا تیرا ہی آسرا ہے، تو ہی بیبوں کا پردہ دار ہے، میری جھولی میں سو چھید ہیں، پھر بھی یہ جھولی تیرے سامنے بھلی ہوئی ہے۔ اسے بھردے میرے مالک..... میں جس قدر گڑ گڑاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری اتنی ہی تیزی سے بہتی، اس روز مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اور آتا بھی کیسے، مجھے آج تک ذہن مانگنے ہی سب کچھ جوتلا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ دعا صرف لفظوں سے مانگنے کا نام نہیں۔ اللہ کے سامنے تو ویسے ہی ہمارے بہترین لفظ کھو جاتے ہیں۔ ہم بھی ”فوں غاں“ ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور دعا کا وقت نکل جاتا ہے۔ ہم بڑی تیاری سے دعاؤں کی فہرست ذہن میں ترتیب دے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اگلے ہی لمحے سب بھول بھال کر کسی جھوٹے نیچے کی طرح صرف ”بیٹھا“ مانگنے ہی پر اکتفا کیے رہتے ہیں۔ یہ تو دینے والے کی وسعت ہے کہ وہ پھر بھی ہم بے زبانوں کو، نادانوں کو صرف ”بیٹھے“ کے لالچوں کو، سب کی ضرورت کے مطابق دیتا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری طلب، کبھی اس قابل نہ تھی کہ ہمیں کچھ عطا کیا جاتا۔

میں بھی ساری رات ہڑکتا رہا، لیکن ڈھنگ سے کچھ مانگ نہ سکا، حالاں کہ دینے والے نے اپنے سب ہی خزانوں کے منہ کھول رکھے تھے۔ صبح لندن کا موسم بہت ادا تھا۔ برف کی تازہ جھڑی نے پرانے سفیدے پر غنی قلعی پھیر دی تھی۔ باسی برف پر جب تازہ برف کی چادر پڑتی ہے، تو یوں لگتا ہے، جیسے پرانی رضائی پر نیا لحاف اوڑھا دیا گیا ہو۔ سہ پہر تک ایسی تین مرتبہ چکر لگا کر مایوسی سے سر ہلا گئی تھی۔ مطلب پیئر کی حالت ابھی تک سنبھل نہیں پائی تھی۔ جانے کیوں، میرے دل میں ایک نئے خدشے کے سانپ نے پھن پھیلایا، کہیں گرو نے اپنی جنگ شروع تو نہیں کر دی۔ شام کو جب میں گرو کی رہائش گاہ جانے کے لیے نکلنے لگا، تو منہ اور پتا پہلے سے گاڑی میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اپنے ساحر کو تنہا نہیں جانے دیں گے، لہذا میں چپ ہی رہا۔ اندھیرا ہونے کے قریب ہم گرو کے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ باہر میڈیا کے رپورٹرز اور مختلف ٹی وی چینلوں کے مایک دیکھ کر میرا ماتھا ٹھکا۔ میں جانتا تھا کہ گرو اس موقع کی تشہیر سے نہیں بچ سکے گا۔ اسے ایک بہترین موقع مل رہا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنے عقیدے اور مسلک کو فاتح ثابت کر کے لوگوں کے ذہن مزید تسخیر کر سکے۔ میں ہال میں داخل ہوا تو کھڑے اور کھڑا چل رہا تھا۔ کچھ کچھ بھرے ہوئے ہال کی ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ لوگ دیواروں کے ساتھ، بالکنی میں اور نشستوں کے درمیان والی جگہ پر بھی بھرے پڑے تھے۔ کیمروں کے زائے اور فلپس کی چکا چونڈ سے صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ ٹی وی سے براہ راست بھی نشر ہوگا۔ گرو پہلے سے اسٹیج پر مایک سنبھالے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جاؤا بلند تعارف کروایا۔ ”خواتین و حضرات..... آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ ہمیں جس شخصیت کا انتظار تھا، وہ اب ہمارے درمیان ہے۔“ پورے ہال پر ہل بھر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور سب ہی کی نظر میکائی انداز میں میری طرف اٹھ گئی۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر پسینے کی ایک بوند پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قدموں کے نیچے سے زمین جیسے کھسکتی گئی۔ مناظرہ شروع ہو چکا تھا۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

اک خاک پسر نو جوان کا قصہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رگ سے کچھ دور تلاشی رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و مشہور ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا ڈیمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک عالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نو جوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق انہی اسرار و رموز کے گروہ بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سر بستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی مہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janguroup.com.pk

دفعہ مجھے احساس ہوا کہ آج خصوصی طور پر ہال میں ایک بہت بڑی اسکرین بھی لگائی گئی تھی، جس کے ذریعے ہال کے آخری کونے میں بیٹھا شخص بھی اسٹیج کا تمام منظرِ خوب و کچھ سکتا تھا۔ دو شخص میرا ہاتھ تھام کر میری بوسا کھی سنبھالتے، مجھے اسٹیج پر لے گئے اور باقی دو نے منہ اور پہنا کی رہنمائی کی ڈمے داری سنبھال لی اور انہیں لے کر ہال کے نیلگوں اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ گرو نے ”عبداللہ“ کے نام سے میرا تعارف کروایا۔ اسٹیج پر کیمروں کے قلبش کی چکا چوند اتنی زیادہ تھی کہ مجھے سامنے ہال میں بیٹھے جھوم کا بس ایک دھندلا سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گرو نے بات کا آغاز کیا۔ ”آج ہم یہاں ایک عظیم اور مقدس مقصد کی تکمیل کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے، جو میرے اور اپنے عقیدے کی جانچ کے لیے یہاں تک آیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھے جانے سے قطع نظر اور کسی بھی فیصلے کے اعلان سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس شخص کی بہت کا اعتراف کریں۔“ پورے ہال نے تالیماں بجا کر گرو کی بات کی تائید کی۔ ہال میں داخل ہوتے وقت میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ناظرین میں زیادہ تر تعداد نو جوان اور جو ٹھیلے طبقے کی ہے، جو ذہنی طور پر پہلے ہی گرو کی فتح تسلیم کر چکے ہیں۔ بزرگ طبقہ، البتہ کچھ خاموش اور بے چین سا دکھائی دیتا تھا۔ گرو کی تقریر جاری تھی۔ ”ہم دنیا میں صرف مذہب اور عقیدے کے لیے وارد ہوتے ہیں اور وقتِ رخصت یہی ہمارا زور دار ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ کئی پچھڑ میں وقت کا پیہر رک جانے کی حقیقت بیان کر چکا ہوں اور میرے عقیدے کے مطابق وہ گھڑی اب زیادہ دور نہیں، جو ہمارے لیے صدی اور برسوں کا وقفہ ہے۔ دینی وقت قدرت کے پیسے کے لیے بس ایک پل کی ساعت ہے۔“ گرو نے چھت پر قانون کی صورت لٹکے ہوئے داؤدی ستارے اور اس کے اطراف گھنٹی دو پتلی کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ مقدس نشان دو جڑی ہوئی مثلثوں اور دو کپڑوں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں اوپر کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس خدائے بزرگ و برتر کی عظیم الشان بڑائی کا استعارہ ہے اور اوپر والی مثلث کپڑا آسمان پر خدا کی خدائی گویاں کرتی ہے، فحش اسی طرح نیچے کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس ذات کا استعارہ ہے، جو آخر کار خداوند کی مرضی سے زمین پر آخری مسیحا کی صورت میں وارد ہوگا اور ہمیشہ کے لیے خدا کا قانون نافذ کرے گا۔ اٹنی مثلث کے نیچے والی کپڑا اس روئے ارض پر موجود مسندوں کا استعارہ ہے۔ جہاں میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ آخری مسیحا (دجال) وارد ہونے کے بعد خود کو دنیا کی نظر سے خفیہ رکھے ہوئے ہے۔“ بے خیالی میں میری نظر بھی گرو کی اٹھی انگلی کے تعاقب میں اٹھ گئی اور اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ یہ تو جھنڈے پر بنی ہوئی شہید تھی۔ ہاں، یہود کا جھنڈا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس شہید کی توجہ کچھ مجھ میں آئی۔ گرو کی بات ختم ہو رہی تھی۔ ”میں ایک بار پھر آپ سب کو سچ کے سفر کی دعوت دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جب ہم سب اس سفر کے لیے روانہ ہوں تو عبداللہ ہمارا ہم سفر ہو۔“ تالیوں کی شدید گونج میں گرو اپنی بات ختم کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اب مجھے دو قدم آگے بڑھ کر اپنا نقطہ نظر پیش کرنا ہوگا اور اس کے بعد اصل مناظرہ شروع ہوگا۔ ہال میں کچھ آوازے کسے گئے اور بوڑھوں نے میرے اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھ رہنے پر کھانسنے کی اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور کوئی درمیانی نشستوں میں سے چلا یا۔ ”آگے بڑھ کر اپنی صفائی پیش کرو ورنہ کے..... ہم تمہیں سننے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔“ تب میرا ماتھا ٹھکا اور میں کچھ طنزیہ قہقہوں کی بازگشت میں قدم بڑھا کر مائیک کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کھنکھارتے ہی ہال میں پھر سے وہی سناٹا چھا گیا۔ میری زبان لڑکھرائی۔ ”میرا نام عبداللہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ایسی محفل کے قافلے کیا ہوتے ہیں، میں تو ابھی تک اپنے نام کی لاج ہی نہیں رکھ پایا تو“ آدابِ مناظرہ“ سے بھلا میری کیا واقفیت ہوگی۔ مذہب اور عقیدے کی سچائی کے لیے لڑنے والے تو بہت عظیم لوگ ہوتے ہوں گے۔ مجھ پر تو ابھی ٹھیک طرح سے منصب اور عقیدہ کھلا بھی نہیں و در در کی شوکرین کھاتا ہوا، میں یہاں تک پہنچا ہوں اور میرا واحد اثنا آج بھی صرف اور صرف میرا کامل یقین ہے۔ یقین اپنے مذہب پر، عقیدے پر، اپنے خدا اور اس کے آخری نبی ﷺ پر اور میرا ایمان ہے کہ وقت کا پیہر تمہے گا اور ضرور تمہے گا، مگر ابھی اس گھڑی میں ذرا دیر باقی ہے۔ میرا آخری مسیحا ابھی تک آسمانوں میں ہے اور وہ تب زمین پر بھیجا جائے گا، جب اسے صلیب پر سے زندہ اٹھا لینے والا میرا مالک حکم دے گا۔ مجھے بھی اس آخری جنگ کا پورا یقین ہے، البتہ میرا فاتح کوئی اور (مسیح) ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور سمندروں کا مالک، بس وہی میرا اللہ ہے، جو یہاں موجود ہر بندے کا ”خدا“ ہے۔“ میں نے اپنی بات ختم کی تو پورے ہال میں ایک تالی کی گونج بھی نہیں تھی۔ پھر ایک کونے سے کسی شخص کا جھولنا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور تالی بجنے کی آواز ابھری۔ کوئی بھڑائی ہوئی آواز میں زور سے بولا۔ ”جیتے رہو سا حرا، مجھے تم پر فخر ہے۔“ اور پھر پہنا کی تالیوں کی آواز میں منہ کے ہاتھ بھی شامل ہو گئے۔ کیا ہوا جو پورے ہال میں میرا ایک حمایتی بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے، مجھے جنم دینے والے عظیم ترین ماں باپ تو تھے، کیمروں کا رخ منہ، پپا کی طرف ہو گیا۔ ہال میں لگی اسکرین پر مجھے دونوں کی آنکھ سے بہتے آنسو صاف دکھائی دیے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جلتی آنکھوں کو بند کرنے سے روکا۔ سپاہی جنگ میں رویا نہیں کرتے۔ ہال میں تیز سرگوشیاں ہونے لگیں۔

گرو نے پہلے دور میں اپنا اثر کچھ زائل ہوتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھا۔ ”اب میں عبداللہ کو براہِ راست دعوت دیتا ہوں کہ اگر اس کے پاس

اپنے عقیدے کی سچائی کے حق میں کوئی بھی ثبوت، علم، معجزہ یا کرشمہ ہے تو وہ پورے ہال کے سامنے پیش کرے۔ یا اگر وہ چاہے تو میں پہل کروں؟“ ہال میں موجود سب ہی افراد کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ہال میں لگی اسکرین پر صرف میرے چہرے کو فوکس کیا جا رہا تھا۔ ”میں نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میں یہاں کسی ثبوت یا کرشمے کے بنیادی صرف اپنے یقین کے بل پر آیا ہوں اور اگر میرا یقین سچا ہے، تو اسے کسی معجزے یا کرامت کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی مخصوص علم بھی نہیں، جس کے ذریعے میں لوگوں کو مسحور کر سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ گرو نے روحانیات کی تعلیم کے دوران جتنا کچھ سیکھا ہے، مجھے اس کا عشر عشر بھی نہیں آتا۔ میں یہاں کسی سے مقابلے کے لیے نہیں آیا۔ بنا کسی ثبوت اور بنا کسی دستاویز، صرف اپنے عقیدے کی سچائی بیان کرنا ہی میرا مقصد ہے، لہذا میں پہلے گرو سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام حاضرین کے سامنے اپنے وسیع علم کا مظاہرہ کرے۔“ گرو نے فاتحانہ انداز میں یوں میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، ”تم نے تو لڑے بنائی آدمی بازی ہار دی۔“ ہال میں بھی جو لوگ کسی بڑے ”تمناشے“ کی امید میں گھروں سے نکل کر آئے تھے، سب ہی کے چہروں پر مایوسی اور بددلی سی چھانے لگی۔ ہال میں گئے گیسرے اسکرین پر ناظرین کے تاثرات جھلکیوں کی صورت پیش کر رہے تھے، پھر گرو کے محلے نے مریضوں کے نام اور ان کی بیماریوں کی تفصیل فہرست سے پڑھنا شروع کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مریض اسٹیج پر آکر گرو کی کرشماتی شفا سے فیض یاب ہونا شروع ہو گئے۔ لوگوں کی جبینوں سے گرو کی دوا انگلیاں چھوتے ہی سارے درد، کھینچاؤ اور تکالیف غائب ہو جاتیں۔ گرو نے مجھے پیش کش کی کہ اگر مجھے کسی قسم کا کوئی شک ہو، تو آج کے دن کے لیے خصوصی طور پر معالجین کی ایک ٹیم بھی طلب کی گئی ہے، جو یو این اسٹیج پر دستی مشینیں لگا کر باقاعدہ مریضوں کی طبیعت سنہلنے سے پہلے اور بعد کی رپورٹ پیش کر کے میرے شبہات بھی دور کر سکتی ہے، لیکن میں نے گرو سے کہا کہ مجھے اس کی میساگری پر پورے یقین ہے۔ اسکرین ہر چند لمحے بعد مٹا اور پٹا کے چہرے کے تاثرات فوکس کر دی تھی۔ دونوں کے چہروں پر مجھے رفتہ رفتہ شدید پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے نظر آنے لگے تھے۔ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنے نالائق ترین بچے کو بھی یوں بھری دنیا کے سامنے ٹکست کھاتا نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ جہاں کے لیے اس کا بیٹا دنیا کا سب سے بڑا فاتح اور ہر باپ کے لیے اس کا نجات جگر سب سے زیادہ کام یاب ہوتا ہے، لیکن ہال کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت میرے والدین کو کچھ اور ہی آئینہ دکھا رہی تھی۔ ہال کے بڑے بڑے روشن دانوں سے باہر برف کے گائے گرتے نظر آ رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا، تو میں اور میرے دوست کو کچھ جیسے پہاڑی علاقوں میں گزارے اپنے بچپن کے دسمبر کے دوران، ان برفیلی شاموں میں گھٹنوں سر جوڑے بیٹھ کر، یہ سوچا کرتے تھے کہ آخر اللہ میاں نے صرف ہمارے محلے پر برف برسانے کے لیے کتنے فرشتوں کی ”ڈیوٹی“ لگا رکھی ہوگی اور فرشتے آخر کیسے اتنی بہت سی برف اکٹھی کر کے یورپ میں بھر بھرا لاتے ہوں گے اور پھر کسی بہت بڑی چھلنی سے چھان کر ہم پر گراتے ہوں گے۔ ہم ان دودھیا بادلوں ہی کو فرشتوں کی بوریاں سمجھتے تھے، جسے وہ اپنی پیٹھ پر لادے، رات بھر آسمان پر ڈھویا کرتے تھے۔ جانے دو میرے بچپن کے دوست اور وہ بادلوں کی بوریاں ڈھوتے معصوم فرشتے، اب کہاں ہوں گے۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ گرو کی آواز نے مجھے پھر سے اسی ہال میں پہنچا دیا۔ وہ آخری مریض کو شفا یاب کرنے کے بعد اب مجھے دعوت دے رہا تھا۔ تب، میں اسی وقت میں نے ایک اور فرشتے کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فرشتہ بھی میرے لیے کچھ ڈھونڈ رہا تھا اور میرے دل کی دھڑکن آج بھی اتنی ہی تیز ہو گئی، جتنی کبھی برف کے پہلے گائے کو پٹکوں پر ٹھہرانے سے ہوتی تھی۔ ہاں، وہ ایسی ہی تھی، جو میری درخواست پر نہ جانے کس مشکل سے دھیل چیئر پر بیٹھے پیٹر کو اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس ہال تک لانے میں کام یاب ہو گئی تھی۔

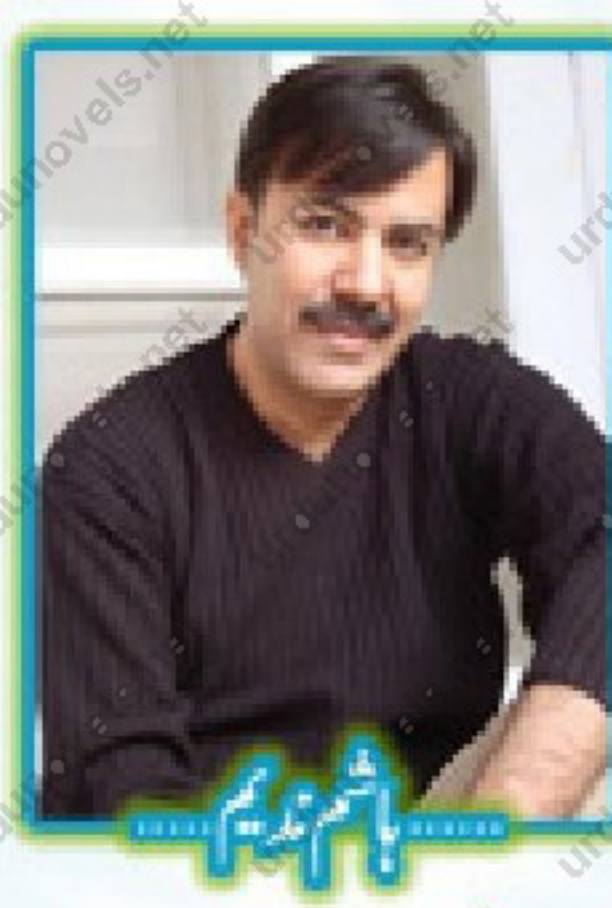
ہال کے سنائے میں دھیل چیئر کے پیروں کی آواز گونجی تو سب ہی کیمروں کا رخ پیٹر اور ایکی کی جانب ہو گیا۔ گرو نے بھی چونک ایکی کی جانب دیکھا اور جلدی سے محلے کو اس کی مدد کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد ایکی، پیٹر سمیت اسٹیج پر موجود تھی۔ میرا دل کچھ ایسی تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسیلوں کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہال میں پھر سے سرسراہٹیں ہونے لگیں۔ گرو کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر گڑی تھیں۔ میرے لب کھلے۔ ”میں گرو کے علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں اور میرے پاس کوئی دلیل نہیں، جس سے گرو کے اس علم کی کسی ساخت یا قسم پر تبصرہ کروں، کیوں کہ اگر یہ ٹیلی پیٹھی یا چنانازم کی بھی کوئی شاخ ہے، تو بہر حال لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ میری گرو ہے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اس نڈھال لڑکے کو بھی شفا یاب کر دے، جس کے جسم میں تازہ خون بننا بند ہو چکا ہے۔ یہ گھائل لڑکا پیٹر خود گرو کا بہت بڑا پرستار اور پیروکار ہے اور گرو کے ساتھ اس کے اگلے دورے پر جانے کا خواہش مند بھی ہے۔ مجھے امید ہے، گرو میری یہ درخواست رد نہیں کرے گا۔“ گرو کے چہرے پر پیٹر کے ہال میں آنے پر جو کشت تاثر ابھرا تھا، اب وہ ایک مسکراہٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے یوں دیکھا، جیسے بڑے، سچے کی کسی ”شرارت“ پر حسیہ کرنے کے لیے دیکھتے ہیں۔ وہ بولا۔ ”میں عبد اللہ کو پہلے بھی یہ بات کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ روحانیات، انسان کو ان بیماریوں سے شفا یاب کرنے کا نام ہے، جو کسی روحانی پے چیدگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے میں بھی انسان بظاہر کسی بھی بیماری کا شکار تو نظر آتا ہے، مثلاً درد، بخار، جسم کی معذوری، فالج کے اثرات دل کی بیماریاں، ذہنی کشیدگی، جگر کی پراگندگی، بصارت و سماعت کا متاثر ہونا یا پھر معدے کے امراض وغیرہ، لیکن اصل میں ان تمام بیماریوں کی اصل وجہ انسان کے جسم کے اندر موجود روح کا گھائل ہونا یا روح کی بغاوت ہے۔ روحانی علم سے ہم ایسی ہی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں اور روح کے مندرجہ ہوتے ہی جسم کی بیماری خود بہ خود دور ہو جاتی ہے، لیکن روحانی علاج کے ذریعے ہم خاص خاص جسمانی بیماریوں کو فوری رفع نہیں کر سکتے، مثلاً کوئی حادثہ، جسم سے چوٹ کی صورت میں خون بہنا، کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے اندرونی اعضاء کی ٹوٹ پھوٹ۔ ایسی صورت میں پہلے مریض کو فوراً جسمانی طبی علاج کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ ہاں، البتہ ایسی صورت میں روحانیت اپنا کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ پیٹر کی بیماری بھی خاص ایک جسمانی بیماری ہے، جس میں ہڈیوں کے گودے کے پورا کام نہ کرنے کی وجہ سے جسم میں سرخ خلیوں کی پیدائش ختم ہونے کے قریب ہے۔ یہ بیماری بھی ایک چوٹ کا نتیجہ ہے اور پیٹر جانتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ سے طبی علاج سے کہیں زیادہ اس کا دار و مدار میرے روحانی علاج ہی پر ہے۔ آج بھی میں روحانی عمل کے ذریعے پیٹر کی روح کو اس حد تک ضرور مندرجہ کر دوں گا کہ وہ اس بہتر حالت سے باہر نکل آئے اور پھر سے کچھ دن تک اپنی زندگی بنا کسی روحانی درد اور تکلیف کے گزار سکے۔ ہاں البتہ اس کا طبی علاج جاری رہے، تو مجھے امید ہے کہ پیٹر آخر کار اس بیماری سے چھٹکارا پائی لے گا۔“ گرو نے زبردست کچھ پڑھنا شروع کیا اور وقفے وقفے سے اپنی دوا انگلیاں پیٹر کے ماتھے پر رکھ کر پھونکتا رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پیٹر کی حالت میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہال میں لگی برقی اسکرین پر پیٹر کا چہرہ اور لرزتی، دھیرے دھیرے کھلتی پٹکوں کا منظر واضح تھا۔ گرداب اپنی آنکھیں بند کر کے مکمل ارتکاز کرتے ہوئے، بنالاب ہلائے، پیٹر کی روحانی میساگری میں مشغول تھا۔ میں نے آج تک جتنی مرتبہ پیٹر کو دیکھا تھا، جانے کیوں، ہر مرتبہ وہ مجھے کسی سحر کے زیر اثر دکھائی دیا۔ ٹیلی پیٹھی اور چنانازم بھی تو جادو کی قسمیں ہیں۔ چند لمحوں میں گرو نے آنکھیں کھولیں اور پیٹر سے پوچھا۔ ”اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو پیٹر.....؟“ پیٹر مسکرایا، وہ اب مکمل ہوش میں آچکا تھا۔ ”میں پہلے سے بہت بہتر ہوں.....“ ہال نے پیٹر کی آواز سننے ہی تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ گرو نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو ”تم مکمل ہار چکے ہو، لہذا اب ہتھیار ڈال دو۔“ میں نے طبی ماہرین کی ٹیم کو اشارہ کیا، جنہوں نے چند لمحوں میں پیٹر کی تمام تر جسمانی حالت کی رپورٹ بیان کر دی۔ اسکرین پر بھی وہی تفصیلات غفلوں کی صورت میں نمایاں ہونے لگیں۔ پیٹر کو ابھی تک بخار تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ اور اس

کے خون کا دباؤ بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک فوری معائنے کے ذریعے پیٹر کے جسم میں موجود تازہ سفید اور سرخ خلیوں کی تعداد بھی بیان کر دی گئی، جو تازہ خون بناتے جسم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی، مگر وہ کچھ حیرت اور کچھ الجھن سے یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا، لیکن چپ رہا۔

اب وہ آخری بازی کھیلنے کا وقت آچکا تھا، جو میرے یقین کی پہلی اور آخری بنیاد تھی اور جس کے عقیدے کی دیواروں پر کھڑے ہو کر میں نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا، میں نے آنکھیں بند کیں اور میرا دل زور سے جیسے آخری بار دھڑکا، اندر سے آخری فریاد ابھری۔ ”تیرا ہی آسرا ہے میرے مولا، بس تیرا ہی توکل ہے۔ میرے اعمال کو نہ دیکھ، میرے دل میں چھپے کسی منافق اور چور سے درگزر کر، میری ریاکاری اور عیبوں کو صرف نظر کر دے۔ میرے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت کو جلوہ گر کر، اپنی رحمت کے صدقے، پیارے نبی کی رحمت کے صدقے، میرے امتی ہونے کے صدقے اور اپنی اس عظیم الشان شفقت کے صدقے کہ جس کے آگے پوری کائنات کے تمام جرم اور گناہ مل کر بھی ریت کے ایک حقیر ذرے جتنا وزن بھی نہیں رکھتے۔ بس، اسی رحمت کی ایک جھلک دکھا دے، میرے مولا۔ آج تو ہی میرا پردہ رکھ سکتا ہے۔ اپنے اس عاجز، گناہ گار، عاصی، منافق اور ریاکار بندے کا پردہ رکھ لے، رحم کر میرے مولا..... رحم کر.....“ میرا ایک ہاتھ پیٹر کے سر پر تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی کسی تیز بارش کی طرح جاری تھی۔ میں نے سحر کے توڑ کے لیے ہمیشہ سلطان بابا کو سورہ فاتحہ کے بعد چار قل پڑھتے ہوئے سنا تھا اور انہوں نے مجھے بھی خصوصی طور پر یاد کرانے کے بعد، ان چاروں قلوں کا ورد ہر امتحان میں جاری رکھنے کا حکم دیا تھا۔ میرے لب تیزی سے اس وقت ہی یہ ورد و ہر امر ہے تھے..... قل یا ایہا الکافرون..... قل ہو اللہ واحد..... قل اعوذ برب الفلق..... قل اعوذ برب الناس..... جس تیزی سے میرے ہونٹ میرے دل کی آواز پر ملی رہے تھے، اتنی ہی تیزی سے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پیٹر کا جسم ابھی تک مختلف تاروں کے ذریعے ان مشینوں سے جڑا ہوا تھا، جو اس کی حالت کے بل بل کی خبر پورے ہال تک بذریعہ اسکرین پہنچا رہی تھیں۔ بند آنکھوں کے پردے تلے مجھے کسی ڈاکٹر کے چلانے کی آواز آئی۔ ”پیٹر کا دل ڈوب رہا ہے..... اوہ میرے خدا.....“ ہال میں عراسیگی سی پھیل گئی، جسے میں بند آنکھوں کے پردے تلے بھی خوب محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی عورت زور سے چلائی۔ ”اس لڑکے کو روکو، یہ پیٹر کو مار دے گا“ میرے لب مزید تیزی سے ہلنے لگے۔ پیٹر کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ روح کے سفید اور کالے قاتلوں کے درمیان جنگ شدید ہونے لگی۔ ایسی کے رونے کی آوازیں میری سامتیں شکل کر رہی تھیں۔ اس کی ڈوبتی فریاد ابھری۔ ”مجھے تم پر بھروسا ہے عبد اللہ، میں نے پیٹر کو تم پر قربان کیا۔“ میرے جسم کے مساموں سے پسینہ یوں تیزی سے بہہ رہا تھا، جیسے تیز طوفان اور شدید سیلاب کے دوران پانی چھوٹے نکاسوں سے سارے بند توڑ کر بہتا ہے، پھر کوئی ڈاکٹر زور سے چیخا ”اوہ میرے خدا..... بند کرو یہ سب کچھ..... مگر..... ٹھہرو.....“ میری گزارش جاری رہی۔ ”قل یا ایہا الکافرون.....“؛ ”ارے یہ لڑکا تو ابھر رہا ہے.....“؛ ”قل ہو اللہ احد.....“؛ ”پیٹر کو جھٹکے لگ رہے ہیں.....“؛ ”قل اعوذ برب الفلق.....“؛ ”پیٹر کا بخار کم رہا ہے“؛ ”قل اعوذ برب الناس.....“؛ ”پیٹر کا دل معمول پر آ گیا ہے۔ اسے ہوش آ رہا ہے.....“ میری التجا اور ہال کے جھوم کی آوازیں آپس میں گنڈھ ہونے لگیں اور پھر امی زور سے چلائی ”یسوع مسیح کی قسم، پیٹر کے جسم میں سرخ خلیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔“ میں نے بے دم ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

ہال پر سکتہ طاری تھا۔ سب ہی کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں، جہاں پیٹر کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی حالت کی تفصیل جگمگا رہی تھی۔ پیٹر وہیل چیئر پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ خود اس کا جسم بھی پسینے سے تر تھا۔ مگر وہ جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا تھا، پھر سب سے پہلے امی کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ روتے ہوئے بھی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ دور سے میری ماں نے مجھے پکارا ”عبد اللہ.....“ میں نے بھیگی پلکوں سے ان کی جانب دیکھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ منانے سلطان بابا کے دیے ہوئے نام سے مجھے پکارا تھا۔ وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھیں، لیکن انہیں اور پاپا کو شاید اپنے آنسوؤں کا اور اک نہ تھا۔ منانے دور سے مجھے اپنی آنکھیں پونچھنے کا اشارہ کیا، جیسے وہ مجھے رونے سے منع کر رہی ہوں، مگر خود وہ دونوں بھی تو رو رہے تھے اور جب ماں روتی ہے تو دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ چاہے وہ دنیا کے لیے کتنا ہی بڑا اور بہادر کیوں نہ ہو، پھر رفتہ رفتہ ہال کے چھپکے کونوں سے لوگ کھڑے ہونے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں اور پھر کچھ ہی دیر میں پورا ہال اس شور سے گونج رہا تھا۔ آج ایک بار پھر ایک انتہائی گناہ گار بندے کی التجا رو نہیں ہوئی تھی۔ میرے تمام گناہوں اور کم ظرفی کے باوجود اس کی عظیم الشان رحمت نے جوش مارا تھا۔ ڈاکٹر دوڑ دوڑ کر پیٹر کا معائنہ کر رہے تھے اور خود پیٹر بھی بھیگی پلکیں لیے حیرت زدہ سا لنگ کھڑا تھا۔ امی کبھی اسے اپنے ساتھ لپٹاتی اور کبھی میرا سراود دیتا تھا جوتی۔ منانے رہا نہ گیا اور وہ دوڑ کر میرے پاس چلی آئیں۔ پتا بھی ان کی تھلید میں اسٹچ پر چڑھ آئے تھے۔ ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیمروں کے زوایے، فرش کی چکا چوند، ٹی وی اور اخبار کے رپورٹرز کے بڑھتے مائیک، یہ یک وقت سیکڑوں سوال..... لیکن میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اس قابل بھی کب تھا کہ کسی کو کوئی جواب دے سکتا۔ میں تو خود ایک سوال تھا..... سراپا سوال..... آج ایک بار پھر ثابت ہو گیا تھا کہ اس کی رحمت ہمارے گناہوں سے متصل نہیں۔ بس، یقین کی حد لا محدود ہونی چاہے اور رحمت طلب کرتے لمحے دل کو اتنا ہی عاجز، پاک اور منافقت و ریا سے مبرا ہونا چاہیے، جتنا کسی معصوم بچے کا دل دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت ہوتا ہے۔ مگر مجھ جیسے نالی کے کیڑے کے لیے اس کی رحمت کی یہ وسعت تھی، تو پھر اپنے نیک اور پاک باز بندوں کے لیے یہ ابر کس قدر وسیع ہوگا۔ میری عقل اسے ناپنے سے عاجز تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر بہ مشکل ہال کو خاموش رہنے کی التجا کی۔ کافی دیر بعد ٹھوٹھا، میری آنسوؤں سے لرزتی آواز ابھری۔ ”شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ سب تعریفیں اسی اللہ کے لیے ہیں، جو ہم سب کا مالک اور پالنے والا ہے۔ جس نے آج اپنے اس عاجز، گناہ گار اور ناکارہ انسان کی فریاد کی لاج رکھی۔ یہ کسی کی بار ہے اور نہ کسی کی جیت۔ یہ تو بس ایک اشارہ ہے، فلاح کی جانب بڑھنے کا اشارہ..... خود اپنا راستہ طے کرنے کا اشارہ..... یہ کوئی معجزہ ہے، نہ کوئی کرشمہ..... یہ بس اس کی بے کراں رحمت کی چھوٹی سی ایک بوند ہے اور اس کی نعمت ہمیں دن رات یوں تلاش کرتی ہے، جیسے اندھیرے کی تلاش میں روشنی کے جگنو..... اور یہ رحمت اور اس کا کرم کسی ایک انسان کے جسم میں خون کے چند خلیے بڑھ جانے سے کہیں زیادہ اور عظیم تر ہے۔ میرا مذہب صرف سلامتی ہے اور سارے زمانوں کے لیے ہے اور میرا پیغام آپ سب کے لیے، بس یہی رحمت ہے..... خدا ہم سب کو اس رحمت کا سایہ نصیب کرے“ میں اپنی بات ختم کر کے منہا، پتا اور امی کو لیے، اسٹچ سے اتر، تو میرے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ جھوم بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی روتی ہوئی ماں کا سراپے کا نہ دھسے لگا رکھا تھا۔ پتا لوگوں سے درخواست کر کے راستہ بنا رہے تھے۔ اچانک میں اور گرو آسنے سامنے آ گئے۔ اس کی آنکھیں سرخ اور آواز ڈوبی ہوئی تھی۔ ”تم نے میری برسوں کی بنی ساکھ اور محنت برباد کر دی۔ آج تمہیں بتانا ہوگا کہ تم کون ہو.....؟“ میں نے دکھ اور حیرت سے اس گم راہ کو دیکھا، شاید دلوں کو اتنی پردوں سے ڈھک دیے جانے کی ایک مثال میرے سامنے کھڑی تھی، گرو نے پھر اپنا سوال دہرایا، اس مرتبہ اس کا انداز جیجانی تھا۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کون ہو.....؟“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا ”عبد اللہ..... اللہ کا ایک بندہ.....“ گرو اپنی جگہ جم رہا گیا اور ہم اسے بنا کر ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی۔ لندن کی سڑکیں پھر سے دوبارہ برف سے ڈھک چکی تھیں۔ چوراہوں پر میں نے بہت سے لوگوں کو اونچی عمارتوں پر لگی برق اسکرینوں کے نیچے کھڑے ہال میں ہوتی کارروائی پر بحث کرتے دیکھا۔ اسپتال میں پہنچنے سے پہلے، شاید ہماری خبر پہنچ چکی تھی، اسی لیے ڈاکٹر البرٹ سمیت بہت سا عملہ استقبال پر ہماری راہ تک رہا تھا۔ پاپا نے میری بیساکھیاں جانے کہاں پھینک دی تھیں اور میرا سا راہبوہ، اپنے جسم پر سنبالے ہوئے تھے۔ امی کو جیسے پر سے لگے ہوئے تھے اور وہ بھاگ بھاگ کر سب کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہمارے اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل ہی عملے کی ایک نرس تیزی سے چلتی ہوئی میری جانب بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ ”آپ کے ملک سے آپ کے لیے ایک ضروری فیکس آیا ہے۔ اس پر راجٹ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔“ پپا نے جلدی سے کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑائیں۔ ”جس اسپتال میں سلطان بابا داخل ہیں، وہاں سے خبر آئی ہے کہ ان کی حالت ابتر ہے۔ تمہیں جلد از جلد ملک واپس پہنچنے کی تاکید کی گئی ہے۔“ میرا جسم بے جان سا ہونے لگا۔ میں نے پاپا سے التجا کی۔ ”کل صبح کی فلائٹ سے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس بار میری التجا..... نہ کیجیے گا“ پپا نے گہری سی سانس لی اور اگلے روز ہم ڈاکٹر البرٹ کے ہزار منع کرنے کے باوجود ڈیوئیز پورٹ کے ٹرمینل پر موجود تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی میری پہلی نظر، جس شخص پر پڑی، وہ گرو تھا۔

(جاری ہے)



”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب نائل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janguroup.com.pk

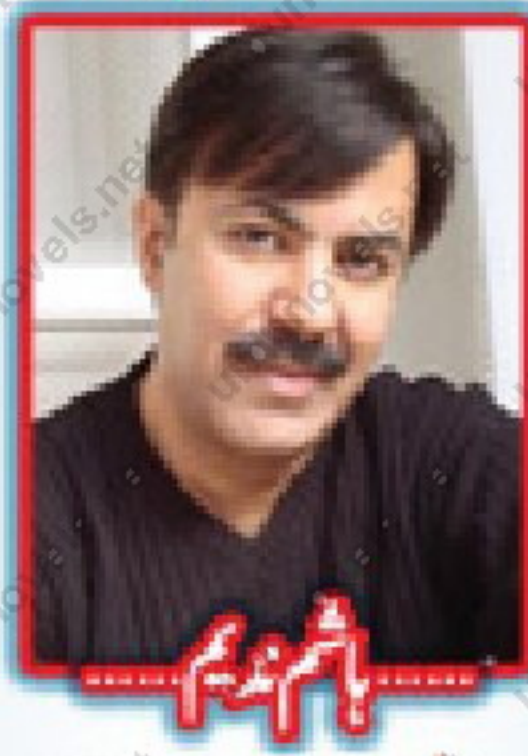
میں گرو کو دیکھ کر چونکا، دوڑ گئیں پس منظر میں مجھے ایسی اور پیٹری جھلک بھی دکھائی دی۔ مجھے الوداع کہنے کے لیے اسپتال کے تمام محفلے سمیت ایک جھوم بے کرائی اس وقت بے تھرڈ وائر پورٹ پر موجود تھا۔ گرو میری جانب بڑھا۔ ”تم نے واپسی میں بہت جلدی دکھائی۔ میرا خیال تھا، تم کچھ دن مزید لندن میں پھاؤ گے، تاکہ اپنی فتح کا لطف لے سکو، لیکن میری توقعات کے برعکس شاید تمہیں ہر فتح کے بعد آگے بڑھ جانے کی عادت ہے۔“ میں نے غور سے گرو کی جانب دیکھا۔ ”تم اپنے ہر گزرتے دن کو انگریزوں کی فتح اور شکست کے پیمانے پر جانچتے رہے، تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے، صرف جیت اور ہار سے بہت بڑھ کر ہے یہ حیات۔ وقت ملے تو کبھی سوچنا۔“ میں آگے بڑھنے لگا لیکن گرو کی ڈوبتی آواز نے میرے قدم پھر روک دیے۔ ”میرے لیے میرے عقیدے کی فتح سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے، لڑکے اور میں آج تمہیں یہی بتانے کے لیے یہاں آیا ہوں کہ میری اور تمہاری آخری جنگ ابھی باقی ہے اور جانتے ہو، یہ جنگ کہاں ہوگی۔ یروشلم میں۔“ میں چونک کر پلٹا ”یروشلم میں.....؟“، ”ہاں، بیت المقدس میں، میرا گیان کہتا ہے کہ تم سے میری اگلی ملاقات فلسطین میں ہوگی۔“ جانے کیوں اس لمحے گرو کی آنکھوں میں مجھے، اس زخمی بھیڑیے کی ایک جھلک دکھائی دی، جس کے بچوں سے عین اس وقت شکار چھین لیا گیا ہو، جب وہ اپنی کچھار میں معصوم بچے کو چیر پھاڑ کرنے کی تیاری میں ہو۔ اور تب ہی مجھے اپنے عقب سے بچنے کی آواز سنائی دی۔ ”ہے عبداللہ..... تم لیٹ ہو رہے ہو، مین“ پیٹر اور ایچی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ دورِ منہ پچا، ڈاکٹر البرٹ اور عملے سے رخصت لے رہے تھے اور ڈاکٹر البرٹ اس آخری لمحے میں پتا کو میرے لیے برقی جانے والی ہدایات کی فہرست دُہرانے میں مصروف تھے۔ ایچی کی سدا برسنے والی آنکھیں آج بھی بن بادل برسات لیے تیار تھیں۔ جانے یہ بھینس اتنا بہت سانس لین پانی کیسے جمع رکھ لیتی ہیں، ان کنوروں میں۔ میں نے پیٹر کا کارڈ درست کیا ”کیسے ہو کھانڈرے لڑکے، اپنا بہت خیال رکھنا اور ایچی کا بھی۔“ پیٹر کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”وہ اب ایچی نہیں رہی، آمنہ بنی چکی ہے۔“ مجھے یوں لگا، جیسے پورا ایئر پورٹ ہی پل بھر میں رنگ و نور کی بارات میں نہا سا گیا ہو۔ ”کیا..... آمنہ.....“ میں ایچی کی جانب پلٹا۔ اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ”ہاں عبداللہ! میں نے سچ کی وہ راہ پالی ہے، جس کی ایک جھلک تم نے گزشتہ رات پورے لندن کو دکھائی تھی۔ دجا کرنا میں ثابت قدم رہوں۔“ میں نے گرو کے چہرے پر کالی آندھی سی چلتی دیکھی، لیکن شاید تقدیر نے ابھی کچھ مزید اندھیرا اس کی تقدیر کے لیے بچا رکھا تھا۔ آمنہ نے پیٹر کا ہاتھ تھاما اور اسے میرے سامنے کھڑا کر دیا۔ ”اور یہ رہا اس راستے کا ایک اور راہی، اس نے اپنے نام کا حق تمہارے لیے بچا رکھا ہے۔ تم ہی اس کا نیا نام تجویز کردو۔ جو اس راہِ حق پر تا عمر اس کے ساتھ رہے۔“ مجھے یوں لگا، جیسے میری روح روشنی سے بھر دی گئی ہو، نور کے جھماکے میرے چہرے سے جھلک کر اس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر بھی منعکس ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا، جیسے میری لندن آمد کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہمارے گرو الوداع کہنے والوں کی دائرہ نما بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور لاؤنج میں لگے اچھیکر، ہمارے جہاز کی روانگی کا آخری اعلان نشر کر رہے تھے۔ میں نے پیٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ گرو کے اندر کا کرب شدید بے چینی کی صورت، اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو، وہ چند لمحوں کے لیے اپنی ٹیلی فون کیس کے ذریعے پورے ایئر پورٹ کی بیجاکی اور سماعت سلب کر لیتا، تاکہ وہ دلوں کے پلٹنے کی کرامت نہ دیکھ سکیں، لیکن آج گرو بے بس تھا کہ جب کراہتیں رونما ہوں، تو تھک پیریں دھری رہ جاتی ہیں۔ پیٹر کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اپنی تھیلی سے نئی جذب کی ”آج میں پیٹر کو وہ نام دیتا ہوں، جس نے میری کایا پلٹ کر رکھ دی۔ عبداللہ، پیٹر آج سے عبداللہ ہے۔“ پورا ایئر پورٹ تالیوں سے گونج اٹھا۔ عبداللہ نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سامنے میرا ایک نیا جہنم کھڑا تھا۔ ایک عبداللہ لندن سے پلٹ رہا تھا اور دوسرا اپنے اندر ایمان کی روشنی لیے فرنگ و یہودی ان گلیوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، جہاں اب اس کے لیے قدم قدم پر گرو جیسے فتنوں کی سازشوں کا جال بچھا تھا۔ میں نے دن وے سے ٹیک آف کرتے جہاز کی کھڑکی سے آخری بار دھند میں لپٹے لندن کو دیکھتے ہوئے یہی دعا کی کہ یا میرے اللہ! ان دونوں بہن بھائی کی ہر مشکل آسان کرنا۔

ایئر ہوسٹس نے اخبار میرے حوالے کیا اور میری ناگوں پر پڑا کھل درست کر کے آگے بڑھ گئی۔ تب ہی میری نظریں انگریزی اخبار کی ایک ذیلی سرخی پر جیسے جم ہی گئیں۔ ”فلسطینی مسلمانوں کے قبلہ اول کے ارد گرد ہوتی غیر قانونی کھدائی کے خلاف یروشلم کی سڑکوں پر مظاہرہ۔۔۔۔۔“ میں نے جلدی سے پوری خبر پر نظر ڈورائی، جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ برسوں سے یہودی کسی نہ کسی بہانے، بیت المقدس کے گرد کھدائی جاری رکھے ہوئے ہیں، جس کا واحد مقصد ”ہیکل سلیمانی“ کی تلاش تھی۔ صیہونیوں کا ایک گروہ، اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ان کی مقدس ترین نشانی یعنی ہیکل سلیمانی اسی قبلہ اول کے نیچے کہیں دفن ہے، لہذا اس تک پہنچنے کا ذریعہ بیت المقدس کی بنیادوں سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ اس تلاش کے لیے انہیں (نعوذ باللہ) بیت المقدس کو ڈھانا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں گرو کی آواز گونجی ”میری اور تمہاری آخری ملاقات بیت المقدس میں ہوگی۔“ جانے کیوں میں نے اس لمحے اپنی رگوں میں ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی محسوس کی اور پھر اس بے چینی نے تب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا، جب تک جہاز کے پہیوں نے میرے شہر کی زمین کو چھو نہیں لیا۔ ایئر پورٹ سے نکلے ہی مجھے سلطان بابا کی فکر نے یوں گھیرا کہ دنیا کی ہر یاد جیسے ذہن سے محو ہو گئی۔ ہم ایئر پورٹ سے سیدھے اسپتال پہنچے، تو پتا چلا کہ سلطان بابا ابھی تک کوئے میں ہیں۔ منہ پچا جانتے تھے کہ میں اب اسپتال سے ٹلنے والا نہیں، لہذا وہ میری ضرورت کا سامان لینے گھر روانہ ہو گئے۔ میرے قدم اب میرا بوجھ سہار سکتے تھے، لیکن کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر البرٹ نے مزید کچھ روز کے لیے مجھے بیساکھی کا سہارا لینے کی تاکید کی تھی، اس لیے میری ایک بیساکھی اب بھی راہ داری میں پڑے بیچ کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی، جہاں میں پچھلے دو گھنٹوں سے بیٹھا ڈاکٹروں کے سلطان بابا کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے والی دیوار میں شیشے کی قید آدم کھڑکیوں کا ایک طویل سلسلہ اس طرح سے جڑا تھا کہ باہر پھیلی ملگی شام کے ڈیرے دھیرے دھیرے، طویل برآمدے میں بھی اترتے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی شام کچھ اس طور ڈھلتی ہے کہ ہمیں اپنے دل سمیت، سب کچھ ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زوال، چاہے بھر پور دن کا ہو یا پھر کسی بھی عروج کا، ہمیشہ اس کر جاتا ہے، میں بھی اس ڈھلتی شام میں اداہی کا گہرا نیلا رنگ اپنی نسلوں میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ اچانک مجھے باہر کی جانب بل کھاتی اسپتال کی مرکزی سڑک پر ایک شناسا چہرہ نظر آیا، کون تھا وہ؟ اچانک ذہن میں دوسرا جھماکا ہوا۔ ارے..... یہ تو انور تھا۔ زہرہ کی مرسدیز کا ڈرائیور۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھڑکنی اور میں بیساکھی بھول بھال لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی جانب لپکا۔ ایک نرس میری دیوانگی دیکھ کر بوکھلا سی گئی اور جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ایک جانب رکھ کر میری بیساکھی میرے حوالے کرنے لگی، لیکن اس وقفے میں انور میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس نیم اندھیری سڑک پر دوڑتے بیساکھی ٹیکتا تقریباً دوڑتا چلا گیا، لیکن آس پاس گزرتے چہروں میں مجھے انور کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے انور کی کو دیکھا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک نئے خیال نے گھٹی بجائی اور میں جلدی سے اسپتال کی پارکنگ کی جانب لپکا، لیکن شاید تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے اور میں توحید کا تقدیر کا مادا تھا، لہذا جس وقت میں زہرہ کی کالی مرسدیز کار کی تلاش میں پارکنگ میں مارا مارا بھٹک رہا تھا، میں نے انور کو سفید رنگ کی ایک بی ایم ڈبلیو میں پارکنگ کے آخری گیٹ سے نکلے دیکھا۔ میرا ہوا میں اٹھا ہاتھ، اٹھاسی رو گیا، لیکن گاڑی مجھ سے اتنی دور تھی کہ میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا اور آواز کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ شاید کار کی کچھلی نشست پر میں نے کسی کا ہولا بھی دیکھا، لیکن کون، شاید وہ زہرہ ہی ہوگی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو بے اختیار نکلے اور پارکنگ کے چمکیلے فرش پر کہیں لڑھک گئے۔ جن آنسوؤں کی قسمت میں کسی دلبر کا شانہ نہیں ہوتا، وہ یونہی خاک میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ کاش میں بھی کسی کی آنکھ کا ایسا ہی ایک فانی آنسو ہوتا۔ جس ستم گر کے لیے میں پوری دنیا کا سفر طے کر کے واپس یہاں تک پہنچا تھا، وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی دور تھی، جتنی میری پہلی نظر کی خطا والے لمحے میں تھی، لیکن ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ جس نے اسے میری خبر لینے سے بھی روک رکھا۔ کہیں ماما کے خدشات سچ تو نہیں تھے۔ ایک دیوانے ہوتے مجنوں کے لیے کون اپنی عمر برباد کرنے کو تیار ہوگا۔ فرزندگی کا یہی تقاضا ہوگا کہ خاموشی سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے اور پھر یہاں سے لندن جاتے وقت تو میری معذوری اور بیساکھیوں کے سہارے کا بھی سارا زمانہ شاید تھا۔ دیوانے کو تو چلتے پھرتے بھی برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سو مجنوں اگر بیساکھیوں پر اپنا وجود گھسیٹتا پھرتا ہو، تو پھر کسی بھی ہوش مند کو اپنے قدم روک ہی لینے چاہئیں، لیکن کیا میری زہرہ بھی ایسی ہی تھی۔ وہ صرف ایک بار مجھے اشارہ تو کرتی، میں خود اپنا یہ بوسیدہ جسم لے کر ہمیشہ کے لیے اس کی دنیا سے کہیں دور چلا جاتا۔ آخر، اس نے ساحر کو اتنا کم زور کیوں جانا۔ جب میں اپنی ہر سانس اس کے نام کر چکا تھا، تو پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنا دم گھونٹنے میں بھلا مجھے کیا مشکل ہوتی۔ صرف ایک بار..... بس ایک بار، وہ اپنے ابو گرا کر، ایک اشارہ تو کرتی۔ میں جس قدر سوچتا رہا، اسی قدر میرے اندر کی ابھی ڈوریں مزید الجھتی گئیں۔ جب تک میں واپس سلطان بابا کے کمرے کے باہر والے برآمدے تک پہنچا، تب تک رات اسپتال کے درود دیوار پر پوری طرح اپنی سیاہی مل چکی تھی۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں۔ روشنی کے چند فانوس اور چند برقی قفے جلا کر اور ان کی باکھل روشنی کے دائروں میں بیٹھ کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ہم نے ”رات“ کو خلست دے دی۔ ہم کبھی نہیں سمجھ پاتے کہ رات تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، تو بھلا ازل کو کیسی خلست۔ میرے اندر کی رات بھی ازل کی تھی۔ میرے اندر کے اندھیرے بھی سدا کے لیے تھے۔ اچانک ایک ڈاکٹر کی آواز اس اندھیرے میں کسی جگہ کی طرح لگی۔ ”آپ کے مریض کو ہوش آ رہا ہے، جلدی کریں۔ یہ ہوش کا وقفہ نہایت عارضی بھی ہو سکتا ہے۔“ میں تیزی سے اٹھا۔ میری بیساکھی چکنے فرش پر پھسلی اور میں گرتے گرتے بچا۔ جس وقت میں سلطان بابا کے کمرے میں داخل ہوا، تب تک وہ اپنی پلکیں دھیرے دھیرے کھول چکے تھے۔ میری بیساکھی پر ان کی نظر پڑی، تو ان کی آنکھوں کا وضو ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ”کیوں ستاتے ہیں آپ مجھے اتنا۔ جلدی سے ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتے۔ محمد اللہ

بہت تھک گیا ہے۔ اسے اور نہ رلائیں۔“ انہیں چپ کراتے کراتے، خود میری آنکھیں برسنے لگیں۔ سلطان بابا کو نگاہت کی وجہ سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ ان کی سرگوشی نثار آواز ابھری۔ ”کیا ہے میاں.....؟ رلاتے بھی خود ہوا اور الزام بھی ہم ہی کو دیتے ہو۔ یاد رہے، جب جب جو جو ہونا ہے، تب تب سوسو ہوتا ہے۔ تمہیں ابھی بہت سی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ ابھی سے اگر عبد اللہ تھک گیا تو پھر.....“ ان کی آواز ڈوب سی گئی۔ میں جوان کے سینے پر سر رکھے رو رہا تھا، گھبرا کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ان کی پلکیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر کو پکارا۔ نرس دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو پھر سے آنکھیں اور مختلف انجیکشنز اور ڈمپ کے کیونولاز سے لا دیا گیا۔ میں بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹا، وہیں کمرے کے ایک کونے میں بے دم سا بیٹھا، یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اگر ہماری روح ہی سب کچھ ہے، تو پھر ہمیں اس نازک اور خستہ جسم کے اندر قید کیوں کر دیا گیا ہے۔ ہمیں روح کی صورت ہی کیوں نہیں بھیجا گیا، اس خالی دنیا میں۔ یہ روز روز اپنوں کے پھٹنے اور ان کے جسم کے تڑپنے کی تکلیف سے تو نجات مل جاتی ہمیں۔ یہ کیسی سزا دے دی تھی قدرت نے ہمیں، اس جسم کی قید کی صورت میں۔ میں پوری رات سلطان بابا کو جسم کی قید کی یہ سزا جھکتے دیکھتا رہا۔ ان کی سانس رک رک کر اور کچھ اس اذیت سے سینے کے پیچے سے نکل رہی تھی کہ خود مجھے اپنے پیچھے ہڑوئی میں بہ یک وقت ہزاروں چھریاں کھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی حلق سے سانس بھی کچھ اس طور نکلتی ہے، جیسے جسم سے روح۔ شاید وہ رات، میری زندگی کی سب سے بھاری رات تھی۔ صبح تک خود میری روح بھی نہ جانے کتنی بار، جسم سے نکل کر واپس اس قید خانے میں داخل ہوئی۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک سلطان بابا کی طبیعت ذرا سی سنبھلی، تو میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ مناجات پڑھنا شروع کیا، میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوائیہ نظروں سے منہ کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مدعا سمجھ گئی، لیکن ان کی نظر جھکتی چلی گئی اور میں ان کے کچھ کہے بنائی سمجھ گیا کہ ان کا زہرہ سے اب تک کوئی رابطہ نہیں ہو پایا۔ اب تو یہ سوال خود ایک بوجھ بننا جا رہا تھا۔ میں نے انوکھا ذکر نہیں کیا۔ ناشتا کیا کرنا تھا، میں مہمانگاہ پر چائے کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اٹھ کر وہیں برآمدے کے بیچ پر، ان کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور نہ جانے کس پل میری آنکھ لگ گئی۔ یہ ماں کی گود بھی کس قدر نشلی ہوتی ہے۔ اندر چاہے کتنا ہی بڑا اور دیکھوں نہ پل رہا ہو، تھپک تھپک کر بن بولوں والی میٹھی لوری سنا کر سلاہی دیتی ہے اور یہ مائیں بھی اپنی گود میں سر رکھے، اپنے لاڈ لے کے لیے کیسی سنگ مرمر کی صورت بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ مجال ہے وہ زہرہ برابر بھی جنہش ہو جائے، ان کے جامد وجود میں۔ میری ماں بھی یونہی اکڑی بیٹھی رہی، تب تک، جب تک میری پلکیں دھیرے دھیرے دوبارہ کھل نہیں گئیں۔

دوپہر ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ مہمانگاہوں پر ان کے بہتے آنسوؤں کی دھاریاں اب بھی موجود تھیں۔ میں نے جلدی سے ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”آپ رو رہی تھیں، اتنی دیر ہو گئی مٹا۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں.....؟“ وہ مسکرا دیں۔ ”بڑی مشکل سے اپنے آنسو تمہاری پلکوں پر گرنے سے روکے رکھے میں نے۔ میرا عبد اللہ برسوں بعد میری گود میں سر رکھ کر سویا تھا، کیسے جگا دیتی۔“ مٹا اب مجھے ساحر کی جگہ عبد اللہ کے نام ہی سے پکارتی تھیں اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے سیاہ نصیب بننے کے کالے مقدروں پر آنسو بہا رہی تھیں۔ سلطان بابا اسی طرح اپنے کمرے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میں شام سے ذرا پہلے کسی شکستہ امید کی آس لیے پارکنگ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے مجھے ایک بیچ پر آکر بیٹھ گیا۔ بھکاریوں کو تو سدراہ میں بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔ چاہے بھیک کا صلہ مشکول میں پڑے یا خالی مشکول لے کر ہی رات گئے گھر واپس لوٹنا پڑے۔ میں بھی اپنے نصیب کا خالی مشکول لیے، تقدیر کی راہ پر بیٹھا، اندر آنے والی ہر گاڑی کو اسی نظر سے دیکھنے لگا، جیسے کوئی گداگر چپکتے سٹوں کو دیکھتا ہے اور پھر میرے نصیب کا مسئلہ چکا، میں یہ جانی انداز میں کھڑا ہو گیا۔ سفید بی ایم ڈبلیو نے لمبا سا موڑ کاٹا اور پارکنگ کی جانب بڑھی۔ میں تیزی سے سڑک کی جانب لپکا، جلدی میں بیساکھی مجھ سے چھوٹ گئی اور میں منہ کے بل ٹھیک اسی گاڑی کے سامنے جا گرا۔ کار نے زور کی بڑیک لگائی، ڈرائیور غصے میں بکتا جھکتا گاڑی سے اترا۔ ”مرنے کا ارادہ ہے کیا؟“ میں نے اپنا خاک آلود چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”مار ہی ڈالو، لیکن دھیان رہے کہ پوری موت دینا۔ تڑپتے ہوئے نہ چھوڑ جانا.....“ انور کو ایک زور کا جھکا لگا۔ وہ تڑپ کر میری جانب لپکا۔ ”ارے..... ساحر بابا..... آپ، یہ کیا حال بنا رکھا ہے، آپ نے.....“ انور نے جلدی سے اپنی جیب سے روٹال نکال کر میرے چہرے سے خاک صاف کی۔ کاش قدرت ایسے روٹال بھی بنا دیتی، جو ہمارے مقدروں پر پڑی گرد بھی جھاڑ سکتے۔ انور نے جلدی سے گاڑی ایک جانب پارک کی اور میرے قریب اسی بیچ پر آ بیٹھا، جہاں میری بیساکھی پڑی ہوئی تھی۔ ”دورو پڑا“ ساحر بابا..... یہ کیا.....؟ آپ ابھی تک.....؟“ میری تنگی زبان پر آ سی گئی ”ہاں..... میں ابھی تک معذور ہوں..... کیا تم بھی اپنی مالکن کی طرح معذوروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، انور.....“ انور نے جلدی سے اپنے ہاتھ جوڑے ”میرے بچے آپ پر قربان ہوں، ساحر بابا! ایسا کیوں کہا آپ نے.....؟“ پھر نہ جانے کیوں، وہ خود ہی کچھ کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔ شاید وہ میرا مدعا سمجھ گیا تھا۔ ”کیا آپ کی زہرہ بی بی سے ملاقات نہیں ہوئی“ میں روٹالسا ہو گیا۔ ”نہیں انور..... تمہاری زہرہ بی بی مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔ کیا تم مجھے اس سے ایک بار ملوا سکتے ہو.....؟“ انور کچھ دیر چپ رہا، پھر اس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اب زہرہ کے ہاں نوکری نہیں کرتا۔ کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے اب وہ شہر کے معروف صنعت کار کمال صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور یہ سفید بی ایم ڈبلیو بھی انہی کی تھی۔ انور یہاں اپنے مالک کے کسی جاننے والے مریض کے لیے کھانا وغیرہ لے کر آتا تھا۔ مجھے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ انور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اس سے زہرہ کا پتا پوچھا، کیوں کہ اس کے پرانے گھر پر سوائے نوکروں کے اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ انور نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ زہرہ کے ابا کا اسی شہر کے مضافات میں ایک اور بہت بڑا بنگلہ ہے، جو برسوں سے بند پڑا تھا، لیکن کچھ عرصے پہلے اچانک نہ جانے کس وجہ سے برسوں سے بند پڑے کوڑھول کر، پھر سے تازہ قلعی پھروائی گئی اور سب ہی گھر والے وہاں منتقل ہو گئے۔ میں نے لمبی سے سانس لی، تب ہی زہرہ کے پرانے گھر پر جہاز فون اٹھانے والا بھی کوئی نہیں بچا۔ انور کی آنکھیں بار بار چمک جاتی تھیں۔ اسے میرے ساحر سے عبد اللہ بننے تک کا پورا احوال معلوم تھا اور یہ انور ہی تھا، جس کی گاڑی دیکھ کر میں پہلی مرتبہ درگاہ پر دکھا تھا۔ میں نے انور سے زہرہ کے دوسرے گھر کا پتا پوچھا، وہ کچھ ہکلا یا ”آپ وہاں نہ جاؤ ساحر بابا..... میرا مطلب ہے، پہلے آپ پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ، پھر جانا۔ ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے فور سے انور کو دیکھا ”تم جانتے ہو انور، میرا جنوں اس مقام پر ہے، جہاں مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے راستوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں جس راستے پر بھی چلوں گا، وہ راستہ خود مجھے زہرہ کی چوکھٹ پر پہنچا دے گا، تم اگر مجھے آزمانا چاہتے ہو، تو یونہی سہی۔“ میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ساحر بابا..... میں آپ کو بھی خوب جانتا ہوں اور آپ کی دیوانگی کو بھی۔ میں نے آپ کی نظر کی تیش سے سخت فولا دو کپھلتے دیکھا ہے، لیکن میری آپ سے التجا ہے کہ ابھی وہاں نہ جاؤ، جہاں تک میری معلومات ہیں، اس ماہ زہرہ بی بی کی منگنی کی تیاری ہے، وہاں پہ..... غرم میاں اسی شہر کے ایک بڑے رئیس کی اکلوتی اولاد ہیں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں، آپ وہاں نہ جائیں، اسی میں شاید سب کی بھلائی ہے۔“ انور نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا، لیکن میرے کانوں میں وہ پہلے ہی ایک ایسا جھلا سیسہ اٹھیل چکا تھا کہ جس کے بعد میری سامعتوں کو اور کچھ سننے کا یارا ہی نہ تھا۔ میں وہیں بیچ پڑھ گیا۔..... (جاری ہے)

اک خاکِ بسرنو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہد گ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



.....ہاشم ندیم.....

”عبداللہ“ ملک کے معروف و مقرب ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سندے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا ڈیمبر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنایا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے مربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk



جاتے جاتے انور میری حالت کے پیشِ نظر مجھے زہرہ کے دوسرے مکان کا پتہ دے گیا، بلکہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ خود مجھے وہاں لے کر جائے گا، لیکن اب بھلا میرا وہاں کیا کام تھا۔ میرا ہم سفر تو اپنی راہ بدل چکا تھا، پھر وہاں جا کر اس کی راہ کھوئی کرنے سے بھلا کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیوں، لیکن مجھے ہمیشہ سے اپنی وفا کی دہائیاں دینے والے بہت برے لگتے تھے، جیسے وہ اپنے کسی انمول جذبے کی توہین کر رہے ہوں۔ وہ وفا ہی کیا، جسے رو کر اور دہائی دے کر بیان کرنا پڑے۔ اگر دنیا کا بازار ہی کھوتا ہے، تو پھر اپنے وفا کے چمکتے ستارے کی بے حرمتی کرنا فضول ہی تو ٹھہرا۔ بے وفا کی سولی چڑھنا ہی مقدر ہو، تو پھر خاموشی سے چپ چاپ یہ پسند اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے۔ بیچ و پکار کر کے اور زمانے بھر کو اپنی رسوائی کا تماشہ دکھا کر خود کو گمِ ظرف ثابت کرنا مجھے کبھی گوارہ نہ تھا، لیکن یہ دل..... ہاں..... یہ دل ہی تو ہمیں عرش سے فرش پر لا بھینکتا ہے۔ ہماری خودداری، انا..... ہمارا سب کچھ، اسی دل کے پاس ہی تو گروی پڑا رہتا ہے، تب ہی یہ ہماری انا اور خودداری کے سووے سر بازار کرتا پھرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے ہم جس ارادے کا اٹل فیصلہ کر کے سکون کا ایک سانس بھی پوری طرح نہیں لے پاتے کہ دوسرے ہی لمحے یہ ہمارا فیصلہ بدل دیتا ہے، ہمیں پھر سے اسی بے چینی اور اسی تڑپ کی نگلی برہمیوں کے جنگل میں لا بھینکتا ہے، جہاں پل پل مرنا بھی ہمارا مقدر ٹھہرتا ہے۔ ہم لوگوں کی اور خود اپنی نظر میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار فیصلے بدلتے ہیں، ارادے باندھتے ہیں، پھر توڑ دیتے ہیں، لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خود اپنا آپ بچ کر بھی، ہم اس دہر کو جیت نہیں سکتے، جس کے لیے ہم اپنے اس دشمن دل کے ہاتھوں اتنی ذلت بھگت رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی پوری رات اسی عذاب سے گزرتا رہا۔ ایک پل میں مجھے یوں محسوس ہوتا کہ آج کے بعد مجھے کبھی زہرہ کی چوکت کا رخ نہیں کرنا چاہیے، پھر دوسرے ہی پل میرا دل کوئی دوسرا پٹا بھینک دیتا۔ ”نہیں، ضرور اس کی کوئی مجبوری رہی ہوگی، ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی۔“ میں پھر تڑپ کر کمرٹ بدلتا۔ ”تو کیا مجھے ایک آخری بار اس سے مل کر سب سوالوں کے جواب نہیں مانگ لینے چاہئیں.....؟ نہیں، اسے تمہاری اتنی فکر ہوتی، تو وہ خود آکر تم سے اپنی مجبوری بیان کر دیتی۔ اب خبر داں، جو تم نے اس جانب کا رخ بھی کیا تو.....“ اسی ادھیڑ بن میں پوری رات گز رہی، لیکن بعض مرتبہ ہمارے رات کے اعدا میرے میں کیے گئے فیصلے، دن کے اجالے کے ساتھ ہی اس تاریکی کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جو صرف رات کا خاصہ ہوتی ہے۔ رات ہمیں بہت بہادر بنا دیتی ہے اور دن پھر سے ہمارے نازک دل کو مسل کر خوف، خدشات اور دوسروں سے بھر دیتا ہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شدید تیز بخار آنے لگا۔ میں ابھی تک سلطان بابا کے کمرے سے ملحق ملاقاتیوں کے کمرے ہی میں لیٹا ہوا تھا۔ پپا نے میری بگڑی حالت دیکھی، تو دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ مرناسنڈی پنیاں پیشانی پر رکھ کر، نہ جانے کیا پڑھ کر پھونکتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہیں۔ انہیں اتنی خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں اپنی اولاد کے لیے کسی خاص وظیفے کی ضرورت بھلا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بس خالی پھونک ہی ماریں، تو ان کی محبت کی مہجراتی تاثیر اولاد کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اگر شام تک میرا بخار نہ اترتا تو مجھے بھی اسپتال میں داخل کر لیا جائے گا۔ شام تک میری حالت تو کیا سنبھلتی، البتہ سلطان بابا کی سانسیں پھر سے اکھڑنے لگیں اور پھر میں نے کچھ شناسا چہروں کو اسپتال کی راہ داری میں چلتے دیکھا۔ ارے..... یہ تو سب سے آگے حاکم بابا تھے، پھر مولوی خضر، پھر عامر، ہاں وہی پہلا عبداللہ، جس نے اپنی گدی مجھے سوچی تھی اور پھر آخر میں نعمان..... وہ جسے، میں عبداللہ کے لقب کے ساتھ ساحلِ والی درگاہ کا انتظام سونپ کر آیا تھا اور بھی کچھ لوگ تھے، لیکن میں ان کے نورانی چہروں میں اپنی پہچان کی کوئی شبیہ تلاش نہیں کر پایا۔ وہ سب لوگ چلتے ہوئے میرے بستر کے گرد جمع ہو گئے، حاکم بابا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میرے جوگی کا سزا بھی ختم نہیں ہوا شاید..... کیا سب ہی بازیاں تم ہی مار جاؤ گے میاں۔“ میں نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن پہلے والے عبداللہ نے میرا کندھا دبا کر مجھے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ میری آواز میں نفابت تھی۔ ”آپ سب ایک ساتھ

..... یہاں کیسے.....؟“ ہمیں سلطان بابا نے یاد کیا تھا۔ ان کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں۔“ میں نے حیرت سے ان سب کی طرف دیکھا۔ ”لیکن سلطان بابا تو..... میرا مطلب ہے کہ کیسا حکم.....؟“ مولوی خضر نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”اب بھی وہی سوال کرنے کی عادت، ہم سلطان بابا کو لے جانے آئے ہیں۔ وہ حجاز مقدس کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں۔ ہم سب انہیں رخصت کرنے آئے ہیں۔“ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ”حجاز مقدس، لیکن وہ تو بہت بیمار ہیں، وہ اتنا لمبا سفر کیسے کریں گے.....؟“ حاکم بابا نے مجھے یوں دیکھا، جیسے کوئی بزرگ کسی ضدی بچے کو دیکھتا ہے اور پھر انہوں نے میرے سر کو یوں تھپتھپایا، جیسے کہہ رہے ہوں کہ ”فکر نہ کرو بچے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نہ جانے ان کے ہاتھوں میں کیسا جادو تھا کہ میں پل بھر ہی میں مدہوش سا ہو گیا۔ مجھ پر غنودگی کا شدید حملہ ہوا اور پلکیں بوجھل ہو کر خود بخود گرتی چلی گئیں۔ تب ہی مجھے یوں لگا، جیسے کوئی ہولے ہولے میرا شانہ ہلا رہا ہو۔ پھر مجھے دور کہیں سے پاپا کی آواز سنائی دی۔ ”آنکھیں کھولو بیٹا، دیکھو شام ڈھل رہی ہے۔“ میں نے نقاہت کے بوجھ تلے دبے پتھوں کو دھیرے دھیرے کھولا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا، مطلب بخارا تر چکا تھا، لیکن وہ جو کچھ میں ابھی چند لمحوں پہلے محسوس کر رہا تھا، وہ سب کیا صرف ایک خواب تھا۔

میں نے جلدی سے ادھر ادھر کمرے میں نظر دوڑائی، لیکن وہاں نہ تو مولوی خضر موجود تھے اور نہ ہی حاکم بابا..... باقی سب لوگ بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پاس بیٹھی منا سے پوچھا کہ کیا ابھی کچھ دیر پہلے یہاں ساحلی درگاہ سے کچھ ملاقاتی آئے تھے.....؟ منا نے ٹلی میں سر ہلا دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیسا خواب تھا۔ اتنے میں نرمی نے آکر بتایا کہ سلطان بابا کی بے ہوشی کا وقت کچھ دیر کے لیے پھر ٹوٹ گیا ہے۔ میں لپک کر ان کے بستر کے قریب پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیمے سے مسکائے۔ میں نے ان کے اشارے پر اپنا کان ان کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔ ان کی آواز بمشکل مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ”ساحرمیاں! اب عارضی جدائی کا وقت ہو چلا ہے۔ میں اپنے حواس کی آخری حد سے پہلے حجاز کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے حاکم اور خضر کو پیغام بھیج دیا ہے۔ بس، اب تم بھی مجھے رخصت کر دو۔“ میری بدحواسی فزوں تر ہو گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ اس حالت میں کیسے جاسکتے ہیں اور پھر جانا طے ہی ہے، تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا، جہاں سلطان بابا، وہیں عبداللہ..... آپ نے اکیلے سفر کا تصور بھی کیسے کر لیا۔؟“ ان کی مسکراہٹ گہری، لیکن آواز دور ہو گئی۔ ”عبداللہ بھلا سلطان سے کب جدا ہوا ہے، لیکن تمہیں یہاں ابھی میرے بہت سے احوالے کام سرانجام دینے ہیں، لہذا تمہارا نہیں رکنا ضروری ہے اور یاد رہے، ثابت قدم رہنا۔ وقت کی آمدھی اپنا آخری زور ضرور لگائے گی، تمہارے قدم اکھاڑنے کی کوشش بھرپور کرے گی، مگر تمہیں جتنے رہنا ہوگا۔ یہی میرا آخری حکم ہے۔“ میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی، لیکن پھر بھی ان کی ہتھیلیوں کی پشت بھٹکتی چلی گئی۔ ”لیکن میں یہاں اکیلا کیسے رہ پاؤں گا۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے چلنا بھی نہیں آتا اور آپ مجھے براہ راست دوڑ کے میدان میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ میں ٹوٹ جاؤں گا آپ کے بنا.....“ ان کی آواز ٹوٹ کر ابھر رہی تھی ”کوئی کبھی، کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا ساحرمیاں! ہم سب گواہیک نہ ایک دن جدا ہو جانا ہے، لیکن اطمینان رکھو، یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی جدائی ہوگی۔ سلطان ہمیشہ تمہارے آس پاس موجود رہے گا۔ اب مسکرا کر میری طرف دیکھو ایک بار۔ تم نے سلطان کو بھی اپنے سحر کے حصار میں لے ہی لیا میاں۔ واقعی پتے ساحر ہو۔“ میں ان کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر خود بھی ان کی دل جوئی کے لیے مسکرا دیا۔ انہوں نے اپنا لرزتا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پھر غنودگی میں ڈوبتے گئے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سلطان بابا نے حجاز جانے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا، ان کی وہ تمنا کیسے پوری ہوگی اور سلطان بابا یہ جدائی کی بات بار بار کیوں کر رہے تھے؟ انہی الجھنوں میں گھرے جانے کب صبح کا سورج بھی نمودار ہو گیا۔ صبح ان کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم کے چہرے پر مایوسی کے اثرات میں صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اسی جھوم میں کسی ڈاکٹر کی سرگوشی سنائی دی۔ ”صرف دماغ ہی کام کر رہا ہے، باقی تمام اعضاء تقریباً کام چھوڑ چکے۔“ میرا جی چاہا کہ میں اس شخص کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پورے اسپتال سے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو انہوں نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں ان کے منہ میں پانی پکا لیا تھا، پھر یہ ڈاکٹر کیا اتنا پشیمان ہوا۔ چار ہاتھ۔ اچانک ایک دوسرا ڈاکٹر ہاتھ میں ایک کانٹہ لیے کمرے میں نمودار ہوا۔ ”سعود یہ اسپتال کا فیکس آ گیا ہے، ڈاکٹر حیات بن حبیب نے مریض کو حجاز منتقل کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اب ان کے علاج کی آخری امید بس ڈاکٹر حیات ہی ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اجازت نامے پر دستخط کون کرے گا؟ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی تو نہیں ہے آس پاس؟“ سب کی نظر میری جانب اٹھ گئی، مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ سلطان بابا کی تمنا پوری ہونے پر محسوس یا ان کے جدا ہونے پر زور زور سے روؤں۔ جانے ڈاکٹر حیات بن حبیب کون تھے اور ان کا سلطان بابا کی بیماری سے کیا تعلق تھا، لیکن اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ سلطان بابا نے اپنے حجاز کے سفر کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ میں نے اجازت نامے پر ان کے شاگرد کے طور پر دستخط کر دیے اور ضمانت نامہ بھی بھردیا کہ کسی بھی ان ہونی کی ذمہ داری میری ہوگی۔ یہ نادان طیب کیا جانیں کہ جوان ہونی ہوئی تھی، وہ تو ہونے جا رہی تھی۔ میرے جسم سے میری روح جدا ہو رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر کوسے کی حالت میں بھی ایسا سکون آمیز تاثر تھا، جیسے گہری نیند سورہے ہوں۔ ایک بار میرے جی میں آئی کہ ان سے کیا وعدہ توڑ دوں اور ان کی حکم عدولی کرتے ہوئے، میں بھی اسی جہاز پر سوار ہو جاؤں، جو ابھی کچھ دیر بعد انہیں لے کر حجاز کی مقدس سرزمین کے لیے روانہ ہونے والا تھا، لیکن ایبویٹنس سے اترتے ہی میرے دل کا یہ چور بھی پکڑا گیا۔

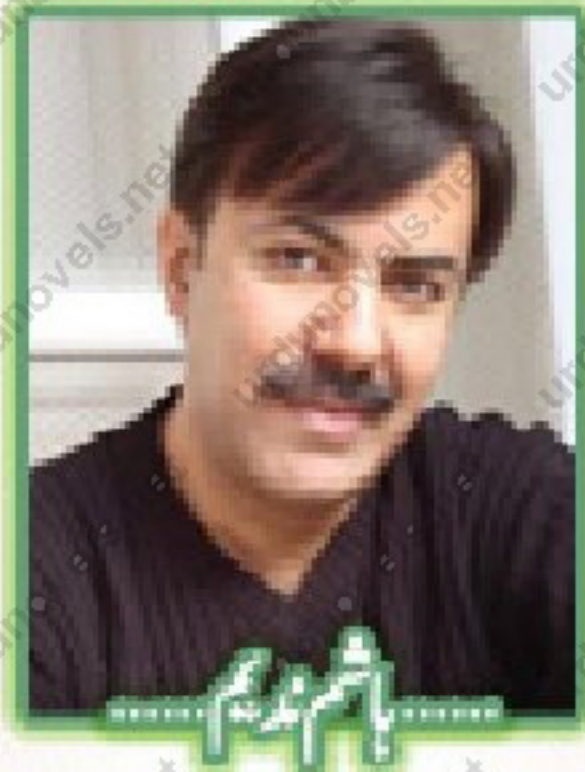
مریضوں کے لیے بنائی گئی خصوصی راہ داری جو اسٹریچر سمیت مریض کو سیدھا رن وے تک لے کر جاتی تھی، اس کے سرے پر مجھے حاکم بابا اور مولوی خضر سمیت اپنے پرانے سب ہی ساتھی انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ اب مجھے ان باتوں پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ شاید رفتہ رفتہ میں خود بھی اسی غیر مرئی نظام کا حصہ بنتا جا رہا تھا، جو سلطان بابا کے ارد گرد اور ان کے معتقدین کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ حاکم بابا، اس سفر میں سلطان بابا کے ہم سفر ہوں گے۔ کتنا بے بس تھا میں اس لمحے، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے۔ سلطان بابا نے خدا کے گھر کی زیارت کرنی تھی اور بس..... وہ جانتے تھے کہ میں انہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا، لہذا انہوں نے چپ سا دھ کر میری ضد کا راستہ ہی بند کر ڈالا تھا۔ حاکم بابا بہت دیر تک مجھے سینے سے لگا کر تھپکتے رہے۔ کچھ سفر، آغاز ہی سے اپنا انجام بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے علاوہ وہاں موجود سب ہی لوگ اس انجام سے واقف ہیں، صرف ایک میں ہی ان سب میں، ایسا کم ظرف تھا، جسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فضا میں ہوائی جہاز کو بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں میرے دل سے ایک خاموش صدا نکلی ”الوداع.....“ کبھی کبھی ہماری زندگی میں اچانک ہی کچھ ایسے غلابیدہ ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنا آپ ہوا میں معلق نظر آتا ہے، کچھ ایسی ہی میری بھی صورت حال تھی۔ مولوی خضر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رات گزارنے کے لیے گھر چلا جاؤں اور جی چاہے تو صبح ساحل والی پرانی درگاہ پر آ جاؤں۔

گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نہ جانے کیوں اسی پرانے ساحر کی یاد نے شہت سے آگھیرا۔ شاید اس یاد کے پیچھے بھی زہرہ کی سلگتی یادوں کے انگاروں کی آج اور وحدت موجود تھی۔ مجھے ساحر اس لیے بھی یاد آیا کہ وہ جھپٹ کر چھین لینے کا عادی تھا، جب کہ اس کے برعکس عبداللہ خود اپنی دنیا لٹتے

دیکھ کر بھی ہونٹ سیے بیٹھا تھا۔ آج اگر وہ پرانا ساحر ہوتا، تو کسی کی مجال تھی کہ وہ یوں اطمینان سے اس کی محبت کو چھین کر لے جاتا۔ وہ زہرہ کے محل کی چوکھٹ پر جا بیٹھتا اور اپنی قضا یا پھر زہرہ کا ہاتھ کوئی ایک سوغات لے کر ہی واپس لوٹا، لیکن یہ کیسا المیہ تھا کہ سلطان بابا نے میرے اندر کے ساحر کی تمام گرہیں عبد اللہ نام کی عاجزی سے باندھ رکھی تھیں۔ جب ہم مجبور اور لاچار انسان بہت زیادہ بے بس ہو جاتے ہیں، تو ہمارا بھگڑا، ہمارے خدا سے شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنے گزشتہ تمام گناہ جائز کئے گئے ہیں اور ہمارے دل میں کہیں دور یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے کہ ہمارا خدا بھی ہمیں اسی طرح منالے، جس طرح کسی بے جا ضد پر رات کو کھانا کھائے بغیر سو جانے پر ہماری ماں مناتی ہے، بالوں میں انگلیاں پھیر کر، کبھی گدگدا کر اور کبھی رو کر..... میں بھی اپنے خدا سے ناراض سا، ہنا کھانا کھائے، بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جب انتقام لینے کے لیے کوئی ہستی میسر نہ ہو، پھر انسان خود اپنے آپ سے انتقام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور میں تو خود ہی اپنے آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ مجھے بھلا کسی اور دشمن کی ضرورت ہی کب تھی، لہذا میں خود ہی اپنی روح کو غم، دکھ اور جلن کی برچھیاں گھونپتا، نہ جانے کب نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا۔ تب ہی مجھے یوں لگا، جیسے سلطان بابا میرے پلکیں موندنے کے انتظار میں میری پتلیوں کے پیچھے کہیں چھپے بیٹھے تھے۔ ان کا لباس سفید اور تسبیح کا رنگ دودھیا تھا۔ دور پس منظر میں سبز گنبد کی ہلکی سی پرچھائیں دکھائی دے رہی تھیں۔ سلطان بابا کے چہرے پر خلاف معمول بے حد تازگی اور بشارت کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے تروتازہ لہجے میں مجھے اسی طرح چھیڑ کر مخاطب کیا، جو اس دنیا میں انہی کا خاصہ تھا۔ ”کیوں میاں! تمہاری خدا سے ضد کی عادت نہ گئی۔ کبھی دو گھڑی کے لیے اپنے اندر کی اس لڑائی کو روک بھی لیا کرو۔ کیوں خود کو ہر مل لبو لہان کیسے رکھتے ہو۔“ میرے لہجے میں شکوہ تھا ”آپ کو اس سے کیا.....؟ آپ تو مجھے تنہا چھوڑ گئے ناں..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس راہ پر آپ کا ہاتھ پڑے بنا، ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتا، پھر بھی آپ مجھے یوں ہی درمیان میں بھٹکتا چھوڑ کر چل دیے۔“ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے ”پرندے کو پرواز سکھانے کے لیے اس کے اپنے شہر کو بھی ایک مرتبہ اسے چوٹی سے نیچے پھینکنا ہی پڑتا ہے، اس نوزائیدہ کے پر کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مخالف ہوا کا دباؤ، تیزی سے قریب آتی چٹانیں، زمین کی کشش اور آندھی جیسی چنگھاڑتی آوازیں، اس شایین بچے کو اپنے پتھ پتھر پھرانے پر مجبور کر ہی دیتی ہیں۔“ میں گڑگڑایا ”لیکن میرے پر تو پہلے ہی کسی کے ناکام عشق نے کاٹ دیے ہیں۔ مجھے پرواز کا سبق کیا دیں گے آپ۔ میری اڑان تو بھرنے سے پہلے ہی کسی کی زہریلی محبت نے گھونٹ دی ہے۔ اب میرا مقدر صرف چوٹی سے نیچے کی جانب جھانکتی قاتل چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا ہے، فنا ہی میرا مقدر ہے، لیکن انہوں کہ میری تباہی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے آپ یہاں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے آخری کا ندھا تو دے جاتے۔“ میری آواز خلا میں بھٹک کر واپس آگئی اور اگلے ہی لمحے میری آنکھ کھل گئی، پھر پوری رات میں کروٹیں ہی بدلتا رہا۔

شاید وہ فجر سے ذرا پہلے کی کوئی ساعت تھی، جب کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میرے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا، میں نے ہڑا کر جلدی سے دروازہ کھولا، تو منہ اور پتا دونوں ہی تاریک چہرے لیے باہر موجود تھے۔ میری سانسیں اٹکنے لگیں، ”کیا ہوا.....؟“ منہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن ان کی آواز اندر ہی گھٹ گئی اور وہ رونے لگیں، میں نے پتا کو پکڑ کر جھنجھوڑا ”خدا کے لیے کچھ تو بولیں.....“ پاپا نے میرے کا ندھے زور سے تھام لیے۔ ”ابھی ابھی درگاہ سے مولوی خضر کا پیغام آیا ہے، سلطان بابا اب ہمارے درمیان نہیں رہے.....“ میری سماعتیں شل ہو گئیں۔ اس کے بعد پتا نہ جانے کیا بولتے رہے، مجھے صرف ان کے لب ملتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید میں وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر گر بھی گیا تھا اور شاید نیچے ڈھتے وقت دروازے کی چوکھٹ میرے سر سے ٹکرائی بھی تھی، کیوں کہ میں نے منہ کو جلدی سے اپنا دوپٹا پھاڑ کر سر پر پٹی باندھے محسوس کیا، لیکن کیا میری نسوں میں ابھی خون کی روانی باقی تھی اور کیا میری سانس ابھی چل رہی تھی، کیا میری بصارت کا ہر رنگ ابھی قائم تھا۔ اگر ایسا تھا، تو پھر میں واقعی بڑا ”کم ظرف“ تھا۔ عقیدت اور محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ میرے حواس بھی ٹھیک اسی لمحے ہمیشہ کے لیے معطل ہو جاتے، جس لمحے میں نے پپا سے وہ لفظ سنے تھے، لیکن حیف، مجھ پر کہ میں اب بھی پپا کو زور زور سے چلاتے ہوئے سن رہا تھا۔ ”ساحر ہوش میں آؤ۔ مولوی خضر نے ظہر کے بعد درگاہ پر سلطان بابا کی غائبانہ نمازہ جنازہ کا پیغام بھیجا ہے اور تمہارے لیے خاص حکم ہے وہاں پہنچنے کا۔ شاید یہ بھی سلطان بابا ہی کی کوئی آخری خواہش ہو۔“ لیکن میں اس وقت کسی حکم کی تعمیل کے قابل ہی کہاں تھا۔ پتا نہیں کب سورج چڑھا اور کب پاپا مجھے دونوں کی مدد سے سنبھالے ہوئے اپنی گاڑی میں درگاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ کچھ ان ہونیاں ایسی ہوتی ہیں، جو ہمیں صاف نظر آتے ہوئے بھی درپیش آنے کے بعد اتنا ہی بڑا اخصابی جھٹکا دے جاتی ہیں، جیسے کہ ہم ان کی حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں کہیں نہ کہیں یہ بات سلطان بابا کے حجاز کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ شاید یہ ان کا آخری سفر ہے، لیکن ان کی قضا کی خبر نے میرے اندر سب ہی کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کی رخصتی کا ٹھیک وہی وقت تھا، جس وقت وہ میرے خواب میں مجھ سے ہم کلام تھے۔ میرے ذہن میں ان کی بات گونجی۔ ”یاد رہے، یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی دوری ہوگی۔“ لیکن میرے لیے تو اب بھی یہ جسم ہی سب کچھ تھا، میں ابھی روح کی حدود تک پہنچا ہی کب تھا۔ ہم درگاہ پہنچے تو حاکم بابا کے علاوہ باقی سب لوگ موجود تھے۔ جانے مجھے کس نے محن میں وہیں بٹھا دیا، جہاں میں کبھی سلطان بابا کے سامنے دوڑا نو ہو کر بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے تو اب بھی ہر جانب وہی نظر آرہے تھے، پھر یہ لوگ ان کی جدائی پر اس قدر افسردہ کیوں بیٹھے تھے۔ مجھے مولوی خضر کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ”سوگ صرف تین دن کا ہوتا ہے“، ”سوگ“ میں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا ”کیسا سوگ.....؟“ آج یہ سب کیسی بھکی باتیں کر رہے تھے۔ ظہر کی نماز شروع ہوئی، تو کسی نے مجھے بھی صف میں لاکھڑا کیا اور پھر فرض نماز کے بعد غائبانہ نماز جنازہ کی نیت بھی باندھ لی گئی۔ کبھی کسی نے زندوں کی نماز جنازہ بھی پڑھی ہے؟ نماز کے بعد درگاہ کے لوگوں کے علاوہ باقی سب لوگ تتر بتر ہو گئے۔ مجھ سے پہلے اور بعد والے عبد اللہ، مولوی خضر اور کچھ ان جان لوگ سر جوڑے، پتا نہیں کیا باتیں کر رہے تھے، پپا میرے قریب ہی خاموش سے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اس درگاہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ جانے کون بتا رہا تھا کہ سلطان بابا کی وصیت کے مطابق انہیں ملکہ کی سرزمین کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ میرا ہی چاہ رہا تھا کہ پپا سے کہوں کہ آج رات ہی ٹکٹ کروالیں۔ میں بابا کے پاس سعودیہ جانا چاہتا ہوں۔ عصر کے بعد مولوی خضر نے حجرے سے ایک کاغذ منگوایا اور دھیرے سے بولے ”سلطان بابا کی وصیت پڑھنے کی اجازت چاہوں گا۔“ پھر مولوی خضر دھیرے دھیرے سلطان بابا کی استعمال کی چیزوں کو ان کی وصیت کے مطابق بانٹتے گئے۔ کسی کے حصے میں تسبیح آئی، تو کسی کو ان کا جائے نماز ملا، کوئی لباس اور لاٹھی کا حق دار ٹھہرا، میرے لیے کچھ نہ بچا۔ مولوی خضر نے وصیت ختم کی ”اور اب میں آخر میں سلطان بابا کی وصیت کے مطابق ان کے جان نشین کا اعلان کرنا چاہوں گا۔ سلطان بابا نے اپنا جان نشین اسے مقرر کیا ہے جو ان کے مطابق، سب سے زیادہ اس اعزاز کا حق دار ہے اور وہ ہیں ساحر میاں..... سلطان بابا کے عبد اللہ.....“ میرے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔

ایک خاک ہسرو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رنگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا



ہاشم ندیم

”عبداللہ“ ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ”سنڈے میگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمبہر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پر یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سر بہت بے بیادوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب کچھ کے ساتھ..... آپ کی مہلت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہِ راحت بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

کچھ لمحوں کے لیے مجھے لگا، جیسے اس ساحلی درگاہ کے آس پاس کا تمام شور بالکل ساکت ہو گیا ہو۔ لہریں اپنی اپنی جگہ تھم کر ڈک گئیں اور فضا میں تیرتے پرنے بھی جامد و معلق ہو گئے۔ میں تو خود اپنی ذات کا جاں نشین بننے کے قابل نہیں تھا، پھر یہ مولوی خضر کیا کہہ گئے تھے؟ ضرور انہیں وصیت نامہ پڑھتے، نظر کا کوئی دھوکا ہوا ہو گا۔ وہ بھی تو شدید غم کے عالم میں تھے اور غم میں انسان کے سامنے لکھی تحریر کے لفظ اکثر آپس میں گنڈا ہو جاتے ہیں، لیکن وہ سب خاموش بیٹھے، میری جانب یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کا فریضہ تمام ہوا اور اب جو بھی کہنا ہے، مجھے کہنا ہے، پر میرے پاس لفظ ہی کہاں بچے تھے؟ میری تمام لغت تو سلطان بابا اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور اب بھلا مجھے الفاظ اور قوتِ گویائی کی ضرورت ہی کب تھی۔ جن کے لیے اظہار کا یہ ذریعہ، یہ فن گنگو میرے اندر چنپ رہا تھا، وہ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کبھی کبھی جب زبان تالو سے چکی رہنا چاہے اور لوگ آپ کو کچھ کہنے پر مجبور کریں، تو یہ لفظ بھی کتاب یا ابو جہ بن جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ بوجھ ڈھونڈنے کی ہر ممکن سعی کی، لیکن ہونٹوں سے الفاظ تو نہ نکل پائے، البتہ آنکھوں سے دو مونے آنسو نکل کر درگاہ کے چمکنے فرش پر سجدہ دریز ہو گئے۔ مولوی خضر جلدی سے میری جانب لپکے ”ارے..... یہ کیا عبداللہ میاں..... یہ آنسو.....؟“ بس پھر کیا تھا۔ سیلاب کا راستہ روکنے والے سب ہی باندھ خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ میں یوں پلک پلک کر رہا تھا، جیسے کوئی معصوم بچہ غیلے میں اپنوں سے بچھڑ کر تب روتا ہے، جب شام ڈھلنے لگتی ہے۔ آس پاس کے تمام ٹھو لے اور ٹھیلے سنسان ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے چھانا اندھیرا اُسے ڈوانے لگتا ہے۔ درگاہ پر بھی شام ڈھل رہی تھی اور میری آنکھوں کا ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ مجھے پُپ کراتے کراتے سب ہی مڑ حال ہونے لگے اور پتا تو باقاعدہ خود بھی رو پڑے۔ شاید ہم انسانوں کے آنسوؤں کا آپس میں کچھ باہمی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تب ہی ہم اکثر کسی دوسرے کو روتا دیکھ کر خود بھی رو پڑتے ہیں اور کبھی کبھی تو ہمارا دونا ان دوسرے باوقار اور سنجیدہ طبع لوگوں کے لیے بھی ایک نعمت ثابت ہوتا ہے، جو دوسروں کے سامنے مرنے میں پہل سے ہچکچاتے ہیں۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ مغرب کے بعد پپا نے مولوی خضر سے مجھے گھر لے جانے کی اجازت طلب کی۔ مولوی خضر نے میری جانب یوں دیکھا، جیسے وہ مجھ سے میری رائے جاننا چاہتے ہوں، لیکن اب مجھے زمان و مکان سے کوئی دلی جھپی نہیں تھی۔ میں پتھر ہو چکا تھا اور پتھر کو اس بات سے کیا غرض کہ وہ کسی درگاہ کی دیوار میں بجوار ہے یا پھر کسی مکان کی طاق میں..... البتہ پپا اس کپے سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ غم سے عارضی افراد کا بہترین ذریعہ نیند ہے۔ سو انہوں نے گھر پہنچتے ہی نہ جانے کس بہانے، مجھے نیند کی کوئی دوا پلا دی، لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ اب نیند میرے لیے دوسری بیداری بن چکی تھی۔ ایک جہاں کی طرف سے آنکھیں بند ہونے لگتیں، تو دوسرا جہاں نظروں کے سامنے کھل جاتا تھا، لہذا..... آنکھیں بند کرتے ہی میری رُوح کے بندھ کوڑ کھلنے لگے۔ میں نے خود کو کسی سیلا دی محفل میں پایا۔ سب ہی پُپ چاپ و رد میں مشغول تھے۔ میری آنکھیں سلطان بابا کو ڈھونڈتی رہیں، پر وہ مجھے وہاں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے قریب بیٹھے ایک بزرگ سے ان کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ پر ہلکی سی سرزنش بھری نظر بھی ڈالی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سب لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، لیکن میں بھی ان ہی کے ساتھ فرش پر بھی چٹائی پر بیٹھ گیا اور خود بھی باقی سب حاضرین کی تقلید میں آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھیک اُسی لمحے میری آنکھ کھل گئی، باہر دن چڑھ کر اترنے کے قریب تھا۔ شاید عصر سے کچھ پہلے کا وقت ہو گا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گویا میں پوری رات اور سارا دن موتا رہا۔ عام طور پر میں قضا نمازوں کو بھی بہت پابندی سے ادا کرتا تھا، لیکن اس روز نہ جانے کیوں عصر کی فرض نماز میں بھی میرا دھیان کسی اور جانب ہی بٹا رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے آج تک اپنی ایک بھی نماز مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی ہو۔ ہر بار کوئی سوداؤ بہن میں سایا ہی رہا۔ کبھی نفس اور کبھی جنس..... بس اتنا ہی محدود دائرہ تھا میرا۔ پھر مغرب ہوئی اور پھر عشاء، لیکن میں اپنے کمرے ہی میں بند رہا۔ مہاتمن چار بار کمرے میں جھانک کر واپس چلی گئیں، لیکن مجھے باہر نکلنے کا سوچ گری دھشت ہونے لگتی تھی۔

شاید وہ تیسرا دن تھا، جب میرے بعد والا عبداللہ (نعمان) مجھے لینے کے لیے آن پہنچا۔ مولوی خضر نے بلاوا بھیجا تھا۔ میں درگاہ نہیں جانا چاہتا تھا، مگر مولوی خضر کی بات ثانی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ میں پُپ چاپ درگاہ چلا آیا۔ صحن میں بہت سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ سب ہی میری آمد پر یوں چونکے اور مجھ سے کچھ ایسا خاص برتاؤ کیا گیا کہ مجھے الجھن ہی ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے عصر کے بعد دعا ہوئی، تو کچھ تھائی میسر آئی۔ میں ڈھلتی دھوپ کے ایک شری، لیکن نامکمل ٹکڑے میں دیوار کی منڈیر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ شاید دھوپ بھی زندگی کی علامت ہوتی ہے، تب ہی وہ ہم سے اس قدر جلد روٹھ جاتی ہے، خاص طور پر عصر کے بعد کی دھوپ تو کچھ یوں لپکتی جھپکتی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے، جیسے اس نے شام کے اندھیرے سے کچھ وعدے جوڑ رکھے ہوں، کچھ قسمیں باندھ رکھی ہوں۔ میں بھی اُسی عصر کے بعد کی دھوپ کو گاؤں کی اس الہی طرح تیزی سے پلٹتے دیکھ رہا تھا، جسے کنویں کی منڈیر پر پانی بھرنے کے بہانے اپنے محبوب کے انتظار میں شام پڑ گئی ہو۔ اس کے محبوب کے گھوڑے کی ناپیں کنویں تک آتی چمکندہ پرنے لگی ہیں اور اب وہ بے چاری اس سوچ میں تیز قدموں سے گھروٹ رہی ہو کہ گھر کے آگن میں ٹپلتے بائل کو یوں اندھیرے تک باہر رہنے کا کیا جواز بتائے گی۔ میں نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا کہ قریب ہی کسی کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ”نکل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں..... لیکن میں نے سوچا کہ گھر واپس پلٹنے سے پہلے آپ سے دعا

لیتا جاؤں۔“ میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ مناسب قیمتی لباس میں ایک ادھیر عمر شخص مودب سا سر جھکائے، میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے ہلکے سے داغ تھے اور ماتھے سے بال کافی حد تک اڑے ہوئے تھے۔ گہرا سانولا رنگ اور چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھیں۔ میں نے اپنی بے زاری چھپانے کی پوری کوشش کی اور مولوی بھڑکی کی جانب اشارہ کیا، جو صحن میں موجود سڑک پر نیار ہڑانے میں مشغول تھے۔ ”آپ ان صاحب سے مل لیں۔ وہ میرے استاد بھی ہیں اور وہی اس درگاہ میں اس وقت سب سے معرا اور قابل احترام شخصیت ہیں۔ وہ آپ کے لیے ضرور دعا کریں گے، میں کسی کو وعادینے کے قابل نہیں۔ مجھے تو خود آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ وہ شخص اپنی جگہ جمادہا۔ ”جی..... میں پہلے ان ہی مولانا کے پاس گیا تھا، لیکن انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ دیکھیے، آپ مجھے مالے گانہیں۔ میں بڑی دور سے یہاں تک آیا ہوں۔“ میں نے حیرت سے پہلے اُسے اور پھر مولوی بھڑکی کی جانب دیکھا۔ بھلا انہوں نے یہ ذمہ داری مجھ پر کیوں ڈالی۔ بہر حال، مجھے وہ شخص ملتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اس سے پوچھا ”آپ ضد کرتے ہیں تو یوں ہی کہیں، لیکن آپ کے لیے کیا دعا کروں، کوئی خاص حاجت.....؟“ وہ شخص کچھ ہچکچایا ”کچھ عجیب سی بات ہے، لیکن اب بے چینی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ کی دھول چاٹ چکا۔ اب آخر کار کسی نے اس درگاہ کا ہتھ دیا ہے کہ یہاں میرا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔“ میں نے دل میں سوچا کہ جس ہستی پر خدا کا یہ خاص کرم تھا، وہ تو خود اس کی جانب پلٹ چکی۔ اب کون بھلا وہ دعائے خاص کرے گا تمہارے لیے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اس نے اپنا گلہ خرا کیا اور بہ مشکل بولا ”میرا مرض بڑا عجیب ہے جناب۔ میں ”فریفتہ“ ہوں۔“ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ ”جی.....؟“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”میرا مطلب ہے، میں ”فریفتہ صفت“ ہوں۔“ میں اب بھی نہیں سمجھا۔ ”اُس نے ایک گہری سی سانس لی۔“ جی مجھے اندازہ ہے۔“ واصل یہ بات ہی اتنی الجھی ہوئی ہے کہ میں کبھی کسی کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پایا۔ میرا نام بختیار ہے، لیکن میری ”بخت“ سے کبھی یاری نہیں رہی۔ ہوش سنبھالا تو متوسط طبقے کے ایک خاندان کا عام سا بچہ تھا، نین نقش بھی عام سے تھی، لیکن تب یہ چیچک کے داغ میرے چہرے کی زینت نہیں بنے تھے۔ یہ جوانی کا تھد ہے، البتہ رنگ تب بھی سانولا ہی تھا۔ میری طرح کے ہزاروں، لاکھوں بچے اس ملک کے گھرانوں میں پل بڑھ کر جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ بے حد اور شدید حساسیت بھی، شاید ہی کبھی کسی کی راہ کی دیوار بنی ہو یا شاید متوسط طبقے کے شب و روز ایسے بچوں سے خود بخود حساسیت چھین لیتے ہیں، لیکن قدرت نے میرے اندر کچھ اور ہی جذبے دکھائے تھے۔ بے حد شرمیلا ہونے کے باوجود میں قدرت کی ہر خوب صورتی کو پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ نویں دسویں جماعت میں ٹونے پھوٹے شعر بھی کہنا شروع کر دیے اور پھر انٹر کے بعد مجھے ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ مجھے عورت کی خوب صورتی اپنی جانب عام انسانوں سے کئی درجے زیادہ کھینچتی اور متاثر کرتی ہے۔ میرا دل خوب صورت چہروں کے ارد گرد گھٹنوں منڈلانے کے لیے پھل پھل جاتا تھا، لیکن المیہ یہ تھا کہ میری حدود درجہ عام، بلکہ کسی حد تک بھڑکی شخصیت کے لیے میری ہم عمر لڑکیوں اور آس پاس کی دیگر خواتین کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لڑکیاں پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنستیں اور میری بُر دباری اور باوقار بنے رہنے کی کوششوں پر آوازے کسے جاتے۔ کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کا دور شروع ہوا، تو میں ہر جم ادب کا منتظم منتخب ہو گیا، تب تک میری شخصیت کے برعکس میری شاعری کافی نکھر چکی تھی۔ اردو شعبے میں میری کافی دھماک بیٹھ گئی تھی اور جو نیر لڑکیاں میرے لفظوں کی وجہ سے میرا احترام بھی کرنے لگی تھیں، لیکن یہ ساری عزت میرے شعروں کی مرہون منت تھی۔ خود میرا وجود ان کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، میرے اندر چاہے جانے کی خواہش امرتیل کی طرح پھیلتی چلی گئی، لیکن پوری یونیورسٹی میں کوئی بھی ایسی لڑکی نہ تھی، جس نے کبھی نظر بھر کر بھی میری جانب دیکھا ہو۔ ان ہی میں میری نکاس کی ٹھل لالہ بھی تھی۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی، جس کی ایک جھلک پانے کے لیے اعلیٰ طبقے کے سب ہی لڑکے اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں صبح سویرے اس کی راہ میں پلکیں بچھائے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ میرا دل بھی ٹھل لالہ کے لیے اُسی ہڈت سے دھڑکتا تھا، لیکن اُسے متاثر کرنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس، نہ شکل و صورت، نہ روپا پیسا اور نہ ہی کوئی منفرد اور بھرپور صلاحیت۔ بد قسمتی سے اُسے شعر و ادب کی محفلوں سے بھی کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا، لہذا یونیورسٹی کے چار برسوں میں چار مرتبہ بھی میری اس سے بات نہیں ہو پائی، لیکن میرا وحشی دل مزید وحشی ہوتا گیا اور نتیجتاً مجھے جاگتے میں بھی خواب دیکھتے رہنے کی لت پڑ گئی۔ میرے خواب عموماً کچھ اس طرح کے ہوتے کہ میرے ارد گرد خوب صورت چہروں کا جم لگتا ہے اور میں ان سب کی نظروں میں محبوب ہوں۔ کبھی میں خود کو کسی انتہائی شعلہ بیان مقرر کے روپ میں دیکھتا، جو یونیورسٹی کے اسٹیج پر سارے ہال کو انقلابی تقریروں سے گرم رہا ہے، تو کبھی میں پوری محفل ٹوٹ لینے والا موسیقار یا گلوکار بن جاتا اور کبھی فوجی یا سپاہی، جو سب کا ہیرو ہوتا، لیکن میری ہر ہم جوئی کا انعام صرف مہرہ رخوں کا کوئی جھرمٹ ہوتا۔ میرے خوابوں میں خوب صورت خواتین مجھ سے صرف چند لفظ سننے کے لیے مری جاتیں اور میں سب پر ایک نگاہ غلط ڈال کر مسکراتا ہوا محفل سے گزر جاتا۔ دل چپ بات یہ ہے کہ میں کبھی کسی ایک چہرے یا کسی ایک ٹھل رخ کے لیے ہیرو نہ بنتا، بلکہ بہ یک وقت کئی نازینینائیں میری مدح سرائی میں مشغول رہتیں، لیکن خواب تو پھر خواب ہوتے ہیں۔ میں جب ان خوابوں کے سحر سے باہر لگتا، تو میری عام سی شخصیت میرا منہ چڑاتی۔ ادیب اور مصنف عورت کی کم صورتی اور اس سے متعلق المیوں کا ذکر تو اپنے افسانوں میں بار بار کرتے ہیں، لیکن کسی مری کی کم تر شخصیت اور اس سے بچوے دکھوں کا آج تک کسی نے بیان کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اور مرد بھی کیسا..... مجھ جیسا ”فریفتہ صفت“..... جسے ہر لمحہ کسی پری رخ کے عارض پر پھیلتے کمال کے گلابی پن کی ضرورت رہتی تھی۔ یاد رہے کہ میں بدکردار ہرگز نہ تھا۔ مجھے تو بس خوب صورتی کے ایک احساس کی ضرورت تھی، جو ہر لمحہ میرے چارٹو پھیلا رہے۔ شاید میرے اندر محبوب بننے کی تمنا اپنی آخری حدوں سے بھی کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ پراسوس، میں کبھی کسی کا محبوب نہ بن سکا۔ میں ہمیشہ اُن تقاریب میں سب سے پہلے پہنچ جاتا، جہاں کسی بھی ایسے چہرے کی ایک جھلک نظر آنے کی بھی امید ہوتی۔ بظاہر میں لا پرواہ سا بنا اس محفل میں ٹھہرا رہتا، پر میری نظریں اپنا مخصوص طواف جاری رکھتیں۔ مجھے ہر دم یہی خوش فہمی گھیرے رکھتی کہ محفل کا سب سے حسین چہرہ میری کسی بات سے متاثر ضرور ہوگا اور قدرت میرے لیے ایسا کوئی موقع ضرور تراشے گی، جب خود اس مہرہ جہیں کے گھر والے مجھے اپنے ہاں کسی تقریب میں مدعو کریں گے۔ شاید کوئی مجھے اردو شاعری میں مدد کے لیے شام کی چائے پر بلا لے، لیکن افسوس میرا کوئی خواب کبھی پورا نہ ہوسکا اور آخر کار گھر والوں کی پسند سے میری شادی ہو گئی۔ میں کسی کا محبوب بننے سے پہلے ہی شوہر بن گیا۔ میری بیوی ایک سادہ اور ٹیک دل عورت تھی۔ پر، وہ مجھے محبوب کے درجے پر فائز ہی نہ کر سکی۔ شادی کے ایک سال بعد جب میں پہلی بار اس کے ساتھ چند دن اس کے گاؤں میں رہنے کے لیے گیا، تو یہ چیچک کے داغوں کا تھد میرا منتظر تھا۔ بیماری کے بعد میرا دل کچھ یوں اچاٹ ہوا کہ میں نے روزگار کے لیے وہی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ شاید اس کوشش کے پیچھے بھی کہیں میری فریفتگی ہی کا دخل تھا۔ مجھے امید تھی کہ پیسا ہاتھ آنے کے بعد میں ضرور چاہا جاؤں گا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ پیسا مرد کی تمام بد صورتیاں چھپا لیتا ہے۔ دس سال میں نے دن رات محلا کر دینی کے رنگ زاروں میں اپنا پسینہ بہایا اور جب میں واپس ٹلک لونا تو ایک رئیس تھا۔ میں نے آتے ہی شہر کی مختلف سماجی سرگرمیوں میں دل کھول کر پیسا خرچ کیا اور پھر چند ہفتوں ہی میں، میں کئی ادبی و سماجی تنظیموں کا

اعزازی صدر بن چکا تھا۔ شہری کوئی تقریب میری شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، لیکن میرا مسئلہ اب بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ میں معاشرے میں زبردستی کی عزت تو کسی نہ کسی طور کم چکا تھا، لیکن محبت کی ایک نظر اب بھی میری واحد تلاش تھی۔ میں اپنی ساری دولت دے کر بھی صرف اس ایک ستائش بھری نظر کا طالب تھا، جو مجھے چند لمحوں کے لیے ہی محبوبیت کے مقام تک پہنچا دیتی۔ میں ہوائی جہاز کا سفر اس امید پر کرتا کہ شاید میری ساتھ والی لاشٹ پر کوئی حسینہ بیٹھی مل جائے۔ شاید کوئی ایئر ہوسٹس ہی میری طرف نظر بھر کے دیکھ لے۔ اسپتال میں نزلے و زکام کے لیے بھی بہترین کمرہ مخصوص کر دالینا کہ شاید میری طبعیت یا نرس ہی وہ چہرہ ہو، جس کے التفات کے انتظار میں میری ساری عمر گزرتی۔ میں جان بوجھ کر اپنے ارد گرد کسی نہ کسی بہانے حسین چہروں کا جھگڑا لگائے رکھتا، مگر مجھے کبھی بھی اپنے دل کے اندر کسی پائل کی نازک جھکارسنائی نہ دی۔ کچھ میرے قریب بھی آئیں، مگر وہ صرف روپے کی بچاؤ نہیں تھیں۔۔۔۔۔۔

میرا بیٹا بھی میری ادھوری اور بد صورت شخصیت کو مکمل نہ کر سکا۔ میں سدا سنائول ہی رہا، ابھی سا جن نہ بن سکا اور آج زندگی کی 68 خزاںیں جھیلنے کے بعد بھی میں یہاں اُس دعا کی امید میں کھڑا ہوں، جو میرے وحشی سن کو سکون کا ایک لمحہ ہی نصیب کر دے۔ میں بے حد غمگین ہوں۔ میرے قدم تھک کر شل ہو چکے ہیں۔ اب یہ ”فریڈ پین“ میری جان کا روگ بن چکا ہے۔ یہ دینا، بد صورت لوگوں کے لیے بڑی بد صورت جگہ ہے جناب۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر قدرت نے میرا سن اتنا کوئل ہی بنانا تھا، تو میری شخصیت کو بھی اتنا ہی مختلف کیوں نہ بنایا۔۔۔۔۔؟ قدرت نے میرے وجود کے سب ہی تاروں کو گر سُر اور سوتیلی کی مدھرتانوں سے جوڑ کر نوسوں میں عجب بیجاں خیز خواب دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی، تو پھر بے وحشی شخصیت کا تال میل بھی کیوں درست نہ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری تہا ہی میں، دل کے ساتھ ساتھ میری سماعت کا بھی برابر کا تصور ہے۔ جانے یہ سیلوڈی ایک ہی لمحے میں میرے اندر سب کچھ اٹھل پھٹل کیسے کر دیتی ہے۔ میں پل بھر میں مکروہ بھکاری سے حسین شہزادہ بن جاتا ہوں۔ ساری قدرت میرے سامنے دوڑا نوں ہو جاتی ہے۔ پر یاں رقص کرتی ہیں اور میرے رُوم رُوم سے فریفتگی جھلکنے لگ جاتی ہے۔ آپ ضرور مجھے کوئی دیوانہ سمجھ رہے ہوں گے، لیکن یقین کریں کہ میں نے ابھی اپنی دیوانگی کا دین فی صد بھی آپ کو نہیں سنایا۔ میں اپنے اندر کے پرستان اور باہر کی بے رحم اور کانٹوں بھری دنیا کے درمیان پس کر رہ گیا ہوں۔ میں اپنے اندر راجا اندر اور باہر صرف ایک ٹو در ہوں، جس کے لیے کسی نازنین کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔۔؟ بختیار اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔ سچ ہے، یہ تمھیں تو ساری زندگی کی تھی۔ اندھیرا داخل چکا تھا اور بختیار کی آنکھوں میں جھلکنے والے وہ آنسو اس لمحے مجھے ان دو بے مراد چراغوں کی طرح دکھائی دے، جو کسی گم نام کے ویران مزار پر، کوئی ترس کھا کر جلا گیا ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس تھکے ہوئے، معصوم اور اندر سے بے انتہا خوب صورت شخص کے آنسو پونچھ کر اسے بتاؤں کہ اس دنیا میں کون ہے، جو فریڈ نہیں ہے، کوئی عورت پر فریڈ ہے، تو کوئی جاہ و ہشم پر، کسی کو دولت کی فریفتگی ہے، تو کوئی سونے کے محلوں پر شیدا ہے۔ شاید انسان پیدا ہی ”فریڈ صفت“ ہوتا ہے۔ پھر جن کی ظاہری صورت اور شخصیت دنیا کے معیار پر پوری اترتی ہے، انہیں تو اپنی فریفتگی کا صلہ مل جاتا ہے اور کچھ بختیار جیسے سیاہ نصیب بھی ہوتے ہیں، جو اس تڑپ اور تک کی کانٹوں بھری خلش اور لا حاصل پن کے ساتھ ہی پوری زندگی جیتتے ہیں۔ میں نے مزید کچھ کہے بنا، دعا کے لیے ہاتھ تو اٹھا دیے، لیکن سچ یہ ہے کہ میرے پاس دعا کے لیے لفظ تھے ہی نہیں۔ شاید کچھ دعاؤں کے لیے لفظ ضروری نہیں ہوتے۔

بختیار نے پلٹنے سے پہلے مجھ سے کہا کہ وہ اگلے بیٹے کو بارہ یہاں آئے گا۔ اس کے جاتے ہی مجھے مہارگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آتی ہوئی دکھائی دیں، شاید وہ زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی میرے اور پیا کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھیں، لیکن نہ جانے کیوں آج مجھے ان کا زرد چہرہ کچھ اور ہی داستان سناتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پیا بھی میرے گھٹنوں کے قریب آ بیٹھے۔ شاید وہ بھی مہارگاہ کے مضطرب چہرے کی کوئی تحریر پڑھ چکے تھے۔ بہت دیر کے بعد وہ کچھ بولنے کی ہمت جمع کر پائیں۔ ”ساحر۔۔۔۔۔ آج میری زہرہ سے ملاقات ہوئی تھی۔۔۔۔۔“ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اتنا سن کر ہی میرا دم نکل جاتا، لیکن آج میرے لیے میں ایک عجیب سی بے گانگی تھی۔ ”اچھا۔۔۔۔۔؟“ ”مما کچھ دیر چپ رہیں، پھر انہوں نے بتایا کہ زہرہ کی پرانی مسائی کو خصوصی تاکید کر چکی تھیں کہ جب کبھی زہرہ کے گھر والے یا وہ خود اپنے پرانے گھر کسی بھی کام سے آئیں، تو ماما کو ضرور اطلاع کر دی جائے۔ یہ بات بھی مسائی ہی نے ماما کو بتائی تھی کہ زہرہ کے گھر والے اپنے کچھ ضروری سامان سمیت کچھ عرصے سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہیں۔ آج شام اچانک ہی ماما کو اس مسائی کا فون آ گیا کہ اس نے ابھی ابھی ڈائریور سمیت زہرہ کی گاڑی کو ان کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ ماما ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گھر سے نکل پڑیں اور جب وہ وہاں پہنچیں، تو زہرہ واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ ماما کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، لیکن وہ پوری تعظیم سے ان سے ملی۔ البتہ ماما کے تمام سوالوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ ساحر کو اس کا بس ایک پیغام پہنچا دیا جائے کہ ”شاید قدرت کو ہمارا ملن منظور نہیں اور وہ قدرت کا یہ فیصلہ منظور کر چکی ہے۔ سو، بھتر ہو گا کہ ساحر بھی اس ان ہونی کو تسلیم کر لے۔ شاید یہی ہمارا نصیب تھا۔“ لوگ کتنی آسانی سے اپنا کیا دھرا نصیب اور قدرت کی سیاهی سے جوڑ دیتے ہیں؟ ماما اس کے سامنے بہت روئیں اور گورگرائیں کہ وہ بس ایک باہری مجھ سے مل لے، تاکہ ساحر کے وحشی سن کو کچھ تو سکون نصیب ہو، لیکن زہرہ نے بیٹگی آنکھوں سمیت ماما کی یہ درخواست بھی نام منظور کر دی۔ میرا جی چاہا کہ میں ماما کو اس کی بے درخی کی اصل وجہ بھی بتا دوں کہ اس کے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی تہندی رہنے والی ہے، لہذا اُسے اب ہمارے بے رنگ آنسوؤں سے بھلا کیا غرض ہو سکتی ہے؟ ماما اپنی بات ختم کر کے بھٹوٹ بھٹوٹ کر رو پڑیں اور میں یوں ہی اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا، پل بھر میں زہرہ نے مجھے بھی بختیار بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں ایک لمحے ہی میں شہزادے سے مکروہ بھکاری بن گیا ہوں اور ساری دنیا مجھے حقارت سے دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہے۔ میں نے پیا کے کوٹ کی جیب میں انکا چین لٹکالا اور قریب پڑے ایک کاغذ پر اپنی زندگی کی پہلی تحریک کا عنوان لکھ ڈالا۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے۔۔۔۔۔؟“ پتا نہیں، یہ نظم تھی، سنز تھی یا پھر صرف چند بھٹے ہوئے خیالات، لیکن میں لکھتا چلا گیا۔

سنو۔۔۔۔۔

تمہاری وفا پہ مجھ کو۔۔۔۔۔

یوں تو بے راہیقن ہے۔۔۔۔۔

پر۔۔۔۔۔ زمانے کے دار کا کچھ بھروسہ نہیں ہے

سو گری بھی ایسا ہو جائے۔۔۔۔۔ اور تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے۔۔۔۔۔

تو ان راہوں سے نفرت نہ کرنا۔۔۔۔۔ جن پر کبھی ہم اک ساتھ چلے تھے

کہ کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے۔۔۔۔۔ بھلا ان بل کھاتی راہوں کو کیا واسطہ۔۔۔۔۔؟

ان نظاروں سے نفرت مت کرنا۔۔۔۔۔ جو ہم نے کبھی اک ساتھ دیکھے تھے

کہ کسی کے وجود کی بدینیت ویرانی سے۔۔۔۔۔ بھلا ان خوب صورت نظاروں کو کیا لاحقہ۔۔۔۔۔؟

ان باتوں سے نفرت مت کرنا۔۔۔۔۔ جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں

کہ کسی کی بے توازن شخصیت کی کڑواہٹ سے۔۔۔۔۔ بھلا اُن میٹھی باتوں کا کیا سابقہ۔۔۔۔۔؟

ان خوابوں سے نفرت مت کرنا۔۔۔۔۔ جو ہم نے کبھی ایک ساتھ مل کر دیکھے تھے

کہ کسی ”ہیکر بد نصیب“ کے گھناؤنے پن سے۔۔۔۔۔ بھلا اُن روشن تعبیروں کا کیا رابطہ۔۔۔۔۔؟

بس مجھ ہی سے نفرت کرنا۔۔۔۔۔ کہ میری روح کی سیاهی سے ہی۔۔۔۔۔ چارٹو کیا اندھیرا ہے۔۔۔۔۔

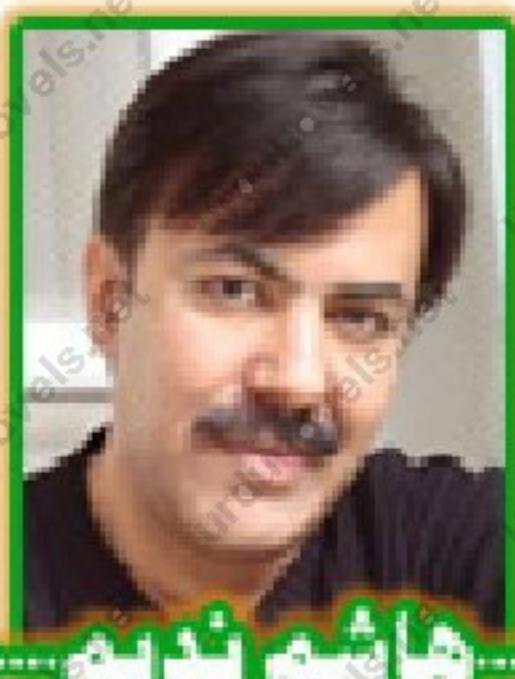
میری بد صورتی کی وجہ سے ہی۔۔۔۔۔ دنیا کا ہر رنگ پھیکا ہے۔۔۔۔۔ ہر راہ بے راہ ہے۔۔۔۔۔

ہر نظارہ مکروہ ہے۔۔۔۔۔ ہر خواب سراب ہے۔۔۔۔۔

بس مجھ سے ہی نفرت کرنا۔۔۔۔۔ کہ صرف میں۔۔۔۔۔ اور میں میں ہی۔۔۔۔۔ تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں۔۔۔۔۔ (ساحر)

میں نے کاغذ لفافے میں ڈالا اور اس پر زہرہ کا پتا لکھ کر پیا کی جانب بڑھا دیا۔ ”اس پر زہرہ کا پتا لکھا ہوا ہے۔ ایک اور احسان کر دیں مجھ پر۔ گھر واپسی پہ یہ

(باقی آئندہ)



.....ہاشم ندیم.....

اک خاک بسر نو جوان کا قصہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

”عبداللہ“ ملک کے معروف و مشہور ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ بھگ ”سڈے پیگزین“ ہی میں چھپنے والے ناول ”عبداللہ“ کا سیکوئل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ”عبداللہ“ دور حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نو جوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھے، ”عبداللہ“ ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janguroup.com.pk

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن رات کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ موسم میرے لیے بے معنی ہو گئے اور میں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا گیا۔ جہاں ٹھہر جاتا، گھنٹوں کھڑا رہتا اور جہاں بیٹھ جاتا، وہاں تب تک خاک سے جڑا رہتا، جب تک کوئی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانے لے جاتا۔ مجھے آئینہ دیکھے نہ جانے کتنا زمانہ بیت چکا تھا۔ لوگ مجھے مجذوب کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ عشق بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ کیا صرف ہوش و حواس چھن جانے ہی سے کوئی مجذوب بن جاتا ہے یا پھر شاید سب ہی مجذوب کسی نہ کسی ناکام عشق کی بھٹی سے تپ کر نکلتے ہوں گے۔ درگاہ پر مولوی خضر ہی میرے ساتھ باقی رہ گئے۔ سب اپنی اپنی تعیناتی کی منزل کی جانب پلٹ چکے تھے، لیکن سلطان بابا جاتے جاتے جاں نشینی کا جو طوق میرے گلے میں ڈال گئے تھے، وہ اب بھی میرے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا، ورنہ شاید میں کب کا کسی ویرانے کی جانب کوچ کر چکا ہوتا، کیوں کہ اب میرا ان انسانوں کی محفل میں گزارہ بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں جتنا لوگوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا، اتنا ہی مجھے ان کا سامنا کرنا پڑتا، شاید ان مزاروں پر ”پہلو تھی“ انسان کو مزید معتر بنا دیتی ہے۔ اُس رات پہا میرا خط لے کر زہرہ کے در تک پہنچے، تو بہت دیر انتظار کے بعد اندر سے کوئی نوکر برآمد ہوا۔ پیانے اس سے زہرہ کا پوچھا، تو بتا چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر پر موجود ہے۔ پیانے اُسے میرا قہقہہ دے کر زہرہ تک پہنچانے کی درخواست کی اور خود پلٹ کر گاڑی میں واپسی کے لیے جا بیٹھے۔ جب ان کی گاڑی زہرہ کی حویلی کو مڑنے والی سڑک کے موڑ تک پہنچی، تو انہوں نے حویلی کے اندر پورچ میں سے تیزی سے کسی کو حویلی کے پھاٹک کی جانب آتے دیکھا تھا، لیکن میری التجا کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے زہرہ کے گھرانے کے کسی بھی فرد سے براہ راست رابطہ کرنے سے اجتناب برتا، حالاں کہ انہیں فاصلہ ہونے کے باوجود یہ گمان ہوا تھا کہ باہر لپک کر آنے والی زہرہ ہی تھی۔ یہ وہی رات تھی، جب میرے ماں باپ کی زبانی آخری بار میری سماعتوں میں زہرہ کے نام کا امرت انڈیلا گیا تھا۔ اس کے بعد صرف کڑواہٹ ہی میرا نصیب تھی۔ میں اپنے خوابوں میں سلطان بابا کا انتظار کرتا، مختلف محفلوں اور ویرانوں میں بھٹکتا رہتا، لیکن وہ مجھے نہ ملتے۔ ہاں البتہ ان کے پیغام بھی کبھار مجھ تک کسی وسیلے سے پہنچ جایا کرتے۔ کئی بار ان کے ہاتھ کے لکھے پرانے اوراق مجھے حجرے میں یادگار کے کسی اور کونے میں پڑے مل جاتے۔ وہ بظاہر تو ان کی موت سے پہلے کی یادداشتیں تھیں، مگر دوسری یا تیسری مرتبہ پڑھنے پر مجھے اپنے حال سے مطابق کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ کچھ کاغذ پرانی تاریخوں کے باوجود تازہ لکھے ہوئے ہوتے۔ اُس روز بھی مجھے درگاہ کے حجرے کی پرانی انگلیٹھی کے پیچھے سے، صفائی کے دوران ایک ایسا ہی رقعہ دھول اور کالک میں اٹا ملا۔ میں نے اسے جھاڑ کر صاف کیا اور اس کی شکستہ تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”جب جب جو جو ہونا ہے، جب تب سو سو.....“ تحریر کچھ مٹی ہوئی تھی اور کچھ کالک کی سیاہی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ مجھے الجھن ہوئے گی۔ میں نے بہت دفعہ سلطان بابا کو مختلف رقعہ نما کاغذوں پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن یہ کاغذ یوں ایک ایک کر کے، بعد میں مجھے ہی ملتے جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا، ورنہ میں اُسی وقت یہ تمام پر چیاں سینٹ سینٹ کر سنبھال رکھتا۔ میں تو آخری وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ ان پرچیوں پر مختلف احکامات لکھ کر بانٹ دیتے ہوں گے۔ میں نے کاغذ کی گرد کو پھر سے پھونک مار کر جھاڑا اور جو حصہ پڑھے جانے کے قابل تھا، اس کا ربط جوڑنے کی کوشش کی ”عصر کا وقت اہم ہے..... کہ اس کی قسم کھائی گئی ہے..... دھیان رہے..... سائل نہ پو کے.....“ بس اتنا ہی سمجھ میں آیا۔ کیا عصر کے وقت کوئی خاص واقعہ ظہور پزیر ہونے والا تھا؟ اور یہ کس سائل کا ذکر ہو رہا تھا؟ ہمیشہ کی طرح میں اپنے ذہن میں بہت سے سوالات لیے، خود ہی سے الجھتا، درگاہ کے صحن میں آ بیٹھا۔ مولوی خضر چند سالوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کبھی لوگوں سے اکتاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم رزق کی طرح اپنے نصیب کے بندے بھی اوپر سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ سو جسے قدرت نے ہم تک پہنچا دیا، وہ ضرور کچھ مقصد لے کر ہی آیا ہوگا، مگر میں سوچتا تھا کہ میرے نصیب میں تو بس میرا قاتل ہی لکھا تھا، شاید قدرت نے اُسے میری فنا کے لیے ہی اس درگاہ پر بھیجا تھا۔

عصر کی نماز ختم ہوئی، ابھی مولوی خضر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ دو افراد جلدی سے دعا مانگتے بنائے اٹھ کر چل دیے اور ٹھیک اسی لمحے دو اشخاص درگاہ کے مسجد والے حصے میں داخل ہوئے اور مولوی خضر کو دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے دیکھ کر جلدی سے صوف کے آخر میں بیٹھ گئے اور پھر سب نمازیوں کے ساتھ ہی انہوں نے دعا کر لی۔ دعا کے خاتمے کے بعد اٹھ کر اپنی عصر کی نماز ادا کرنے لگے، باقی نمازیوں کے جانے کے بعد مولوی خضر نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیوں میاں، دیکھا تم نے..... محنت کس کے حصے میں آئی اور انعام کسے ملا.....؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ”دعا کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے، شاید ہمیں عبادت کا حکم بھی کہیں اسی دعا مانگنے کی فضیلت عطا کرنے کی نیت سے دیا گیا ہوگا۔ وہ جو دو اشخاص نماز پڑھ کر بنا دعا مانگے اٹھ کر چلے گئے، انہوں نے اپنے حصے کی مشقت تو کر لی، پر انعام لیے بنائے چل دیے اور وہ دو، جو اپنی جماعت تو قضا کر

بیٹھے تھے، لیکن عین وقت پر پہنچ کر دعا میں شامل ہو گئے، انہوں نے محنت تو نہیں کی، لیکن قدرت نے انعام ان کے حصے میں لکھ رکھا تھا۔ سو، انہیں دعا میں اپنا حصہ مانگنے کا موقع مل گیا اور کون جانے کہ یہی وہ خاص وقت دعا ہو، جس میں دعائیں ساتویں عرش پر سنی جاتی ہیں۔“ مولوی خضر ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، ساری عمر سجدے میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، جب وہ سجدہ ہی قضا ہو جائے، جس میں رب سے اُسے مانگنا تھا..... میں بھی شاید وہ سجدہ قضا کر چکا تھا اور پھر میری قضاؤں کی تو گنتی بھی اب محال تھی۔ میں تو اپنی ساری دنیا قضا کر چکا تھا اور اب دین بھی مجھ سے دھیرے دھیرے قضا ہو رہا تھا۔ تحصیل مانی کے مجذوب کی دشمن گوئی پوری ہو رہی تھی، لیکن خود میرے ہاتھ میں بھلا میرا کوئی فیصلہ کب تھا؟ عصر کے بعد مولوی خضر ٹھہرے میں کچھ دیر آرام کے لیے چلے گئے اور میں پھر سے اپنے وجود کی گرہیں کھولنے کی ناکام کوشش کرنے، درگاہ کے صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی اونچے گھرانے کی ایک عورت اپنے ڈرائیور اور دو خادماؤں سمیت درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اس نے درگاہ میں داخل ہوتے ہی ادھر ادھر کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر تیزی سے میری جانب بڑھی۔ ”سٹوٹ کے ایہاں کے بزرگ بابا کہاں ہیں.....؟“ شاید وہ مولوی خضر کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ ”وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی.....؟“ وہ کچھ ہچکچائی۔ ”تم..... میرا مطلب ہے تم تو..... اچھا ٹھیک ہے۔ تم یہ نذر اور نیاز درگاہ پر چڑھا دو اور اپنے بزرگ سے درخواست کرو کہ وہ چند لمحوں کے لیے میرے ساتھ نیچے بیٹھیں۔“ چلے آئیں۔ دراصل میں اپنے بیٹے کے لیے خصوصی دعا کروانا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں تک نہیں آ سکتا۔“ مجھے لگا کہ بڑے گھر کی کوئی مجبور ماں اپنے لاڈلے کے لیے دعا کروانے آئی ہے، جو ماں کی خواہش کے باوجود اپنے قدموں کو زحمت دے کر درگاہ کی سیڑھیاں نہیں چڑھنا چاہتا۔ کبھی میں خود بھی تو ایسا ہی تھا۔ مہما مجھے پکارتی رہ جاتیں، لیکن اگر میرا کہیں جانے کا موڑ نہ ہوتا، تو میں کان لپیٹے پڑا رہتا۔ میں مولوی خضر کو بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ خاتون کسی بزرگ ہی کی تلاش میں یہاں تک آئی تھیں۔ کچھ دیر میں مولوی خضر بھی باہر نکل آئے۔ خاتون نے اپنا اندھا بھرے بیان کیا۔ مولوی خضر نے میری جانب دیکھا اور انہیں بتایا ”یہ عبد اللہ میاں ہیں۔ یہی اب درگاہ کے متولی ہیں۔ بہر حال، آپ کہتی ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔“ عورت کے چہرے پر تحیرت کے اثرات ابھرے ”تو یہ عبد اللہ ہے؟“ میں درگاہ کی سیڑھیوں کے پاس آ کر ٹھہر گیا، کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ سائل کی خواہش کے مطابق مولوی خضر ہی اس لڑکے کے لیے دعا کریں، کیوں کہ یہ ان کے اعتماد اور یقین کا معاملہ تھا اور دعا بقاء کا مل یقین، کب اپنا اثر دکھاتی ہے، لیکن مولوی خضر جب چند سیڑھیاں نیچے اتر چکے اور انہوں نے مجھے ہم قدم نہیں پایا، تو وہ بھی ٹھٹھک کر رک گئے ”عبد اللہ میاں..... آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ، ان کے صاحب زادے کو دعا دینے.....؟“ مجبوراً مجھے بھی قدم بڑھانا پڑے۔ نیچے نئے سال کے ماڈل کی ایک چمکتی دکتی کار کھڑی تھی اور ایک نوجوان لڑکا کانوں میں ہیڈ فون لگائے، کسی نفی کی دھن پر اپنی انگلیوں کے تال ملانے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس وقت گاڑی کے اسٹیرنگ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ اس نے ایک مسکراتی نگاہ پہلے اپنی ماں اور پھر ہم دونوں پر ڈالی، لیکن وہ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ خاتون نے ہمارا تعارف کروایا۔ ”شہزاد بیٹا..... یہ بزرگ تمہیں دعا دینے آئے ہیں اور یہ نوجوان اس درگاہ کا متولی ہے۔“ شہزاد مسکرایا ”واہ..... کیا بات ہے، کیا آج کل درگاہوں پر بھی نئے لڑکے کی۔ ایس۔ ایس۔ ایس کا اس قسم کا کوئی دوسرا مقابلے کا امتحان پاس کر کے آنے لگے ہیں۔ آئی سین، سی از کو انٹریجک فور اینی جی پلیس مام۔“ ماں نے بیٹے کو گھور کر تنبیہ کی۔ مولوی خضر نے بنا کچھ کہے، وہیں کار کے قریب کھڑے کھڑے شہزاد کے لیے دعا کی اور ہم دونوں نے آمین کہہ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیا۔ شہزاد اب بھی اپنی جگہ کار میں جما بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے، تو ماں نے ممنونیت سے ہمیں دعا دی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جو ماں ہمیں دعا دے رہے تھی، وہ اپنے بیٹے کے لیے دعا کروانے اتنی دُور چلی آئی تھی۔ ان ماؤں کو اولاد کے معاملے میں اپنی دعاؤں پر اک ذرا سہ اعتماد بھی کیوں نہیں ہوتا۔ کسی ماں کی دعا سے بڑھ کر کسی بھی درگاہ کے مجاور، متولی یا بزرگ کی دعا بھلا کیا ہوگی؟ ہمارے مڑتے وقت لڑکے نے اپنی ماں سے انگریزی میں کہا ”آپ نے خواہواہ اتنی دُور آکر اپنا اور میرا وقت ضائع کیا۔ اس بوڑھے اور اس لڑکے کو تو خود دعا کی ضرورت ہے، ورنہ یہ دونوں یہاں اس ویرانے میں نہ پڑے ہوتے۔“ میں سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، لیکن خلاف معمول اور خلاف توقع، نہ جانے مولوی خضر کیوں رک گئے اور انہوں نے شدھ انگریزی میں شہزاد کو جواب دیا۔ ”دعا کی ضرورت کسے نہیں ہوتی، کوئی دعا کی محبت میں یہاں وہاں بھٹکتا ہے اور کسی کو محبت کی دعا کے لیے ان ویرانوں تک آنا پڑتا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے، میری دعا ہے کہ وہ تمہاری بھی سنے۔“

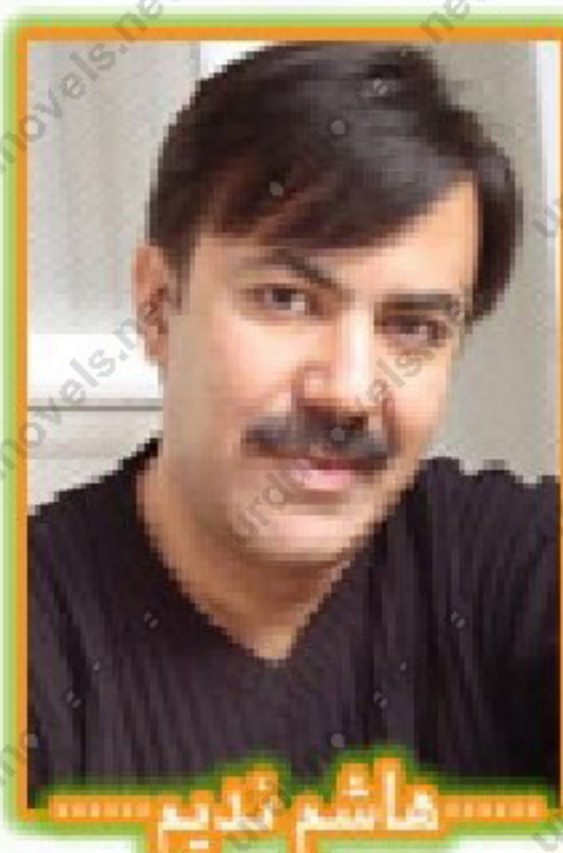
ہم شہزاد اور اس کی ماں کو ہچکچاک چھوڑ کر اوپر درگاہ میں چلے آئے۔ جانے کیوں مولوی خضر مجھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے، لیکن میں نے صبر و عادت انہیں گریہ نہ مانا مناسب نہیں سمجھا۔ مغرب کے بعد میرے اندرونی اک عجیب سی بے چینی سراپت کرنے لگی، جواب شاید میری زندگی کا حصہ بنتی جا رہی تھی، لیکن آج بہت دنوں کے بعد زہرہ کی یاد کا وہ مستقل کانٹا سر شام ہی نہیں دینے لگا تھا، جسے میں عموماً ساری دنیا کے سو جانے کے بعد رات کی تنہائی میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نشتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بے اختیار رونا آ گیا اور نہ جانے کب فجر سے کی دیوار سے ٹک لگائے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں بھی روتا ہی رہا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ گھٹنوں سے سر جوڑے دنیا میں آنے کا انتظار کرتا ہے۔ کہتے ہیں، جسم کا یہی آسن انسان کو فطرت سے سب سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر نیند میں گھٹنے سینے کی جانب موڑے رکھتے ہیں۔ میں بھی اس وقت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہ رہا تھا، تب ہی مجھے اپنے سر کے اوپر کسی کے ہاتھ کا مانوس شفقت بھرا مس محسوس ہوا۔ میں نے سر اٹھایا۔ وہ سلطان بابا تھے، ہاں..... وہی تو تھے، لیکن میں تو ان سے روٹھا ہوا تھا۔ اس لیے سلام کر کے چپ چاپ اپنے آنسو اپنی پتیلیوں سے صاف کر کے روٹھا سا بیٹھا رہا۔ ان کے ہونٹوں پر وہی دھیمی سی مخصوص مسکراہٹ تھی ہوئی تھی۔ ”یہ کیا سحر میاں؟ اپنے سلطان بابا سے بات بھی نہیں کرو گے کیا۔ اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔ یہود سے اتنی بڑی جنگ جیتنے والا بھی کبھی روتا ہے کیا؟“ میں خیران کی جانب شکایت بھری نظر ڈالی۔ ”آپ جانتے ہیں، آپ کے بٹا میری ہر جیت، ہار ہے، اور جانے آپ نے مجھ سے اتنی توقعات کیوں وابستہ کر لی ہیں۔ اتنا مضبوط نہیں ہوں میں۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں، مت ڈالیں اتنے بڑے امتحان میں مجھے۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”منزل کے اتنے قریب پہنچ کر پلٹ جاؤ گے.....؟ واپسی کا رستہ اس ڈگر سے کہیں زیادہ طویل ہے، جو سیدھی تمہاری منزل مقصود تک جاتی ہے۔“ اب میں انہیں کیا بتانا کہ محبت کے سفینے عموماً اپنے ساحلوں کے قریب ہی غرق ہوتے ہیں۔ میری ناؤ تو زہرہ کے جاتے ہی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں سے لڑنے کی ہر کوشش بھی ترک کر چکا تھا۔ اب تو بس سمندر کی تہ میں جا لیٹنا باقی تھا۔ وہاں کی ریت، سپیان اور گھونگھے ساحر کا انتظار کر رہے تھے۔ سلطان بابا نے میرا ہاتھ میرے ہی دل پر رکھ دیا۔ ”جو لوگ یہاں سے سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں، انہیں زیادہ غم نہیں سنتا، اور ہاں، یاد رہے کہ ہمارے راستے پہلے سے مقرر ہیں۔ ہمیں بس قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کل تمہارے قدم بھی تمہارے مقررہ رستے پر اٹھ ہی جائیں گے۔“ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سلطان بابا کے ہاتھ سے کوئی قوت آمیز حرارت میرے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔

میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میں وہیں درگاہ کی ہنڈیر کے پاس گھٹنے جوڑے بیٹھا ہوا تھا اور میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لکیریں اس بجی میرے گالوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا دایاں ہاتھ ٹھیک اسی جگہ میرے دل پر اب بھی اسی طرح جما ہوا تھا، جیسے سلطان بابا اسے رکھ گئے تھے۔ رات ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی اور اس سے کہیں زیادہ باقی میرے اندر کی گرہیں تھیں۔ رات تو شاید کچھ دیر بعد بیت ہی جاتی تھی، لیکن یہ مگر ہیں کھلنے کے لیے نہ جانے کتنی صدیاں درکار تھیں۔

صبح ہوئی تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنکھیں بند کیے حجرے میں پڑا رہوں، کیوں کہ مجھے سورج کی کرنیں برچھٹیوں کی طرح پیچھ رہی تھیں۔ شاید ساڑھے دس کے قریب کا وقت تھا، جب مجھے صحن سے مولوی خضر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی، کیوں کہ فجر کی نماز کے بعد خود انہوں نے ہی مجھے حجرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ وہ میری سوجی ہوئی آنکھوں سے میری اتر حالت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ ان کی دوسری آواز کے ساتھ ہی میں حجرے سے باہر نکل آیا۔ صحن میں وہی گزشتہ روز والی خاتون شدید پریشان سا چہرہ لیے کھڑی نظر آئیں۔ مولوی خضر میری جانب بڑھے ”عبداللہ میاں..... یہ بی بی اپنی ایک پریشانی لے کر آئی ہیں۔ کل تم نے ان کے پیٹے کے لیے میرے ساتھ دعا کی تھی ناں۔ آج پھر اس لڑکے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اتنی زیادہ کہ وہ چل کر یہاں تک آ بھی نہیں سکتا۔ یہ بی بی اس لیے پریشان ہیں کہ کل ان کے بیٹے نے کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تھا، تو کہیں یہ اسی کیے کی سزا تو نہیں ملی اُسے۔ میں کافی دیر سے انہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فقیروں کے پاس سوائے دعا کے اور کوئی نذرانہ نہیں ہوتا۔ بدو دعا نام کا کوئی بھی سکہ ہمارے مشکول میں کہاں، لیکن انہیں اطمینان نہیں ہو رہا۔ تم ایسا کرو کہ ذرا دیر کے لیے ان کے ساتھ ان کے گھر آؤ۔ یہ پڑھا ہوا پانی اس نوجوان کو پلا دینا، انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔“ مولوی خضر نے پانی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں کچھ کہہ نہیں پایا۔ کوئی بات تو خلاف معمول ضرور تھی، ورنہ مولوی خضر مجھے اس بخار نما کیفیت میں کبھی اس عورت کے ساتھ جانے کا نہ کہتے، حالاں کہ نہ جانے کیوں، میں اندر سے وہاں جانے کے لیے راضی نہیں تھا۔ شہزاد کا ستو قع برتاؤ بھی میرے پیش نظر تھا، لیکن میں صرف قہیل کرنا جانتا تھا، لہذا پانی کی بوتل اٹھائے، چپ چاپ نیچے کھڑی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شہر کے مضافات کے آس پاس ہی ایک بہت بڑی سی محل نما کوٹھی میں گاڑی داخل ہوئی، تو میکینوں کی نفاست کا اندازہ بڑے باغیچے کی نہایت عمدگی سے تراشی باز ڈھ ہی سے ہو گیا۔ پورچ میں کچھ اور گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ ہم مختلف راہ دریوں سے ہوتے ہوئے ایک نفیس سی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ سامنے، ستر پر شہزاد جسم پر ایک بڑا اسلخاف ڈالے پڑا، بخار میں تپ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ہے یو ایجنری بیک مین! مجھے امید نہیں تھی کہ تم می کے ساتھ آؤ گے۔ کل جب میں نے تم لوگوں کو ڈی گریڈ کرنے کی حماقت کی تھی، مجھے اسی وقت تمہارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بھی میری بات سمجھ گئے ہو، لیکن میری توقع کے برعکس جواب تمہارے بزرگ کی طرف سے آیا۔ ہو سکے تو میری معذرت قبول کر لو۔ دراصل اس بیماری نے مجھے بے حد چڑا بنا دیا ہے۔“ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”بھول جاؤ سب کچھ..... یہ پانی پی لو..... انشاء اللہ افاقہ ہوگا.....“ شہزاد نے بے دلی سے پانی کا گھونٹ بھرا۔ ”تمہیں سچ بتاؤں..... مجھے ان باتوں پر بالکل یقین نہیں۔ میں بس می کی وجہ سے.....“ شہزاد کی ماں نے گھور کر اپنے بیٹے کو تنبیہ کی، شہزاد بادل خواستہ پانی پی گیا۔ ماں مجھ سے بولی۔ ”بیٹا تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ تو سدا کا پنگا ہے۔ تم اپنا عمل پورا کرو۔ میں تمہارے لیے چائے کا کہہ کر ابھی آئی۔“ میں نے جلدی سے انہیں روکا ”نہیں نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں..... اور مجھے کوئی ایسا خاص عمل نہیں کرنا۔ بس مولوی خضر کی ہدایت کے مطابق چند دعائیں پڑھنی ہیں۔ آپ کسی تکلف میں نہ پڑیں۔ مجھے جلد واپس لوٹنا ہے۔“ لیکن مائیں بھلا کب کسی کی سختی ہیں۔ سو، وہ بھی میری سنے بغیر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شہزاد اپنی تمام تر زندہ دلی کے باوجود خاصی تکلیف میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تمام بات چیت کے دوران لینا ہی رہا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، تو وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دعا ختم ہونے کے بعد اس کا سوال ہونٹوں پر آئی گیا۔ ”کیا تمہیں اپنی دعا پر پورا یقین ہے.....؟“ میں نے غور سے اسے دیکھا ”جب تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے نہیں، تب تک میں بھی اتنا ہی بے یقین رہتا ہوں، جتنے تم اس وقت ہو، لیکن ہاتھ آسمان کی جانب اٹھنے کے بعد نہ جانے کہاں سے اتنا یقین میرے اندر بھر جاتا ہے کہ ہاتھ کرنے سے پہلے سارا جہان اپنی ان دو جڑی پھلیوں کے پیالے میں پڑا نظر آتا ہے۔ کبھی موقع ملے تو تم بھی آزمائے۔ یقین خود بخود تمہارے اندر کی خالی درزیں بھر دے گا۔ ویسے تمہیں ہوا کیا ہے، کوئی خاص بیماری.....؟“ شہزاد نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری ”کہتے ہیں جس کو عشق..... غلل ہے دماغ کا..... بس یوں سمجھ لو کہ یہی غلل دماغ کی چولیس ہلا گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی سودا میرے من میں بھی سما گیا ہے۔ بولو..... ہے کوئی دعا تمہارے پاس اس غلل کو رفع کرنے کے لیے.....؟“ میں نے چونک کر شہزاد کو دیکھا۔ تو گویا یہ مرض یہاں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں شہزاد کو منع کر دوں کہ اس راستے پر قدم نہ بڑھائے۔ جتنی جلدی ہو سکے، واپس پلٹ آئے، ورنہ محبت کی ان مل کھائی پگھلے یوں پروا پس کی راستوں میں گھنے جنگل اگ آتے ہیں۔ دکھ کی اسریل عاشق کے قدم آگے بڑھتے ہی پیچھے یوں تیزی سے ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے الٹتی ہے کہ پھر کوئی سزا بھی چاہے، تو واپسی کا کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا۔ درد اور غم کے مغریت ان گھنے جنگلوں میں سرشام ہی ال تاس کے بیڑوں سے نیچے اتر آتے ہیں اور واپسی کے بجائے معصوم مسافروں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ محبت کے راستے پر آگے بھی موت ہے اور پیچھے بھی فنا۔ محبت وہ خونی جزیرہ ہے، جو اپنے بایسوں کے لیے پل بھر میں اُس بریفے گلیشیر میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو اپنے ساحل سے کٹ کر گہرے سمندر میں بہہ چکا ہے اور اب دھیرے دھیرے مکمل کر خود بھی پانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اس جزیرے پر بسنے والوں کے لیے ایک ایک انچ کر کے پاؤں دھرنے کی جگہ ختم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار سب ہی ڈوب جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لپٹے، چیختے چلاتے، روتے، سسکیاں بھرتے، کسی برباد ہوتے نا ئی ٹینک کی طرح.....

میں جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ شہزاد کی می کے کھنکھارنے کی آواز من کر پھر سے حال میں پہنچ گیا۔ وہ جانے کب کی چائے کی ٹرالی و حسیاتی خادمہ کے ساتھ واپس آ چکی تھیں۔ شہزاد نے مسکراتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ ”کن خیالوں میں کھو گئے۔ میں نے کہا تھا نا کہ عشق لا علاج ہوتا ہے۔ اس جڑ سے کا علاج دنیا کی کوئی بھی سائنس آج تک نہیں ڈھونڈ پائی۔ تم بھی اپنے روحانی علاج کی حدیں آزما دیکھو۔“ شہزاد کی ماں نے پھر اُسے ٹوکا۔ ”شہری! تم باز نہیں آؤ گے ناں، کیوں مہمان کو زنج کر رہے ہو۔ یہ صرف تمہارے لیے اتنی دُور سے یہاں تک آیا ہے۔“ خادمہ نے چائے کی پیالی مجھے پیش کی، لیکن خلاف توقع شہزاد نے چائے پینے سے گریز کیا۔ میں نے جلدی میں دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اٹھ لیے اور واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شہزاد نے لپٹے لپٹے ہاتھ بڑھایا۔ ”پھر کب ملاقات ہوگی پیر جی.....“ میں جانتا تھا کہ ”پیر جی“ کی اصطلاح صرف اس نے الوداعی لمحات کو خوش گوار بنانے کے لیے گھڑی تھی۔ جلد ہوگی، لیکن پہلے تمہارے اس غلل کی کوئی ترکیب تو ڈھونڈ نکالوں، حالاں کہ یہ تو وہ عارضہ ہے کہ جس کے طبیب بھی بعض اوقات اس جڑ سے نہ ہر کا شکار ہو کر بيموں بنے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی محبت، نہجوت کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ سو، پہلے میں اس کا اینٹی وائرس ڈھونڈ لوں، پھر تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔“ شہزاد کی می حیرت سے ہم دونوں کے درمیان ہوتی اس گفتگو کو سن رہی تھیں۔ مسکرا کر بولیں۔ ”اس کے لیے تمہیں کوئی اینٹی وائرس ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ یہ پہلے ہی محبت کی جنگ جیت چکا ہے۔ جانے اس کے دل سے یہ بے معنی غدشات کیوں نہیں نکلتے۔ اگلے ماہ ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہمارے آگن میں بہار بن کر اترنے والی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، پیر اپنا سدا کا پنگا ہے۔“ شہزاد نے مسکرا کر اپنی ماں کو دیکھا اور مجھے کے نیچے سے ایک تصویر نکالی اور دھیرے سے مجھے اپنے آپ سے بولا ”اُن گے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق.....“ ماں نے ہنس کر بیٹے سے تصویر لے لی اور فخر سے اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالی اور پھر مجھ سے بولیں۔ ”بیٹا! اپنے بزرگ سے کہیے گا کہ میرے بیٹے کی خوشیوں کے لیے بھی دعا کریں۔ میں خود کسی دن اپنی ہونے والی، ہو کو لے کر درگاہ آؤں گی۔“

میں نے سلام کر کے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اور مڑتے مڑتے میری چھلکتی سی نظر ماں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تصویر پر پڑ گئی۔ میرے ذہن میں قیامت کا دھماکا ہوا اور ذہن میں شق ہو گئی۔ میں پکرا کر زمین پر گر پڑا، لیکن گرتے گرتے بھی میری زخمی نگاہ شہزاد کی ماں کے ہاتھ میں پکڑی زہرہ کی تصویر ہی پڑ جی رہی۔ ہاں..... وہ زہرہ ہی تھی..... جو کبھی میری تھی۔ (بائی آئندہ)



ہاشم ندیم

ایک خاک بسر نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی ہمدردی سے کچھ دور تلاش رہا تھا

جانے میں کتنی دیر اپنے حواس سے بیگانہ رہا۔ جب ہوش آیا، تو شہزادہ کی ماں اور گھر کے نوکر پریشانی کے عالم میں میرے اطراف گھڑے تھے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جانے تک میں وہیں آرام کر لوں، لیکن میں نے یہ مشکل ان سب کو یقین دلایا کہ ایسے دورے میرے لیے معمول کی بات ہیں اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لہذا میرا درگاہ پہنچنا ضروری ہے کہ وہاں کی بہت سی ذمے داریاں میری راہ تک رہی ہیں۔ میرے جسم کی لڑوٹ ابھی تک قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب گاڑی میں بیٹھا اور کب ڈرائیور نے مجھے درگاہ کی میٹریوں کے قریب لا کر اتار دیا۔ میں نے پہلی میٹری پر قدم رکھا، تو مجھے زہرہ کے پرانے ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ اس نے تو زہرہ کے ہونے والے ہم سفر کا نام خرم بتایا تھا، تو پھر یہ شہزادہ.....؟ میں فوراً واپس پلٹا، ڈرائیور تب تک گاڑی موڑ چکا تھا، میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ”یہ جو لڑکا بیمار تھا..... اس کا پورا نام کیا ہے.....؟“ ڈرائیور چونکا۔ ”کون چھوٹے صاحب، ان کا نام شہزادہ ہے..... خرم شہزادہ.....“ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی اور میں جیسے صدیوں پیچھے کا سفر ایک ہی پل میں طے کر گیا۔ کیا ہاتھ آیا میرے.....؟ میں تو آج بھی اتنا ہی تھکی وادمن تھا۔ میں جب تک درگاہ کی میٹریاں چڑھ کر اوپر چھن تک پہنچا، تب تک میرا جسم باقاعدہ کانپنا شروع کر چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر حجرے میں تھے، ورنہ بوکھلا ہی جاتے۔ میں یہ مشکل خود کو کسی طرح گھسیٹ کر درگاہ کی منڈیر تک جا پہنچا اور وہیں ٹیک لگا کر گر سا گیا۔ کچھ ہونیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو بالکل کسی ان ہونی کی طرح ہم پر وارد ہوتی ہیں۔ مجھے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی کہ زہرہ کسی اور کی ہونے والی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ خبر میرے حواس پر آج اسی طرح بجلی بن کر گری، جیسے مجھے آج ہی اس بات کی آگہی ہوئی ہو۔ شاید انسان کی فطرت ہی میں آخری لمحے تک طوفان ٹل جانے کی امید نہیں نہ کہیں باقی رہتی ہے، لیکن جن طوفانوں کو آنا ہوتا ہے..... وہ آکر ہی رہتے ہیں، میری زندگی کا سب سے بڑا طوفان بھی آچکا تھا اور کیسی بے بسی تھی کہ مجھے تو کوئی سائبان بھی میسر نہیں تھا یا طوفان شاید ان کے لیے ہی طوفان کہلاتا ہے، جو مجھ جیسے بے سائبان ہوتے ہیں۔ ساری رات میں یوں ہی درگاہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر گزار رہا اور صبح میری آنکھوں سے پوری رات کی بہتی شہنم درگاہ کی زمین پر ٹھہرے کے موتیوں کی صورت چمک رہی تھی، لیکن میرا نصیب وہی سدا کا ماندہ، مدہم اور کا لک زدہ تھا۔ مجھے جس کی سبجائی کے لیے پختا گیا تھا، وہ خود میرا ہی رقیب تھا۔ عاشق تو اپنے رقیب کے خلاف تعویذ گنڈے کر دانے کے لیے عاملوں کے در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ایک میں تھا کہ جسے مقدر خود اپنے رقیب کے در پر لے آیا تھا کہ جا اپنے دامن میں بچا آخری امید کا گلاب بھی اپنے رقیب کے حوالے کر دے اور اس کی جھولی میں بھرے سبھی کانٹے اپنے جگر میں پر کر لو لہان اور خالی ہاتھ واپس لوٹ جا۔ سو میں خالی ہاتھ درگاہ کے چھن میں دھول میں انا بیٹھا تھا۔ دھوپ نے درگاہ کی منڈیر کا ہاتھ پھوٹا تو مولوی خضر حجرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنی آواز میں چھپے طوفان دبانے کی کوشش کی۔ ”آپ جانتے تھے کہ خرم شہزادہ زہرہ کا ہونے والا جیون ساتھی ہے، پھر آپ نے مجھے وہاں کیوں بھیجا، اس کی تیار داری کے لیے.....؟ کیا آپ کو بھی عبد اللہ کو بار بار ہارتی آگ میں جھونکنا بہت بھاتا ہے۔ ایک ہی بار مجھے جھسم کیوں نہیں گھرو دیا جاتا..... یہ روز روز کے سنگتے داغ میری روح کو کب تک سہنا ہوں گے.....؟“ شاید میرا لہجہ کچھ زیادہ تلخ ہوتا گیا، لیکن مولوی خضر حسب عادت چپ چاپ سر جھکائے، سنتے رہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بولتے بولتے میرا گلا رندھ گیا اور ازل سے بیگلی پلکیں پھر سے نم ہونے لگیں۔ مولوی خضر نے دھیرے سے سر اٹھایا اور میرا ہاتھ تھام کر کچھ دیر تک لفظ جوڑتے رہے۔ ”یقین جانو، عبد اللہ میاں، میرے بس میں ہوتا، تو یہ ساری آگ اپنے مقدر کے پیالے میں بھر لیتا، لیکن تمہاری روح پر مزید کوئی ضرب نہ پڑنے دیتا، پر ہم دوسروں کے نصیب مول پاتے، تو بات ہی کیا تھی۔ بس اتنا سمجھ لو کہ سب پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے اور ہم شدید خواہش رکھنے کے باوجود، کبھی دعا کی کنجی سے بھی کچھ بندتا لے کھول نہیں پاتے۔“ مولوی خضر یونہی چپ چاپ بیٹھے کافی دیر تک میرا ہاتھ تھکتے رہے۔ کبھی کبھی خاموشی ہی بہترین گفتگو ہوتی ہے۔ لفظ ہلکے پڑنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ خاموشی اور سکوت قدرت کے عطیات میں سے ایک ہیں اور لفظ اور بولی انسان کی اپنی ایجاد۔ سو، میں اور مولوی خضر بھی سکوت میں خاموشی کی آہٹوں اور سرگوشیوں والی بولی بولتے اور سنتے رہے، لیکن ہمارے لب ساکت ہی رہے۔

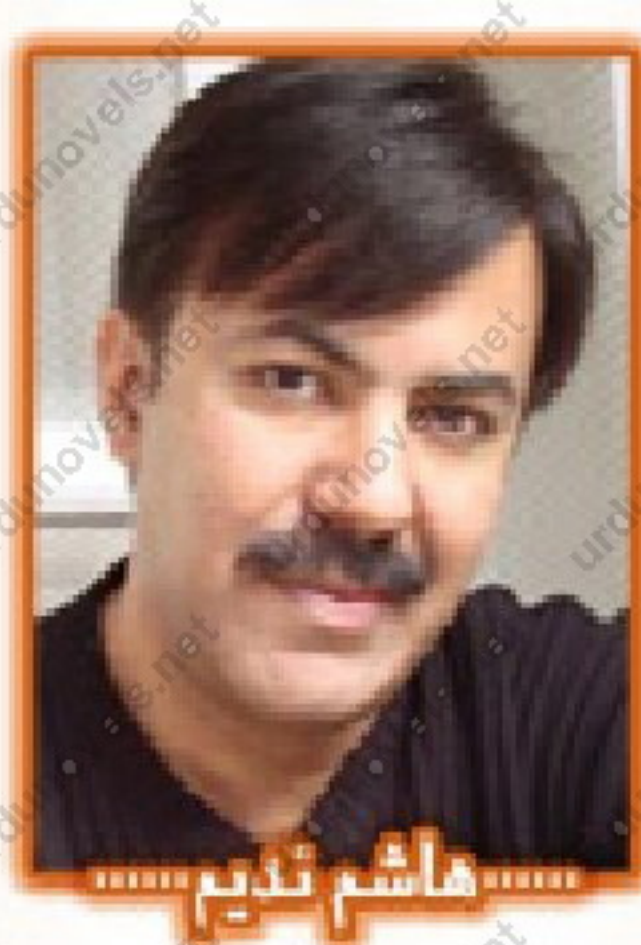
سہ پہر کے بعد مولوی خضر کو چند زائرین نے آگھیرا، تو میرا جی گھبرانے لگا اور میں نے خود کو درگاہ کی میٹریوں سے کچھ فاصلے پر واقع بازار میں گم کرنے کا تہیہ کر کے، باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ بعض اوقات اجنبی جھوم بھی ذہن کی ابھی گریں انکانے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے، لیکن ابھی میرے قدم تھیری میٹری ہی پر تھے کہ میں نے خرم کی ماں کو درگاہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ ان کا ڈرائیور بھی ان کے پیچھے چلا آ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں پھلوں کی چند ٹوکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاتون کی نظر مجھ پر پڑی، تو وہ جلدی سے میری جانب بڑھیں۔ ”عبد اللہ..... تم کہیں جا رہے ہو بیٹا.....؟“ میں رک گیا۔ ”جی..... بس ذرا دل گھبرا رہا تھا، سوچا کچھ دیر ٹھیل آؤں۔“ انہوں نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اوہ..... تمہیں تو بہت تھیز بخار ہے۔ ایسی حالت میں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ ”اب اسی حالت میں مجھے آرام ملتا ہے۔“ لیکن اچھا ہوا کہ میرے لب سے ہی رہے، مجبوراً مجھے ان کے ساتھ ہی درگاہ واپس لوٹنا پڑا۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں، انہوں نے خصوصی طور پر مولوی خضر کا شکر یہ ادا کیا کہ خرم کی حالت اب بہت بہتر ہے اور یہ سب ان کے بقول اس ”کرشمائی پانی“ کا اثر تھا، جو میں گزشتہ روز خرم کو پلا کر آیا تھا۔ مولوی خضر مسکرا کر بولے ”اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے بی بی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ میں نے تو بس اس خالق کے لازوال کلام کی چند آیات پڑھ کر اس پانی پر پھونکی تھیں اور یہ عمل آپ خود

اپنے گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو چند مخصوص آیات لکھ کر دے دوں گا۔ آپ روزانہ شام کو مغرب سے پہلے اپنے بیٹے کو پانی دم کر کے پلا دیا کریں۔ اللہ شفا دے گا۔“ خرم کی والدہ میری جانب مڑیں..... ”وہ تمہیں بھی یاد کر رہا تھا بیٹا۔ جب کبھی وقت ملے، تو ہماری طرف ضرور چکر لگاتا۔ مجھے خوشی ہوگی۔“

میں صرف سر ہلا کر رہ گیا، پھر نہ جانے کیوں ان کی آواز بھڑاسی گئی ”ہمارے پاس خوشیوں کی ویسے بھی بہت کمی ہے۔ میں تو بس اب اس دن کے انتظار میں جی رہی ہوں، جب زہرہ، خرم شہزادی ولہن بن کر ہمارے گھر کی رونق بنے گی۔ مجھے یقین ہے، اس دن میرے پنگے بیٹے کے ہونٹوں پر سدا قائم رہنے والی مسکان ابھرے گی اور اس کی زندگی کا ہر دور، ہر غم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔“ زہرہ کا نام سنتے ہی میرے آس پاس وہی تیز آنسو صبا چلنے لگیں، جو ہمیشہ مجھے ایک کم زور تنکے کی طرح اڑا لے جاتی تھیں۔ خرم کی والدہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں، جسے زہرہ نصیب ہو جائے، پھر بھلا اسے کسی اور چاندنی کی ضرورت کہاں.....؟ کبھی وہ میرے مقدر کا چاند تھی، جسے میں نے پا کر کھو دیا تھا۔ کچھ آنگن سدا سونے بھی تو رہتے ہیں۔ ان کے نصیب کی چاندنی کسی اور کی مندر پر پر چنگ جاتی ہے۔ تقدیر کے گھنے کالے سائے، پتیل کے بیڑ سے لپٹ کر اس آنگن تک روشنی کی ایک نیلی کرن بھی نہیں پہنچنے دیتے اور پھر مجھے مقدر سے گلہ کرنے کا حق بھی کب تھا۔ زہرہ تو جبل پور میں لاریب کی حویلی ہی میں، مجھے اپنی روح سوپنے کا عندیہ دے چکی تھی، لیکن میں ہی اسے انتظار کی صلیب پر مصلوب کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے تو اسی وقت سلطان بابا نے اجازت دے دی تھی کہ میرے سفر کا پہلا پڑاؤ آچکا، لہذا میں چاہوں تو زہرہ کا ہاتھ تمام کر واپس پلٹ سکتا ہوں۔ میں نے تب ہی اپنا نصیب کیوں نہیں سمیٹ لیا۔ نصیب بھی تو ستر خوان پر بچھے رزق کی طرح ہوتا ہے، اسے زیادہ دیر انتظار کروایا جائے، تو اس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مقدر روٹھ جاتے ہیں۔ کسی اور کی تقدیر بن جاتے ہیں، لیکن میں بھلا کب ناشکر تھا؟ میرے دل میں اگر کچھ بھرم تھے، تو وہ بھی بلا وجہ تو نہیں تھے۔ زہرہ کے انتظار کا بھرم، میری واپسی تک اس کی غفلت پلوں کو اپنی راہ میں رکھے دیکھنے کا بھرم، اپنی اس برباد محبت پر اعتماد کا بھرم، لیکن بھرم تو بس ٹوٹ جانے کے لیے ہی قائم ہوا کرتے ہیں، کتنی عجیب بات ہے کہ یہ آگینے جیسے نازک بھرم، اپنے دل کے اندر پالتے تو ہم خود ہیں، لیکن ان کے ٹوٹنے کی ڈھائی ہم اور وہی کودے پھرتے ہیں، میرا پاگل دل بھی اپنے بھرم کی شکست کا بار زہرہ پر ڈالنے کے جواز ڈھونڈ رہا تھا، لیکن اب میں اپنے اس ”نادان دوست“ کے بہکاوے میں آنے والا نہیں تھا، زہرہ اگر میرا انتظار نہیں کر پائی، تو کیا ہوا۔ اس نے کبھی ایک بار مجھے اپنی روح سوپنی تھی، کیا یہ ایک اعزاز ہی میرے پورے جہنم کے لیے کافی نہیں تھا، تو پھر میرا یہ دیوانہ پن ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔ میری کوئل روح کے پرے یوں پارہ پارہ ہو کر فضا میں کیوں تحلیل ہوئے جارہے تھے، آخر ہم انسان اپنے نصیب کے لمحے جی کر بھی پل پل کیوں مرتے رہتے ہیں۔ مقدر ہمارا ظرف اتنا وسیع کیوں نہیں کر دیتا کہ ہم اپنی تمام عمر اس ایک جاوداں پل ہی میں گزار دیں، جو کبھی ہمارا نصیب تھا۔ ہم یادیں سمیٹنے کی دھن میں اتنی دور کیوں چلے آتے ہیں کہ پھر واپسی کے خیال ہی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے، خرم کی والدہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں ان کے مستقبل کے سنہرے سنوں کی داستان میں اپنا آج چلتے دیکھتا رہا۔ شاید محبت کی پیاس بھی پانی کی پیاس جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہر بار میرا ہونچنے کے بعد پھر پلٹ آنے والی پیاس۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر وہاں موجود تھے اور وہ خاتون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے، ورنہ میں تو بس گنگ ہی بیٹھا رہا۔ وہ نہ جانے کب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر، دعا دے کر چل دیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

رات تک میرا جسم شدید بخار میں پھٹکنے لگا، بات صرف جسم تک ہی محدود ہوتی، تو میرا یہ جسم ایسے کئی عذاب بہ یک وقت جھیلنے کی ہمت رکھتا تھا، لیکن یہ صحت تو میری روح کے ریشوں کو بھی جھلسا رہی تھی۔ دل کچھ عجب انداز میں دھڑک رہا تھا، جیسے اپنی گنتی کی دھڑکنیں اس رات پوری کر کے ہی دم لے گا اور پھر اگلی صبح جب اس بے چینی کا عروج، میرے زوال کا اختتامی باب لکھنے کے قریب ہی تھا کہ اچانک پھر اسی باونیم کے مہطر اور بچھونکے نے میرے تن من کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ تو وہی مانوس خوش بو تھی، جو اس ہستی قاتل سے منسوب تھی، جس کے ہاتھوں پر میرے خون کے متبادل مہندی کا رنگ سجے کو تیار تھا۔ ہاں، یہ تو وہی مانوس ہوا تھی، جو زہرہ کی آمد سے منسوب تھی۔ میں اس وقت صحن میں آنکھیں موندے پڑا تھا اور مولوی خضر میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر پٹیاں رکھ رہے تھے۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا، مولوی خضر ”ارے..... ارے“ ہی کرتے رہ گئے، لیکن میری نظریں درگاہ کے صحن میں داخل دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ مولوی خضر نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی، لیکن داخلی راستہ تو سنان پڑا تھا۔ مولوی خضر نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ ”کیا ہوا میاں..... کس کی راہ دیکھ رہے ہو؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”وہ..... جس کی راہ کی وصول بنا میرا مقدر ٹھہر چکا ہے۔“ مولوی خضر نے دوبارہ دروازے کی جانب دیکھا ”لیکن وہاں تو کوئی نہیں ہے میاں.....“ میرے دل نے آج تک پہلے کبھی اس کی آمد کی جھوٹی گواہی نہیں دی تھی، لیکن آج درگاہ کا سنان دروازہ میرا یہ بیجا کھچا اور آخری مان بھی تو زودینا چاہتا تھا۔ میری نظر پتھر ہونے لگی اور میری آنکھ کا جھرنا بیٹے لگا اور تب ہی میری دھندلائی ہوئی نگاہ نے خرم کی والدہ کی اوٹ میں اس چاند کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے کا پتھر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہاں وہ زہرہ ہی تھی۔ وہی سیاہ لباس میں بلبلوں، ویسے ہی جیسے پانیوں پر خیرتی ہوئی راج ہنسی۔ میری آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ بصارت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا، اضافی تھا۔ زہرہ کی رنگت میں پیلاہٹ کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سارے ساحل پر سرسوں اُگ آئی ہو یا پھر درگاہ ہی پر کسی نے ہلدی کی پوری پرات الٹ دی تھی۔ وہی پلوں کی مسلسل لرزش، وہ نظریں جھکائے، خرم کی والدہ کے پیچھے، مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، لیکن کبھی کبھی چند قدم بھی صدیوں کا فاصلہ بن جاتے ہیں یا شاید ہمارا دوری کو ناپنے کا پیمانہ ہی سدا سے غلط ہے۔ دور یوں کا بھلا فاصلوں سے کیا واسطہ ٹھیک اسی لمحے، مجھے اس دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں اور ان کی تمام لغات کے محدود ہونے کے احساس نے آگھیرا۔ ہمارے لفظ اور ہماری بولیاں صرف اور صرف ظاہری جذبول اور احساسات ہی کو بیان کر پاتی ہیں۔ جسم سے جسم کے فاصلے کو ”دوری“ کہتے ہیں، لیکن روح سے روح کے فاصلے کو کیا کہا جائے۔ جو جسم کو جلائے، وہ ”آگ“ کہلاتی ہے، لیکن جو روح کو جھلسائے، اسے کیا نام دیا جائے۔ جو بولی زبان سے ادا ہو، اسے ”لفظ“ کہتے ہیں، لیکن جو دن بولے اور دن سنے ہی روح کو جھنجھوڑ جائے، اس بولی کو کیا کہیں۔ میں بھی اپنے سامنے سر جھکائے کھڑی زہرہ کی روح سے کچھ ایسی ہی بولی بول رہا تھا۔ وہ روح، جو کبھی میری ملکیت تھی، لیکن آج کسی پرانے کے تصرف کے بوجھ تلے دہلی نظر آ رہی تھی۔ خرم کی والدہ مولوی خضر سے باتوں میں مشغول تھیں ”آپ ہی اسے سمجھائیں مولوی صاحب۔ یہ تو یہاں آنے کے لیے کبھی راضی ہی نہ ہوتیں، اگر خرم ضد نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے اسے یہاں لائی ہوں۔ خرم کی طبیعت ٹھیک ہوتی، تو وہ بھی ضرور آتا، لیکن آج آپ میری ہونے والی بہو اور بیٹے کے لیے کچھ ایسی دعا کریں کہ ان کی آنے والی زندگی سے غم اور تکلیف کے سائے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔ ہم نے بہت غم دیکھے ہیں مولوی صاحب۔ اب اگر خوشی مل رہی ہے، تو دعا کریں کہ وہ بھی پوری اور پھر پور ملے۔“ مولوی خضر ہلکے سے بولے ”بی بی! میری اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ کے ساتھ سب خیر ہی کا معاملہ رہے۔ بس، اتنا جان لیں کہ خوشی نام کے جذبے کا بنیادی عنصر ہی اس کی کامیابی سے ہے۔ جو سدا کے لیے ہو، وہ ”خوشی“ نہیں رہتی، معمول بن جاتی ہے۔“ مولوی خضر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے، لیکن میرے ہاتھ گرے ہی رہے۔ میری دعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا، تو آج وہ کسی اور کی نہ ہوتی۔ میرے کانوں میں خرم کی والدہ کی بات کی بازگشت گونجتی رہی۔ ”یہ تو یہاں کبھی نہ آتی،

اگر خرم ضد نہ کرتا....." گویا آج کا یہ پھیرا بھی میرے مقدر کی دین نہیں، بلکہ اس رقیب کی دی ہوئی خیرات تھا۔ مولوی خضر نے دعا ختم کر کے زہرہ کے سر پر ہاتھ پھیرا "سدا سکھی رہو۔" خرم کی والدہ واپسی کے لیے پلٹتے پلٹتے رک گئیں۔ "ارے ہاں عبداللہ بیٹا! وہ تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ اس کی بہت کم لوگوں سے اتنی جلدی بنی ہوگی۔ تم بھی ہمارے ساتھ گھر چلو نا۔ خرم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ شام سے پہلے ڈرائیور تمہیں واپس چھوڑ جائے گا۔" مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ مولوی خضر نے جلدی سے بات بنائی۔ "عبداللہ میاں ضرور آپ کے ساتھ چلے چلتے، لیکن آج تو انہیں بخار نے بری طرح سے گھیر رکھا ہے۔ طبیعت کچھ سنبھل جائے، تو میں خود لے کر آؤں گا۔ آپ کے دولت خانے پر....." یہ میرا وہ ہم تھا، کوئی سراب تھا یا میری خوش فہمی کہ جس وقت مولوی خضر نے میری بیماری کا ذکر کیا، تو اس بے رحم کی جھکی پلکوں کی جھلک میں ارتعاش کی اک لہری پیدا ہوئی تھی۔ خرم کی والدہ میرے بخار کا سن کر پریشان ہو گئیں اور انہوں نے جلدی سے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھوا۔ ہاں بخار تو بڑا تیز ہے۔ "عبداللہ تم باقاعدگی سے اپنا علاج کیوں نہیں کراتے۔ آخر یہ کیسا روگ ہے.....؟" اور یہی وہ لمحہ تھا، جب شدید ضبط کے باوجود میری زبان گسل ہی گئی۔ "وفا کا روگ ہے مجھے..... آپ دعا کریں کہ قدرت مجھے بھی بے وفائی کا سرمایہ عطا کر دے۔" خاتون نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور میں اس شکاری کی طرح بچھٹایا، جس سے کمان سیدھی کرنے کے دوران ہی تیر پھسل چائے اور وہ اندھا تیر کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو جائے۔ میری زبان سے پھسلے تیر نے بھی اس کانچ کی شہزادی کے کورے من کو داغ دیا تھا۔ لمحہ بھر کو زہرہ کی پلکیں اٹھیں اور میرا سارا جہاں ڈھے گیا۔ میری کہانی کا آغاز بھی اسی درگاہ سے اور زہرہ کی انھی اک ایسی ہی نگاہ سے ہوا تھا اور میرا انجام بھی بس وہی ایک نظر تھی، پھر نہ جانے کب خرم کی والدہ نے مولوی خضر سے اجازت طلب کی اور کب وہ دونوں درگاہ سے واپس پلٹ گئیں، مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ میں وہیں درگاہ کے صحن میں بکھرے پتوں کی مانند پڑا رہا اور ساحل کی ہوا میرے نوسے پڑھتی رہی۔ مغرب کے قریب مولوی خضر نے زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے بٹھا دیا اور کہیں سے ایک کبل لاکر میرے لرزتے جسم پر ڈھک دیا، پر روح کی لڑزش کا کیا علاج.....؟ اتنے میں میرے قریب ہی قدموں کی آہٹ ابھری اور شام کے طلعتے اندھیرے میں کوئی سایا میرے قریب آ کر رک گیا۔ مجھ میں گردن اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی۔ پھر کسی نے اچانک بڑھ کر میرے ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا دیے۔ میں نے چہرہ پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ بختیار تھا، ہاں..... وہی "فریفتہ نصیب" بختیار..... لیکن آج اس کے چہرے پر ایک خاص چمک نظر آ رہی تھی، اس کا لہجہ ممنونیت سے بھر پور تھا۔ "آپ کی ایک دعا نے میری زندگی بدل دی۔ مجھے ازل کے صحرا سے نکال کر امید کے ایک ایسے نخلستان میں پہنچا دیا، جہاں میں نے سب پالیا ہے۔ میں آپ کا شکر یہ کیسے ادا کروں۔؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ بختیار نے یہ جان آہیر خوشی کے ساتھ بتایا کہ آخر کار اسے پوری کائنات کھونے کے بعد، وہ اک نگاہ میسر ہوئی تھی، جو صرف اور صرف اس کی مدح سرائی میں اٹھی اور پھر اسی کے لیے جھک گئی تھی۔ بختیار کے بقول، وہ ایک مجسمہ ساز تھی، جس کے ادارے کا سالانہ چندہ بختیار کے ہاں ہی سے جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے ادارے نے اس کے مجسموں کی نمائش کا اہتمام کیا، تو بختیار کو بھی بطور مہمان خصوصی وہاں مدعو کیا گیا اور تب ہی بختیار کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس حسین مجسمہ ساز، سائرہ کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے، لیکن یہ تو بختیار کے لیے معمول کی بات تھی۔ پوری زندگی وہ ایسے فریفتہ پن ہی کا شکار رہا تھا، لیکن یہ معاملہ تب "خلاف معمول" تک جا پہنچا، جب سائرہ نے بختیار کی زبانی اپنے من کی تعریف سن کر شر ماتے اور جھکتے ہوئے بختیار کے چہرے کا مجسمہ بنانے کی اجازت طلب کر لی۔ بختیار حیرت زدہ سا رہ گیا، لیکن وہ اس معصوم خواہش کو چاہتے ہوئے بھی رد نہ کر سکا۔ سائرہ، بختیار کی مصروفیات کے پیش نظر، اس کے گھر ہی پر روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آنے لگی اور بختیار کی اپنی ذاتی آرٹ گیلری ہی میں اس نے کچی منی اور پکے سے بختیار کا منت تراشا شروع کر دیا۔ تب زندگی میں پہلی بار بختیار کی جھلستی روح پر خٹلے پانی کے چند چھینٹے پڑے، جب سائرہ نے اسے یہ بتایا کہ وہ بختیار کی سوچ، خیالات اور شاعری سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اس لیے اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی جرأت کی ہے کہ خود کسی سے فرمائش کر کے اس کا مجسمہ گوندھے، آخر کار بختیار کے چہرے کا مجسمہ تیار ہو گیا اور بختیار کے بقول، اس نے آج تک کبھی اپنے آپ پر حیرا آتا محسوس نہیں کیا تھا، لیکن سائرہ کے کمال فن نے اسے بھی اتنا حسین کر دیا کہ خود بختیار کوئی گھنٹے اپنے چہرے کے تراویے اور خط سرائتا رہا۔ بختیار کا یہ ماننا تھا کہ یہ سب میری دعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ سائرہ اس کے اندر چھپے خوب صورت انسان کے چہرے کو یوں نہ گوندھ پاتی۔ میں نے بختیار کی جانب دیکھا۔ "کاش میں اتنا مستر ہوتا کہ میری دعائیں بھی قبولیت کا شرف پائیں۔ بہر حال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا خواب پورا ہو گیا۔" بختیار کچھ ہچکچایا۔ "ہاں، مگر ابھی ایک الجھن باقی ہے۔ امید ہے کہ آپ آج بھی میرے حق میں دعا کریں گے۔" میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا "کیسی الجھن.....؟" بختیار نے نظریں چرا لیں "آپ یہ دعا کریں کہ قدرت کبھی سائرہ کی بیٹائی نہ لوٹائے۔" میرے اندر ایک زوردار جھٹکا ہوا اور میری رگوں اور نسون میں وہ سب کانچ دور تک پیوست ہو گیا۔ "کیا.....؟..... کیا مطلب..... کیا سائرہ ناپید ہے..... مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ قدرت نے آپ کو آپ کے حصے کی وہ ایک نظر بخش دی ہے، لیکن اگر سائرہ دیکھ ہی نہیں سکتی تو پھر.....؟" بختیار نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ "ہاں..... یہ سچ ہے کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ سائرہ ناپید ہے، لیکن کیا ضروری ہے کہ نظر کا واسطہ صرف بیٹائی ہی سے ہو.....؟" میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا۔ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا وہ واقعی، ضروری تو نہیں کہ بختیار کے مقدر میں صرف "بیٹا نظر" ہی لکھی ہو؟ بختیار نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہ اپنی انگلیوں سے چھو کر دیکھتی ہے۔ قسمت نے اس کی انگلیوں کی پوروں میں اس کی بصارت چھپا رکھی ہے۔ میرے چہرے کا مجسمہ بھی اس نے اپنی پوروں کی بیٹائی سے چھو کر اور محسوس کر کے گوندھا تھا۔ تب ہی اس مجسمے کے چہرے پر کوئی داغ نہیں تھا، کوئی سلوٹ، کوئی بدنما زانو یہ نہیں تھا۔ مجھے اسی شام یہ احساس بھی ہوا کہ کبھی کبھی مجھے جیسے بد بینتوں کے لیے بصارت بھی کس قدر بڑا عذاب بن جاتی ہے۔ کاش میں بھی سائرہ کی طرح ناپید ہوتا اور قدرت میری انگلیوں کی پوروں کو بھی سائرہ جیسی خوب صورت بیٹائی عطا کر دیتی..... کاش....." بختیار بو لے چلا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، میرے من سے ایک ایسا ٹھنڈا بیٹھا تھا، جو اپنی محبوب کے لیے سدا کی بے بصیرتی کی بددعا لینے کے لیے یہاں تک آیا تھا، کیوں کہ اسے خوف تھا کہ بیٹائی لوٹ آنے کے بعد اس کے نصیب کی نظر ہمیشہ کے لیے پلٹ جائے گی، پھر سے وہی نفرت اس کا مقدر ہوگی، جو جنم سے اب تک اس کی روح کو چھلنی کرتی آئی ہے، لیکن تم یہ تھا کڈا کنڑوں کے حساب سے سائرہ کی نظر واپس آ سکتی تھی، بات صرف اس کے جوڑ کے خلیے والی پتلیوں کے ملنے تک کی تھی اور بختیار یہ چاہتا تھا کہ یہ وقفہ بختیار کی موت سے پہلے تک کبھی مکمل نہ ہو۔ بختیار جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش، شدید خود غرضی کے زمرے میں شمار کی جائے گی، لیکن وہ بے بس تھا، شاید زندگی میں ہم سب کبھی نہ کبھی ایسی خود غرضی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ بختیار نے مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر جلدی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔ "آپ میرے لیے دعا کریں گے نا! دیکھیں میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ بھیجے گا واپس....." "آپ نے ٹھیک کہا۔ نظر کا بھلا بیٹائی سے کیا واسطہ.....؟ اور یہ بھی سچ ہے کہ کبھی بیٹا وہ نظر نہیں رکھتے، تو پھر ہم دونوں مل کر یہ دعا کیوں نہ کریں کہ خدا سائرہ کو بیٹائی کے ساتھ ساتھ آپ کے مقدر کی وہ ایک نظر بھی عطا کر دے۔" وہ بے چین سا ہو گیا "بات صرف میری نہیں ہے۔ ہماری بصارت کی دنیا سائرہ کی پوروں والی دنیا کے مقابلے میں انتہائی بد صورت ہے۔ یہاں صرف میں ہی بد نما نہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کر پائے گی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔" "ٹھیک ہے..... لیکن دعائیں عرش پار کر جائیں تو پھر واپس نہیں پلٹا کریں۔ اس لیے دعا مانگتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کل شام تک دوبارہ مہوچ لیں۔ اگر پھر بھی آپ کا یہی فیصلہ رہا، تو ہم دونوں مل کر اللہ کے دربار میں اس بددعا کی عرض بھی ڈال دیں گے۔" اچانک میرے عقب سے وہی روح کھینچ لینے والی ملائمتی آواز ابھری "اگر بددعا ہی کسی سیاہ نصیب کی دنیا کو بدلنے کا ایک واحد ذریعہ ہے، تو ایک بددعا میرے حق میں بھی فرما دیجیے۔"



.....ہاشم تہیر.....

ہاں..... وہ زہرہ ہی تھی۔ اگر بختیار میرے سامنے نہ بیٹھا ہوتا، تو میں اسے ایک خواب ہی سمجھتا، لیکن وہ تعبیر تھی، میری نہ سہی..... کسی اور کے خوابوں ہی کی سہی..... لیکن زہرہ یوں شام ڈھلے اور اس طرح اکیلی یہاں.....؟ میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ بختیار کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک تھی۔ اس نے ایک جانب ہو کر دھڑکے لیے جگہ خالی کی اور زہرہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آج بھی پلکوں کی وہی ”لڑزش بیکراں“ میرے اندر کی دنیا اٹھل پٹھل کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے کائنات تھم سی گئی اور پھر اس کے لب بٹے۔ ”خرم کی امی آپ کا نیچے گاڑی میں انتظار کر رہی ہیں۔ خرم بھی ان کے ساتھ ہیں، وہ اوپر تک نہیں آسکتے اس لیے.....“ میرے اندر زور کا تھکڑو چلا اور میرے دل کی ڈالی پر بچا، آخری پتہ بھی ٹوٹ کر خاک میں جا ملا۔ گویا اب میرا نصیب بھی میرا رقب لکھے گا۔ میں نے بختیار سے معذرت طلب کی، لیکن میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوتا چلا گیا۔ ”معافی چاہتا ہوں..... مجھے کچھ دیر کے لیے درگاہ سے باہر جانا ہوگا۔ آپ تو بددعا لینے کے لیے خود یہاں تک چل کر آئے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کو بددعا بھی اپنے دروازے پر درکار ہوتی ہے۔ وہ خود اٹھ کر کسی کے در پر نہیں آتے، اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔“ زہرہ نے میری بات کا گھاؤ محسوس کر کے بھی اپنی نظر جھکائے رکھی۔ بختیار جو حیرت سے ہم دونوں کی حالت دیکھ رہا تھا، کچھ بڑبڑا سا گیا۔ ”جی جی..... ضرور کیوں نہیں..... میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا، آپ سائل کی سن لیں.....“

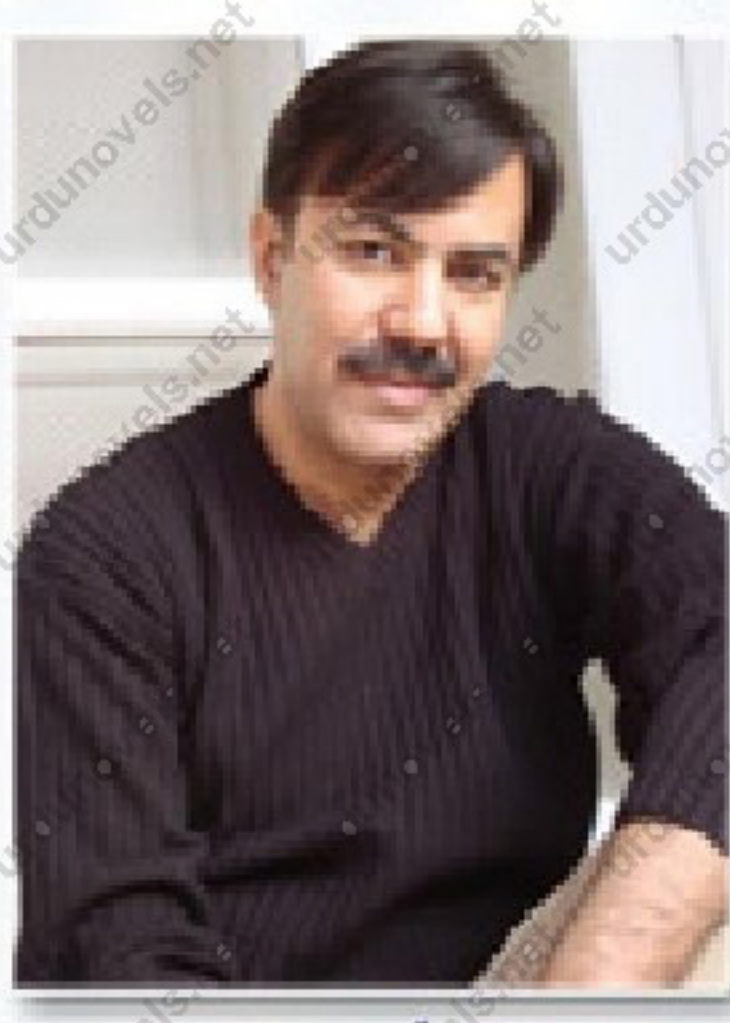
”جانے ہم دونوں میں سے سائل کون ہے اور سوالی کون.....؟“ بختیار میری بات سن کر اٹھتے اٹھتے ایک بار پر ٹھٹھک کر رک گیا اور پھر موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے سلام کر کے، وہاں سے چل دیا۔ میں اور زہرہ درگاہ کے صحن میں اکیلے رہ گئے۔ زہرہ کی پلکیں کچھ نم سی ہونے لگیں، میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ ”چلیں..... میں حاضر ہوں“ میں نے قدم آگے بڑھائے۔ زہرہ کی آواز نے میرا تعاقب کیا۔ ”سنیں.....“ میں رک گیا، لیکن پلٹ کر اسے نہیں دیکھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ یہ وہ ظلم ہے، جو پلٹ کر دیکھنے والوں کو پتھر کا بنا دیتا ہے۔ ”میں آپ سے معافی نہیں مانگوں گی، کیوں کہ کچھ جرم اپنی سزا خود اپنے آپ ہوتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی آپ کے سامنے دوبارہ نہ آتی، لیکن ساری بات ہی اختیار کی ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ میں بے اختیار اور مجبور تھی۔“ کاش وہ اتنی وضاحت بھی نہ کرتی۔ جانے ہم ہمیشہ انہی ہستیوں کے سامنے اپنا سارا ضبط کیوں کھو بیٹھتے ہیں، جن کے سامنے ہمیں ضبط کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے اپنا سارا ضبط کھو بیٹھا اور تڑپ کر پلٹا، وہ سر جھکائے اپنا کانپتا وجود سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کم از کم آپ کی زبان سے یہ مجبوری کا حیلہ بہت عجیب لگتا ہے۔ میں نے آپ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی، نہ ہی آپ کو اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ لیے رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں کافی محتاط ہوتی ہیں۔ ایسے میں اگر انہیں کسی معذوری کے قریب تر دیوانے اور کسی شہزادے، امیر زادے کے درمیان کسی ایک کا چناؤ کرنا ہو، تو فیصلہ وہی ہوگا، جو آپ نے کیا۔ ساری عمر کے لیے کسی معذوری کی بیساکھیاں بننے سے بہتر ہے، کبھی مضبوط شانے کا سہارا بن کر زندگی گزار دی جائے۔ مجھے اس فیصلے پر آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ میں نے اپنی ترغیض کے سب سے تیر خالی کر دینے کے بعد دوبارہ قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے دم توڑتے گھانگ کی آخری ڈوبتی آواز سنائی دی۔ ”آپ کو حق ہے مجھ سے نفرت کرنے کا۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ گھر سے چلتے ہوئے میں نے کچھ سطریں لکھی تھیں، وقت ملے تو انہیں پڑھ لیجیے گا۔“ زہرہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک تہہ شدہ ورق میرے حوالے کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں اس سے یہ بھی نہ کہہ پایا کہ ”نفرت“ محبت کا سب سے خطرناک روپ ہوتا ہے اور شاید محبت سے بھی کہیں زیادہ خالص اور سچا روپ۔ میں درگاہ کی سیڑھیاں اتر کر زہرہ کے نقش قدم پر چلتا ہوا جب نیچے پہنچا، تو مجھے دیکھ کر خرم کی والدہ جلدی سے گاڑی سے نیچے اتر آئیں، لیکن خرم حسب معمول گاڑی ہی میں بیٹھا ہا۔ آج وہ ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے مقابل والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے آج بھی پیلاہٹ جھلک رہی تھی، مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ”بڑے مغرور ہو میرے مہیا۔ آخر مجھے یہاں تک آنا پڑا۔“ خرم کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گھور کر اپنے بیٹے کو تنبیہ کی۔ ”شہزاد..... تیز سے.....“ تب میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ خرم کی امی جب بہت پریشان یا سنجیدہ ہوتیں، تو خرم کو شہزاد بلاتی تھیں۔ ”میرے پاس غرور کے قابل کچھ نہیں ہے، سب مان، سارے غرور نوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں۔ میں تو اب بس خاک کا ایک ڈھیر ہوں۔ غرور اور فخر کے گئے تو آپ جیسوں پر سجتے ہیں، جنہیں ایک کائنات میسر ہے۔ اپنا نصیب تو بس داغ ہی ہیں۔“ خرم نے چونک کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”میری..... میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا عبداللہ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری کائنات میں بس ایک ہی قابل فخر گہنا ہے۔ میرے پاس بھی بس ایک غرور ہی تو باقی بچا ہے، جس سے میری ساری کائنات منور ہے۔“ خرم نے مسکرا کر زہرہ کی جانب دیکھا، وہ جو کبھی میرا مان تھی، آج کسی اور کا غرور تھی۔ اس دنیا میں تخت لٹے اور تاج بدلنے کب دیر لگتی ہے۔ کل کے بادشاہ، آج کے بھکاری بنے پھرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ مولوی خضر نے خرم کے لیے سہ پہر کو پانی پر دم کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے خرم کی والدہ سے کہا کہ وہ خرم کو اوپر درگاہ پر لے چلیں، تاکہ مولوی صاحب ہی اسے وہ پانی بھی پلا دیں، لیکن مجھے یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ میری بات سنتے ہی ان کے چہرے پر ایک عجیب سا تردد چھا گیا۔ انہیں ہچکچاتے دیکھ کر میں نے خرم سے کہا کہ دھکڑی کے لیے وہ میرے ساتھ درگاہ کے حجرے تک آجائے، تاکہ مولوی خضر سے بھی اس کی ملاقات ہو جائے۔ خرم کسی سوچ میں پڑ گیا، جیسے میں نے کوئی بہت ہی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ زہرہ کے چہرے پر بھی کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ تینوں خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے، پھر خرم نے جسے کوئی فیصلہ کر لیا اور اس کے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ لوٹ آئی۔ ”اچھا چلو..... ہم بھی یہ معرکہ سر کر رہی لیتے ہیں، ورنہ تم یہی سوچو گے کہ یہ کیسا مغرور اور سر بھرا امیر زادہ ہے، جو خود اپنے مطلب کے لیے بھی دو قدم چل کر اوپر نہیں آسکتا۔“ خرم نے اپنے ڈرائیور کی جانب دیکھا، جو جلدی سے گاڑی سے اتر کر خرم کے دروازے کی جانب بڑھ گیا، لیکن خرم کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کوئی چیز نکالی اور پھر خرم کی نشست والا دروازہ کھول دیا۔ میرے وجود کے اندر ایک دھماکہ ہوا اور کچھ دیر کے لیے ارد گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں دو بیساکھیاں تھیں اور گاڑی میں بیٹھے خرم کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے مھنوی تھیں۔ ڈرائیور نے سہارا دے کر خرم کو گاڑی سے باہر نکالا اور بیساکھیاں اسے تھما دیں۔ خرم نے کچھ لڑکھڑا

کر پہلا قدم اٹھایا۔ میں سوچنے بھننے سمیت اپنے تمام حواس کھوپکا تھا۔ گویا خرم اس معذوری کی وجہ سے آج تک کبھی گاڑی سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے کار کے گھج اور ایکسلیٹر کا وہ مخصوص خود کار نظام بھی دیکھ لیا، جو خاص طور پر معذور افراد کی گاڑیوں میں نصب کیا جاتا ہے۔ خرم نے ڈمگاتے ہوئے دوسرا قدم اٹھایا اور ڈرائیور کے سہارے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ اٹھنے میں اوپر سے مولوی خضر کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ارے میاں..... تم وہیں رکو..... میں نیچے آ رہا ہوں۔“ مولوی خضر ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے اور انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے خرم کو چند گھونٹ پانی پلا دیا، جو ان دو قدموں کے سفر میں بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ بہت بٹا کھڑا رہ گیا۔ خرم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”میں نے کہا تھا نا..... میرے پاس نخر کرنے کی بس ایک ہی وجہ رہ گئی ہے، لیکن یقین مانو، یہ آخری مان اور بھرم ہی اس ایک زندگی کو کنارے لگانے کے لیے کافی ہے۔“ ڈرائیور نے خرم کو پھر سے سہارا دے کر گاڑی کے اندر بٹھا دیا۔ خرم کی والدہ اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی نظر آئیں۔ زہرہ ویسے ہی سر جھکائے اپنا پیلا چہرہ چھپاتی، کار کی پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ مولوی خضر نے خرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب دیکھ کر دھیرے سے کھانے۔ میں جیسے کسی خواب کے اثر سے نکل کر، ہوش کی دنیا میں پہنچ گیا، لیکن تب تک خرم کا ڈرائیور گاڑی کے انجن کو بیدار کر چکا تھا۔ میرا ہاتھ ہوا میں اٹھا رہا تھا اور خرم کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں گاڑی کے پچھلے پہیوں کی رگڑ سے فضا میں اڑتی ریت کے ساتھ دھول ہوتا چلا گیا۔ میں جاننا تھا کہ مولوی خضر نے خرم کو الوداع کہنے کے لیے کھٹاکر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی کہ تہذیب اور آداب کا یہی تقاضا تھا، لیکن خرم کی معذوری دیکھنے کے بعد میں اپنے حواس میں تھا ہی کب.....؟ کاش دنیا کے سب ہی دیوانوں کے ماتھے پر قدرت ہوش چھینٹے ہی کوئی واضح مہر ثبت کر دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان کی جبین پر پڑے داغ کو دیکھ کر ہی دوسرا ان سے کسی ادب آداب یا تہذیب کی کوئی امید نہ رکھتا۔ نہ جانے میں کس طرح لرزے قدموں کو سنبھالنا، واپس درگاہ کے صحن تک پہنچنا۔

آج سمندر کی لہروں کی بھی آپس میں کوئی جنگ چل رہی تھی شاید..... اسی لیے ان کے چنگھاڑنے اور لڑنے کی آوازیں درگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھیں، لیکن اس شور سے کئی گنا زیادہ شور اس وقت خود میرے وجود کے سمندر میں اٹھ رہا تھا۔ سماعتیں معطل کر دینے والا شور، شاید بہت شدید اور حدود کو پار کر جانے والا شور بھی خاموشی ہی کی ایک قسم بن جاتا ہے۔ ایسی ہی کسی لرزتی خاموشی کی سماعت میں، میں نے اپنے کانچے ہاتھوں سے زہرہ کا دیا ہوا کاغذ کھولا۔ میں زہرہ کی تحریر کو خط کہہ کر اس کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضروری تو نہیں کہ ہر نامہ ”خط“ ہی ہو یا پھر ”خط“ کسی کی تحریر ہی سے جڑا ہو؟ کچھ تعلق خط سے بڑھ کر بھی تو ہوتے ہیں اور کچھ ”خط“ لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ آنسوؤں سے بھیگی میری دھندلی نگاہ، ان سیاہ موتیوں پر پھینکنے سے پہلے تعظیم کے تمام تقاضے پورے کرنا نہیں بھولی۔ وہی دل میں اتر جانے والی تحریر اور وہی اندازِ تکلم، کون کہتا ہے کہ ثبات صرف ایک تغیر کو ہے.....؟ اور بھی کچھ ایسا ہے کہ جس کی دل کشی سدا قائم رہنے والی ہے۔ میں نے بہ مشکل اپنی نظر کاغذ پر جمائی۔ ”میں جانتی ہوں کہ اب میرا کوئی بھی لفظ آپ کے زخموں کا مرہم نہ ہو سکے گا۔ شاید کچھ لوگ پیدا ہی سدا زخم دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں آپ کی راہ میں پھول بچھاؤں، لیکن اپنے مقدر کے کانٹے بھی آپ کے راستے میں پرودوں کی، ایسا بھلا کب سوچا تھا؟ آپ کی ہر بدگمانی جائز ہے اور اگر میرا اور آپ کا دوبارہ سامنا نہ ہوتا، تو شاید میں ان ہی بدگمانیوں کے پتے سائے تلے، اپنی باقی تمام زندگی گزار دیتی، کیوں کہ کبھی کبھی یہ بدگمانی ہی کسی کے جینے کا سہارا بن جاتی ہے۔ آپ کا مجھ سے بدگمان رہنا ہی خود آپ کے لیے بہتر تھا، لیکن میری بے بسی کی انتہا دیکھیے کہ میں اپنے حق میں کسی کی عمر بھر کی بدگمانی کی حق دار بھی نہیں رہی۔“ میری نظریں تیزی سے خط کے منظر نامے کو اپنے ذہن کے پردے پر منتقل کرنے لگیں۔

زہرہ کی کہانی ٹھیک اسی دن سے شروع ہوتی تھی، جس دن میری داستان کا اختتام لکھا تھا۔ اس دن ”کاسا بلا نکا“ کو زہرہ کے شہر کے اسی ساحل پر لنگر انداز ہونا تھا، جہاں اس کی ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زہرہ کو ساحر کا پیغام مل چکا تھا کہ وہ زہرہ کو بندرگاہ کے ساحل پر پہلا قدم دھرتے ہی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے کہ یہی تو وہ ساحل تھا، جہاں ساحر کے دل نے آخری بار لنگر انداز ہو کر زہرہ کے قدموں میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ساحر کو سفر پر نکلے آج چھ مہینے پورے ہو رہے تھے اور یہ بات صرف زہرہ کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے یہ چھ ماہ کس طرح پل پل کر کے کانٹے تھے، لیکن آج کا دن کانٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جہاز سہ پہر کو لنگر انداز ہونے والا تھا، مگر کبھی کبھی یہ دن اتنا طویل کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کا پہلا پہر ہی سال با سال کی طرح ڈھلتا ہے۔ زہرہ بھی بہ مشکل دوسرے پہر تک انتظار کی سولی پر خود کو ٹانگ سکی اور پھر دو پہر کو آٹے والے ڈرائیور کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے گاڑی نکالی اور بندرگاہ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ وہ اپنی دھن میں اتنی سرشار تھی کہ اسے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ روزانہ کی طرح ایک اسپورٹس بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پوش، اس کی گاڑی کے پیچھے چل پڑا ہے۔ سیاہ رنگ کا ہیلمٹ پہنے یہ نو جوان گزشتہ چند روز سے زہرہ کے گھر کے آس پاس ہی منڈلا مار رہا تھا اور جیسے ہی زہرہ ڈرائیور وغیرہ کے ساتھ کسی بھی مقصد سے گھر سے باہر نکلتی، تو وہ اس وقت تک زہرہ کی گاڑی کا طواف جاری رکھتا، جب تک وہ واپس گھر نہیں پہنچ جاتی۔ زہرہ سے پہلے زہرہ کے ڈرائیور نے یہ بات محسوس کر لی تھی اور اس نے ایک آدھ بار رنگ کر موٹر سائیکل سوار سے یہ پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ وہ کیوں گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے، لیکن ڈرائیور کے گاڑی سے اترتے ہی وہ ہیوی بائیک ایک زوردار ایکسلیٹر کے ساتھ فرائے بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ ڈرائیور نے زہرہ کی توجہ بھی اس جانب مبذول کروائی۔ ابھن تو زہرہ کو بھی ہوئی، مگر اس نے ڈرائیور کو یہ بات گھر میں کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا، کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے والدین بلاوجہ پریشان ہوں۔ ہاں البتہ زہرہ نے خود گھر سے نکلنا کم کر دیا اور اگر کسی اشد ضرورت سے گھر سے باہر جانا بھی پڑتا، تو وہ دن کے اجالے ہی میں کام نمٹا کر جلد از جلد واپس گھر پہنچنے کی کرتی، لیکن اس روز ساحر کے آنے کی خوشی میں وہ تمام احتیاطیں بھلا بیٹھی اور اسے ہوش تب آیا، جب اس نے ایک قدم دے ویران سڑک پر اسی نیلے رنگ کی ہیوی اسپورٹس بائیک کو اپنی گاڑی کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ زہرہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، کیوں کہ وہ نہایت معمولی سی رفتار کے ساتھ گاڑی چلانے کی عادی تھی۔ اسے تیز رفتاری کا بالکل بھی تجربہ نہیں تھا، جب کہ اس وقت وہ بائیک سوار اس کی گاڑی کے پچھلے ہمسر سے بالکل چھوٹے ہوئے اپنی بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا آ رہا تھا۔ زہرہ نے بھی بوکھلا کر گاڑی کی رفتار بڑھادی، مگر فاصلہ

بڑھنے کے بجائے مزید کم ہوتا چلا گیا۔ زہرہ کا پاؤں ایکسپلر میٹر پر دھتا چلا گیا اور سرسبز کا بھرپور طاقت و راجن اپنے وحشی زور کے نل پر بے قابو ہونے لگا اور پھر جب ایک معروف سڑک پر موڑ کا منٹے ہی اچانک اشارہ سرخ ہو گیا، تو زہرہ سے گاڑی سنبھالنا مشکل تر ہو گیا۔ غلٹ میں لگائی گئی بریک نے سرسبز کے چاروں پہیے تو تارکول کی سڑک پر بچو ست کر دیے، لیکن گاڑی کی بقیہ گاڑی اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے بری طرح جھول کر گھومی اور پیچھے سے آتی ہیوی بانیک زوردار آواز کے ساتھ گھومتی ہوئی گاڑی کے دروازے والی طرف سے ٹکرائی۔ موٹر سائیکل سوار اس طرح ہوا میں اچھلا، جیسے کسی توپ کا ٹکڑا کوئی گولا، فضا میں قلاباڑیاں کھاتا گاڑی کے اوپر سے ہوتا ہوا، دوسری جانب سڑک پر دم سے گر کر بے سدھ ہو گیا، لیکن آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے بائیں جانب سے ایک کار کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا، سوار نے کسمسا کر اپنا وجود بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر کروٹ بد لنے کی کوشش کی، لیکن کار رکتے رکتے بھی اس کی گھائل ٹانگوں کو روند گئی۔ فضا میں خون کے چند چھینٹے اڑے اور زہرہ جس کا سر جھٹکے کی وجہ سے زوردار طریقے سے اسٹیرنگ سے ٹکرا چکا تھا، یہ سب دیکھ کر وہیں بیٹھے بیٹھے ڈھے گئی اور جب اسے ہوش آیا، تو رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال آیا کہ ساحر کا جہاز بند گارہ پر لنگر انداز ہوا ہوگا اور جب ساحر نے زہرہ کو وہاں اپنے استقبال کے لیے نہیں پایا ہوگا، تو وہ کتنا پریشان ہوا ہوگا؟ ضرور ساحر نے زہرہ کے گھر پر بھی رابطے کی کوشش کی ہوگی، لیکن گھر پر نوکروں کے سوا اور کون تھا، جو اسے کوئی تسلی بخش جواب ہی دے پاتا۔ زہرہ نے ڈاکٹروں سے پہلا سوال اس اسپورٹس بانیک والے گھائل کے بارے میں پوچھا، لیکن جواب میں اسے نیند کا انجیکشن ملا اور زہرہ اپنے سر میں اٹھتی ٹیسوں سمیت پھر سے غافل ہو گئی۔ شاید یہ ٹھیک وہی لہو تھا، جب دوسری جانب ساحر اپنے حواس کھو رہا تھا اور پھر جب تک دو دن بعد زہرہ کے ہوش سنبھلے، تب تک ساحر اپنے جنوں کے آخری دورے سے گزر کر لندن کے لیے پرواز کر چکا تھا، لیکن زہرہ کے لیے کا آخری بھی لکھا جانا تھا۔ ایک نئی قیامت اسی اسپتال کے ایک کمرے میں ان کا انتظار کر رہی تھی، جہاں اس کی گاڑی سے ٹکرا کر گرنے والا موٹر سائیکل سوار، موت و زندگی کے اس دورا ہے پر کھڑا تھا، جہاں سے کچھ کم خوش نصیب ہی واپس پلٹتے ہیں اور یہ دیکھ کر زہرہ کی روح ہی اس کے بدن سے نکل گئی کہ اس نوجوان کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے غائب تھیں۔ کار نے اس بری طرح سے انہیں کچل ڈالا تھا کہ ڈاکٹروں کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ذرا سا مزید انتظار سارے جسم میں زہر پھیلنے کا باعث بن سکتا تھا۔ نوجوان کا نام خرم شہزاد تھا اور اس کے نڈھال والدین بھی وہیں موجود تھے۔ زہرہ تو ٹھیک طرح سے انہیں آداب بھی نہیں کہہ پائی۔ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مطابق بظاہر یہ ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کا کیس تھا، جس میں سراسر غلطی زہرہ کی تیز رفتاری اور اچانک بریک تھی، لیکن خرم کے والد نے پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ خود بھی شہر کے بڑے متوئل تھے اور براہ راست زہرہ کے والد حاجی مقبول کو نہ جاننے کے باوجود، وہ ان کے بڑے خاندان اور رتبے سے واقف تھے۔ خرم نے پہلی مرتبہ ہوش میں آتے ہی پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ غلطی زہرہ کی نہیں تھی، وہ خود ہی نہایت تیز رفتاری کا عادی تھا۔ زہرہ کے والدین کو بھی اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر خرم کا خاندان جذبات میں آکر زہرہ کے خلاف شکایت درج کر دیتا، تو انہیں اپنی بیٹی کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی اور معاشرہ کس کس انداز میں انہیں تیروں کا نشانہ بناتا، لیکن یہ ان کی بھی خوش قسمتی تھی کہ ان کا پالا ظرف والوں سے پڑا تھا۔ ہاں مگر اگلے کے ظرف کا پوجہ اٹھانا بھی تو صرف ظرف والوں کا ہی خاصہ ہے، جنہی تو زہرہ کے والدین بھی گزشتہ تین روز سے خرم کے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے سے لگے کھڑے تھے، مگر جن کا جوان بیٹا عمر بھر کے لیے معذور ہو چکا ہو، ان کا دکھ کوئی کیا تاپے.....؟ خود خرم کی اپنی دنیا ہمیشہ کے لیے لٹ چکی تھی۔ وہ تیز رفتاری کا دل دادہ اور زندگی سے بھی ایک قدم آگے چلنے کا عادی تھا، مگر وقت نے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے قدم ہی کھو بیٹھا، مگر آفرین ہے اس کی زندہ دلی اور ہمت پر کہ اس نے اپنے والدین کی اگلی اولاد ہونے کا خوب حق ادا کیا اور اپنے ہونٹوں کی ازلی مسکراہٹ کو لبوں سے جدا نہیں ہونے دیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا، تو پھر اس کے ماں باپ کی کرچیاں بھی کوئی نہیں سنبھال پائے گا، لیکن ابھی کسی اور کے من کے آئینے میں دراڑ آنا باقی تھا۔ قدرت جب زندگیاں بدلنے کا فیصلہ کر لیتی ہے، تو پھر ہر دعا، بد دعا میں تبدیل ہونے لگتی ہے، خرم نے پہلی تہائی پاتے ہی زہرہ کو بتا دیا کہ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے صرف زہرہ کی ایک جھٹک دیکھنے کے لیے پہروں اس کی کونھی کے چکر کا قارہا ہے۔ خرم نے زہرہ کو پہلی مرتبہ کتابوں کی ایک پڑی نمائش میں غالب اور میر میں گھرے دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ زہرہ کا نقاب سے جھلکتا خیرہ کن حسن، اس کے دل پر بجلی کی چمک کی طرح کوند اور ہل بھر میں ہی سب بھسم کر گیا، لیکن کون جانتا تھا کہ خرم کی اس پہلی نظر کا انجام اس کی ازلی معذوری کی صورت میں نکلے گا۔ خرم کی حالت حادثے کے دن سے لے کر اب تک غمتی، بگڑتی رہی تھی۔ خون کے حد سے زیادہ اخراج اور پھر ایک طویل آپریشن نے اس کی رگوں سے جان کھینچنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن زہرہ کو دیکھتے ہی اس کے اندر پھر سے جینے کی خواہش جاگ اٹھتی تھی اور پھر ایسے ہی ایک لمحے میں جب بنفیس ڈوبنے لگیں، تو خرم نے زہرہ سے اس کا سدا کا ساتھ مانگ لیا۔ فیصلہ کرنے کی آزادی زہرہ کو میسر تھی اور خرم نے ”نہ“ کا حق بھی اسے تقویض کر دیا تھا، لیکن کبھی یہ حق اور یہ ”اختیار“ خود انسان کے لیے سب سے بڑی زنجیر بن جاتا ہے۔ زہرہ ابھی خرم کو یہ بتا ہی نہیں پائی تھی کہ اس کی روح پہلے سے ساحر کی راہ میں پلکیں بچھائے منتظر ہے، کیوں کہ خرم کی غمتی بگڑتی حالت کو قرار نہ تھا۔ زہرہ نے خود کو گھر میں بند کر لیا۔ خرم کی معذوری ہی زہرہ کی سب سے بڑی مجبوری غمتی چلی گئی، کیوں کہ وہ اب بھی گھٹیں نہ کہیں، اس کی اس حالت کا ذمے دار خود ہی کو سمجھتی تھی، حالاں کہ خرم نے خود اپنے والدین سے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اپنی اس معذوری کے بعد، وہ خود کو کسی طور بھی زہرہ کے قابل نہیں سمجھتا اور زہرہ کے انکار کا اسے صدمہ ضرور ہوگا، پر اچنبھا نہیں۔ کیوں کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی عمر بھر کے لیے کسی معذوری کی بیساکھیاں بننا پسند نہیں کرے گی۔ زہرہ تک خرم کے یہ خیالات بھی خرم کی ماں کے دیلے ہی سے پہنچے اور زہرہ یہ جانتی تھی کہ وہ خرم کو انہی کے ذریعے یہ پیغام پہنچائے کہ اس کی ”نہ“ کی وجہ خرم کی معذوری نہیں کوئی ”اور“ ہے۔ لیکن کچھ پیغام ہمیشہ ہونٹوں میں دبے اور کچھ باتیں ہمیشہ ان کی پوری صحت یابی اب دوا سے زیادہ اس کی قوت ارادی پر منحصر ہے اور خرم کی ماں کو یہ پتا تھا کہ اس کا بیٹا اب زندگی کی طرف تب ہی لوٹ پائے گا، جب اسے دوسرے کنارے پر زہرہ اپنا انتظار کرتی ملے گی، ورنہ خرم کا بخار اب اس کی سانس کے ساتھ ہی ٹوٹے گا۔ خرم کا پیغام آئے آج ساتواں دن تھا اور اتنے ہی خرم کی مسلسل اور لگا تار حرارت ہونے کو آئے تھے۔ ابھی زہرہ اسی شش و پنج میں تھی کہ اسپتال سے خرم کی والدہ کے لیے جلد بچنے کا پیغام آ گیا۔ خرم کی سانس پھر سے اکھڑنے لگی تھی۔ وہ سب بھاگ بھاگ اسپتال پہنچے تو اس ابتر حالت میں بھی زہرہ کو اپنے سامنے دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمرے سے نکلتے ہوئے خرم کی ماں سسک پڑی اور اس نے زہرہ کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ زہرہ نے روتے ہوئے ان کے جڑے ہاتھ کھول کر اپنے مقدور کے سب دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ زہرہ کے والدین کے ہاتھ تو حادثے والے دن ہی سے بندھے ہوئے تھے، لیکن زہرہ نے اپنے گھر والوں کے سامنے واحد شرط یہی رکھی تھی کہ ماضی کے سنہری دھاگوں سے نانا تاؤڑنے کے لیے شہر والی کونھی چھوڑ کر مضافات والی حویلی میں بسیرا کیا جائے۔ پرانے گھر کے نوکروں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ نئے ٹھکانے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ زہرہ کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ ساحر کو یہ سب بتا کر اس کے جنوں کو دیوانگی کی آخری حد تک پہنچا دے یا پھر خاسوشی سے سب کچھ سہ کر ساحر کے ٹھیک ہو کر پلٹ آئے تب خود کو کہیں بچھا لے، بدگمانیوں کو اس حد تک ہوا دے کہ ہلکی آنچ بھڑکتی ہوئی آگ میں بدل جائے اور ساحر سے ہر شے جل کر بھسم ہو جائے۔ زہرہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اس میں اسے سب کا بھلا نظر آیا، لیکن نصیب تدبیر سے ہمیشہ ایک قدم آگے کی چال چلتا ہے کہ زہرہ کا سامنا ایک بار پھر ساحر سے ہونا بھی تو اسی مقدور نے طے کیا تھا۔“ میں نے لرزتے ہاتھوں سے زہرہ کا خط تہہ کیا، مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب آسمان نے میرے آنسو دھونے کے لیے اپنی بوندوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں برستی بارش میں درگاہ کے محن میں بیٹھا بیٹھا زہرہ کی تحریر کے لفظ وصل کر محن میں بہتے چلے گئے۔ کاش، میرے نصیب کی تحریر بھی اتنی ہی کچی ہوتی کہ میرے آنسوؤں سے وصل جاتی۔ میرے ذہن میں پھر اسی مجذوب کی پیش گوئی گونجی۔ ”تجھے خدا ہی ملے گا..... نہ وصال صنم..... (بانی آنسو)“



..... ہاشم ندیم

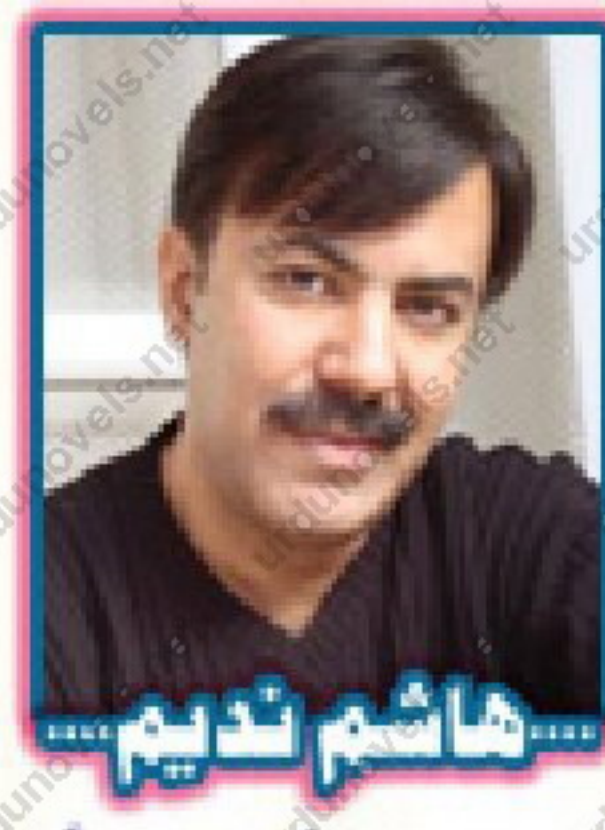
زہرہ کی تحریر نے ایک ہی پل میں ہی میرے اندر کی تمام دنیا تلپٹ کر دی۔ سیدھ میں تو پہلے بھی کچھ نہ تھا، مگر اس کاغذ نے رہا سہا بھی سب الٹ دیا۔ کبھی کبھی انسان کی برسوں کی ریاضت بھی بس ایک لمحے کی نذر ہو جاتی ہے، دل پلٹ جاتے ہیں اور ہمیں اسی وقت تک کا سب کیا دھرا محض ایک بے مقصد مشق لگنے لگتا ہے۔ شاید انسانی سوچ سن آج تک جتنے بھی انقلابات رونما ہوئے ہیں، وہ سب اسی ایک لمحے کی کاپی پلٹ کا کرشمہ ہیں، پھر کون طوفان سے لڑ کر ساحل تک پہنچے اور کون بد نصیب اس لمحے کا شکار ہو کر بے سکون ساحل سے پیچھا چھڑا کر خود کو پھرتے طوفانوں کے حوالے کر جائے، اپنی اپنی قسمت۔ میرے دل بھی پلٹ گیا۔ ایک لمحے ہی میں میرے اندر یہ سوال شدت سے ابھرا کہ آخر اس بے مقصد سفر کا حاصل کیا تھا۔ کیا قدرت نے یہ سارا کھیل زہرہ کو خرم سے ملانے کے لیے کھیلایا؟ کیا میرا کردار اس کہانی میں بس اس قدر تھا۔ میں نے زہرہ کی تحریر کا آخری صفحہ پلٹا اور تب ہی اندر سے ایک تہہ شدہ رقعہ گر پڑا۔ شاید کوئی اہم بات باقی رہ گئی تھی، جسے الگ سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اسی بے خیالی میں رفتے کی تہہ کھولی اور اندر لکھی تحریر نے میری روح کا آخری ریشہ بھی اویڑ دیا۔ یہ وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرہ کو بھیجی تھی۔ میری نظر ڈبڈبائے لگی۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے،.....“ نظم میری اپنی، لیکن تحریر زہرہ کی تھی۔ اس نے دوبارہ وہی سطر میں مجھے لکھ بھیجی تھیں۔ ”سنو..... تمہاری وفا پہ مجھ کو..... یوں تو پورا یقین ہے..... مگر..... میرے اندر کا شور بڑھتا گیا..... سو، گر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے، تو ان راتوں سے نفرت نہ کرنا، جن پر کبھی ہم ساتھ مل کر چلے تھے.....“ تیز ہوا کا ایک جھونکا میری آنکھ سے بہتے آنسو کا رستہ بدل گیا ”ان باتوں سے نفرت نہ کرنا، جو کبھی ہم نے تمہائی میں کی تھیں..... ان خوابوں سے نفرت مت کرنا..... جو کبھی ہم نے ساتھ مل کر دیکھے تھے.....“ مجھے ایک دم ہی وہ سب ہی تیر یاد آ گئے، جو میں نے یکے بعد دیگرے زہرہ کے کول وجود میں پوست کر دیے تھے۔ ”بس مجھ سے..... اور صرف مجھ سے نفرت کرنا..... کہ صرف میں..... اور بس میں ہی..... تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں.....“ ”نفرت.....“ چار حرفی یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر کتنی کاٹ، کتنے گھاؤ، کتنی جلن اور کتنی جھین چھپائے رکھتا ہے، اس کا ادراک مجھے ٹھیک اسی لمحے ہوا تھا، لیکن نفرت، زہرہ سے نفرت..... یہ اس نے کیسے سوچ لیا.....؟ وہ تو میرے خون میں رنگ بن کر رہی تھی، تو کیا کوئی خود سے بھی نفرت کر سکتا ہے۔ جن کے اپنے سنے جگ نہیں ہوتے، وہ دوسروں کے خوابوں کو تعبیر دینے کا فریضہ انجام نہ دیں، تو پھر بھلا اور کیا کریں۔ زہرہ بھی تو یہی کر رہی تھی، لیکن میرے خواب، ان کی تعبیر کیا ہوئی۔ سچ ہے کہ تعبیریں بھی ہر کسی کا مقتدر نہیں ہوتیں۔ پوری رات میں برستی بارش میں زہرہ کی تحریر اپنے ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھا رہا۔ تیز بارشیں کاغذ کی تحریر تو دھوڑا ستی ہیں، مگر مقدر کے لکھے بھلا بہتے پانیوں سے کب دھلے ہیں۔ اگلی صبح کی پہلی اجلی کرن کے ساتھ ہی بختیار اپنے چہرے پر زما نہ بھر کے اندر صبرے سجائے درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا۔ اس کا انداز چیمانی تھا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کسی جھیلے میں پڑے بنائی میرے لیے دعا کر ڈالیں۔ آپ نے دیر کر دی۔ اور جانتے ہیں اب کسی نے سائرہ کی آنکھوں میں بصارت پانے کا خواب بھر دیا ہے۔“ میں نے چونک کر بختیار کی جانب دیکھا، لیکن میں اسے یہ کہہ نہیں پایا کہ کون جانے کہ یہ ”دیر“ بھی قدرت نے کسی اور کے لیے طے کر رکھی ہو اور بختیار صرف ایک مہرہ ہو۔ سائرہ کی کہانی کو انجام کے قریب لانے کا ایک بہانہ ہو۔ بختیار اپنی ذہن میں بولتا رہا، اس نے مجھے بتایا کہ کوئی اور نو جوان مجسمہ ساز ہے، جو آج کل بڑی ٹن دی سے سائرہ کی بے پینا آنکھوں کے لیے کسی جڑواں پتلی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس کا آج کل زیادہ تر وقت سائرہ کی آرٹ گیلری ہی میں گزرتا ہے۔ وہ جوان ہے، خوب صورت اور متاثر کن شخصیت کا مالک ہے اور دو تہہ روز سائرہ کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بختیار کی پریشانی اس کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج یا کل سائرہ کو اس کی بصارت واپس مل ہی جائے گی اور تب وہ اپنے حصے کی اس نظر کو کھودے گا، جو عمر بھر کی کھوج کے بعد اس کا مقدر بنی ہے۔ میری اپنی حالت، رات بھر بارش میں جھپکتے رہنے کے بعد اس وقت تک اتنی دگرگوں ہو چکی تھی کہ مجبوراً مجھے بختیار سے معذرت کرنی پڑی کہ ہم اس ملاقات کو کسی اور وقت پر نا لی رکھیں، تو اس کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ خود بھی میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس پلٹ گیا۔

شام تک میرا جی اس بری طرح گھبرانے لگا کہ میرے لیے درگاہ میں نکلے رہنا ناممکن ہو گیا اور پھر جب میرے حوالے کچھ بحال ہوئے، تو میں نے خود کو ساحل کی غمریت پر چلتے پایا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چند بچے بیٹھے ریت کے گھروں کے بنانے کا کھیل کھیل رہے تھے، اس بات سے بے خبر کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں، وہاں کچھ ہی دیر میں سمندر کی لہریں آگے بڑھ کر ان کے گھر وندوں کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی، پھر مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ بنانے والے کو بنانے سے کام اور اچاڑنے والے کو اپنے فرض سے سروکار ہوتا ہے۔ جو بنتا ہے، اسے اجڑ ہی جانا ہوتا ہے۔ وقت کی کمی یا زیادتی تو بس اضافی ہے۔ اچانک دائیں جانب سے کچھ آواز سے کسے جانے اور پھر کسی کی غصے سے بھری ڈانٹ ڈپٹ اور وحشکار کی آوازیں سنائی دیں۔ دو ایک لمبے لمبے کے پاس کچھ بچے کسی عمر رسیدہ شخص کو شاید اس کے عجیب و غریب چلنے کی وجہ سے تنگ کر رہے تھے اور وہ بوڑھا نامی کی طرف دیکھتے ہوئے بکتا جھکتا چلا آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس شرارتی جھوم کی طرف تھا، لہذا چلتے ہوئے اسے ایک زوردار ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ عقب سے زوردار قہقہے بلند ہوئے اور میں تیزی سے اس فقیر کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا، لیکن ایک گرج دار آواز آئی۔ ”ہٹ جا میرے سامنے سے..... جو خود گرے ہوں، وہ دوسروں کو سہارا بھلا کیا دیں گے.....؟“ بوڑھے کا چہرہ گرنے کی وجہ سے ریت اور مٹی سے لت پت تھا۔ اس نے زور سے اپنی دوا زلٹوں کو جھاڑا اور مجھے یوں لگا کہ زمانے بھر کی گرد سے بھر اوجوداٹ گیا ہے، یہ تو وہی مجذوب تھا، جو مجھے تھانہ مائی کی حوالات میں ملا تھا، لیکن میں اسے یہاں اپنے شہر کے ساحل پر یوں پالوں گا، یہ تو میرے گماں کی آخری حدوں سے بھی پرے کی سوچ تھی۔ میری لڑکھڑائی زبان سے بس اچھا ہی نکل سکا۔ ”آپ..... یہاں..... کیسے.....؟“ مجذوب نے

بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے۔ ”فقہروں کے لیے زمین بھی تنگ نہیں پڑتی۔ تیرے لیے اگر شان دار بحری جہاز بھیجا گیا تھا، تو کوئی ٹوٹی کشتی میرے لیے بھی تو آسکتی ہے۔“ میں نے جلدی سے اس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش کی۔ ”آپ ہمیشہ آدمی بات کہہ کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ آج میں آپ کو نہیں نہیں جانے دوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ میں نے قدم بڑھا کر مجذوب کا راستہ روک لیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ شدید غصے کے عالم میں وہ زمین سے کوئی پتھر اٹھا کر مجھے دے مارے گا۔ وہ جوں ہی غصے سے زمین پر جھکا، اس نے کسی متوقع گھاؤ کی امید میں آنکھیں سختی سے میچ لیں، لیکن وہ ہنس پڑا ”ٹو کیا سمجھتا ہے، تیری یہ ضد تجھے پار لگا دے گی۔ کبھی نہیں، ضد چھوڑ کر جا جز بن جا۔ عشق میں ضد نہیں چلتی۔“ ”میرے پاس ضد کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے۔؟“ ”میرے جواب پر مجذوب پھر سے غصے میں آ گیا۔ ”بس، یہی تو تیری ضد ہے۔ جو تیرا ہے ہی نہیں، اسے اپنا سمجھنے کی زبردستی نہ کر۔ کب سے خاک چھان رہا ہے، ان درگا ہوں اور ویرانوں کی۔ تجھے سمجھاتے سمجھاتے، وہ اللہ کا بندہ بھی رخصت ہوا، پر تیری عقل میں یہ بات نہ آئی۔“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا، وہ ضرور سلطان بابا کی بات کر رہا تھا۔ میں اپنی آواز کو اونچا ہونے سے نہیں روک پایا۔ ”ہاں، انہوں نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اگر میری ناؤ کھینا ہی تھی، تو یوں ہیج ہمنور میں تنہا تو نہ چھوڑتے۔ اب میں کہاں جاؤں؟“ ”مجذوب نے مجھے ڈانٹا۔ ”لڑکے! جو جتنی سانسیں لکھوا کر لاتا ہے، وہ اتنا ہی جیتا ہے۔ مجھے، تجھے، ہم سب کو واپس جانا ہے۔ اس کا وقت پورا ہو گیا تھا، وہ چلا گیا۔ یاد رکھ، یہاں سب قافی ہے۔“ میرے اندر کا شور پھر سے باہر کو اٹھ آیا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر آپ میری فنا کی دعا تو کر سکتے ہیں۔ جب راستے ہی اتنے دھندلے ہو گئے، تو پھر منزل کی توقع بھی کیوں رکھوں۔“ ”مجذوب نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا ”فنا تو، ٹو کب کا ہو چکا۔ چل، اب میرا راستہ کھونا نہ کر۔ ابھی بہت کام ادھورے پڑے ہیں۔“ میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کے روؤں۔ اتنا ہے بس ولا چار تو میں نے خود کو آج تک کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں مجذوب کے راستے سے ہٹ گیا، لیکن شدید ضبط کے باوجود میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر زمین کو بنجر کر گیا۔ مجذوب قدم اٹھا چکا تھا، لیکن میری بیگی آنکھیں دیکھ کر یک دم نہ جانے اسے کیا ہوا اور وہ تیزی سے پلٹا۔ ”روتا کیوں ہے پنگے، پہلے ہی تیرے آنسوؤں نے چاروں طرف آگ لگا رکھی ہے۔ اب اور کس کس کو جلائے گا۔؟“ ”پتا نہیں اس کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ پھر میں اپنی روح سے چھلکتے اس نمکین سمندر پر مزید کوئی بند نہ باندھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور کچھ دیر پہلے پتھر بنا وہ مجذوب اب مجھے یوں چپ کر رہا تھا، جیسے کوئی کسی چھوٹے بچے کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس پاس سے گزرتے لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک پروانہ کسی دیوانے کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ شاید لوگوں کو یہ پہچانتے میں دشواری ہو رہی ہوگی کہ ہم دونوں میں سے قیس کون ہے اور فرہاد کون۔؟“ میں نے کہا تھا ناں، ٹو بہت ضدی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ جانے سے پہلے تجھ سے ایک ملاقات ضرور ہوگی۔ اب واپس چلا جا۔ وہ بزرگ دانا تیری راہ نکلتا ہوگا اور ایک بات یاد رکھنا۔ ٹو جس خدا کو ان درگا ہوں اور ویرانوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، وہ تیرے اندر موجود ہے۔ تیری شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ ان پتھر کی بے جان عمارتوں سے نکل اور خود کو دریا فت کر۔۔۔۔۔ تیری اسی دریافت کے لیے سلطان نے تجھے یہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لیے در بدر کی ٹھوکریں کھائیں، پر ٹو آخر کار پھر وہیں آٹھرا، جہاں سے چلا تھا۔۔۔۔۔ میں ہٹا ہٹا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا اور مجذوب اپنی ہی دھن میں نہ جاتے کیا بڑا بڑا ہوتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ذہن میں نہ جانے کتنے سوالات کی قطار لیے، جب میں درگاہ پہنچا، تو مولوی خضر پریشان سے، میری تلاش میں نکلنے ہی کو تھے۔ ”کہاں رہ گئے تھے میاں! شام ڈھلے لوٹے ہو۔“ ”کون جانے، واپس لوٹا بھی ہوں یا پھر خود بھی اس شام کے ساتھ کہیں ڈھل آیا ہوں۔“ مولوی خضر چوٹے۔ ”کوئی خاص بات۔؟“ میں نے انہیں مجذوب سے ملاقات کا تمام احوال سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ مولوی خضر بہت دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ مجبوراً مجھے ہی یہ سکوت توڑنا پڑا۔ ”بتائیں نا، ان درگا ہوں کا اسرار کیا ہے؟ ہمارا ٹھکانہ زیادہ تر یہیں کیوں ملے ہے۔؟ اور رہبانیت کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ ہم ان ویرانوں میں رہ کر خدا سے دور ہو رہے ہیں یا اسے پار ہے ہوتے ہیں۔؟“ ”مولوی خضر کچھ دیر تک میرے چہرے پر جیسے کچھ ٹوٹتے رہے۔“ ”رہبانیت کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب تنہائی کی کمزری دل کی دیواروں پر خود پسندی کے جال پھنا شروع کر دیتی ہے۔ انسان حقوق العباد سے بے گانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا کو پانے کی چاہ میں، اس کے بندوں کو کھونا شروع کر دیتا ہے، سارا فیض خود اکٹھا کر لینا چاہتا ہے، جب کہ اللہ کی مخلوق کو بے فیض رکھتا ہے۔ ایک ایسا پھل دار درخت بن جاتا ہے، جس کے ثمر سے عام شخص بے بہرہ رہتا ہے، مگر اس کے برعکس تنہا ہی تمام تربیت حقوق العباد کی ادائیگی کی اولیت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ وہ مجذوب نہیں تھا، وہ اللہ کے انتہائی قریبی بندوں میں سے کوئی ایک ہوگا، جو اتنی بڑی بات کہہ گیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ درگا ہیں اگر مستند ہوں، تو بس اللہ کے نیک بندوں کی آرام گاہیں ہوتی ہیں۔ کسی کی تقدیر بدلنے کا اٹھان بھلا کسی مقبرے کو کہاں؟ تقدیر صرف دعا سے بدل سکتی ہے اور کون چاہے کہ ان درگا ہوں پر مانگی گئی وہ دعائیں جو قبولیت کا شرف پائیں، وہ اس کامل یقین کا انعام ہوں، جو دعا مانگتے وقت سائل کے دل میں ٹھانیں مار رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ خدا ویرانوں میں رہ کر دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے، نہ جھوم میں دل سے دور۔۔۔۔۔ وہ ہر حال میں ہماری دھڑکن کی طرح ہمارے اندر موجود رہتا ہے۔۔۔۔۔“ میرے اندر چھلپے سوال باہر آنے لگے ”تو پھر میں اسے اپنی شہہ رگ سے زیادہ قریب کیوں نہیں محسوس کرتا۔ مجھے اسے محسوس کرنے کے لیے یوں در بدر کی خاک کیوں چھاننا پڑ رہی ہے۔؟ کیا یہ میرے اندر کے ایمان کی کمزوری ہے۔؟“ ”نہیں میاں، یہ درجہ بندی تو بس وہی جانتا ہے، سب ہی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ مقرر ہے، تمہارا راستہ زہرہ کے گھر کی پگڈنڈی سے ہو کر گزرا ہے، تو یہ بھی اسی کی مرضی ہے۔ بس، اتنا جان لو کہ اگر عشق مجازی کی ناکامی رہبانیت کی پہلی سیڑھی بن سکتی ہے، تو قدرت چاہے تو یہ ناکامی کسی کی کا یا بھی پلٹ سکتی ہے۔“ مولوی خضر جاتے جاتے رک گئے اور پلٹ کر بولے۔ ”تمہارے آخری سوال کا جواب مجھ پر ادھار رہا۔ ہم اپنی درگا ہوں اور ویرانوں میں ٹھکانہ کیوں کرتے ہیں، وقت آنے پر یہ حقیقت بھی تم پر کھل جائے گی۔۔۔۔۔ اور آج مجھے وہ وقت بہت قریب دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گئے اور میں ساری رات اسی ادھیڑ میں جلتا رہا کہ میں زہرہ کی تلاش میں عشق حقیقی کی راہ پر چل پڑا تھا یا اللہ کی راہ سے بھٹک کر دنیاوی محبتوں کے جال میں الجھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر کے ساحر اور عبد اللہ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ساحر، عبد اللہ کو دو غلے پن کا طعنہ دیتا تھا کہ بظاہر اللہ کی راہ کھوجانے والا اب بھی اسی محبت کی کھوج میں در بدر ہے، جس محبت نے ساحر سے اس کی شناخت چھین کر اسے عبد اللہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اور عبد اللہ کو ساحر سے یہ گلہ رہتا کہ وہ بار بار سامنے آ کر عبد اللہ کی راہ کھوٹی کر جاتا ہے۔ اگر ساحر کو زہرہ نہیں ملی تو اس میں عبد اللہ کا کیا قصور۔۔۔۔۔؟ مگر ساحر، زہرہ کو نہ پاس کا ثواب انتقاماً عبد اللہ کے راستے میں کانٹے تو نہ بچائے۔۔۔۔۔

صبح تک میرے اندر کی یہ جنگ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے یہی لگنے لگا کہ میرے اندر دین اور دنیا میں غی ہوئی یہ دہری شخصیت کٹ کر دو حصوں میں دائیں بائیں گر جائے گی۔ آخر کار، جیت ساحر کی ہی ہوئی اور طے پا گیا کہ اس دنیا میں قدم رکھنے کا واحد مقصد اگر زہرہ کی محبت کا حصول تھا، تو یہ کبھی تو

لب بام ہی ٹوٹ چکی، لہذا اب عبداللہ کو میرے اندر سے رخصت ہو جانا چاہیے، کیوں کہ اگر اس سال میرے زائد کے عرصے میں بھی وہ عبداللہ، میرے اندر کے ساحر کی جگہ نہیں لے سکا، تو اب اسے ساحر کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ ٹھیک ہے ساحر، زہرہ کو نہیں پاسکا، مگر عبداللہ بھی تو زہرہ کی چاہت کو ساحر کے دل سے نہیں مٹا پایا۔ ”مات“ اگر ساحر کے عشق مجازی کا مقدر رہی، تو ”جیت“ عبداللہ کے عشق حقیقی کا نصیب بھی نہیں بن پائی۔ میرے دل میں یہ احساس پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ میرا عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ہی ایک دوسرے کی راہ کا کاٹنا بن چکے ہیں اور دونوں کی بہ یک وقت موجودگی، اب میرے اندر کے طوفانوں کو کبھی تھمتے نہیں دے گی۔ زہرہ کا نام کسی اور سے جڑنے کو تھا، مگر میرا یہ پاگل دل اب بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا یہ جنوں اس عفت مآب کی کسی رسوائی کا سبب بنے، مجھے اس شہر ہی سے کہیں دور چلے جانا چاہیے، کیوں کہ میرے دل کا معاملہ زیادہ دیر تک ان دنیا والوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور یہ ظاہر پرست دنیا تو بس تیروں سے چھٹی کرنا ہی جانتی ہے۔ میرے ذہن میں ابھی سے آنے والے وقت کی صدائیں گونجنے لگیں ”ذرا دیکھو تو..... ان درگا ہوں کی آڑ میں یہ کیسا کھیل کھیل جا رہا ہے؟“، ”ہونہ..... حلیہ تو بڑا اندہی بنا رکھا ہے اور دل کے اندر کتنا بڑا چور چھپائے بیٹھا ہے۔“، ”تو بہ ہے بھی، ان جیسے لوگوں ہی نے مذہب کا نام بدنام کر رکھا ہے۔“، ”یہ شخص تو زنا کا فر ہے۔ ہاتھ پر محراب سجائے، ایک لڑکی کے عشق میں دیوانہ بنا پھرنا ہے۔“، ”اسے تو سنگ سار کر دینا چاہیے۔ یہ ایمان کے دائرے سے خارج ہو چکا ہے۔“ میں نے گہرا کراپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سماعتیں سلب کر لینی چاہیں، لیکن کان بند کر لینے سے روح کی سماعت بھلا کب چوکتی ہے۔ میں نے آسمان پر شکوہ بھری نظر ڈالی کہ یا تو میرے اندر اپنی محبت کو اس قدر بھردے کہ دنیا کی سب ہی محبتیں چھلک کر باہر جا گریں اور یا پھر میرے ادھر سے مجازی عشق کو مکمل جنوں میں بدل دے، تاکہ خود کو بھی بھول جاؤں۔ مجھے دو دھاری تلوار پر نہ چلا، میرے رب، جو بھی بخشا ہے، پورا بخش دے۔ آدھے مذہب اور آدمی دنیا میں سے کسی ایک کو تو مکمل کر دے، ورنہ یہ آدھا جنوں اور آدھا فراق مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالے گا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اپنے اندر کے ساحر کی موجودگی میں، اپنے بقیہ نصف حق دار، عبداللہ سے یہ منافقت کا کھیل اب ختم کر دینا چاہیے۔ مجھے مولوی خضر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سلطان بابا کی جان بخشی کا تاج اور درگاہ کی ذمے داری کسی اور کے حوالے کرنے کی درخواست کر کے خود پہلی فرصت میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میری بد نصیبی کی انتہا یہ تھی کہ نہ میں ساحر ہا اور نہ ہی عبداللہ بن سکا۔ عبداللہ کے لقب نے مجھے پورا ساحر نہ دینے دیا اور زہرہ کی محبت نے مجھے مکمل عبداللہ نہ بننے دیا، لیکن میں ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں دھونڈ پایا تھا کہ ہم عشق مجازی کی آج اپنے دل میں قائم رکھتے ہوئے بھی عشق حقیقی کو کیوں نہیں پاسکتے۔ بہ یک وقت دونوں حدوں کو اپنے دل میں محسوس کرنے والا دنیا کی نظر میں منافق اور گناہ گار ہی کیوں ٹھہرتا ہے، جب کہ دونوں ہی معاملوں میں اختیار کا حق کسی اور کے پاس ہے اور مجھ جیسا کم زور انسان تو مکمل بے بس ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اختیار رکھتے ہوئے بھی اس اختیار سے نابلد ہوتے ہیں، ورنہ قدرت کبھی کسی ناکردہ جرم کی سزا تو نہیں دیتی۔ جانے میں مزید کتنی دیر خود ہی کو ادھیڑ تار بٹاتا، اگر بختیاری کی آواز میرے خیالات کے تسلسل تو زہد دیتی۔ ”کہاں کھوئے ہوئے ہیں جناب اذل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں۔“ سچ یہ ہے کہ اس وقت بختیاری آمد مجھے کسی غیبی امداد سے کم نہیں لگی۔ کبھی کبھی جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی اکٹھا جاتے ہیں، تب ایسے میں کسی تیسرے آگے کی موجودگی ہمیں خود اپنی شبیہ سے چھٹکارا دلا جاتی ہے، لیکن خود بختیاری کا کچھ آج کرچی کرچی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے نہایت پریشانی اور دکھی دل سے مجھے بتایا کہ آخر کار اس نوجوان مجسمہ ساز نے سائرہ کی جزاؤں آنکھ کی پتلی دھونڈ لی ہے اور اسی ہفتے وہ سائرہ کا آپریشن کروانے کا منصوبہ بھی رکھتا ہے۔ سائرہ بھی بصارت پانے کے خیال سے بے حد خوش ہے اور پل پل گن کے دن کاٹ رہی ہے۔ اسے اس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد اپنے محسن اور مری بختیار کو بھی دیکھ سکے گی۔ جس نے اس کے فن کو ملک بھر میں پھیلانے کی ٹھان رکھی تھی، لیکن خود بختیار کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اس کی صورت دیکھتے ہی سائرہ کی نظر پلٹ جائے گی اور وہ اپنے نوجوان رفیق کے ساتھ مل کر اسی طرح اس کا تمسخر اڑائے گی، جیسے آج تک باقی ساری دنیا اڑاتی رہی ہے۔ میں نے تجمل سے اس کی تمام بات سنی۔ ”مجھے افسوس ہے، اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے درگاہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، لہذا اگر میری دعا میں خدا نے کوئی تاثیر رکھی بھی تھی، تو وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی ختم ہو جانی چاہیے۔“ بختیار رہنما بکا سا رہ گیا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ منزل پر پہنچ کر پھر سے رنجب سفر کیوں ہاتھ دے رہے ہیں؟ ایسا نہ کریں خدا را۔“ میں نے ایک گہری سانس لی ”کچھ لوگوں کا مقدر خدا مسافت ہی رہتا ہے۔ ان کے نصیب میں منزل کا سکون نہیں ہوتا۔ وہ بھی آپ کی طرح سدا ”فریفتہ“ ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی اس فریفتگی کے ساتھ، پھر سے دنیا کی اس بے چین بھیڑ میں کھو جانا ہے۔“ جانے کیوں میری بات سن کر بختیار کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی، اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا، لیکن میں تو خود بھکاری ہوں۔ اور آج آپ سے ایک آخری دعا کی بھیک مانگتے آیا تھا، کیا آپ جاتے جاتے میرے حق میں ایک آخری دعا بھی نہیں کریں گے.....؟“ میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور بختیار کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا کر بولا۔ ”آپ دعا یقین سے پوری ہوتی ہے، لیکن آپ کہتے ہیں تو یونہی سہمی.....“ میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور بختیار کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا کر بولا۔ ”آپ دعا کریں کہ میرا رقیب مر جائے.....“ میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا اور میرے ہاتھ نیچے گر گئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... میں کسی کی موت کی دعا کیسے کر سکتا ہوں؟“ بختیار رو ہانسا ہو گیا۔ ”تو پھر آپ یہ دعا کریں کہ سائرہ کو بصارت ملنے سے پہلے میں مر جاؤں۔ آپ نہیں جانتے۔ رقیب لفظ کی دھاری کسی دل جلے کے جگر کو پار کرنے کو کافی ہے۔ رقیب سے بڑا دشمن کوئی نہیں۔ نہ ہی رقابت سے بڑا کوئی عذاب ہے۔“ میں چونک گیا، میری نظر میں خرم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں بختیار کو کیا بتاتا کہ اس زہری کڑواہٹ سے آشناء مجھ سے زیادہ بھلا اور کون ہوگا۔ مولوی خضر کے ہمارے طرف چلے آنے کی وجہ سے بختیار زیادہ دیر تک وہاں تک نہیں پایا، لیکن جاتے جاتے بھی اس نے اشارے سے مجھے یاد دہانی کروادی کہ مجھے اس کے لیے کوئی منت مانگنی ہے۔ مولوی خضر نے اس کے پلٹتے ہی مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”گویا تمہاری دعا کی تاثیر پر لوگوں کو اعتبار ہونے لگا ہے۔“ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر ”کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ میری دعائیں لے گا، جب کہ خود آپ ہی نے مجھے بتایا کہ ان جگہوں پر مانگی گئی زیادہ تر دعائیں خود سائل کے کامل یقین کی بنیاد پر قبول ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم یہاں آکر دعا کے لیے فریاد کرنے والوں کو براہ راست یہ کلیہ کیوں نہیں سکھا دیتے کہ اسی اعتماد کے ساتھ وہ اپنی چوکھٹ پر بھی لگڑیں گے، تو خدا ان کی ضرورت سے گا۔ اس میں ہم جیسوں کا یا ان درگا ہوں کا کوئی کمال نہیں ہے۔“، ”ٹھیک کہتے ہو میاں..... لیکن اگر ایک شخص اتنی دور چل کر اس امید میں یہاں تک پہنچا ہے کہ خرم اس کے لیے دو گھڑی ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا مانگ لوگے، تو ایسی دعا میں بھلا کیا حرج ہے؟ ہو سکتا ہے، اللہ ہم گناہ گاروں کی صرف اس لیے سن لے کہ اس کا ایک مجبور بندہ دعا کی آس میں اتنی دور چل کر آیا ہے۔ کون جانے اس کی دعا کی قبولیت گھر بیٹھے نہ لکھی ہو..... یہاں تک چل کر آنے کی سعی کے بعد لکھی ہو اور کبھی کبھی خدا اپنے کسی خاص بندے کی دعا میں اثر بھی ڈال دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے، عبداللہ میاں بھی انہی خاص بندوں میں سے ایک ہوں۔“ مولوی خضر میرا سر تھپتھا کر مسکراتے ہوئے ظہر کی نماز کے لیے چل دیے، دفعتاً مجھے درگاہ کے دروازے کے پاس سے مجذب کی آواز سنائی دی ”اپنی رخصت کا وقت ہو گیا ہے لڑکے۔ تجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو، آگیا ہوں۔“ میں جلدی سے باہر نکلا، تو وہ میڑھیوں سے پرے کھڑا تھا ”آپ کہاں جا رہے ہیں۔“ اس نے سر جھٹکا ”سب ہی کو ایک دن جانا ہے، تو بھی تو جا رہا ہے.....“ میں چونکا، وہ اپنی دھن میں بولتا رہا ”بس ایک بات یاد رکھ، لڑنا چھوڑ دے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ صرف اپنا ماتھا ہی پھوڑے گا اور کچھ نہیں۔“ میں نے زخمی نگاہ اٹھائی۔ ”اپنی پیشانی کی پروا نہیں ہے مجھے۔ ہاں اس گھاؤ سے اڑتے خون کے چھینٹے کسی کے اگلے دامن کو داغ دار نہ کریں، بس اس بات کا ڈر ہے اسی لیے جا رہا ہوں۔“ مجذب نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”اتنا بزدل دکھائی تو نہیں دیتا۔ تو تو دوسروں کو جہنم کرنے والوں میں سے تھا، پھر خود جل کر دکھ کیسے ہو گیا؟“، ”میں تو سدا کا ”راکھ“ تھا نہ پتا نہیں، یہاں کے لوگوں نے مجھے چنگاری کیسے مان لیا.....؟“ میری کپکپی آواز نے جانے اس پر کیا اثر کیا کہ وہ جلال میں آگیا۔ ”ٹو کہے تو ابھی فیصلہ کرواؤں، تجھے دنیا چاہیے نا..... جا میرے مالک نے آج سے دنیا تیرے نام کر دی..... وہ تجھے مل جائے گی، لیکن اب کی بار دیکھ کا، تو پھر کبھی فریاد نہ کرنا۔ وہ تجھ سے صرف ایک بد دعا کی دوری پر ہے۔ تجھے اوپر والے سے یہی گلہ تھا کہ اس نے تجھے آدھا دین اور آدھی دنیا کیوں دی۔ جا..... آج سے میری دنیا پوری کر دی گئی ہے..... اب آگے تیری اپنی ہمت ہے۔“ مجذب ایک جھٹکے سے مڑا اور مزید کچھ کہے بنا لے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔



.....ہاشم ندیم.....

ایک خاک بستر نو جوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہرہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

قارئین کرام! جنگ خندے میگزین نے اپنے قارئین، شائقین اور مدعاہوں کے بڑے زور اصرار پر 24 اگست 2008ء سے ایک نیا تجربہ کیا۔ میگزین میں سلسلہ وار ناول کی اشاعت کا ناول کے منفرد موضوع، دل شہی اسلوب نے قریباً 30 ہفتوں تک فکشن کے رسیاؤں کو اپنے حصار میں لیے رکھا۔ 8 مارچ 2009ء کو ناول، عبداللہ کا بہت کام باب سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس دوران ہمیں ان گنت خطوط، ای میلز، فون کالز موصول ہوئیں۔ کسی نے ناول کو بے مثالی، لاثانی قرار دیا، تو کسی کو ناول نے چنانا خون کر دیا، پھر ایک سروے رپورٹ کے مطابق اسے دور حاضر کا مقبول ترین سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول بھی قرار دیا گیا، مگر..... ناول کے اختتام کے بعد قارئین ہی کے مسلسل اصرار پر ہمیں مجبوراً ایک بار پھر ناول کے سیکوئل (سلسل) کا آغاز کرنا پڑا۔ تو 7 جون 2009ء سے ”عبداللہ“ نے ایک بار پھر جنم لیا۔ نئی ابتداء، پرانے سلسلے، کچھ مختلف انداز، نئے سبب ناسل کے ساتھ..... اور اب آج یہ سیکوئل بھی اختتامی سیر می پکڑاؤ، ڈوبتے سورج کی طرح (لیکن ایک اور حسین طلوع محری امید کے ساتھ) اپنے لاکھوں مدعاہوں کو ہاتھ بلا کے الوداع کہہ رہا ہے۔ ہمیں بتائیے، عبداللہ کا 44 ہفتوں پر محیط، یہ سفر آپ کو کیسا لگا، آپ کی توقعات، امیدوں کے شایان شان یا..... برعکس۔ ناول کا آغاز جس قدر متاثر کن تھا، کیا اختتام بھی اتنا ہی پڑا اثر رہا، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے اس انوکھے و لافانی سفر میں آپ پر، اس دنیا کے بالکل متوازی چلتی دوسری دنیا کے کن کن اسرار و رموز، مہربستہ معیروں کا پردہ چاک ہوا؟ ہمیں، اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ ہم آئندہ بھی آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی بھرپور سعی کرتے رہیں گے اور جلد ہی ایک نئے ناول نئی صبح (نئی ہی روشن، چمک دار یا اس سے بھی کچھ اجلی) کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ تب تک آپ اس غلام کدے (عبداللہ کے صحر) سے نکلنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

(انچارج، جنگ سندھی میگزین)

خرم کے گھر کی جانب جاتے ہوئے، تمام راستے مجھے مجذوب کی کئی باتوں کی بازگشت نے گھیرے رکھا اور پھر خرم کے سر ہانے زہرہ کو کھڑے دیکھ کر میرا دم اٹکنے لگا۔ اس کی موجودگی میں تو اکثر میں سانس لینا بھی بھول جاتا تھا۔ کسی بیمار کے لیے دعا کیا خاک کر پاتا؟ جانے کس مشکل سے میں نے اپنے حواس یک جا کیے۔ خرم کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ پتا چلا کہ طبی تشخیص کے مطابق حادثے کے بعد اگر کچھ خرم کو فوری طور پر آپریشن تھیر پیچنچا دیا گیا تھا لیکن تمام احتیاط کے باوجود، جسم میں پھیلتا زہر اپنا اثر دکھا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ٹانگیں کٹنے کے باوجود خرم روز بروز روز بروز حال ہوتا گیا اور اس کا ہر چوہیں گھٹنے بعد پلٹنے والا بخار اب دن رات مستقل اُس کا وجود محض کا تار جتا تھا۔ ڈاکٹر اپنی ہی تمام کوششیں کر چکے تھے۔ ان کی آخری امید بیرون ملک سے منگوائی گئی ایک خاص ویکسین تھی، جو اگلے شام کے ہوائی جہاز سے لائی جا رہی تھی۔ لیکن خود، خرم اپنی ہر امید تیاگ چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں اس کے چلتے بدن اور سکتی روح کو اگر چند لمحے کی ٹھنڈک نصیب ہوئی تھی، تو وہ صرف درگاہ سے آئے، پڑھے ہوئے پانی کی مہربانی تھی۔ مولوی خضر کی بتائی ہوئی وہی چند خصوصیات آیات پڑھ کر میں نے پانی کے گلاس پر پھونک دین اور خرم نے بے تابی سے وہ پانی حلق سے نیچے اتار لیا۔ کچھ میل کے لیے اس کی انگارہ سانہوں کو قرار سال گیا۔ میں بغور اس کی حالت دیکھتا رہا، اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں نے سنا ہے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے عبداللہ..... تم میرے لیے دعا کرو گے ناں.....“ ”تمہاری جینے کی خواہش ہی تمہاری سب سے بڑی دعا ہے خرم۔ تمہیں کسی بھی دعا سے کہیں زیادہ تمہاری اپنی قوت ارادی پر بھروسے کی ضرورت ہے۔“ اُس نے سر جھٹکا ”نہیں..... مسیحا کو عام طور پر اپنی مسیحا کا اعجاز کم ہی ہوتا ہے۔ میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دور کہیں میری روح سے جو ہے ہو۔ کچھ نا تا تو تم سے ایسا ضرور ہے، جس نے مجھے یہ احساس بخشا ہے کہ میرے دروہا بس تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اس بار بھی تم نے میری مسیحا نہیں کی، تو میں مرجاؤں گا۔“ خرم کی بات سن کر اس کی ماں رو پڑی، میری نظر اٹھی اور زہرہ کی ڈبڈبی نظر کا سارا خروش نمک میرے حلق میں اٹھ گئی، پھر مجھ سے وہاں نہیں ٹھہرا گیا اور میں پُپ چاپ اٹھ کر باہر نکل آیا۔ درگاہ تک واپس پہنچتے پہنچتے رات ڈھل چکی تھی۔ مولوی خضر میرے انتظار میں محن کے چوبارے پر بیٹھے صبح پڑھ رہے تھے۔ ”کہو میاں، کچھ آرام آیا، تمہارے مریض کو.....؟“ ”آپ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں۔ میں دوبارہ خرم کے گھر نہیں جاؤں گا، آخر ان سب لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا میں اور کیا میری دعا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔“ مولوی خضر نے غور سے میری جانب دیکھا ”جیسے تمہاری مرضی میاں! لیکن یاد رہے، کبھی کبھی وعادہ دینے کا مطلب، بددعا دینا بھی ہو جاتا ہے۔“ میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ مجذوب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ زہرہ مجھ سے صرف ایک بددعا کی دوری پر ہے، تو کہیں، یہ وہی بددعا تو نہیں۔ یہ کیسا قسم تھا کہ قدرت نے میرے رقیب کے نصیب کی آخری دعا میرے حصے میں رکھ چھوڑی تھی اور اس دعا کی قبولیت کی پہلی اور آخری شرط میرے خلوص سے متصل کر دی گئی تھی، بھلا کوئی اپنے رقیب کے لیے بھی پوری شدت اور کامل خلوص کے ساتھ دعا مانگ سکتا ہے؟ میں وہیں درگاہ کے چبوترے پر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور جانے کب آسمان پر اپنے مقدر کا دھندلا ستارہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں پھر وہی گہری ڈھند تھی اور وہی اک نیا دھندلا جہاں بائیں پھیلائے میرا انتظار کر رہا تھا، لیکن میں خواب میں بھی درگاہ کے محن میں طر مٹنا کھڑا تھا اور میری فرد جرم پڑھ کر سنائی جا رہی تھی ”یہی ہے وہ سیاہ نصیب، جس نے درگاہ کے مجاور کے روپ میں محبت جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کا حلیہ تو بظاہر شرعی ہے، لیکن اس کا اندر رشید آلودہ اور کا لک زدہ ہے۔ بظاہر خدا کی تلاش میں سرگرداں، مگر اصل میں اپنے محبوب کی جاہت میں اور بدر ہے۔ یہ ٹیک لوگوں کی محبت میں رہتے ہوئے اور ایسی مقدس چادر یواریوں کے بیچ بھی بس اسی ایک چہرے کو سوچتا رہتا ہے۔ اسے اس کے رہبر نے زمانے کے سب ہی سرد گرم سے آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اس کا من پھر بھی اُسی ایک عشق سے انارہا۔ اس کا دل کبھی پوری طرح پاک نہ ہو پایا اور یہ جہاں بھی گیا، وہاں دین کی تبلیغ کے برعکس اپنی محبت کی ترویج ہی کرتا رہا۔ تو بولو، ایسے گناہ جو جرم کی سزا کیا ہونی چاہیے؟“ سارا مجمع چلائے لگا ”اسے سنگ سار کر دو۔ اسے مار ڈالو.....“ چاروں طرف سے مجھ پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر خود کو پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ ”ٹھہرو، مجھے مت مارو..... میں نے کبھی پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ میں تو بس اپنی محبت کی تلاش میں پھنسلے ہوئے اس دنیا تک پہنچا تھا اور مجھے اُسی محبت کو پانے کے دعوے کے ساتھ اس چوکھٹ کو پار کرایا گیا تھا۔ میں نے اس تمام سفر میں کبھی ”اعلان بزرگیت“ نہیں کیا، پھر مجھ سے پاکی دامان کا تقاضا اور امید کیوں.....؟ اگر اس تمام سفر میں میرے دل سے اُس گناہ محبت کے دانوں کو گھر چا نہ جاسکا، تو اس قدر داؤد بلا کیوں؟ ایک ”بے اختیار“ کو سزا کیوں؟“ میں یوں ہی چلا تار ہا اور تب ہی اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

سورہا ہونے لگا۔ کاش، کوئی سورج ایسا بھی ابھرتا، جو دلوں کے اندر میرے دور کر پاتا۔ دن چڑھے بختیار بھی آکھنچا۔ جانے کیوں آج اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ اس نے آتے ہی دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ ”آپ نے کیا فیصلہ کیا.....؟“ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا ”کیا محبت خود غرض بھی ہو سکتی ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت صرف قربان ہونا جانتی ہے۔ محبت صرف خود لٹ جانے کا نام ہے۔“ بختیار میری بات ممل ہونے سے پہلے ہی چلا اٹھا۔ ”سب جھوٹ ہے۔ یہ سب بزدلوں کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ محبت تو بس جیت لینے کا نام ہے۔ جو ہار جائیں، صرف وہی لٹ جانے کی دہائی دیتے پھرتے ہیں اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا، جو اپنی محبت ہار جائے، اُسے جینے کا کوئی حق نہیں..... کہ محبت کے بھائی تو صرف نئی ہی اس کا نصیب ہے۔ میں ساری عمر روزمرتا آیا ہوں۔ اب اگر چند بل جینے کا موقع مل رہا ہے، تو میں اُسے کسی رقیب کی سمجھت کیسے چڑھ جانے دوں۔ کچھ لوگوں کے لیے قدرت کی جھولی میں صرف ایک ہی موقع باقی ہوتا ہے اور میں یہ آخری موقع کسی کم زور ہڈ پاتی لمحے کی نذر ہو کر رہا نہیں کر سکتا۔ ہر بار نصیب مجھ ہی سے قربانی کیوں مانگے۔ اس بار قربانی میرے رقیب کو دینی ہوگی۔“ بختیار اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا اور میرے اندر جھک سے چلنے لگے۔ ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر بار قربانی ہمارا مقدر ہی کیوں.....؟ کہیں خرم کی یہ بیماری میرے لیے بھی قدرت کے سٹگول میں بچا ہوا آخری موقع تو نہیں؟ اور اگر اس کا انجام اسی بیماری کے ہاتھوں لگھو دیا گیا ہے، تو پھر میری دعا کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ بختیار اب بھی پُر امید لگا ہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ بختیار پرشادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی، جیسے واقعی میری دعا ہی اس کی محبت کے حصول کا آخری ذریعہ ہو۔ کاش محبتیں صرف دعاؤں سے حاصل ہو سکتیں، تو آج سارے زمانے میں کوئی نامزد نہ ہوتا۔ میں نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا، تو بختیار سے رہا نہ گیا۔ ”آپ نے میرے لیے کیا مانگا“ مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی ”میں نے اللہ سے تمہارے رقیب کی قربانی مانگی ہے..... اگر تمہاری محبت کا انجام تم دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی ہی سے وابستہ ہے، تو میں نے خدا سے التجا کی ہے کہ اس بار ایتار کا یہ پہاڑ تمہارے رقیب کے کانحوں پر رکھ دے۔“ بختیار اس چھوٹے بچے کی طرح خوش ہو گیا، جو پرانا کھلونا ٹوٹ جانے پر کسی نئے کھلونے کے بھلاوے میں آکر رونا بھول جاتا ہے، لیکن میں اپنے اُس پاگل دل کا کیا کرتا، جو آخری بازی مات ہو جانے کے بعد بھی کسی ضدی بچے کی طرح چل رہا تھا اور کسی بھلاوے میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج شام مجھے خرم کوئی ویکسین کا ٹیکا لگائے جانے سے پہلے مغرب سے قبل اس کے لیے دعا کرنے جانا تھا، لیکن میرے دل اور دماغ کی جنگ سہ پہر تک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جسم بخار میں تپنے لگا۔ میرا دماغ مجھے خرم کے گھر جانے سے روکتا رہا اور دل اس بھرم کی دہائی دیتا رہا، جو خرم اور اس کی ماں کو مجھ پر تھا، لیکن کیا دنیا کا کوئی بھی بھرم کوئی بھی امن اتنا اہم ہو سکتا تھا کہ جس کی خاطر میں زہرہ کو کھو دوں۔ اس کشمکش نے عصر سے پہلے ہی میری رگوں میں انگارے بھر دیے اور میں جب لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا، تو محن میں وضو کرتے مولوی خضر میری حالت دیکھ کر فوراً میری جانب دوڑے۔ میرے ماتھے کو چھونے اور ان کے تشویش بھرے لہجے میں کچھ بڑبڑانے کی حد تک تو میرے حواس نے ساتھ دیا اور پھر چڑاؤں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے ہوش آیا، جب میں نے اپنے ماتھے پر برف میں جھگوئی بیٹیوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔ میں درگاہ کے فجر سے میں تھا اور کھڑکی سے باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں نے بڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی، تو مولوی خضر نے مجھے روک دیا ”لینے رہو میاں، ابھی تمہاری حالت سنبھلی نہیں ہے۔“ میں کسمسا یا۔ ”لیکن.....“ مولوی خضر میرا مدعا سمجھ گئے۔ ”اُس کام کے لیے اب دیر ہو چکی۔ خرم کی والدہ تمہیں مغرب سے پہلے لینے کے لیے آئی تھیں، لیکن تم اس وقت ہڈیانی حالت میں نہ جانے کیا کچھ بول رہے تھے تمہاری حالت دیکھ کر تو وہ خود گھبرا گئیں اور پھر انہی کا ذرا سیور یہاں ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا تھا۔“ میں نے بھولا کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ ”میں کچھ زیادہ ہڈیان تو نہیں.....“ ”نہیں..... وہ کچھ نہیں سمجھیں..... انہیں خرم کی پریشانی میں کچھ یاد ہی کب تھا۔ بہر حال، وہ نامزد ہی واپس لوٹ گئیں کہ شاید اُن کے بیٹے کی قسمت میں دعا نہیں۔“ میں نے تھک کر تکیے سے سر نکال دیا۔ کچھ فیصلے قدرت خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے، کیوں کہ ہم کم زور انسانوں کا ظرف ان کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتا، لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پھر سے کوئی ان ہونی میرے تعاقب میں ہو۔ مولوی خضر میری اندرونی کشمکش بھانپ گئے ”خود سے اتنا نڈرا کر عبداللہ میاں! دل پھٹ جانے کا تمہارا۔ سب اوپر والے پر چھوڑ دو۔“ لیکن کاش، یہ گھلے میرا دل بھی سمجھ پاتا۔ جب تک ہوش رہے، ہم خود ہی سے توڑتے رہتے ہیں۔ تب ہی قدرت ہم پر رحم کھا کر ہمیں کچھ دیر کے لیے ہوش دھوا سے بیگانہ کر دیتی ہے، کسی کو فائدہ کی صورت، اور کسی کو بے ہوشی کی شکل میں سکون بخش دیتی ہے۔ میں بھی شدید بخار کے زیر اثر تھک ہار کر چلیں موند بیٹھا۔ جانے رات کے کس پہر مجھے درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رکنے کی آواز آئی اور پھر غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے مولوی خضر جحرے سے نکل کر باہر گئے ہوں۔ کچھ قدموں کی چاپ ابھری اور پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ میرا ذہن پھر سے تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور پھر کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا ”ساحر۔“ مجھے یوں لگا، جیسے کوئی روشنی کی تیز کرن، اندھیرے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی، مگر بے پائوں کو کاٹتی، میرے دل و دماغ کو منور کر گئی ہو۔ اس آواز کو میں لاکھوں کمرؤوں کے بھوم میں پہچان سکتا تھا۔ یہ زہرہ کی آواز تھی۔ میں نے کچھ اس طرح ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں، جیسے پلکوں کی ذرا سی تیز حرکت سے یہ سنہرا اسپنا ٹوٹ نہ جائے۔ وہ میرے سر ہانے کھڑی تھی..... ہاں..... وہ زہرہ ہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے زمان و مکان کی ہر حرکت رکت گئی۔ میری نظر اس کی بیگنی نظر سے ٹکرائی اور مقصد حیات تمام ہوا۔ اس کے باقوت لب پھر سے بولے۔ ”ساحر..... آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اس کے سامنے ہوتا ہی کب تھا۔ اس کی موجودگی تو ہمیشہ میرا اپنا آپ بنا کر رکھ دیتی تھی۔ میرے سامنے اور خود مجھ میں، بس وہ ہی وہ باقی رہ جاتی تھی، لیکن اس کی نظر ڈبڈبی ہوئی کیوں تھی۔ اس کے قریب ہی مولوی خضر بھی نہایت پریشان سے کھڑے تھے اور جحرے سے باہر درگاہ کے محن میں بھی کسی عورت کی دنی دنی سی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں وہ ان ہونی خوش تو نہیں آگئی۔ مولوی خضر کی لرزتی آواز نے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ”عبداللہ میاں..... زہرہ بی بی تمہیں لینے کے لیے آگئی ہیں۔ خرم کی حالت بہت بگڑ گئی ہے۔ امید اپنے آخری دم پر ہے۔ باہر محن میں خرم کے والدین بھی موجود ہیں۔ میں انہیں تمہاری شدید ناساز طبیعت کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ مولوی خضر اپنی بات ختم کر کے مجھ سے نظریں ملائے بنا جحرے سے باہر نکل گئے۔ کیا آپ نے کبھی شدید پیاس سے دم توڑتے، ایسے کسی بد نصیب گھماں کو دیکھا ہے، جو اپنے ہاتھوں کے کنورے میں پانی کی پٹی ہوئی آخری چند بوندوں سے اپنے لب تر کرنے والا ہوا اور تب ہی کوئی دوسرا اُس سے وہ پانی مانگ لے۔ میں نے اُسی جان باب بد نصیب کی نظر سے زہرہ کی جانب دیکھا۔ اس کی لرزتی پلکیں ٹھکی جونی تھیں اور آنسو گرنے کو تھے۔ قاتل کا تقاضا تھا کہ مقتول خود اپنے ہاتھوں سے چمکی دھار کو اپنے منہ کے پار کرے اور شرط یہ تھی کہ کیوں کی مسکان بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ میں نے

اٹھنے کی کوشش کی، لیکن کراہ کر رہ گیا۔ زہرہ کچکپاتی آواز میں بولی ”آپ اس حالت میں سفر نہیں کر پائیں گے۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ.....“۔ رات جا بڑی..... قیدی اگر تحریک نہ کر سکے، تو پچھائی ملتی نہیں ہو جاتی۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلے کو تیار ہوں۔“ اندر سے آتی ہوئی آنکھوں کی آواز سن کر خرم کے والدین بھی مولوی خضر کے ساتھ حجرے میں آ گئے۔ نہ جانے کس طرح میں مولوی خضر کے شانے کا سہارا لے کر نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ مولوی خضر بھی میرے ساتھ ہی کچھلی سیٹ پر بیٹھے لٹا کر سہارا دینے کے لیے بیٹھ گئے اور میں آنکھیں بند کیے اپنی ہستی کو سینے پر ڈال رہا، جب کہ میں جانتا تھا کہ یہ راہ رقیب کے گھر کو جاتی ہے اور مجھے وہاں پہنچ کر سدا کے لیے گھر جانا ہے۔ پتا نہیں، یہ کیسا امتحان تھا۔ خرم کے دل میں یہ بات کیوں گڑبگڑ گئی تھی کہ اسے میری دعا ہی سے مسیحا نصیب ہوگی۔ یہ کیسا بھید تھا، جو گھٹانا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے خرم کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ خرم کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور اس کا چہرہ سورج کبھی کے پھول جیسا زرد پڑ چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آخری دموں پر ہے۔ خرم کے سر ہانے پڑی چھوٹی میز پر درآدھ شدہ ویکسین کے خالی خول (وائل) پڑے ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ اسے دوا دی جا چکی تھی، تو پھر اس کی نبض کیوں ڈوب رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اس کے پریشان کھڑے والدین کی طرف دیکھا۔ ”دیکھیں میں آپ لوگوں کے کہنے پر یہاں تک تو آ گیا ہوں اور اوپر والے کی بارگاہ میں اپنی دعا کی عرضی بھی ڈال دوں گا، لیکن میری آپ لوگوں سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ آپ مزید دیر نہ کریں، خرم کو فوراً پہلی اڑان سے بیرون ملک لے جائیں۔ دعا کے ساتھ مناسب دوا بھی بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تک میری دعا کا بھرم ٹوٹے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔“ خرم کے والد نے ایک گہری سانس بھری ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے پہلے بھی ان باتوں پر اعتبار بھی نہیں تھا، بلکہ میں تو اکثر خرم کی ماں سے ٹپ پڑتا تھا کہ اس جدید سائنسی دور میں ان احتیاطی باتوں پر بھلا کون یقین کرے گا، لیکن پھر خرم کے معاملے میں ہر وہ بات غلط ثابت ہوتی گئی، جسے ہماری ظاہری سائنس صدیوں پہلے ثابت کر چکی ہے۔ اس کا آخری نمونہ آج شام ہی ہم سب نے دیکھا ہے۔ خرم کی حالت کے پیش نظر میں نے خود ہی دنیا کی سب سے بہترین ویکسین اور تمام قابل ذکر ڈاکٹروں کی ٹیم بلوائی تھی، لیکن سر شام دی جانے والی دوا کا اثر بھی تمہارے سامنے ہی ہے۔ اس لیے آج میں نے بھی خرم کی والدہ کے یقین کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اسے بہت پہلے کسی مجذوب نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر خرم کی صحت یابی مقدور ہے، تو اس کا ذریعہ صرف اور صرف تمہاری دعا ہی ہے۔ پورے خلوص اور سچے دل سے مانگی گئی تمہاری ایک دعا ہی خرم کی نجات ہے۔“ مجھے سارا گرا گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کسی مجذوب کا ذکر ہو رہا تھا۔ میرے دعا کے لیے اٹھتے ہاتھ پھر سے نیچے گر گئے ”مجذوب.....“ خرم کی والدہ جلدی سے آگے بڑھیں ”ہاں..... وہ مجذوب وہیں ساحل پر ہی ملا تھا۔ ہم خرم کو گھمانے کے لیے ساحل کی سیر کو لے گئے تھے۔ وہیں ایک ٹوٹی دیوار کے پاس وہ مجذوب ریت اور مٹی میں اٹا بیٹھا تھا۔ اس نے خرم کو دیکھتے ہی، ہنا اس کی بیماری یا تکلیف جانے بغیر فوراً کہہ دیا تھا کہ تیری شفا درگاہ میں بیٹھے عبداللہ کی دعا ہی سے ہوگی، ورنہ نہیں۔ حالاں کہ اس وقت خرم گاڑی ہی میں بیٹھا تھا اور اس مجذوب نے اس کی ظاہری حالت بھی نہیں دیکھی تھی۔“ میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی۔ ”یہ کب کی بات ہے۔ آپ پہلی مرتبہ کب اس مجذوب سے ملی تھیں؟“، ”یہ اسی دن کی بات ہے، جب ہم پہلی مرتبہ درگاہ آئے تھے۔ اُس دن کے بعد وہ مجذوب کبھی دکھائی نہیں دیا۔“ میرے وجود میں بہ یک وقت بہت سی سوئیاں گڑ گئیں، تو گویا یہ کھیل بہت پرانا ہے۔ میں تو بس اُس شطرنج کی بساط کا ایک معمولی سا مہر تھا، جو قدرت نے خرم کی زندگی اور صحت یابی کے لیے بچھا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سمائی کہ سب کچھ پر نوبی چھوڑ چھا، وہاں سے نکل جاؤں، لیکن ٹھیک اُسی لمحے خرم نے ایک ہچکلی سی لی اور اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ مولوی خضر نے اپنی آنکھیں بند کر کے نتیجہ تیز کر دی۔ خرم کی ماں کی آنسو بھری نگاہیں، اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندر عبداللہ کی آواز گونجی ”اگر ساحر کے اس تمام سفر کا حاصل یہاں اس بیمار کے سر ہانے آ کر ایک دعا ہی پر ختم ہونا لگتا ہے، تو پھر اپنی اس تمام تربیت کو بے مقصد نہ جانے دو۔ ساحر نے عبداللہ سے جدائی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے، تو جاتے جاتے عبداللہ کا یہ آخری قرض بھی ادا کرتے جاؤ۔“ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر لیے۔ ”یا اللہ! آج پھر تیرے سامنے وہی کم ظرف، گناہ گار، کم زور اور ناشکرابندہ ہاتھ جوڑے حاضر ہے۔ ٹوٹے ان لوگوں کے دل میں اگر میری دعا کا تلقین کامل پیدا کیا ہے، تو اب تو ہی اس دعا کا پودہ رکھ لے۔ یا میرے اللہ..... میرے دل کے چور اور میری دعا کی بے توقیری اور میرے خلوص اور سچائی کی کمی پر نہ جا، تو میری کم ظرفی اور میرے اندر کے گناہوں سے بہ خوبی واقف ہے۔ تجھے تیرے پیارے حبیب کا واسطہ، تجھے اس ستر ماؤں سے زیادہ محبت کا واسطہ کہ خاص اپنی رحمت کے صدقے اس مجبور ماں کی بھی سن لے، جو اپنے معذور بیٹے کی صحت یابی کے لیے یہاں وہاں سرگردانی پھرتی ہے۔ اس محفل میں موجود اپنے سب سے عزیز بندے کی التجا کے صدقے، مجھ جیسے عاصی کی دعا بھی سن لے اور اس نوجوان کی بیماری دور فرما کر اسے شفاء عطا کر دے۔ میں جانتا ہوں کہ آج اس وقت بھی، یہ دعا مانگتے وقت بھی میرے اندر کے دیار پرست اور گناہوں سے لتھڑے انسان کی تمام خامیاں اور کم زوریاں اپنے عروج پر ہیں اور میری اس دعا میں قبولیت لائق ایک احساس بھی شامل نہیں، لیکن میری رحمت اور میری لازوال عطا کبھی جذبے کی محتاج نہیں۔ ہمیں تیرا دم چاہیے۔ تیرا فضل چاہیے، میرے مولا۔“ میں ہی دل میں گڑ گڑاتا رہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرتے رہے، پھر نہ جانے کتنی دیر بعد مولوی خضر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خرم کا رنگ بدستور زرد تھا۔ مولوی خضر نے پلٹ کر خرم کے والدین سے رخصت طلب کی۔ ہمارے درگاہ پہنچتے پہنچتے سویرا جھلکنے لگا۔ میرا بخار ایک بار پھر زور پکڑ چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولوی خضر نے مجھے حجرے میں آرام کی تلقین کی اور پھر حجرے سے نکلے نکلے انہیں جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر پلٹ کر میری جانب آ گئے اور اچانک مجھے اپنے سینے سے لگا لیا ”مجھے تم پر فخر ہے میاں! میں تمہاری حالت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ آج تم نے سلطان بابا کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا ظرف تو بس ”عبداللہ“ ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ جیسے رہو، آباد رہو۔“ مولوی خضر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئے اور میں اس بارے ہوئے جواری کی طرح بستر پر ڈھلے گیا، جو اپنی آخری سچ پوچھی جانتے بوجھتے خود ایسے داؤ کی بیجٹ چڑھا آیا ہو، جس بازی کی مات کا اُسے پہلے ہی سے یقین ہو۔ میں آنکھیں بند کیے حجرے ہی میں پڑا رہا، حتیٰ کہ صبح کی تیز کرنوں نے حجرے کی کھڑکی سے دھوپ کی شکل اختیار کر کے میرے تاریک وجود پر روشنی کی ایک مستطیل چادر سی تان لی۔ دن چڑھے باہر سے مولوی خضر کی آواز اُبھری ”میاں! جاگ رہے ہو تو بختیار صاحب کو تمہارے پاس اندر بھیج دوں۔ وہ کافی دیر سے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے قریب پڑا کھیں شانوں پر ڈالا اور خود ہی باہر نکل آیا۔ بختیار کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ لپک کر میرے قریب آ گیا اور پریشانی سے بولا ”یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنائی ہے۔ ایک ہی دن میں برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے ہیں۔“ ”ہاں..... شاید کچھ مرض ایک رات ہی میں برسوں کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں، لیکن آج ماشاء اللہ آپ کا چہرہ خلاف معمول بہت کھلا ہوا لگتا ہے۔ آپ کی منت پوری ہو گئی ہے۔“ بختیار نے فرط عقیدت سے میرا ہاتھ تمام لیا۔ ”یہ سب آپ کی دعا کی بدولت ہوا ہے۔ اب کوئی مجھ سے میرے جسم کی نظر نہیں چھین پائے گا۔ سہارہ نے آپ پریشن کروانے سے انکار کر دیا ہے۔“ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا ”کیا.....؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اُسے تو بصارت کی شدید خواہش تھی نا.....؟“ ”پتا نہیں، آپ شاید اسے میری شدید خود غرضی ہی سمجھیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ محبت سے زیادہ خود غرض جذبہ اس دنیا میں کوئی اور ہوگا بھی نہیں اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو خود اپنے لیے خود غرض نہ ہو؟ دراصل میں اس بات سے اس قدر پریشان تھا کہ جب سہارہ نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں آج کل اتنا کھویا کھویا کیوں رہتا ہوں، تو میں اس کے سامنے خود چرچا بوند نہ کر سکا اور وہ پڑا۔ وہ پریشان ہو گئی اور مجھے اُسے بتانا ہی پڑا کہ میں اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ بصارت ملنے کے بعد میں سہارہ کو کھود دوں گا، کیوں کہ میں انتہائی بد صورت ہوں۔ یہ سن کر پہلے تو وہ ہچکچا سی رہ گئی اور پھر وہ بھی رو پڑی کہ میں نے اس کی عقیدت کو اتنا ناتواں کیسے جانا۔ اسے تو میرے اندر کے آدمی سے سروکار تھا۔ وہ بہت دیر روٹی رہی اور پھر اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی بصارت کا آپریشن نہیں کروائے گی۔ اسے وہ نظر نہیں چاہیے، جو میرے بقول، اس سے میرے جسم کی نظر چھین لے جائے گی۔ اُس کے اس فیصلے نے، جانے کیوں..... پر مجھے بھی بہت تر لایا۔ میں اور سہارہ بہت دیر تک دوتے رہے، لیکن شاید وہ ہم دونوں کے آخری آنسو تھے۔“ بختیار نہ جانے اور کیا کچھ بتاتا رہا، مگر میرا ذہن کہیں اور ہی اٹک گیا تھا۔ محبت کو شاید اتنا ہی معصوم اور اتنا ہی خود غرض ہونا چاہیے تھا۔ مجھے بختیار پر رشک آ رہا تھا کہ اس کے اندر پلنے والی محبت وقت پڑنے پر خود غرض ہونا بھی جانتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خود غرضی بھی کسی نفرت سے کم نہیں ہوتی۔ بختیار کے جانے کے بعد بھی میں وہیں درگاہ کی دیوار کے ساتھ ٹپک لگا بے بیضار رہا۔ حتیٰ کہ شام ڈھلنے لگی۔ اس دوران مولوی خضر نہ جانے کتنی بار کسی نہ کسی بہانے درگاہ کی سیڑھیوں تک جا کر واپس پلٹتے رہے۔ میں جانتا تھا کہ انہیں کس نتیجے کا انتظار ہے۔ آخر کار مغرب سے کچھ دیر قبل درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنائی دی اور مولوی خضر تیزی سے حجرے سے باہر نکلے۔ چند لمحوں بعد خرم کے والدین اپنے کئی نوکروں سمیت ڈھیر ساری نذر اور نیاز لیے درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ پتا چلا کہ فجر ہونے سے پہلے ہی خرم کی حالت سدھرنے لگی تھی اور وہ پھر تک اُس کا بخار نوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے درآدھ شدہ ویکسین کا اثر سمجھتے تھے، لیکن خرم کے والدین کے نزدیک یہ دعا کا کرشمہ تھا اور یہ ساری کہانی لکھنے والا لکھاری وہی ایک مجذوب تھا، جو پہلے مجھے اور پھر خرم کی ماں کو ملا تھا۔ کتنا شان دار پلاٹ بنا تھا اُس نے۔ بہر حال، وجہ جو بھی رہی ہو۔ خرم کے والدین کی خوشی چھپا نہیں چھپ رہی تھی۔ ماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح میری ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ اب میں بہت جلد اپنے خرم کے سر پر ہزار سجاوٹ کی اور آپ سب کو آنا ہوگا۔ اور عبداللہ! تم بھی تو میرے بیٹے ہونا، تو تمہیں خرم کا شہید بالابنا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا۔ دیکھو، میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔“ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ جانے یہ شہنائی اور ماتم کا رشتہ کتنا پرانا ہے۔ ان کے لہجے میں شہنائی کی گونج تھی اور میری خاموشی میں ماتم رقصاں تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں مولوی خضر کی جانب پلٹا۔ ”میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید یہی میرے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ آپ درگاہ کے لیے کسی نئے عبداللہ کو منتخب کر لیں۔“ میری آواز آنسوؤں سے رندھ سی گئی۔ مولوی خضر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا ”ٹھیک ہے، اگر یہی رضائے خداوندی ہے، تو یونہی سہی، مگر ایک آدھ دن تو صبر جاؤ۔ جب تک میں بھی درگاہ کے انتظامات کسی کے سپرد کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“ ”جو آپ کا حکم“ میں واپس پلٹ کر حجرے کی طرف بڑھا ”اور ہاں عبداللہ! تمہارا آخری سوال اُدھار تھا مجھ پر، تم نے پوچھا تھا کہ ہمارا امیر ان درگاہوں اور دیوانوں ہی میں کیوں کر ہے، جب کہ خدا کی خدائی کو شہد رگ سے بھی قریب بیان کیا گیا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ خدا ہماری شررگ سے بھی زیادہ نزدیک رہتا ہے۔ اس کی کھوج میں ہمیں کسی بھی درگاہ یا دیوانے میں بھٹکنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تمہیں آج ایک اور بھید بھی بتانا ضروری ہو گیا ہے۔ میں..... حاکم بابا، سلطان بابا اور تم..... ہم سب ان درگاہوں پر اس لیے ہیں، کیوں کہ ہماری تعیناتی کی جگہ یہی مقرر کی گئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں کوئی اور عبداللہ، حاکم یا سلطان تعینات نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک غیر مرئی نظام رائج اور متحرک ہے۔ تم اتنا عرصہ خدا کی تلاش میں نہیں، بلکہ اُسی خدا کے حکم سے بھٹک رہے تھے، تمہارا خدا تو اس تمام سفر میں تمہارے ساتھ ہی تھا، درگاہ سے چھائی گھاٹ، پھر یا قوط، جبل پور، کال گڑھ اور تحصیل ماہی سے لے کر لندن اور واپسی تک کے تمام سفر کا کوئی ایک مقصد ضرور تھا۔ جانتے ہو وہ مقصد کیا تھا، تم سے ”خدا کا تعارف.....“ اُس کے بندوں کے ذریعے۔ اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کے ذریعے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس تعارف کو بہ خوبی سمجھ لیا۔ تم نے واپسی کا فیصلہ کیا ہے، تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس دانتا یاد رہے کہ وہ ہر جگہ، ہر پل تمہارے ساتھ تھا، ساتھ ہے..... اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔“ مولوی خضر پلٹ کر چل دیے اور میں وین چوتھرے پڑھے سا گیا۔ وہ اگر میری شہد رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، تو پھر مجھے مل کیوں نہیں جاتا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا، لیکن جسے میں نیند سمجھتا تھا، کیا واقعی وہ نیند تھی، میں تو اکثر نیند میں جا گئے سے زیادہ بیدار رہتا تھا۔

مجھے آج تک یہ معنائی سمجھ نہیں آئی تھا کہ میں جاگتے ہوئے سوتا ہوں یا سوتے ہوئے جاگ رہا ہوتا ہوں اور پھر صدیوں بعد مجھے اپنے شانے پر وہ مہربان لمس محسوس ہوا، جس کی تلاش میں نہ جانے کب سے میں اپنے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔ ہاں اُوہ سلطان بابا ہی تھے۔ وہی سلج سی مسکراہٹ، وہی مہربان احساس، میں رو پڑا ”کہاں چلے گئے ہیں آپ..... آپ کو میری دُور بردہر بھی پروا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ عبداللہ سے پیار ہی نہیں کرتے۔“ وہ سُکائے ”اچھا تو گویا عبداللہ اپنے سلطان بابا سے روٹھ گیا ہے، لیکن میرا سحر تو مجھ سے خفا نہیں ہے نا۔ وہ تو مجھ سے بات کرے گا؟“، ”آپ جانتے ہیں کہ عبداللہ اور ساحر کی یہ تفریق مجھے کاٹ ڈالے گی، پھر آپ نے میرے اندر کے عبداللہ کو کیوں جگا دیا اور اگر عبداللہ کی حیات اتنی ہی ضروری تھی تو پھر ساحر کو پوری طرح ختم کیوں نہیں کر دیا گیا؟“، ”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ عبداللہ یا ساحر میں سے کسی ایک کی فدا ہی دوسرے کی بھلا کے لیے ضروری ہے۔ یہاں پر سب ہی کے اندر اُدھا ساحر اور اُدھا عبداللہ ہوتا ہے۔ کاملیت تو شاید صرف بتغیر کا نصیب ہوتی ہے۔“ میں سسک پڑا ”تو پھر یہ دنیا والے ہم جیسے گناہ گاروں سے کاملیت کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ دل پر کسی کا زور نہیں“ سلطان بابا پھر سے مسکرائے ”بس..... اتنی سی بات ہے۔ اپنی محبت پر شرمندہ ہو؟ مردوزن کی آپ ہی کشش فطرت کی طے کر دہ ہے۔ میں، تم..... ہم سب ہی ایسے ہی کسی معاشرتی دشمن کی پیداوار اور نتیجہ ہیں، ہاں البتہ مذہب نے ایسے بندہ صحن کی حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ محرم اور غیر محرم کی شرعی پابندی بھی طے شدہ ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی رشتہ طے ہوتا ہے، تو اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ مذہب کا کوئی بھی کلیہ یہ نہیں کہتا کہ کسی درگاہ کے مجاور یا متولی کی شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی پسند کی

شادی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا کیا ہے میاں، وہ جہانیت سے بچو گے تو دنیا پر کسی کا التزام لگانے کی اور دنیا داری سے دامن چھڑاؤ گے، تو رہبانیت کا داغ تمہارے ماتھے پر سجا دے گی۔ ویسے بھی مذہب اللہ کی رضا مندی کے لیے اپنا یا جاتا ہے، نہ کہ دنیا والوں کی خوشنودی کے لیے۔ بس حقوق العباد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور ہاں، عبد اللہ کو یہ بات سدا یاد رکھنی ہوگی کہ رشتے اور جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ سو تمہارے نصیب کا جو رزم تک پہنچ کر رہے گا اور جو تمہارا مقدر نہیں، اس پر کبھی افسوس نہ کرنا۔“ سلطان بابا کی آواز دھیرے دھیرے دُھند میں کھو گئی اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ایک بار سلطان بابا سے سنا تھا کہ قدرت نے نیند اور خواب کو بھی پیغامِ رسانی کے ذریعوں میں سے ”ایک“ مقرر کر رکھا ہے، تو گویا مجھے بھی آخری پیغام پہنچا دیا گیا تھا۔ ہمیشہ اپنے نصیب پر منتظر رہنے کا پیغام۔ چاہے وہ نصیب بتا زہر ہی کے، میرا مقدر کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح مولوی خضر مجھے بہت مصروف دکھائی دے۔ شاید وہ تمام انتظامات کو حتیٰ شکل دے رہے تھے۔ سہ پہر تک میرے بعد والا عبد اللہ، نعمان بھی درگاہ پہنچ گیا، لیکن ابھی سب کو کسی اور کی سواری کا بھی انتظار تھا۔ میں صبح سے درگاہ کے صحن میں بیٹھاں درو دیوار کو تک رہا تھا، جن سے شاسائی اب صدیوں پرانی لگتی تھی۔ ان دیواروں نے یہاں مجھے ساحر سے عبد اللہ تک کا سفر طے کرتے دیکھا تھا اور آج وہ اس عبد اللہ کی واپسی کا سفر بھی دیکھ رہی تھیں۔ تقدیریں کیسے چلت جاتی ہیں، یہ کوئی نہیں جان سکا اور پھر عصر کے وقت وہ سواری بھی آن پہنچی، جس کا سب ہی کو انتظار تھا۔ وہ درگاہ کے صحن میں داخل ہوئے، تو میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں، وہ حاکم بابا ہی تھے، اپنے مخصوص جلال اور غیظ و غضب کے ساتھ، لیکن آج ان کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے انہیں سلام کیا، تو مجھے گھلے لگا لیا۔ ”کیوں بھئی نوجوان..... واپس چل دیے۔ تم نے تو ہمیں یاد نہیں کیا۔ پر دیکھو..... ہم خود تمہیں رخصت کرنے یہاں چلے آئے۔“ میں خاموش رہا، لیکن نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ حاکم بابا نے اب سلطان بابا کے فرائض سنبھال لیے ہیں، کیوں کہ ان کا ہدایت دینے کا انداز اور ان کی ہر معاملے پر گہری نظر اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اب وہ بطور سلطان تعینات ہو چکے ہیں۔ عصر کے بعد میں نے سب سے رخصت چاہی، کیوں کہ میں مٹھارو پچا کو پہلے ہی اطلاع کر چکا تھا اور ان کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ الوداع بھی میرے لیے کسی مخمّر کی دھار کی طرح تھا۔ روح میں بیوست ہو جانے والی دھار..... حاکم بابا دھیرے سے مسکرائے ”جب جب، جو جو ہوتا ہے..... جب جب سو سوتا ہے۔ جارہے ہو میاں! چلو بھیک ہے تمہارا استقبال کرنے والے بھی آپہنچے ہیں اور ہاں..... گھر پہنچ کر اس رختے کو کھول کر پڑھ لینا۔“ انہوں نے خاکی رنگ کا ایک لافہ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہی لافہ تھا، جس کے بارے میں مولوی خضر نے گزشتہ شام مجھ سے ذکر کیا تھا۔ میں تو حاکم بابا کے منہ سے سلطان بابا کا مخصوص جملہ سن کر ہی اپنی جگہ سُن سا کھڑا تھا کہ اچانک عقب سے مہما کی آواز ابھری ”ہم آگئے ہیں بیٹا.....“ میں نے میکا کی انداز میں گردن گھمائی اور پھر منہ اٹھاتا ہوا ساتھ ذیل چیز پر بیٹھے خرم اور اس کے والدین کو ساتھ کھڑے دیکھ کر میں اپنے سارے الفاظ کھو بیٹھا۔ ”آپ سب یہاں.....؟“ تب خرم نے اپنی ذہنی چیز دکھائی اور میرے قریب آ گیا۔ اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں ”واہ میرے میاں! ساری سیاحتی کا اعجاز خود ہی سمیٹ لینا چاہتے ہو کیا؟ ویسے داد دینی پڑے گی تمہارے حوصلے کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا، تو شاید کسی مرحلے پر میرا ظرف جواب دے ہی جاتا، لیکن تم شاید یہ بھول گئے کہ احسان جب حد سے بڑھ جائے، تو ان کا بوجھ اگلے کو توڑ ڈالتا ہے۔ تم نے بھی مجھے توڑ ڈالا ساحر.....“ خرم کے منہ سے اپنا پہلا نام سُن کر مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں نے منہ، ہچکا کو شکایت بھری نظر سے دیکھا۔ میں نے انہیں زہرہ کے رشتے کے بارے میں بتاتے وقت سختی سے تلقین کی تھی کہ وہ کسی بھی حال میں خرم یا اس کے والدین پر یہ عہدہ برگر نہیں کھولیں گے، لیکن شاید اس بار ان میں سے کوئی ایک اپنا وعدہ نہیں بھجایا تھا۔ خرم میری نظروں کا ملبوم بگھ گیا۔ ”نہیں..... تمہارے والدین میں سے کسی نے مجھے تمہارا اصلی نام نہیں بتایا۔ تمہاری اور ان کی مٹی جو مشترک ہے۔ شاید یہ راز مجھ پر بھی کبھی نہ کھلتا، اگر کل سہ پہر ہی تحریر میرے ہاتھ نہ لگتی۔“ خرم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوئی کاغذ لہرایا اور میرے جسم سے رہی سہی جان بھی پرواز کر گئی۔ یہ تو وہی نظم تھی، جو میں نے بپا کے ہاتھ زہرہ کو لکھ بھیجی تھی۔ خرم نے کاغذ کھولا اور زہرہ رب و ہرایا۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....“ پھر خرم نے کاغذ پلٹا اور آخر میں بے خیالی میں لکھے گئے، میرے نام پر اپنی اگلی رکھ دی۔ ”یہ نظم تمہاری ہے ناسا..... اتنا درد سہنا تمہارا خاصہ ہی ہو سکتا ہے۔ بولو ساحر..... چپ کیوں ہو، جواب دو مجھے.....“ میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پتا یہ چلا کہ کل جب دو پہر کے وقت خرم کا بخار ٹوٹ گیا۔ تو کئی دنوں کی اکتاہٹ آمیز صحن اتارنے کے لیے اُس نے اپنے ماں باپ سے مکمل فضا میں نکلنے کی ضد کی، لیکن خرم کے والدین کو منت پوری ہونے کی نیاز چڑھانے کے لیے درگاہ آنا تھا، لہذا طے یہ پایا کہ راستے میں خرم کو کچھ دیر کے لیے زہرہ کی حویلی میں اتار دیا جائے، تاکہ وہ زہرہ کے والدین سے بھی ملاقات کر لے۔ خرم کو اور واداب سے ویسے تو کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا تھا، لیکن اُس نے محسوس کیا تھا کہ اردو ادب زہرہ کی شخصیت کا حصہ اور خاص طور پر نظم اور غزل تو اس کی کم زوری ہے، لہذا اُس نے زہرہ کی غیر موجودگی میں، یونہی بے خیالی میں کوئی کلیات اٹھائی اور تب ہی اُس کے اندر سے یہ کاغذ اس کی گود میں جا کر..... خرم نے جیسے ہی تحریر ختم کر کے آخر میں لکھا نام پڑھا، تب ہی زہرہ کمرے میں داخل ہوئی اور خرم نے اس سے پوچھ لیا کہ یہ ”ساحر“ کون ہے؟“ یہ سوال زہرہ کے لیے اس لمحے اس قدر اچانک اور ناگہانی تھا کہ وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے چہرے کے بدلے رنگ نے خرم کے تجسس کو ہمیز دی اور ایک ایسی بات، جسے عام حالات میں کوئی بھی چھوٹا سا بہانہ کر کے ٹالا جاسکتا تھا، بھڑکتی چلی گئی۔ زہرہ نے خرم سے التجا کی کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مناسب وقت آنے پر وہ خود خرم کو ساحر کے بارے میں بتا دے گی، لیکن اگر بات ختم ہی ہوتا تھی، تو شروع کیوں ہوتی۔ خرم وہ کتاب ہی کیوں اٹھاتا، جس میں میری نظم رکھی ہوئی تھی۔ خرم نے کوئی دوسری کتاب کیوں نہ اٹھائی؟ کچھ سوئے قدرت صرف خاص لمحوں کے لیے ہی لکھ رکھتی ہے۔ وہ بھی شاید ایک ایسا ہی پل تھا۔ آخر کار زہرہ کا صبر جواب دے گیا اور اس نے خرم کو بتا دیا کہ ساحر وہی عبد اللہ ہے، جو گزشتہ رات خرم کی سیاحتی کے لیے اپنی شدید ہجر حالت کے باوجود اس کے سر ہانے کھڑا ہوا تاکہ رہا تھا۔ خرم کے حواس جواب دے گئے اور زہرہ نے شروع سے لے کر آخر تک کی داستان جب ختم کی، تو تب تک خرم اپنے ہی آنسوؤں میں بھیگ چکا تھا۔ وہ رات اس کی زندگی کی سب سے طویل رات ثابت ہوئی اور صبح کا اجالا ہونے سے پہلے وہ اُس فیصلے پر پہنچ گیا، جس کے نتیجے میں آج وہ اپنے والدین سمیت میرے سامنے موجود تھا۔ خرم نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں اُس کرب کا مداوا تو نہیں کر سکتا، جس سے تم ہر پل گزرتے آئے ہو، لیکن یقین جانو..... کل سے میرے گھر میں بھی کسی کو ایک کروٹ آرام نصیب نہیں ہوا۔ شاید ہم سب تمہارے مجرم ہیں۔“ میں نے جلدی سے خرم کی آنکھیں پونچھیں ”ایسا کیوں کہہ رہے ہو، قدرت کا یہی فیصلہ تھا۔“ خرم کی والدہ آگے بڑھیں ”نہیں..... خرم کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو عبد اللہ اور دنیا کی کوئی ماں اپنی اولاد میں فرق نہیں رکھتی۔ زہرہ تمہاری امانت تھی اور ہم تمہاری ہی رہے گی۔ بس، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میرے گھر سے خرم کی بارات جانی تھی اور اب عبد اللہ کی جائے گی اور یہ حق میں تمہاری منہ سے پہلے ہی مانگ چکی ہوں۔ اب تم اپنی اس ماں کو انکار نہ کرنا۔“ انہوں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مہما، مہما میرے دائیں بائیں یوں کھڑے تھے، جیسے بچپن میں مجھے کرنے سے بچانے کے لیے میری پہلی بانہیکل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پلی بھر میں یہ سب کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے تو جانے کب سے اپنے رونے ہوئے مقدر سے دوستی کر لی تھی، لیکن قدرت یوں اچانک مجھ پر اتنی مہربان ہو جانے کی۔ زہرہ کا نام پھر سے میرے نام کے ساتھ جڑ جائے گا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ پتا نہیں میری نظروں کا ملبوم جان لیا۔ ”زہرہ ہمارے ساتھ نہیں آئی بیٹا..... وہ نیچے ساحل ہی پر ڈرک گئی تھی۔ اس نے اپنے ہر فیصلے کو تمہارے فیصلے سے مشروط کر رکھا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج تک اُس نے جتنے بھی فیصلے کیے ہیں، وہ سب نہیں نہ کہیں تمہارے لیے کسی درد کا باعث رہے ہیں، لہذا اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا تم آج بھی زہرہ کا ساتھ چاہتے ہو۔“ خرم نے مجھے جھنجھوڑا ”جاؤ عبد اللہ..... ورنہ کرو۔ اس بار اپنی تقدیر کو جو کچھ نہ دیا، بہت زخم کھالے تم نے۔ بہت گھائل ہو چکے تم..... جاؤ، تمہارا مرہم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے.....“

میں ابھی تک وہیں اپنی جگہ پر جمنا کھڑا تھا کہ اس بار حاکم بابا کی آواز میرے کانوں سے نکرائی۔ ”بے شک اللہ اپنے بندے کے لیے جو چاہتا ہے، وہی اس کا بہترین نصیب ہے۔ جاؤ عبد اللہ..... تمہارا پہلا امتحان آج ختم ہوا۔ اگر تم اپنے قدموں سے چل کر اللہ کے اس بندے خرم کے لیے دعا کرنے نہ جاتے، تو شاید نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اس مجذوب نے تمہیں بددعا کے امتحان میں بھی اُسی اللہ کی مرضی سے ڈالا اور آج اگر تم سرخ رو کھڑے ہو، تو یہ بھی اُسی کی رضا ہے۔ جاؤ..... تمہارا مقدر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ حاکم بابا کی گرج دار آواز نے جیسے مجھے پھر سے ہوش کی دیا میں پہنچا دیا۔ میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ پیچھے سے مولوی خضر کی آواز سنائی دی ”ہم سے رخصت ہو کر الوداع تو کہتے جاؤ میاں..... جانے پھر کب ملاقات ہو.....؟“ میں تڑپ کر پلٹا اور تیزی سے مولوی خضر کے پاس پہنچ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میری رخصت کے فیصلے کے پیچھے بھی تو زہرہ کے نام کا تھکس برقرار رکھنے کی آرزو ہی کا فرما تھی۔ میں آپ سب کو چھوڑ کر اب کہیں نہیں جاؤں گا۔“ حاکم بابا بولے۔ ”جانا تو طے ہو چکا ہے لڑکے..... اور تمہاری خواہش پر ہی یہ سارا انتظام کیا گیا ہے۔“ میں ان کی بات سن کر روہنا ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے مجھے میرے ہی گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہو۔ پھر نہ جانے کیوں ان سب ہی بزرگوں کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ چمک گئی۔ حاکم بابا بولے۔ ”مولوی صاحب..... بہت ستالیا آپ کے شاگرد کو۔ اب اسے اپنا فیصلہ سنا دیں۔“ مولوی خضر نے میری جانب مسکرا کر دیکھا۔ ”عبد اللہ میاں..... تمہارا فیصلہ تو جانے کب سے اس خاکی لفافے میں لکھ کر بند کر دیا گیا تھا، وہی لافہ، جو اب تمہاری جیب میں موجود ہے۔ تم چاہو تو اسے کھولی کر پڑھ سکتے ہو۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جھلت میں اپنی جیب سے وہ لافہ نکالا اور تیزی سے اس پر لگی مہر کھولی۔ اندر سے وہی ہی کاغذ کی ایک سفید پرچی نکلی، جیسی مجھے پہلی مرتبہ عبد اللہ کے نام سے درگاہ میں تعینات ہونے پر ملی تھی۔ میں نے لرزرتے ہاتھوں سے پرچی کھولی، تو اس میں میرے ہی شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ صرف ایک نام..... اور کچھ نہیں۔ میں نے حیرت سے مولوی خضر اور حاکم بابا کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ”تمہیں تمہارے ہی شہر میں تعینات کر دیا گیا ہے، عبد اللہ..... تمہارے فیصلے سے بہت پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا.....“ میں اپنی آواز سے جھجکتی خوشی چھپا نہیں پایا۔ ”گو ماں اب بھی عبد اللہ ہوں..... مجھے بے دخل نہیں کیا جا رہا.....؟“ مولوی خضر نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”قدرت کے کیے گئے فیصلوں سے بے دخلی کا اختیار صرف قدرت ہی کو حاصل ہے، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ عبد اللہ صرف درگاہوں اور دیوانوں ہی میں نہیں، زمین کے ہر خطے میں موجود ہے۔ بس یوں کچھ لو کہ تمہارا ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں تبادلہ ہو گیا ہے، البتہ تمہارا کام اب بھی وہی ہے۔ اللہ کے بندوں کی حتی المقدور خدمت اور اللہ کی بندگی۔ اور یہ دونوں فرائض تم اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے بھی انجام دے سکتے ہو۔ تمہارے مقدر کے بندے وہاں بھی تم تک پہنچ جائیں گے اور تم سے جو ہو سکے، ان کے لیے ضرور کرنا۔ جاؤ اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں بٹ جاؤ، تاوقتیکہ تمہیں تمہاری کسی نئی تعیناتی کا مراسلہ مل جائے۔ ہم سب تمہاری کسی بھی مدد کے لیے ہمیشہ موجود رہیں گے.....“ حاکم بابا، مولوی خضر اور نعمان (عبد اللہ) نے فردا فردا مجھے گلے لگا کر رخصت کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے تنہا ساحل کی جانب چل پڑا۔ مہما، مہما، خرم اور اس کے والدین جان بوجھ کر ایک خاص مقام پر رک گئے اور میں لرزرتی دھڑکنے والے اور دوڑتے سورج کے پیش منظر میں، اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑی زہرہ کے قریب پہنچ کر کچھ قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ کہتے ہیں، کچھ لمحے ایسے بھی وارد ہوتے ہیں، جن کا انتظار خود ”وقت“ کرتا ہے۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس ”ماہ تاب منتظر“ کی پلکیں اٹھیں اور پس منظر میں دوبارہ سورج یک لخت مدھم پڑ گیا۔ پتا نہیں، زندگی اس پل شروع ہوئی تھی یا میری فنا کے بعد بھی میری بنفیس چلی رہی تھیں۔ میں نیند میں تھا یا میرا سب سے خوب صورت خواب کھلی آنکھوں، میرے سامنے جگ گیا تھا نہ مین بننے لگی تھی یا سمندر ساکت ہو گیا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں زہرہ کے کانوں کی بالیوں سے منعکس ہو کر اس کے چہرے کو دمک رہی تھیں یا زہرہ کے چہرے کا ٹوٹا تھا، جو ان کو مزید اجال رہا تھا۔ ہم دونوں چپ کھڑے رہے۔ سمندر کی لہروں نے ہماری خاموشی کی زبان کو ایک دوسرے تک منتقل کرنے کا فریضہ اپنے سر لے لیا۔ آس پاس سرسراہتی ہوائے اُن کے لفظوں کو معنی پہنانا شروع کر دیے۔ زہرہ کی آنکھوں نے کہا۔ ”آپ آگئے ساحر..... میں کب سے آپ کی راہ دیکھ رہی تھی.....“ میں نے بند لپوں سے جواب دیا ”میں تو سدا آپ کے ساتھ تھا..... آپ کی راہ کی دھول بن کر..... کبھی منزل نہ بننے والی راہوں کی دھول.....“ اس کی گھنیر سی پلکیں تڑپ کر جھپکیں ”نہیں..... آپ میری راہوں کی دھول بن کر نہیں، میری آنکھوں کے کھل کی طرح میرے ساتھ تھے۔ میں جس راہ بھی چلتی، میری منزل کا راستہ آپ ہی سے ہو کر گزرتا۔ کبھی کسی منزل میں راستہ بھی تو بن جاتی ہیں۔“ ہم دونوں بظاہر خاموش کھڑے تھے۔ گفتگو اخلاقی بن چکی تھی اور ہماری آنکھوں میں جھلملائے سمندر کا گہرا ہاری بھگی پلکوں سے جھلک رہا تھا۔ کوئی ہمیں دور سے یوں کھڑے دیکھتا تو اسے بھی لگتا کہ شاید ہم دونوں کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہی، مگر یہ ہونٹوں اور زبان کی بولی سننے اور بولنے والے ظاہر پرست ہلکا خاموشی کی باتیں کیا جاتیں؟ زمانہ آج تک لوگوں کے طرزِ تفکر اور تحاطب کی خوب صورتی کی مثالیں دیتا آیا ہے، لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کچھ لوگ جب جو سماعت ہوں تو بھی کمال خوب صورت لگتے ہیں، جیسے ٹھیک اس لمحے وہ خاموش پری اور سماعت کا واسطہ صرف کان سے تو نہیں ہوتا، کبھی کسی کی آنکھیں، جھلکتی پلکیں، جبین پر پسینے کی ہونٹیں، لرزتے بند لب اور کسی کی شمع کھاتی زلف کا بل بھی تو ہماری اُن کی کو پوری طرح سن رہا ہوتا ہے۔ میں اور زہرہ بھی اس وقت مجسم سماعت تھے، ہر اس اقرار، ہر اس بیان کے لیے، جو ہم نے یوں سے ادا نہیں کیا، پھر بھی ہم دونوں نے سن لیا۔ اتنے میں دور نیلے سے مہما کی لہروں کے دوش پر آتی آواز سنائی دی۔ ”عبد اللہ..... ویر ہو رہی ہے بیٹا..... چلو گھر چلیں.....“ میں نے زہرہ سے کہا ”چلیں سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں.....“ اس ناز آفریں نے پہلا قدم اٹھایا، لیکن میں رک گیا۔ ”لیکن یہ جان کر اپنے قدم بڑھانے کا کہ عبد اللہ کی مسافیتیں ابھی باقی ہیں۔ راستے دشوار اور منزلیں سراب ہیں..... تھک تو نہیں جائیں گی.....؟“ زہرہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”ذرا رہے یا تمہیں کہہ رہے ہیں.....؟“ میں بھی مسکا دیا۔ ”صرف اپنے نصیب کی بھول بھلیوں سے آگاہ کر رہا ہوں۔“ تب زندگی میں پہلی مرتبہ زہرہ نے بس اک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں جھانکا اور میں پہلی بار پتھر نہیں ہوا۔ ”اب جو عبد اللہ کی راہ ہے..... وہی زہرہ کا راستہ ہے..... جب مقدر جڑ جائیں، تو نصیب کی گرجیں اپنے آپ کھن جاتی ہیں۔ آپ زہرہ کو ہمیشہ ثابت قدم پا نہیں گے۔“ دور سمندر کے اس پار افق پر سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے قدم بڑھا دیے اور زہرہ میرے پیچھے چل پڑی۔ میرے نقش پا پر اپنے نازک قدم دھرتی..... پہلی مرتبہ عبد اللہ اور زہرہ کو ایک ساتھ اس ذکر پر چلتے دیکھ کر لہریں مسکرائیں اور ڈوبتے سورج نے کہا۔ ”مٹی مسافیتیں..... نئے سفر اور نیا ہم سفر مبارک ہو دوست..... آنے والی سحر کے ساتھ اک نئے آسمان کا سلام..... اور اس ڈھلتی شام کی جانب سے تمہیں الوداع..... الوداع عبد اللہ..... الوداع.....“